

شجرۂ مبارکہ

یعنی

تذکرہ علمائے مبارک پور

(اضافہ شدہ جدید ایڈیشن)

جس میں

شمالی ہندوستان کے مشہور علمی و دینی اور صنعتی قصبہ مبارک پور اور اس کے ملحقات کی ساڑھے چار سو سالہ
اجمالی تاریخ اور قصبہ و سوا قصبہ کے مشائخ و بزرگانِ دین، علماء، فقہاء، محدثین، مدرسین و مصنفین، شعراء
و اُدباء اور دیگر اربابِ علم و فضل کے حالات اور ان کے علمی و دینی کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔

از

مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ

۱۹۱۲ء — ۱۹۹۶ء

تحقیق و اضافہ

مولانا مفتی محمد صادق صاحب مبارک پوری

صدر المدرسین مدرسہ جامعہ نور الاسلام ولید پور ضلع منو

جنرل سکریٹری مولانا شکر اللہ اکیڈمی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ

شائع کردہ: مولانا شکر اللہ اکیڈمی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ

حقوق بحق ناشر محفوظ

کتاب :	شجرہ مبارکہ یعنی تذکرہ علمائے مبارک پور
مصنف :	مورخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ
تکملہ :	مولانا مفتی محمد صادق مبارک پوری
کمپوزنگ :	
ترمیم کار :	قاری عثمان غنی عادل 9450732097
صفحات :	۵۱۲
طبع اول :	۱۳۹۴ھ / ۱۹۷۴ء دائرۃ ملیہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ
طبع دوم :	(اضافہ کے ساتھ) ۱۴۲۹ھ / ۲۰۰۸ء مکتبہ الفہیم منوناتھ بھجن
طبع سوم :	(تکملہ کے ساتھ) محرم الحرام ۱۴۴۲ھ / ستمبر ۲۰۲۰ء
قیمت :	۳۰۰ روپے
تعداد :	۵۰۰

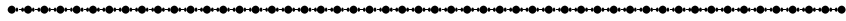
شائع کردہ

مولانا شکر اللہ اکیڈمی مبارک پور ضلع اعظم گڑھ

ملنے کے پتے

منہاج بک ڈپو مبارک پور ضلع اعظم گڑھ
 وہاج پبلیکیشن مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ
 اعظمی بک ڈپو مرکزی جامع مسجد پورہ رانی، مبارک پور

ہلا سکتی نہیں ہے دولت کو نین بھی اٹھہر
جبین فقر پر رکھی ہے بنیادِ خودی ہم نے



فہرست مضامین

نمبر	مضمون	صفحہ
۱	شجرہ نسب خانوادہ قاضی	۲۰
۲	تشکر و اظہار حقیقت (قاضی سلمان مبارک پوری)	۲۱
۳	دعوتِ نظر (علامہ انور صابری)	۲۷
۴	تعارف مصنف	۲۸
۵	سلام	۳۵
۶	مسلم کی دعا	۳۷
۷	پیش لفظ (مولانا عبید الرحمن صاحب قمر مبارک پوری)	۳۹
۸	مقدمہ (مورخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری)	۴۰
۹	اپنی باتیں (محمد صادق مبارک پوری)	۴۷
۱۰	مبارک پور کی اجمالی تاریخ	۴۹
۱۱	نگر پالیکا مبارک پور کی تاریخ	۵۸
۱۲	ملفوظات و سوادِ مبارک پور	۶۰
۱۳	سکٹھی	۶۰
۱۴	سرائے مبارک	۶۱
۱۵	مصطفیٰ آباد	۶۱
۱۶	حسین آباد	۶۲

۶۳	چیونٹی	۱۷
۶۳	سریاں	۱۸
۶۴	نوادہ	۱۹
۶۴	رسول پور	۲۰
۶۵	املو اور لوہیا	۲۱
۶۶	چکیا	۲۲
۶۶	اساور	۲۳
۶۶	لہرا، گجہڑا، فخر الدین پور	۲۴
۶۷	بہور	۲۵
۶۹	مذہبی فتنے	۲۶
۷۲	تکوینی حوادث	۲۷
۷۳	مذہب اور فرقے	۲۸
۷۷	روحانی سلسلے	۲۹
۸۲	مکاتب و مدارس	۳۰
۸۶	علمی اور درسی سلسلے	۳۱
۹۴	علمائے مبارک پور کے تصنیفی کارنامے	۳۲
۱۰۰	شعروادب	۳۳
۱۰۳	علمائے مبارک پور کی عالمی شہرت	۳۴
۱۰۷	ملک شہدائی و دیگر شہداء	۳۵

۱۱۳	راجہ سید مبارک مانک پوری بانی مبارک پور	۳۶
۱۲۴	شیخ محمود قریشی بانی	۳۷
۱۲۸	پیر زادہ مخدوم محمد ماہ الملوی	۳۸
۱۲۹	مخدوم شیخ رشید بن مخدوم شیخ سعید فاروقی	۳۹
۱۳۰	بندگی سید کمال الدین گجہڑا	۴۰
۱۳۱	قاضی محمد صالح گجہڑا	۴۱
۱۳۱	انگرا شاہ	۴۲
۱۳۲	غریب شاہ مبارک پوری	۴۳
۱۳۳	دیوان مصطفیٰ شاہ بانی مصطفیٰ آباد	۴۴
۱۳۳	غریب شاہ الملوی	۴۵
۱۳۳	شاہ فضل کڑا	۴۶
۱۳۴	نگئے شکر مال کڑا	۴۷
۱۳۴	شاہ کدھا سگری	۴۸
۱۳۴	شیخ کمال الدین نواہ	۴۹
۱۳۵	راجہ بھانٹ	۵۰
۱۳۵	حضرت مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراوی	۵۱
۱۴۰	حضرت مولانا شاہ حافظ ابواسحاق محدث لہراوی	۵۲
۱۴۴	شیخ غلام رسول مصطفیٰ آبادی	۵۳
۱۴۵	رمضان علی شاہ شیعی	۵۴

۱۴۶	مولوی ثار علی اسماعیلی سرانمیری شہیدؒ	۵۵
۱۴۹	مولوی محمد نشان شہید	۵۶
۱۵۰	میر معظم حسین شہیدؒ	۵۷
۱۵۱	شیخ چراغ علی شیعہ	۵۸
۱۵۱	شیخ سیف علی شیعہ	۵۹
۱۵۲	شیخ علی شہیدؒ نائب قاضی مبارک پور	۶۰
۱۵۷	شیخ امام بخش	۶۱
۱۵۸	سید ناصر علی	۶۲
۱۶۰	شیخ محمد رضاؒ	۶۳
۱۶۲	شیخ حسام الدین شاہؒ	۶۴
۱۶۳	شیخ محمد رجب	۶۵
۱۶۵	مولانا حکیم امان اللہ	۶۶
۱۶۶	مولوی دھنا سے	۶۷
۱۶۷	مولوی نرہو	۶۸
۱۶۸	شیخ عبدالوہاب سریانویؒ	۶۹
۱۷۰	مولوی جان محمد	۷۰
۱۷۰	مولوی بشارت علی فیض آبادی	۷۱
۱۷۱	مولوی عنایت اللہ امام جامع مسجد	۷۲
۱۷۲	غازی عبدالسبحان الملوئیؒ	۷۳

۱۷۲	غازی محمد اسماعیل الملوئی	۷۴
۱۷۲	شیخ محمد اکبر غازی الملوئی	۷۵
۱۷۴	شیخ الہی بخش غازی الملوئی	۷۶
۱۷۴	شیخ جہانگیر غازی الملوئی	۷۷
۱۷۴	مولانا حافظ خدا بخش مہاجر کی	۷۸
۱۷۹	منشی حبیب اللہ حبیب	۷۹
۱۸۰	ملا پیر بھائی اسماعیلی	۸۰
۱۸۱	مطوف شیخ فتح محمد مہاجر کی	۸۱
۱۸۲	مولوی غریب اللہ	۸۲
۱۸۳	مولوی علی حسن فاروقی	۸۳
۱۸۴	خلیفہ دین علی شاہ	۸۴
۱۸۵	مولوی جان محمد	۸۵
۱۸۵	ملا شیخ عبد الحکیم اسماعیلی	۸۶
۱۸۶	مولوی حکیم عبد اللہ	۸۷
۱۸۶	مولانا حافظ حکیم عبد الرحیم	۸۸
۱۸۸	حافظ شاہ نظام الدین سریانوی	۸۹
۱۹۳	مولوی سلامت اللہ	۹۰
۱۹۳	مولوی اشرف علی بھوری	۹۱
۱۹۳	مولوی عبد الصمد مبارک پوری	۹۲

۱۹۴	مولوی حکیم امیر علی مبارک پوری سورتی	۹۳
۱۹۴	مولوی غلام عباس	۹۴
۱۹۶	حضرت مولانا ابوالعلی عبدالرحمن محدث مبارک پوریؒ	۹۵
۲۰۸	حضرت مولانا ابوالامجد عبدالعلیم رسول پوریؒ	۹۶
۲۱۸	حضرت مولانا حکیم ابوالہدیٰ عبدالسلام مبارک پوری	۹۷
۲۲۷	حضرت مولانا احمد حسین رسول پوریؒ	۹۸
۲۴۶	حضرت مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی	۹۹
۲۵۴	حضرت ملا ابوالطیب رحمت علی اسماعیلی	۱۰۰
۲۶۲	شمس العلماء حضرت مولانا ظفر حسن عینی فاروقی	۱۰۱
۲۶۵	حضرت مولانا ابو محمد عبدالحق ملویؒ	۱۰۲
۲۶۸	حضرت مولانا محمد احمد لہراویؒ	۱۰۳
۲۷۰	حضرت مولانا حکیم الہی بخش صاحب	۱۰۴
۲۷۳	حضرت مولانا شکر اللہ مبارک پوری	۱۰۵
۲۸۶	حضرت مولانا محمد نعمت اللہؒ	۱۰۶
۲۹۰	مولوی ولی محمد صاحب	۱۰۷
۲۹۱	مولوی حکیم محمد شفیع	۱۰۸
۲۹۱	مولوی حکیم غلام رسول فاروقی	۱۰۹
۲۹۲	مولوی محمد یعقوب	۱۱۰
۲۹۲	مولوی قمر الدین ندوی ملوی	۱۱۱

۲۹۳	مولوی حکیم شاہ فیاض عالم املویؒ	۱۱۲
۲۹۳	مولوی حکیم الطاف حسین سکٹھوی	۱۱۳
۲۹۴	مولانا شاہ محمد سریانویؒ	۱۱۴
۲۹۶	مولوی نور محمد امام جامع مسجد	۱۱۵
۲۹۸	مولوی رفیع الدین	۱۱۶
۳۰۰	مولانا حافظ عبدالعزیز	۱۱۷
۳۰۱	مولوی عنایت اللہ	۱۱۸
۳۰۲	مولوی حافظ محمد سجاد بمہوریؒ	۱۱۹
۳۰۳	مولوی رجب علی سکٹھوی	۱۲۰
۳۰۳	مولانا حکیم علی سجاد	۱۲۱
۳۰۴	مولوی عبدالرحمن	۱۲۲
۳۰۴	مولانا غلام رسول	۱۲۳
۳۰۴	مولانا محمد تقی	۱۲۴
۳۰۵	مولانا محمد داؤد	۱۲۵
۳۰۵	مولانا عبدالرحمن زاہد	۱۲۶
۳۰۵	مولوی احمد اللہ املویؒ	۱۲۷
۳۰۶	میاں صاحب عبداللہ شفا	۱۲۸
۳۰۸	منشی قمر الزماں زماں	۱۲۹
۳۱۰	میاں صاحب عبدالکریم عاشق	۱۳۰

۳۱۱	مولانا محمد اسماعیل اصلاحی	۱۳۱
۳۱۲	مولوی حکیم محمد یسین نوادوی	۱۳۲
۳۱۲	استاذ الشعراء مولوی علیم اللہ خیالی مبارک پوری برہان پوری	۱۳۳
۳۱۵	مولوی منشی غلام حسین عاشق مبارک پوری	۱۳۴
۳۱۶	حضرت مولانا محمد شعیب رسول پوری	۱۳۵
۳۱۹	حضرت مولانا عبدالباقی رسول پوری	۱۳۶
۳۲۲	حضرت مولانا عبدالصمد حسین آبادی	۱۳۷
۳۲۶	حضرت مولانا محمد یحییٰ رسول پوری	۱۳۸
۳۳۲	مولوی ممتاز علی سریانوی	۱۳۹
۳۳۳	مولوی فقیر اللہ	۱۴۰
۳۳۴	مولوی حکیم محمد سعید	۱۴۱
۳۳۵	مولوی حکیم عبدالجبار رسول پوری	۱۴۲
۳۳۶	مولوی حکیم عبدالحمید	۱۴۳
۳۳۷	مولوی حکیم شاہ محمد صاحب	۱۴۴
۳۳۷	مولوی محمد ہارون	۱۴۵
۳۳۸	مولوی محمد طفیل الملوئی	۱۴۶
۳۳۹	مولوی ولی الحسن فاروقی	۱۴۷
۳۴۰	مولوی منشی عبدالوحید لاہر پوری	۱۴۸
۳۴۱	حضرت مولانا نذیر احمد رحمانی الملوئی	۱۴۹

۳۴۲	مولانا عبید الرحمن مظاہری رحمانی	۱۵۰
۳۴۳	مولانا حکیم محمد بشیر رحمانی	۱۵۱
۳۴۵	مولانا محمد حنیف رہبر شکری	۱۵۲
۳۴۶	مولانا عبدالحی غفران	۱۵۳
۳۴۷	مولوی احمد علی	۱۵۴
۳۴۸	مولانا محمد شبلی متکلم ندوی بھوری	۱۵۵
۳۴۹	قاری عبدالحی	۱۵۶
۳۴۹	مولانا شمس الحق گجہڑا	۱۵۷
۳۵۰	مولوی حکیم حماد علی	۱۵۸
۳۵۰	مولوی حکیم محمد عمر	۱۵۹
۳۵۰	مولوی محمد یوسف انصاری	۱۶۰
۳۵۱	مولوی محمد حسن	۱۶۱
۳۵۲	مولوی حکیم عبدالباری	۱۶۲
۳۵۲	مولوی محمد اصغر	۱۶۳
۳۵۳	مولوی عبدالحفیظ سریانوی	۱۶۴
۳۵۳	مولوی نظام الدین سریانوی	۱۶۵
۳۵۴	مولوی حفیظ اللہ رضوی	۱۶۶
۳۵۴	مولوی ثار احمد مظاہری	۱۶۷
۳۵۵	مولوی عبد الجبار سکٹھوی	۱۶۸

۱۶۹	مولوی محمد سلیمان	۳۵۵
۱۷۰	مولوی عبدالشکور	۳۵۵
۱۷۱	مولوی عبدالمجید سریانوی	۳۵۶
۱۷۲	مولوی عبداللہ دملوی	۳۵۷
۱۷۳	مولوی نذیر احمد نوادوی	۳۵۷
۱۷۴	مولوی محمد یوسف رحمانی	۳۵۸
۱۷۵	مولانا حافظ عبدالرؤف بلیاوی	۳۵۸
۱۷۶	استاذ الشعراء محمد یسین فغان مبارک پوری سورتی	۳۵۹
۱۷۷	مولوی حکیم عبدالباری	۳۶۰
۱۷۸	مولوی محمد یونس سریانوی	۳۶۱
۱۷۹	مولانا خواجہ عبدالعزیز نعمانی مبارک پوری	۳۶۲
۱۸۰	مولوی محمد بشیر خان سکٹھوی	۳۶۳
۱۸۱	مولوی عبدالغفور	۳۶۴
۱۸۲	مولوی فیاض حسین واعظ	۳۶۵
۱۸۳	مولانا حکیم محمد صابر خان صاحب سکٹھی	۳۶۶
۱۸۴	مولوی فخر الدین مبارک پوری	۳۶۷
۱۸۵	مولوی حافظ مبارز الدین مبارک پوری	۳۶۷
۱۸۶	مولانا خالد کمال مبارک پوری (خلف اکبر مولانا قاضی اطہر مبارک پوری)	۳۶۸

۱۸۷	مراجع و مصادر	۳۷۷
۱۸۸	تکملہ تذکرہ علمائے مبارک پور از: مفتی صادق مبارک پوری	۳۷۹
۱۸۹	پیش لفظ	۳۸۰

الف

۱۹۰	مولانا امین احسن صاحب اصلاحی بمہوری	۳۸۲
۱۹۱	مولانا الیاس احمد صاحب اصلاحی بمہوری	۳۸۴
۱۹۲	مولانا انیس احمد اصلاحی بمہوری	۳۸۵
۱۹۳	مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری	۳۸۷
۱۹۴	مولوی اختر حسین صاحب مبارک پوری	۳۹۰
۱۹۵	مولانا قاری انوار الحق صاحب مبارک پوری	۳۹۰

ب

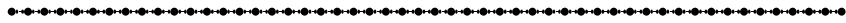
۱۹۶	مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پوری	۳۹۲

ج

۱۹۷	مولوی جواد حسین صاحب مبارک پوری	۳۹۵
۱۹۸	مولانا جمیل احمد صاحب مدنی، مبارک پوری	۳۹۶

ح

۲۹۹	مولانا حفیظ اللہ صاحب نعمانی مبارک پوری	۳۹۹



د

۲۰۰	مولانا داؤد اکبر صاحب اصلاحی جمہوری	۲۰۱
۲۰۱	مولانا دین محمد صاحب ابراہیم پوری	۲۰۳

ر

۲۰۲	مولانا ڈاکٹر رضاء اللہ صاحب مبارک پوری	۲۰۳
۲۰۳	مولوی ریاض احمد صاحب ابراہیم پوری	۲۰۶

س

۲۰۴	مولوی حکیم حاجی سلمان احمد صاحب مبارک پوری	۲۰۷
۲۰۵	مولوی سبط حسن صاحب مبارک پوری	۲۰۸

ش

۲۰۶	مولانا شمس الدین صاحب الحسینی مبارک پوری	۲۰۹
۲۰۷	مولانا شاکر علی صاحب لال چوک مبارک پوری	۲۱۳

ص

۲۰۸	مولانا صفی الرحمن صاحب حسین آبادی	۲۱۴

ظ

۲۰۹	مولانا مفتی ظہور احمد صاحب ندوی	۲۱۷
۲۱۰	مولانا قاضی ظفر مسعود صاحب مبارک پوری	۲۱۹

ع

۲۱۱	مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب مراد آبادی	۲۲۱

۴۲۳	مولوی عبد الحمید صاحب شاہ ناظر مبارک پوری	۲۱۲
۴۲۳	مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی محدث	۲۱۳
۴۲۷	مولوی حکیم عبد الحمید صاحب مبارک پوری	۲۱۴
۴۲۸	مولانا مفتی علی احمد صاحب قریشی مصباحی	۲۱۵
۴۲۹	مولانا عبد الباری صاحب قاسمی	۲۱۶
۴۳۱	مولانا عبد الستار صاحب قاسمی	۲۱۷
۴۳۲	مولانا مفتی عبد المنان صاحب مصباحی اعظمی	۲۱۸
۴۳۴	مولانا عبد الکریم صاحب ابراہیم پوری	۲۱۹
۴۳۸	مولوی علی ارشد نجفی مجتہد	۲۲۰
۴۳۹	مولانا مفتی عبد الرؤف منصف مبارک پوری	۲۲۱
۴۴۱	مولانا عبد الحنان صاحب بمہوری	۲۲۲
۴۴۳	مولانا عبید الرحمن صاحب قمر رحمانی حسین آبادی	۲۲۳
۴۴۴	مولوی عبد الوحید صاحب فیضی	۲۲۴
۴۴۵	مولانا عبد المعید صاحب قاسمی مبارک پوری	۲۲۵
۴۵۰	مولانا عبید اللہ صاحب قاسمی بمہوری	۲۲۶
۴۵۲	مولانا عزیز الرحمن صاحب سلفی حسین آبادی	۲۲۷
۴۵۳	مولوی علی حسین صاحب مبارک پوری	۲۲۸
۴۵۳	مولوی علی اصغر صاحب مبارک پوری	۲۲۹
۴۵۳	مولانا عبد الرب صاحب مبارک پوری	۲۳۰

ق

۲۳۱	مولانا قمر الدین صاحب رسول پوری	۴۵۹
۲۳۲	مولانا قمرۃ العین صاحب فائق مبارک پوری	۴۶۱

م

۲۳۳	مولوی محمد صاحب مبارک پوری	۴۶۴
۲۳۴	مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوری	۴۶۴
۲۳۵	مولانا محمد اصغر صاحب سریا نوئی	۴۶۹
۲۳۶	مولانا محمد عمر صاحب مبارک پوری	۴۶۹
۲۳۷	مولانا محمد علی صاحب مبارک پوری	۴۷۱
۲۳۸	مولوی محمد منیر صاحب مبارک پوری	۴۷۲
۲۳۹	مولانا محمد عثمان صاحب ساحر مبارک پوری	۴۷۲
۲۴۰	مولوی خواجہ محمد شفیع صاحب مبارک پوری	۴۷۴
۲۴۱	مولانا مفتی محمد محبوب صاحب اشرفی نوادوی	۴۷۵
۲۴۲	شیخ مولانا محمد ادریس صاحب آزاد رحمانی	۴۷۷
۲۴۳	مولانا مختار احمد صاحب مبارک پوری	۴۷۸
۲۴۴	الاستاذ محمد حسن صاحب الاعظمی الازہری	۴۷۹
۲۴۵	مولانا مظفر حسن صاحب ظفر ادیبی	۴۸۲
۲۴۶	مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اعظمی قریشی	۴۸۳
۲۴۷	مولانا مطیع اللہ صاحب رحمانی	۴۸۵

۴۸۶	ملا محمد یونس شکیب صاحب اسماعیلی مبارک پوری	۲۴۸
۴۸۷	مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب مبارک پوری	۲۴۹
۴۸۷	مولانا محمد عمر سیفی الاعظمی	۲۵۰
۴۸۹	مولانا قاری محمد زبیر صاحب مبارک پوری	۲۵۱
۴۹۱	مولوی محمد ناصر قاسمی	۲۵۲
۴۹۱	مولانا ڈاکٹر محمد یحییٰ صاحب بمہوری	۲۵۳
۴۹۳	مولانا محمد مسلم صاحب بمہوری	۲۵۴
۴۹۵	مولوی محمد رضوان الحسنین صاحب مبارک پوری	۲۵۵
۴۹۶	مولانا مسرور حسن مجیدی قتی	۲۵۶
۴۹۷	مولانا محمد ہارون صاحب احیائی ابراہیم پوری	۲۵۷
۴۹۹	مولانا محمد عامر صاحب مبارک پوری	۲۵۸
۵۰۱	مولانا مقبول احمد صاحب رحمانی	۲۵۹
۵۰۱	مولوی محمد یوسف صاحب مبارک پوری	۲۶۰
۵۰۲	مولوی محمد داؤد صاحب مبارک پوری	۲۶۱
۵۰۲	مولانا محمد ابراہیم صاحب خازن	۲۶۲
۵۰۳	مولانا محمد حاتم اشرفی مبارک پوری	۲۶۳
۵۰۳	مولانا محمد حنیف صاحب اعظمی کٹرہ	۲۶۴
۵۰۴	مولانا محمد حنیف صاحب لال چوک	۲۶۵
۵۰۴	مولانا مجیب الرحمن صاحب املوی	۲۶۶

ن

۵۰۴	مولوی نور محمد شاہ واعظ مبارک پوریؒ	۲۶۷
۵۰۴	مولانا نجم الدین صاحب احیائی بمہوریؒ	۲۶۸
۵۰۶	مولانا نیاز احمد صاحب العمریؒ سریانوی	۲۶۹
۵۰۷	مولانا قاضی ثناء احمد صاحب مبارک پوری	۲۷۰
۵۰۷	مولانا ثناء احمد صاحب نواہیؒ	۲۷۱
۵۰۹	ماخذ و مصادر	۲۷۲
۵۱۲	قاضی صاحب مرحوم کی تصانیف	۲۷۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تشکر و اظہارِ حقیقت

الحمد لخالق البرایا والشکر لواهب العطایا وصلی
ربی علی محمد بکرا وظہائر وعشایا أما بعد!

والد محترم مورخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوری علیہ الرحمہ کی اہم کتاب ”تذکرہ علمائے مبارک پور“ پہلی بار جون ۱۹۷۴ء میں دائرۃ ملیہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ یوپی سے شائع ہوئی تھی اور عرصہ دراز سے دستیاب نہیں تھی، قدرداں حضرات کا اصرار تھا کہ اس کی دوبارہ اشاعت ہونی چاہیے، اسی اتثالِ امر میں اب تیس سال بعد زبورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آرہی ہے۔ فالحمد لله علی ذلک۔

قصبہ مبارک پور کا کل تاریخی سرمایہ ”تذکرہ علمائے مبارک پور“ ہے، اس کے علاوہ اس موضوع پر کوئی دوسری کتاب اب تک شائع نہیں ہو سکی ہے، البتہ بزرگوں کی بعض قلمی کتابیں اور بیاضیں ہیں، جن کی حیثیت ذاتی روزنامچہ کی ہے، اس سلسلہ میں اپنوں سے بھی شکوہ ہے کہ انھوں نے اپنے وطن کی تاریخ و ثقافت سے بے اعتنائی برتی اور اپنے قلم کے آثار میں اس کو شامل نہیں کیا۔

مبارک پور زائد ایک صدی سے علم و فن اور صنعت و حرفت کا گہوارہ ہے اور مسلمانوں کے ہر مسلک کے مدارس اس وقت سے موجود ہیں، جب ضلع اعظم گڑھ میں خال خال دینی مدارس پائے جاتے تھے، لیکن نصف صدی قبل تک مبارک پور ذات برادری کی عصبیت کا شکار رہا اور اس کے آس پاس کی گمنام بستیوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی، جب

کہ اس وقت مبارک پور کا علمی و دینی، سیاسی و سماجی اعتبار سے سنہرا دور تھا اور اس کی شہرت کا آوازہ ہر طرف تھا، اس کی نظر اندازی کی زندہ مثال ”حیاتِ شبلی“ ہے، جس کے مصنف علامہ سید سلیمان ندوی ہیں، آپ لکھتے ہیں:

”محمد آباد کے قریب مبارک پور نام کا ایک بڑا قصبہ ہے، جو پرانے زمانہ سے پارچہ بانی کا مرکز ہے اور پچھلے زمانہ میں چند نامور علماء پیدا ہوئے ہیں۔“
(حیاتِ شبلی ص ۵۷، ۱۹۲۳ء)

یہ دوسطری عبارت تجاہلِ عارفانہ کا اچھا خاصا نمونہ ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ صدیوں سے مبارک پور کی ریشمی کپڑوں کی صنعت نے ہندوستان سے گزر کر اقصائے عالم میں اپنی راہ ہموار کر لی ہے اور یہاں کی حریری پوشاک نے حسینانِ نازک اندام کو لباس کے بارگراں سے سبکدوش کر دیا ہے، تو دوسری طرف خود اپنے ملک ہندوستان کے نوابوں، راجاؤں، حکام اور اعلیٰ طبقہ میں اس کے کپڑوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، ایسے میں اہل قلم کے یہاں مبارک پور کا ذکر نہ ہونے کی دوسری کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور دینی، علمی، قومی و ملی سیاست کا مرکز رہا ہے، تحریکِ آزادی میں یہ ہر طرح سے شریک تھا، اس مناسبت سے احیاء العلوم اور دارالمصنفین اعظم گڑھ میں دینی، علمی، قومی اور سیاسی ہم آہنگی تھی اور جانبین سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا، خاص طور پر مولانا شکر اللہ مبارک پوری ناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم نے تو حصولِ آزادی کے سلسلہ میں قید و بند کی مشقت بھی اٹھائی تھی، جس وقت علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم دارالمصنفین میں مقیم تھے۔

مورخ اسلام مبارک پوری شبلی منزل اعظم گڑھ اور جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے تعلقات کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

.....

”اُس زمانہ میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں کئی مشہور اہل علم تصنیف و تالیف میں مشغول تھے، مولانا مسعود علی ندوی صاحب کی وجہ سے دارالمصنفین ضلع کی سیاست کا مرکز تھا، میں کبھی کبھی ساتھیوں کے ہمراہ وہاں جایا کرتا تھا اور مولانا سید سلیمان ندوی ادھر ادھر جاتے ہم لوگوں کو دیکھ کر رک جاتے اور خیریت دریافت کرتے اور بعض اوقات وہ خود بھی مدرسہ احیاء العلوم میں آیا کرتے تھے، مگر ان سے یا دارالمصنفین کے کسی عالم سے استفادہ نہیں ہوسکا، ویسے بھی دارالمصنفین دوسروں کے لیے شجر ممنوعہ ہے، البتہ وہاں کی تصانیف اور رسالہ سے بہت فائدہ ہوا اور ان سے میرے ذوق کو مدد ملی۔“

(خودنوشت کاروانِ حیات ص: ۲۷ مصنف: مورخ اسلام مبارک پوری)

مورخ اسلام ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں عربی کے طالب علم تھے اور عربی کی پوری تعلیم احیاء العلوم سے حاصل کی تھی، انھوں نے صرف ایک سال کے لیے مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخلہ لیا اور دورہ حدیث سے فراغت حاصل کی۔ مبارک پور قدیم دور سے علم و فن اور صنعت و حرفت کا مرکز رہا ہے اور دینی علوم کی آبیاری کے لیے یہاں انیسویں صدی کے اخیر میں دینی مدارس کے قیام کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، اس کی پہلی کڑی باب العلم ہے، اس کے بعد دارالتعلیم کی بنیاد پڑی، پھر اس کے بعد مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم اور احیاء العلوم کا قیام ہوا، موخر الذکر دونوں مدارس مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور سات دہائیوں سے ہزاروں علماء کرام سند فراغت حاصل کر چکے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ مبارک پور بیسویں صدی کے شروع سے چاروں مکتب فکر کا مرکز رہا ہے اور آج بھی اس کی یہ حیثیت باقی ہے اور یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پورے متحدہ ضلع اعظم گڑھ میں جو مدارس کے برگ و بار نظر آرہے ہیں، چندے معدودے کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر میں مبارک پوری مدارس کے شجرہ مبارکہ کی قلم لگی ہوئی ہے، خواہ ان کا کسی فرقہ سے تعلق ہو،

مبارک پوری مدارس کی دینی و علمی روشنی ضلع سے نکل کر اطراف و جوانب میں پھیلی ہوئی ہے، اس کے باوجود ۱۹۴۳ء میں مبارک پور کا ذکر محمد آباد کے حوالہ سے کرنا مضحکہ خیز بات ہے۔

جب مبارک پور کے دینی، علمی، فکری اور سیاسی عروج کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اس وقت مبارک پور کے آسمانِ علم و فن پر چندے آفتاب بھی تھے اور چندے ماہتاب بھی، جن کا مفصل تذکرہ اور ان کی علمی و دینی خدمات کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے، ان عبارتہ میں سے چند کے اسمائے گرامی ملاحظہ ہوں:

- (۱) مولانا عبدالعلیم خفی رسول پوری مبارک پوری متوفی ۱۹۲۲ء صاحب کتاب الشہادۃ۔
- (۲) مولانا عبدالسلام مبارک پوری متوفی ۱۹۲۴ء صاحب کتاب سیرۃ البخاری۔
- (۳) مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری متوفی ۱۹۳۵ء صاحب تحفۃ الاحوذی۔
- (۴) مولانا حکیم الہی بخش مبارک پوری متوفی ۱۹۳۷ء بانی مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور۔
- (۵) مولانا احمد حسین رسول پوری مبارک پوری متوفی ۱۹۳۹ء صاحب سبیل الآخرت۔
- (۶) ملا رحمت علی اسماعیلی مبارک پوری متوفی ۱۷ جون ۱۹۴۴ء بوہرہ مذہبی کتابوں کے مصنف اور عربی کے بہترین شاعر۔

(۷) مولانا شکر اللہ مبارک پوری ناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم متوفی ۱۹۴۲ء۔ اگر متحدہ ضلع اعظم گڑھ سے مدرسہ احیاء العلوم، مولانا شکر اللہ مبارک پوری اور اس وقت کے مبارک پوری علمائے کرام کے نام خارج کر دیئے جائیں تو اس ضلع کی دینی، علمی، ادبی، سیاسی، فکری، سماجی اور تحریک آزادی کی کوئی داستان مکمل نہیں ہو سکتی۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے قیام دارالمصنفین کے زمانہ میں علمائے مبارک پور کی دینی و علمی خدمات کا غلغلہ ہندوستان سے باہر عالم اسلام میں پہنچ چکا تھا، ”حیات شبلی“ کے مصنف کو محمد آباد کے ایک دو جج تو نظر آئے، مگر مبارک پور کے درجنوں جہابذہ علم و فن نظر نہیں

آئے، جن کے علمی، دینی اور ادبی سرمایہ کا عالمی سطح پر اعتراف کیا گیا ہے۔

انگریزوں کے دورِ غلامی میں جو ہندوستانی مسلمان سرکاری ملازم تھے، وہ ایک خاص طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، جن کا اسلام اور مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں تھا، وہ صرف اپنے انگریز آقا کی غلامی میں اپنی ساری ذہنی و فکری صلاحیتیں خرچ کرتے تھے اور آزادی کے بعد آج بھی مسلمان سرکاری ملازم پوری زندگی اپنی ساری ذہنی و فکری صلاحیت حکومتِ وقت کی وفاداری کے تنور میں جھونکتے ہیں، مگر صلہ میں ان کو حکومت کی طرف سے صرف غداری کا تمغہ دیا جاتا ہے۔

مسلمان سرکاری ملازمین کا ہندوستانی مسلمانوں کے قومی، ملی، سیاسی اور معاشی مسائل سے کچھ لینا دینا نہ تو آزادی سے پہلے تھا، نہ ہی آزادی کے بعد۔ مبارک پور کی جو علمی، دینی، سماجی، سیاسی اور معاشی ترقی ہے، وہ صرف اہل مبارک پور کی دین داری، عزیمت اور جوہرِ اصلی کی مرہونِ منت ہے، کیوں کہ آزادی کے پہلے اور اس کے بعد اس کے ساتھ سرکاری سطح پر کوئی علمی یا معاشی تعاون نہیں رہا ہے، مبارک پور کی ہمہ گیر ترقی میں صرف مبارک پوری عوام کے حوصلہ اور دینی غیرت و حمیت کا دخل ہے، ان سارے حقائق کے باوجود گمنام بستیوں کی طرح اس کا ذکر کرنا کتنی لغو اور بے تکلی بات ہے، مگر قلم تو محکوم ہوتا ہے اور صاحبِ قلم حاکم، قلم کا کام صرف فرماں برداری کرنا ہے اور بس اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی ہے۔

بہر حال مبارک پور قدیم دور سے علم و فضل اور صنعت و حرفت کا مرکز رہا ہے، مگر روایتی طور پر اسے نظر انداز کرنے کے لیے تجاہل عارفانہ کا انداز اختیار کیا گیا ہے، مورخ اسلام مبارک پوری نے ”تذکرہ علمائے مبارک پور“ کی تصنیف میں تنکے تنکے چنے ہیں، تب کہیں جا کر تاریخ مبارک پور کا آشیانہ تیار ہو سکا ہے، گویا کہ یہ کتاب اس موضوع پر بنیاد کا پتھر ہے اور مصنفؒ نے مبارک پور کی تاریخی کڑی جوڑنے میں رات دن کی قید سے آزاد

ہو کر جگہ جگہ سے معلومات حاصل کی ہے اور تاریخ مبارک پور کو خواب و خیال کی دنیا سے نکال کر کتابی شکل دی ہے، اس موقع پر اقبال سہیل کا ایک شعر یاد آ رہا ہے:

کچھ کھیل نہیں لگیں تعمیر نشیمن کی
بکھرے ہوئے تنکوں کو چُن چُن کے سجانا ہے

یہ کتاب تاریخ مبارک پور رقم کرنے والوں کے لیے نقشِ اولین ہے، جون ۱۹۷۴ء میں شائع ہونے کے بعد آپ نے ۲۳ رسال میں بعض ان علماء کے حالات اس کتاب میں بڑھادیئے ہیں، جو ان کی زندگی میں فوت ہوئے، اس کے علاوہ بھی اس کتاب میں مفید اور اہم اضافہ کیا ہے، جس سے کتاب کی افادیت اور زیادہ ہو گئی ہے۔

یہ ایڈیشن اسی اضافہ شدہ حصہ پر مشتمل ہے، اس کتاب میں مولانا خالد کمال کا تعارف بھی شامل کر لیا گیا ہے، جو اگرچہ مورخ اسلام کے قلم سے نہیں ہے، مگر بیٹے ہونے کی وجہ سے اس کی شمولیت ضروری سمجھی گئی، مصنف نے بعض عبارتوں کے ترجمے نہیں کیے تھے، ان کے ترجمے بھی شامل ہیں، مگر مصنف کی عبارت سے امتیاز قائم کرنے کے لیے قوسین میں سلمان یا قمر لکھ دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کتاب کو قبول فرما کر مصنف کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے آمین یا رب العالمین۔

طالب دعا

قاضی سلمان مبارک پوری

مدیر: قاضی اطہر اکیڈمی

مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، (یو پی) انڈیا

المرقوم ۱۸/رمضان ۱۴۲۸ھ

مطابق یکم اکتوبر ۲۰۰۷ء

دعوتِ نظر

از: علامہ انور صابری

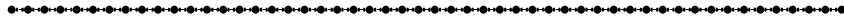
عارضِ الفاظ میں عکسِ جمالِ طور دیکھ
آفتابِ عظمتِ ماضی کا فیضِ نور دیکھ

تذکرے اسلاف کے بخشیں گے روحوں کو حیات
باہمہ کیف و نشاطِ جذبہٴ مسرور دیکھ

اطہر و پاکیزہٴ جذباتِ اطہر کی قسم
دورِ حاضر میں علاجِ خاطرِ رنجور دیکھ

آشنا ہو کر عمل سے جائے گا جو تافلک
وہ نیا رنگِ شعورِ فطرتِ مستور دیکھ

جس میں پر تو ہے قرونِ خیر کے ایمان کا
ہوش کی آنکھوں سے ”تاریخِ مبارک پور“ دیکھ



بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعارف مصنف

از: محمد صادق مبارک پوری

نام عبدالحفیظ، والد کا اسم گرامی الحاج شیخ محمد حسن، تخلص اطہر، مگر اسی تخلص سے مشہور ہوئے، خاندان میں چلے آ رہے عہدہ قضا کی وجہ سے ”قاضی“ کہے گئے اور وطن کی طرف نسبت کرتے ہوئے ”مبارک پوری“ سے مشہور ہوئے، ۲۴ رجب ۱۳۳۲ھ / ۷ مئی ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔

آپ کی والدہ مکرمہ ایک علمی و دینی خانوادہ کی چشم و چراغ تھیں، گویا ننھیال ”ہمہ خانہ آفتاب ست“ کا مصداق تھا۔

اسی بنیاد پر قاضی صاحب کی تعلیم و تربیت میں ننھیال کا بڑا دخل رہا، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر مشرقی یوپی کی قدیم درس گاہ علوم و فنون جامعہ عربیہ احياء العلوم مبارک پور میں ۱۳۵۰ھ میں داخلہ لیا، ۱۳۵۸ھ تک یہاں تعلیم و تربیت کا سلسلہ رہا، چوں کہ بڑی عسرت کا دور تھا، اس لیے گھر پر کسب معاش کا سلسلہ جاری رکھا۔

محی السنہ حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوریؒ سے مرقات، ہدیہ سعیدیہ، ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک، کافیہ، شرح جامی وغیرہ پڑھیں، بعض کتب منطق مولانا بشیر احمد مبارک پوریؒ سے پڑھیں، حضرت مولانا محمد عمر صاحب مبارک پوریؒ سے جلالین شریف، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوریؒ سے ہیئت اور عروض قوانی اور فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوریؒ سے اکثر و بیش تر کتب درسیہ پڑھیں۔

پھر ایک سال دورہ حدیث شریف کی تعلیم جامعہ قاسمیہ مراد آباد میں حاصل کر کے ۱۳۵۹ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، اس چمنستانِ علم میں فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب سے صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی سے صحیح مسلم اور مولانا محمد میاں صاحب سے سنن ترمذی، دیوان حماسہ، مقامات اور زمخشری کا کچھ حصہ پڑھا۔

زمانہ طالب علمی ۱۳۵۳ھ ہی سے آپ کے اشعار اور مضامین ماہ نامہ ”الفرقان“ رسالہ ”قائد“ مراد آباد، سہ روزہ ”زم زم“ لاہور، ہفتہ وار ”مسلمان“ لاہور، ہفتہ وار ”العدل“ گوجرانوالہ، ”الجمعیۃ“ دہلی وغیرہ میں شائع ہونے لگے، پھر معیاری رسائل ”معارف“، ”برہان“، اور ”دارالعلوم“ میں شائع ہونے لگے، رسمی فراغت کے بعد ۱۳۵۹ھ سے ۱۳۶۴ھ تک پانچ سال جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے صیغہ تدریس سے منسلک رہے، پھر ۱۸ ماہ مرکز تنظیم اہل سنت امرتسر سے وابستہ ہو کر ریشیت و قادیانیت پر مضامین لکھے، ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء تک زم زم کمیٹی لاہور سے منسلک رہے، وہاں ۹۰۰ صفحات میں ”منتخب التفاسیر“ مرتب کی اور دوسری کتابیں بھی لکھی، مگر افسوس کی شائع نہ ہو سکیں، تقسیم ملک کی نذر ہو گئیں۔

تقسیم ہند کے بعد ہفتہ وار اخبار ”انصار“ بہرائچ کے مدیر رہے، یہ اخبار حکومت کے نظر عتاب سے ۸ ماہ میں بند ہو گیا، شوال ۱۳۶۶ھ سے صفر ۱۳۶۷ھ تک پھر جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں عارضی مدرس رہے، شوال ۱۳۶۷ھ تا شعبان ۱۳۶۸ھ ایک برس جامعہ اسلامیہ ڈابھیل صوبہ گجرات میں مدرس رہے، نومبر ۱۹۴۹ء میں بمبئی گئے اور دفتر جمعیۃ علماء بمبئی میں افتاء وغیرہ کا کام کیا، جون ۱۹۵۰ء میں وہاں روزنامہ ”جمہوریت“ جاری ہوا تو اس کے نائب مدیر رہے، فروری ۱۹۵۱ء سے مارچ ۱۹۹۱ء تک چالیس سال سے زیادہ مدت تک روزنامہ انقلاب بمبئی میں علمی، تاریخی، دینی، سیاسی مضامین رقم فرماتے رہے، اور یہ

روزنامہ ”انقلاب“ کے ارباب انتظام کی قدردانی ہے کہ آج تک اس کالم کو ہم لوگ قاضی صاحب کی یاد میں ”بیاد قاضی اطہر مبارک پوری“ دیکھتے آرہے ہیں، ۱۹۵۲ء سے ماہ نامہ ”البلاغ“ بمبئی سے جاری ہوا، اور آپ کی ادارت میں ۲۵ سال تک شائع ہوتا رہا، انجمن اسلامی ہائی اسکول بمبئی میں ۱۹۶۰ء سے دس سال تک دینی تعلیم دی، دارالعلوم امدادیہ بمبئی میں دومرتبہ تدریسی خدمات انجام دیں، ۳۰ سال سے زائد عرصہ تک بمبئی میں صحافت و تدریس و تالیف میں مصروف رہے، بھینڈی بمبئی سے قریب میں ”مفتاح العلوم“ قائم کیا، جو بڑی تعلیم گاہ بن چکا ہے، ۱۹۷۶ء میں انصار گرلس ہائی اسکول مبارک پور میں جاری کیا، ۱۴۰۱ھ میں الجامعۃ الحجازیہ اور حجازی مسجد تعمیر کرائی، ۱۹۸۵ء میں علمی و تاریخی تصانیف پر حکومت ہند نے آپ کو اعزازی ایوارڈ عطا کیا، ۱۹۸۰ء، پھر ۱۹۸۴ء اور ۱۹۸۶ء میں نیم سرکاری تنظیم فکر و نظر سندھ کی دعوت پر سرکاری مہمان کی حیثیت سے پاکستان گئے، تنظیم نے آپ کی تصانیف شائع کیں، ایک اجلاس کر کے ان کا رسم اجرا کیا، اور آپ کو ”محسن سندھ“ کا خطاب دیا، جنرل ضیاء الحق صدر پاکستان نے اپنے ہاتھوں سے اعزازی نشان اور ہدایا و تحائف دیئے، آپ کی تصانیف کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ آپ کی تصانیف کا دنیا کی مختلف زبانوں عربی، انگلش، سندھی میں ترجمہ کرا کر شائع ہوئیں اور بعض تصانیف مصر اور ریاض سے بھی چھپیں۔

قاضی صاحب بلند پایہ محقق، عظیم مصنف، ماہر ادیب، قادر الکلام شاعر اور سادگی و تواضع میں سلف صالحین کی نظیر تھے۔

قاضی صاحب علم و فضل، علمی تلاش و تحقیق، تصنیف و تالیف کے ذوق کے ساتھ فضائل اخلاق، سادگی و بے تکلفی، توازن و اعتدال، حق پسندی و غیر جانبداری، مروت و رواداری، گوناگوں محاسن سے آراستہ تھے، ان کی شخصیت میں عالم کا وقار، داعی کا اخلاص،

مردِ مومن کی دل نوازی، محقق کی تلاش و جستجو، اور دینِ کامل کی جامعیت کی جھلکیاں دلوں کو مسرور اور نگاہوں کو مسحور کر دیتی تھیں۔

نماز باجماعت کے نہایت پابند، شاہانہ دعوت ٹھکرا دیتے تھے، اگر اس میں کوئی خلافِ شرع کام ہوتا، روزانہ صبح قبرستان جاتے، مردوں کو ایصالِ ثواب کرتے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے خوگر تھے، ۵/ بار حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرور ہوئے۔ زندگی کے آخری پڑاؤ میں نزہ زکام میں مبتلا رہنے لگے، جس کی وجہ سے ناک کے بائیں سوراخ سے خون آنے لگا، ۲۹/ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو اعظم گڑھ میں ناک کا آپریشن کرایا تھا، پھر ۶ جنوری ۱۹۹۶ء سے بار بار پیشاب کا عارضہ لاحق ہو گیا۔

بالآخر ۲ صفر ۱۴۱۷ھ / ۱۴ جولائی ۱۹۹۶ء یکشنبہ کا دن گزار کر شب میں دس بجے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے، دوسرے روز دوشنبہ کو تین بجے دن میں مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی، بنارس، جون پور، اعظم گڑھ، منو، غازی پور، گورکھپور وغیرہ کے علمائے کرام اور فضلاء عظام کے عظیم مجمع میں نماز جنازہ اور تدفین عمل میں آئی۔

قاضی صاحب کو کل ۸ اولادیں ہوئیں، دو بچے شریف انور اور انور جمال صغیر سنی ہی میں فوت ہو گئے، بقیہ ۶ اولادیں جن میں ۴ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں، ان کا مختصر تذکرہ حوالہ قلم کیا جاتا ہے۔

(۱) مولانا قاضی خالد کمال صاحب سب سے بڑے فرزند، بہت ہی تیز، ذہین و فطین عالم دین، ادیب و شاعر، اور اسلامی دانشور تھے، اور محفل کو زعفران زار بنانے والی شخصیت کے مالک تھے، اپنے والد مکرم کی طرح قلم و قریاس کی دولت سے نوازے گئے تھے، ان کے مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے تھے۔

یکم دسمبر ۱۹۳۸ء کو ولادت ہوئی، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں عالمیت اور دارالعلوم دیوبند میں فضیلت کی تکمیل کی، کچھ دنوں احیاء العلوم میں معلمی کی، پھر چند سالوں کے بعد مدرسہ مفتاح العلوم بھونڈی میں تدریسی خدمات انجام دی۔

۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ طیبہ میں بغرض تعلیم داخل ہوئے، ۱۹۶۷ء میں فراغت ہوئی تو مغربی افریقہ گھانا میں مبعوث ہوئے، جہاں ۱۴ سال تک خدمات انجام دیں اور خصوصاً رِقادِ یانیت پر بڑا کام کیا۔

۱۹۸۱ء میں مملکت سعودیہ نے آپ کو نیوزی لینڈ بھیج دیا، جہاں ۱۸ سال بحیثیت معلم مقیم رہے، اور اسلام اور مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کی، رسومات و بدعات کا خاتمہ کیا، اور پورے وقار کے ساتھ ترجمان اسلام بن کر رہے، اور اپنی جدوجہد سے ویلنگٹن میں اسلامی سینٹر قائم کر کے پہلی مسجد کی بنیاد رکھی، اور ملک میں مسلمانوں کو آزادی اور مساوات کا حق دلایا۔
آپ کی اولاد میں ایک صاحب زادے فوزان طارق ہیں اور بقیہ ۵ صاحب زادیاں ہیں۔

آپ پر برین ہیمرج کا حملہ ہوا اور آپریشن ہوا، آخر اسی مرض میں ہندوستانی تاریخ سے ۵ دسمبر ۱۹۹۹ء بجے شام کو انتقال فرما گئے۔

(۲) مولانا قاضی ظفر مسعود صاحب علم و ادب کے شیدائی، وسیع المطالعہ، ادبی تقریبات سے خاص تعلق رکھنے والے، اور انصار گریس انٹر کالج کے بانیوں میں سے تھے، انھیں موقع محل کے اچھے اشعار خوب یاد تھے۔

یکم دسمبر ۱۹۴۱ء / ۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ھ کو پیدا ہوئے، پرائمری کی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، پھر ایم پی انٹر کالج مبارک پور سے ۱۹۶۰ء میں ہائی اسکول پاس کیا، پھر دینی تعلیم کے لیے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخل

ہوئے، اور ۱۹۶۹ء میں مدرسہ مفتاح العلوم منو سے پہلی پوزیشن سے عالم کا امتحان پاس کیا، ۱۹۶۸ء میں حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادی نے آپ کی علمی لیاقت سے خوش ہو کر خصوصی سند حدیث سے نوازا۔

فراغت کے بعد علمی و دینی سرگرمیاں جاری رہیں، جن سے بہت سے علمی و ادبی میدان سرسبز و شاداب ہوئے، اور کئی انجمنیں، لائبریریاں، ادارے وجود میں آئے، آپ کی ۹ اولاد ہیں، ایک لڑکے مولوی فرحان ظفر قاسمی اور بقیہ لڑکیاں ہیں۔

وفات سے ایک ہفتہ پہلے پی جی آئی اسپتال لکھنؤ میں دل کا آپریشن کرایا تھا، مگر زندگی و صحت مقدر نہ تھی، آخر ۱۷ دسمبر ۲۰۰۹ء پنجشنبہ کی شب میں انتقال فرما گئے، بعد نماز ظہر شاہ پنجہ میں نماز جنازہ اور تدفین عمل میں آئی۔

(۳) مولانا قاضی سلمان مبشر صاحب تیسرے صاحب زادے ہیں۔

کیم جنوری سن ۱۹۵۱ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی اور متوسطات کی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، پھر ایک سال دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کر کے فارغ التحصیل ہوئے، ۱۹۷۴ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے، اور ۱۹۷۸ء میں کلیۃ الدعوة و اصول الدین کی تکمیل کی، پھر مملکت سعودیہ عربیہ سے بحیثیت داعی و مدرس گھانا مبعوث کیے گئے۔

۱۹۹۲ء میں تبادلہ کرا کے ہندوستان آ گئے، اور مختلف مدارس اسلامیہ میں تعلیم و تربیت دے کر آخر میں دارالعلوم انجان شہید ضلع اعظم گڑھ میں صیغہ تدریس سے منسلک تھے، کیم جنوری ۲۰۱۷ء کو ریٹائرڈ ہو کر گھر پر مقیم ہیں، اپنے والد علام کے علمی و تاریخی کارناموں کو منظر عام پر لانے کی دل میں تڑپ رکھتے ہیں، اس سلسلہ میں مختلف اداروں اور افراد سے تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں، قاضی صاحب کی جو تصانیف نایاب ہو چکی تھیں، ان

کی اشاعت ثانی کرانے اور جو منتظر اشاعت ہیں، ان کو زیور طبع سے آراستہ کرنے میں تگ و دو، قیمتی وقت اور صرف کثیر کو لگا رہے ہیں، آپ کی ۵/اولاد ہیں، تین لڑکے قاضی فیصل، قاضی محمد، قاضی ریان احمد اور دو لڑکیاں ہیں۔

(۴) قاضی صاحب کے سب سے چھوٹے فرزند قاضی حسان احمد ہیں، ۴/جنوری ۱۹۵۹ء کو پیدا ہوئے، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور سے تعلیمی سلسلہ شروع کر کے شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے بی اے کیا، پھر کار تجارت میں لگ گئے، فی الحال انصار گریس کالج مبارک پور میں امور مفوضہ انجام دے رہے ہیں۔

آپ کے دو لڑکے قاضی عدنان، قاضی ریحان اور ۶ لڑکیاں ہیں۔

(۵) امۃ الرحمن ام سلمہ یکم مارچ ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوئیں، قاضی صاحب کی سب سے بڑی صاحب زادی ہیں، اپنے نانہالی رشتے میں جناب ماسٹر مصباح الدین صاحب ساکن محمد آباد گوہنہ ضلع منو کے عقد نکاح میں ہیں، ایک لڑکے اور تین لڑکیوں کی ماں ہیں۔

(۶) شمیمہ عائشہ ۵ شعبان ۱۳۷۹ھ کو پیدا ہوئیں، جناب ماسٹر رضوان احمد علیگ نوادہ مبارک پور سے منسوب ہیں، ۶/اولاد میں ۴/اولاد ذکور اور ۲/اولاد اناث کی والدہ محترمہ ہیں۔

.....

سلام

مورخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ

سلام اُس ذات پر جس کا لقب ہے فخرِ انسانی
 سلام اُس ذات پر آئی جو بن کر ظِلِّ سُبْحانی
 سلام اُس ذات پر جو باعثِ تکوینِ عالم ہے
 سلام اُس ذات پر جس کے سبب کونین کا دم ہے
 سلام اُس ذات پر جس کا تبسم رُوحِ میخانہ
 سلام اُس ذات پر جس کی نگاہیں جام و پیمانہ
 سلام اُس ذات پر جس کی ادا صبحِ حنیفانہ
 سلام اُس ذات پر جس کی ادائیں شامِ میخانہ
 سلام اُس ذات پر جس کی صباحتِ فخرِ کنعانی
 سلام اُس ذات پر جس کی ہیں زلفیں سلکِ نورانی
 سلام اُس ذات پر روئے جو اُمت کی خطاؤں پر
 سلام اُس ذات پر جس نے دُعائیں دیں جفاؤں پر
 سلام اُس پر جو چکا کفر کی کالی گھٹاؤں میں
 سلام اُس پر جو نغمہ بن گیا روتی فضاؤں میں

سلام اُس پر جو اٹھا ہاتھ میں تیغِ دو دم لے کر
 سلام اُس پر جو آیا ساتھ بارِ انِ کرم لے کر
 سلام اُس پر جو جلوہ گر ہوا روشن جہیں ہو کر
 سلام اُس پر جو آیا رحمۃ للعالمین ہو کر!
 سلام اُس پر جو سویا بھی تو حالِ قوم پر رو کر!
 سلام اُس پر جو راتیں کاٹ دیتا خاک پر سو کر
 سلام اُس پر جو دیتا ہے فقیروں کو بھی دارائی
 سلام اُس پر جو دیتا ہے مریضوں کو مسیحائی
 سلام اُس پر جو ہے شمعِ ہدا انوارِ سُبْحانی
 سلام اُس پر جو ہے تفسیرِ رحمت، فیضِ ربّانی
 سلام اُن پر ہو اور اُن کے صحابہ کی جماعت پر
 سلام اُن پر ہو اور اُن کے فدا کاروں کی تربت پر
 سلام اُن پر ہو اور اُن کے گلوں کی پاک نکہت پر
 سلام اُن پر ہو اور اُن کے لگائے باغِ جنت پر
 سلام اُن پر ہو اور اُن کی ادا پر مرنے والوں پر
 سلام اُن پر ہو اور اُن کے کنارے سارے ہالوں پر
 سلام ان پر ہو اور ان کے فدا پُر جوش لوگوں پر
 سلام ان پر ہو اور ان کے کفن بردوش لوگوں پر

مسلم کی دعا

مورخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ کی پہلی نظم جو ماہنامہ ”الفرقان“ بریلی بابت جمادی الثانی ۱۳۵۷ھ کے صفحہ ۳۲ پر شائع ہوئی، مولانا اُس وقت مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور کے طالب علم تھے۔

الہی پھر وہی ساقی وہی میخانہ ہو جائے
 شبستانِ جہاں توحید کا کاشانہ ہو جائے
 مجازی وادیوں میں شورشِ مستانہ ہو جائے
 ہر اک فردِ بشر اسلام کا پروانہ ہو جائے
 الہی! پھر پتنگوں میں اُمنگ و سوز پیدا کر
 الہی! پھر رُخِ اسلام پر دُنیا کو شیدا کر
 خدا یا! پھر زمانہ کی ہوا اک دم پلٹ جائے
 حجابِ خوابِ غفلت پھر مسلمانوں سے ہٹ جائے
 خدایا! تختِ باطل جہاں سے پھر اُلٹ جائے
 بلا کا رشتہ باطل دلِ مسلم سے کٹ جائے
 الہی! قطرہٗ نیساں صدف میں پھر دک اُٹھے
 الہی! گوہرِ ایماں سے پھر دنیا چمک اُٹھے

دلِ مسلم کو پھر تو جوشِ ایمانی سے تڑپا دے
 ذرا اک بار پھر اسلام کے شیروں کو بھرا دے
 حرارت وہ عطا کر جو پہاڑوں کو بھی پگھلا دے
 ذرا آواز گلہ باں کی پھر گلوں میں پہنچا دے
 الہی! پھر رہِ اسلام میں قربان ہو جائیں
 فدا کارِ بلالؓ و بوذرؓ و سلمانؓ ہو جائیں
 خدایا! پھر کوئی بو بکرؓ سا انسان پیدا کر
 مسلمانوں میں پھر تو باحیا عثمانؓ پیدا کر
 جلالِ حضرتِ فاروقؓ کی سی آن پیدا کر
 جنابِ حیدرؓ اڑؓ سا ذیشان پیدا کر
 الہی! قرنِ اوّل دورِ حاضر کو بنا دے تو
 الہی! خیر و برکت کا زمانہ پھر دکھا دے تو
 الہی! غازیِ اسلام خالدؓ کو اٹھا دے پھر
 جنابِ عمرو ابنِ عاصؓ کو ہم سے ملا دے پھر
 جنابِ سعدؓ گہری نیند سوتے ہیں جگا دے پھر
 کہاں ہیں بو عبیدہؓ اے خدا اُن کو دکھا دے پھر
 ہمیں اب تختہٴ فرعونیت کو پھر اُلٹنا ہے
 ہمیں اطہر! بتوں کی سلطنت کو پھر پلٹنا ہے

پیش لفظ

از: مولانا عبید الرحمن صاحب قمر مبارک پوری

مسلمانوں کے ملی وقومی محاسن و مفاخر میں تاریخ و تذکرہ کا فن نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اس کے ذریعہ اسلامی و دینی کارناموں اور علمی و فنی ورثہ کو سلف سے خلف تک پہنچایا ہے اور ایسا مربوط تعلق قائم کیا ہے، جس کی کوئی کڑی ٹوٹی نہیں ہے، تذکرہ نویسی اور سوانح نگاری درحقیقت فن اسماء الرجال کا ایک وسیع شعبہ ہے، جس میں آگے چل کر بڑی وسعت پیدا ہوئی اور علماء نے اسلامی بستیوں اور خاندانوں کے حالات قلم بند کیے، چنانچہ آثار الکرام، تذکرہ علمائے بلگرام، سبحة المرجان فی آثار الہندوستان، آثار الاول فی تراجم علمائے فرنگی محل، مناقب غوثی، تذکرہ علمائے سہسوان، کمالان رام پور، تذکرہ مشائخ بنارس، تجلی نور، تذکرہ مشاہیر جون پور، تذکرہ علمائے ہند، تذکرہ علمائے حال اور تراجم علمائے اہل حدیث وغیرہ صد ہا کتابیں ہندوستان میں لکھی گئیں، جن میں یہاں کے علمی و دینی شہروں اور خاندانوں کے حالات اور علماء و فضلاء کے تراجم درج ہیں، ان کتابوں کی افادیت و ضرورت مسلم ہے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے ہمارے قصبہ مبارک پور اور اس کے اطراف کے علماء و فضلاء اور بزرگوں کا ایک جامع تذکرہ مرتب کیا ہے، جو وثیقہ اور سند کی حیثیت رکھتا ہے، اس کی سطر سطر اہل علم و تحقیق کے لیے بڑی قیمتی ثابت ہوگی اور ماخذ بنے گی، مبارک پور قدیم زمانہ سے مختلف مذاہب کا گہوارہ ہے اور یہاں ہر طبقہ میں مشاہیر علماء و فضلاء پیدا ہوئے ہیں، اس کتاب سے یہاں کی دینی و علمی خدمات اور علماء کے کارناموں کا بخوبی علم ہوگا اور خاص بات یہ ہے کہ مصنف کے محتاط قلم نے کسی تذکرہ میں جانب دارانہ لغزش نہیں کھائی ہے۔

اور خاص بات یہ ہے کہ تذکرہ علمائے مبارک پور کے نام سے تاریخ و تذکرہ کی ایک مستند اور صاف، ستھری کتاب ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہے۔

مقدمہ

نام نیک رفتگاں ضائع مکن

تا بماند نام نیکت برقرار

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَالْاٰلِہٖ
وَاصْحَابِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ اَجْمَعِيْنَ.

شیراز ہند پورب کے مردم خیز قصبات میں ایک علمی و دینی اور صنعتی قصبہ مبارک پور بھی ہے، جو قاسم آباد کے نام سے اپنے اقبال وادبار کا ایک دور پورا کر کے مبارک پور کے نام سے تاریخ کے نئے دور میں داخل ہوا اور کڑا مانک پور کے مشہور روحانی خانوادہ حامد یہ چشتیہ کے چشم و چراغ حضرت راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد شاہ مانک پوری متوفی ۲/شوال ۹۶۵ھ نے شہنشاہ ہمایوں نصیر الدین محمد بن بابر متوفی ۷/ربیع الاول ۹۶۳ھ کے دور سلطنت میں اسے دوبارہ اپنے نام سے آباد کیا، بعد میں راجہ مبارک شاہ مانک پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن بھی ہوئے، مگر راقم الحروف کا خاندان جو ان کے ہمراہ مانک پور سے یہاں آیا، یہیں مستقل آباد ہو کر حکومت وقت کی طرف سے نیابت قضا کا عہدہ سنبھالتا رہا اور راجہ مبارک شاہ کے بعد اس قصبہ میں گویا ان کا نائب بن کر رہا۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس دیار میں یہ قصبہ جس قدر قدیم اور مردم خیز ہے، اسی قدر مسلمان موڑخوں اور تذکرہ نویسوں نے اس کی طرف سے بے اعتنائی کی ہے، اسی لیے یہاں کی کسی قسم کی علمی و دینی سرگرمی یا کسی علمی و دینی شخصیت کا حال نہیں ملتا، حالاں کہ یہاں پر اسلامی و دینی خدمات کے مختلف گوشوں میں جس قدر زیادہ اور اہم کام ہوا ہے، اطراف کی کسی بستی میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔

اس تقصیر کے نتیجے میں اس کے علماء و فضلاء اور مشائخ اور ان کے کارنامے تاریخ کی لوح پر ابھر نہ سکے اور مسلمان اپنے اسلاف کے ایک بڑے طبقہ کی خدمات سے بے خبر رہے۔ اس عبرت ناک اور ساتھ ہی حیرت ناک حقیقت کا احساس مجھے طالب علمی کے زمانے ہی سے رہا اور اس زمانے کی حیثیت کے مطابق قصبہ کے علماء و فضلاء اور اعیان و مشاہیر کے حالات تلاش کرتا رہا، یہاں تک کہ تقسیم ملک کے بعد سہ روزہ ”زمزم“ لاہور سے ترک تعلق کر کے ہفتہ وار ”انصار“ کی ادارت کے سلسلے میں بہرائچ جانا ہوا اور وہیں جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ میں تذکرہ مشاہیر اعظم گڑھ و مبارک پور کے نام سے غیر مرتب و نامکمل معلومات جمع کرتا رہا، بعد میں خیال ہوا کہ خود مبارک پور کے علماء و مشاہیر کے حالات کی تلاش و جستجو بہت زیادہ وقت طلب اور وقت طلب ہے، اس لیے پہلے اپنے وطن اور اہل وطن کے حق کی ادائیگی کی کوشش کرنی چاہیے، چنانچہ پچیس سال کی تلاش و تحقیق کے بعد جو کچھ مل سکا ”تذکرہ علمائے مبارک پور“ کے نام سے مرتب کیا جا رہا ہے، کسی بے آب و گیاہ میدان میں چمن بندی آسان نہیں ہے، میں نے اس شجرہ مبارک کو بڑی محنتوں کے بعد ”شجر سایہ دار“ بنایا ہے۔

میرے آبا و اجداد کی بسائی ہوئی بستی کے ارباب فضل و کمال کی یہ خدمت اس شدتِ احساس کا نتیجہ ہے کہ ان بزرگوں کے خاندانوں کا استقبال میرے خاندان نے کیا، ان کو اپنے جوار میں جگہ دے کر ان کی دینی و علمی خدمت کی، بل کہ آج تک کسی نہ کسی حد تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

ان مخدوموں اور بزرگوں کا یہ حق میرے اوپر ہے کہ میں ان کے علمی و دینی کارناموں اور ان کی اسلامی و ملی خدمات کی امانت ناظرین تک پہنچاؤں، میں نے اس حق کی ادائیگی میں دیدہ و دانستہ خیانت اور تقصیر نہیں کی ہے، بل کہ ایک غیر جانب دار مورخ اور تذکرہ نگار کی حیثیت سے یہ خدمت انجام دی ہے۔

مذہبی اختلاف اور ذات و برادری کی سطح سے بلند ہو کر یہ کام کیا ہے اور ان علماء و فضلاء اور مشائخ کی تذکرہ نویسی میں نہ قدیم خانقاہی حلقہ کی طرح کثوف و کرامات اور القاب سے کام لے کر ان کو مافوق البشر بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور نہ آج کل کے ادیبوں اور انشاء پردازوں کی طرح قلم کی جولانی و سحر کاری سے ان کو افسانوی رنگ میں پیش کیا گیا ہے، بل کہ وہ جس سیدھی سادی زندگی کے مالک تھے، ان کے تذکروں میں وہی سیدھا ساد طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

میں نے اس کتاب کی تالیف کے لیے معلومات حاصل کرنے میں بڑی محنت کی ہے اور اپنے بزرگوں کے حالات و تراجم کی تلاش میں دن اور رات کی قید سے آزاد رہ کر آبادیوں اور ویرانوں کا چکر کاٹا ہے، محلوں اور جھونپڑیوں میں آیا گیا ہوں اور دور و نزدیک ہر جگہ سے مطلب کی بات حاصل کی ہے، ذمہ داری اور جذبہ تشکر کے ماتحت جن حضرات نے تراجم کی فراہمی میں مدد کی ہے، ان کے نام بھی دے دیئے ہیں، اس کتاب میں ان ہی حضرات کے تراجم درج کیے گئے ہیں، جن کو موت نے تاریخ کا عنوان بنا دیا ہے اور جو سلف کے زمرہ میں شامل ہو کر ہماری طرف سے اس قرآنی دعا کے مستحق بن چکے ہیں:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَحِيمٌ (سورہ حشر - آیت ۵۹)

اے ہمارے رب! ہماری مغفرت فرما اور ہمارے بھائیوں کی جو ہم سے پہلے ایمان میں سبقت لے جا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے بغض و عداوت نہ ڈال، تو بیشک رءوف و رحیم ہے۔

مبارک پور کی علمی و دینی تاریخ کے تین ادوار ہیں، پہلا دور یہاں کی آبادی حدود ۹۵۰ھ سے تیرہیں صدی کے نصف آخر تک، اس دور کے علماء، فضلاء اور مشائخ کے نام اور حالات بہت کم مل سکے ہیں، دوسرا دور تیرہویں صدی کے اواخر سے لے کر چودھویں صدی کے

اواخر کا سوسالہ دور مبارک پور کی علمی، دینی اور ادبی زندگی کے حق میں بہت ہی عہد آفریں اور بڑا مردم خیز ہے، اس دور کے مبارک پور کو بجا طور پر ”نیشاپور ہند“ کہا جاسکتا ہے، اس دور میں مولانا عبدالرحمن محدث، مولانا عبدالسلام، مولانا عبدالعلیم، مولانا احمد حسین، مولانا محمد شریف، مولانا ظفر حسن عینی، ملا رحمت علی، مولانا ابو محمد عبدالحق، مولانا محمد احمد، مولانا الہی بخش، مولانا شکر اللہ وغیرہ آسمانِ علم و فضل کے آفتاب و ماہتاب تھے اور ان میں ہر ایک اپنی ذات سے انجمن تھا، ان کی تدریسی و تعلیمی خدمات نے ہزار ہا علماء و فضلاء پیدا کیے اور ان کے تصنیفی کارنامے ہندوستان سے گزر کر عرب و عجم میں پھیلے، اسی دور میں ہم نے آنکھ کھولی ہے اور ان بزرگوں میں سے اکثر حضرات کو دیکھا ہے اور ان کی علمی و دینی زندگی سے حصہ پایا ہے۔

تیسرا دور ان حضرات کے تلامذہ و متوسلین کا ہے، جو چل رہا ہے اور آج یہاں جو علمی و دینی روشنی نظر آ رہی ہے، اُن ہی چراغوں کا فیض ہے۔

ہر دور میں علمائے اسلام نے اپنے شہروں اور بستیوں کی تاریخ لکھی ہے، جس میں وہاں کی ابتدائی تاریخ، اسلامی فتوحات، علماء و مشائخ اور ان کے علمی و دینی آثار و علامت کو بیان کیا ہے، اس طرح مسلمانوں کی مشہور و ممتاز بستیوں پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ ”تاریخ بغداد“، ”تاریخ دمشق“، ”تاریخ اصفہان“، ”تاریخ جرجان“ وغیرہ اسی سلسلہ کی کتابیں ہیں، جن کی وجہ سے سلف کا دینی و علمی اور روحانی ربط و تعلق خلف سے قائم رہا اور مسلمانوں کا خاص فن اسماء الرجال اور سوانح نگاری ہر ملک اور ہر دور میں نمایاں ہوا۔

چنانچہ ہمارے ہندوستان میں بھی اس موضوع پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں، پیش نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، امام ابو عبد اللہ حاکم نیشاپوری متوفی سن ۴۰۳ھ نے تاریخ نیشاپور لکھنے کے بعد اپنے ایک تلمیذ رشید سے فرمایا تھا:

”اعلم بأن خراسان وما وراء خراسان اور ما وراء النہر کے ہر شہر کی وہاں کے

النهر لكل بلد تاريخ صنفه عالم
منها ووجدت نيشاپور مع كثرة
العلماء بهالم يصنفوا فيه شيئاً
فدعاني ذلك إلى أن صنفت تاريخ
نيشاپور فتامله لم يسبقه إلى
ذلك أحد۔“

عالم نے تاریخ لکھی، مگر میں نے دیکھا کہ
نیشاپور میں علماء کی کثرت کے باوجود اہل علم
نے یہاں کی کوئی تاریخ نہیں لکھی، اسی بات
نے مجھے تاریخ نیشاپور لکھنے کی دعوت دی، تم
اسے غور سے دیکھو، اس کام کو مجھ سے پہلے کسی
نے نہیں کیا ہے۔

(تذکرۃ الحفاظ ج: ۳ ص: ۲۳۰)

امام حافظ ابوالقاسم حمزہ بن یوسف سہمی جرجانی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۴۲۷ھ نے
تاریخ جرجان کے مقدمہ میں لکھا ہے:

”ولم أراحداً من مشائخنا
رحمهم الله صنف في ذكر علماء
أهل جرجان أو أرّخ لهم تاريخاً
على توافر علمائها وتظاهر شيوخها
وفضلائها فأحببت أن اجمع في
ذلك مجموعاً على قدر جهدي
وطاقتي مع قلة بضاعتي وعرض
لي جمعه حين تفاني العلماء
الذين يوثق بعلمهم ويعتمد
على معرفتهم، ولم أتمكن من
كتبهم فاستمد منها إذ كان

میں نے نہیں دیکھا کہ میرے مشائخ میں
سے کسی نے علمائے اہل جرجان کے ذکر میں
کوئی کتاب لکھی ہے، یا اُن علماء کی کثرت
اور مشائخ وفضلاء کے ظہور کے باوجود اُن
کی کوئی تاریخ مرتب کی ہے، اپنی بے
سروسامانی کے باوجود مجھ کو شوق ہوا کہ اپنے
مقدور بھر کوشش کر کے اُن کے احوال وکوائف کو
جمع کر دوں، ان علماء کا انتقال ہونا جن کے علم پر
اعتبار کیا جاتا تھا اور ان کے معرفت پر اعتماد کیا
جاتا تھا، جب اس خیال میں غرق ہوا تو پتہ
چلا کہ میں جن کی تحریر واطلاع پر اعتماد کر سکتا تھا،

أهلها قد ضاعوها لقلّة غبائهم
 وفتور نيّاتهم فاقتصرت على
 ماحضر واخذت بما تيسّر
 وقدمت العذر حتى أنّ قصرت
 فيه تعقيراً؟ أو شذ عني شيء كنت
 في ذلك معذوراً۔“

انہوں نے اپنی عدم توجہی اور ناقدری کی وجہ
 سے اُن علماء کے ذکر کو ضائع کر دیا ہے، اس لیے
 مجھے جو کچھ آسانی سے مل سکا، انھیں سے اخذ
 واستفادہ کیا، میں معذرت چاہتا ہوں اگر اس
 میں کچھ کوتاہی ہوگئی یا کوئی انہونی چیز آگئی ہو تو
 مجھ کو معذور سمجھا جائے۔ (سلمان)

(تاریخ جرجان ص: ۴ مطبع دائرۃ المعارف حیدرآباد)

شیخ غلام علی آزاد بلگرامی نے ”ماثر الکرام فی تراجم فضلاء بلگرام“ میں ایک مقام
 پر لکھا ہے:

”در صوبہ اودھ محروسہ بلگرام از قدیم
 منشائے فضلاء کرام ومظہر علمائے عظام
 است وفراوان دانش ازین شہر برخاسته
 مجلس افادہ واستفادہ بہ کمال خوبی آراسته
 اما کسے بہ استفادہ احوال اکابر توفیق نہ
 یافت، لاجرم قدماء بیشتر بہ ہمعنائی
 ”منہم من لم نقص“ سبیل
 گمنامی پیبوندند منہم من قصصنا
 علیک در عرصہ معارف جلوہ نمودہ۔“

صوبہ اودھ میں قصبہ بلگرام قدیم زمانہ سے علماء
 وفضلاء کا مرکز ہے، بے شمار اہل دانش اس شہر سے
 اُٹھے اور مجلس درس وافادہ کو کمال خوبی سے آراستہ
 کیا، مگر کسی کو ان اکابر کے حالات لکھنے کی توفیق
 نہیں ہوئی، ناچار بہت سے پُرانے اہل علم وفضل
 ”منہم من لم نقص“ (جن کے بارے
 میں کچھ نہیں لکھا گیا) کی ہم رکابی میں گوشہ گمنامی
 میں چلے گئے اور صاحبان علم کی تھوڑی سی جماعت
 ہی ”منہم من قصصنا علیک“ (جن کے
 احوال لکھے گئے) کی متابعت میں، تاریخ و تذکرہ

کی روشنی میں آئی۔ (قمر)

مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) نے ”ماثر الکرام“ کے مقدمہ میں لکھا ہے:
 ”اگر علماء و فضلاء و دیگر مشاہیر کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اہل
 قصبات کا ملک پر بہت بڑا احسان ہے، کاش مولانا آزاد کی طرح دوسرے اہل
 قصبات بھی اس بات کا خیال رکھتے اور اپنے اپنے قصبہ کے علماء، فضلاء، صوفیا
 و دیگر مشاہیر کے حالات قلم بند کر ڈالتے تو ہندوستان کی تاریخ کو اس سے بڑی مدد
 ملتی، ہندوستان میں بکثرت ایسے قصبات ہیں کہ اگر وہاں کے حالات یا تاریخ
 لکھی جائے تو ایسی مفید معلومات اس سے حاصل ہو سکتی ہیں، جس کا بڑی سے بڑی
 مبسوط تاریخوں میں پتہ نہیں۔“ (ص: ۷)

”قاضی شیخ محمد مچھلی شہری متوفی ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۳ء) نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد
 اعظم گڑھ میں گورنمنٹ کی ملازمت کر لی، جس حاکم بندوبست کے ماتحت تھے، وہ
 آپ کے علم و خلوص کا بڑا معتقد تھا، اس نے دورِ پوپہ یومیہ پر تاریخ ضلع اعظم گڑھ
 لکھوانا شروع کرائی، یہ کام بڑا مشکل تھا، قدیم خاندانی شجرے اور پرانے شاہی
 کاغذات کا پتہ چلا کر ان کو زبانی روایات سے تطبیق دینے کے بعد اپنے اپنے محل پر
 لگانا پڑتا تھا، یہ کتاب اتنی مقبول سمجھی گئی کہ اس کے ایک حصہ کا انگریزی ترجمہ ہو کر
 مسٹر ”جمیسن رابرٹ ایڈ“ کے نام سے شائع ہوا، اُردو کا اصل مسودہ خود قاضی
 صاحب نے تلف کر دیا۔“ (تراجم علمائے اہل حدیث ہند ج: ۱ ص: ۷۶)

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ علمائے اسلام کو اس موضوع کی اہمیت و ضرورت کا کس
 قدر احساس رہا کرتا تھا اور وہ اپنے علاقہ کے علمی و دینی رجال کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔

قاضی اطہر مبارک پوری

جمعہ یکم جمادی الاولیٰ ۱۳۹۴ھ

مطابق ۲۴ مئی ۱۹۷۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اپنی باتیں

مبارک پور شمالی ہندوستان کے دینی، علمی، صنعتی قصبات میں سے اہمیت کا حامل قصبہ ہے، اس کی خاک سے مشائخ و بزرگان، اصحابِ قلم، مدرسین و اساتذہ، علماء، فقہاء، محدثین، مفسرین، ادباء و شعراء اور دیگر اربابِ علم و فضل پیدا ہوئے ہیں، جن کی علمی خدمات بڑے قصبات کی ہمسری کرتی ہیں۔

مؤرخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری مرحوم نے مبارک پور اور اطراف کے علماء و فضلاء اور بزرگوں کے حالات اور ان کے علمی و دینی کارناموں کے تعلق سے ”شجرہ مبارکہ“ کے نام سے ایک جامع تذکرہ تصنیف کیا تھا، جو ایک دستاویز اور سند کی حیثیت رکھتا ہے، اور ”دائرہ ملیہ“ مبارک پور کے زیر اہتمام جمادی الاولیٰ سن ۱۳۹۴ھ/ جون سن ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا۔

اس کے بعد ۴۵ سال کے عرصہ میں بہت سی شخصیات داغِ مقارفت دی گئیں، ان کا تذکرہ لکھنا ہمارے ذمہ ایک قرض تھا، قاضی صاحب نے اپنی حیات میں ۲۰ شخصیات کی تاریخ وفات رقم فرمائی تھی، جن کا تذکرہ لکھنا چاہتے تھے، مگر زندگی کے لمحات نے انھیں اس کی فرصت نہیں دیا۔

سن ۲۰۰۷ء میں مکتبہ الفہیم منونہ تھو بھنجن سے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا، جس کی تحقیق و تعلیق کا کام مولانا قمر الزماں صاحب مبارک پوری نے انجام دیا، اور اس کی سرپرستی مولانا قاضی سلمان مبشر صاحب نے فرمائی تھی۔

مگر تاریخ اور تذکرہ نویسی سے دل چسپی رکھنے والے متعدد احباب خصوصاً قاضی صاحب کے فرزند ارجمند۔ ان کے علمی کارناموں کو منظر عام پر لانے والے۔ مولانا قاضی

سلمان مبشر صاحب مبارک پوری کی دلی خواہش تھی کہ ”تذکرہ علمائے مبارک پور“ کا نیا ایڈیشن اضافہ اور تکمیل کے ساتھ شائع ہو جائے۔

راقم الحروف نے اس کے پیچھے دوڑ بھاگ کی، ہر مکتب فکر کے لوگوں اور اہل علم سے ملاقات کی، اس کے نتیجے میں جو معلومات حاصل ہو سکیں، انہیں رقم کیا، بعض شخصیات کے سلسلہ میں ادھوری معلومات ہوئیں، اتنا ہی رقم کر کے پیش کرنے کی سعادت ہو رہی ہے۔

جب یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ رہا تھا، تو اشاعت کی فکر دامن گیر ہوئی، مولانا شکر اللہ اکیڈمی کی ایک میٹنگ میں اس کی اشاعت کی تجویز آئی، اکیڈمی کے ارکان مجلس منظمہ نے اس کی اشاعت و طباعت کا فیصلہ کر کے اس کا بیڑا اٹھایا۔

راقم سطور جملہ معاونین و محسنین خصوصاً مولانا قاضی سلمان مبشر صاحب مبارک پوری، مولانا مفتی فہیم اختر صاحب قاسمی صدر مولانا شکر اللہ اکیڈمی، اور ارکان مجلس منظمہ مولانا منور الزماں صاحب قاسمی، مولانا مفتی محمد سالم صاحب سریانوی، مولانا محمد اجمال صاحب انصاری، مولانا ضیاء الحق صاحب مبارک پوری، مولانا محمد طیب صاحب بمہوری، مولانا ڈاکٹر محمد ہلال صاحب حیدر آباد دکن، الحاج قاضی محمد ادریس صاحب، الحاج معین الدین صاحب، حافظ قاری عبید الرحمن صاحب ابراہیم پوری، مولانا ارشد جمال صاحب مبارک پوری کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیر خدمت کو قبول فرمائے، اس کتاب کو نفع بخش بنائے، آمین
یارب العالمین۔

محمد صادق مبارک پوری

جنرل سکریٹری مولانا شکر اللہ اکیڈمی

۳۱ دسمبر ۲۰۱۹ء / جمادی الاولیٰ ۱۴۴۱ھ

مبارک پور کی اجمالی تاریخ

قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں، بجانب شمال و مشرق مسلمانوں کی بہت بڑی اور قدیم صنعتی، دینی، علمی اور مردم خیز بستی ہے، اس کی موجودہ آبادی کی بنیاد تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل حضرت راجہ سید شاہ مبارک مانک پوری متوفی ۲ شوال ۹۶۵ھ رحمۃ اللہ علیہ نے بہ عہد سلطان ہمایوں رکھی، جو اپنے زمانے کے مشہور چشتی خانوادہ حامد یہ مانک پور کے روحانی بزرگ تھے۔

اعظم گڑھ گزیٹر کے مصنف مسٹر ڈی ایل ڈرک بروکمان آئی۔سی۔ ایس۔ نے لکھا ہے:

قصبہ مبارک پور کا طول البلد مشرق و مغرب میں ۸۳ درجہ ۱۸ دقیقہ اور عرض

البلد شمال و جنوب میں ۲۶ درجہ ۶ دقیقہ ہے۔ (۱)

یہ قصبہ اعظم گڑھ سے شمال مشرق کی طرف ۸ میل پر واقع ہے اور اعظم گڑھ سے ایک خام (اب پختہ) سڑک کے ذریعہ ملا ہوا ہے، یہ قصبہ ذیل کے مواضع کی زمین پر آباد ہے۔ مبارک پور خاص، سکٹھی، شاہ محمد پور اور املو، قصبہ کی قدیم تاریخ کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، کہا جاتا ہے کہ پہلے اس کا نام قاسم آباد تھا، جو زوال و انحطاط سے کافی دوچار ہو چکا تھا، بعد میں راجہ مبارک کے نام پر آباد ہوا، جو کڑا مانک پور کے ایک روحانی بزرگ تھے، اس نئے نام کے بعد اس مقام نے اہمیت حاصل کر لی، مگر مسلمان موذنوں کے یہاں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے، اس سے پہلے یہ قصبہ متمول تھا، سرکاری کاغذات سے پتہ

(۱) مگر مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوری کی تحقیق میں اس کا طول البلد ۸۳ درجہ ۲۰ دقیقہ اور عرض

البلد ۲۶ درجہ ۵ دقیقہ ہے، جیسا کہ انہوں نے یہاں کے نقشہ افکار و سحر میں اس کی تحقیق فرمائی ہے

چلتا ہے کہ یہاں پہلے زمانے میں دس ہزار سے بارہ ہزار تک آبادی تھی۔ (۱)
 جس میں ایک چوتھائی پارچہ باف مسلمان تھے، ساتھ ہی کچھ دولت مند ہندو تاجر
 تھے، قصبہ کے مسلمان زیادہ تر جذباتی ہیں۔ (اعظم گڑھ گزیٹر ۱۹۱۱ء ص ۱۶۰ و ۱۶۱ ذکر مبارک پور)
 اس کے بعد یہاں کے صنعتی، تجارتی اور معاشی حالات اور سرکاری امور سے متعلق
 باتیں تفصیل سے درج ہیں اور یہاں کی خاص اور قدیم ترین صنعت پارچہ بافی اور ریشمی
 کپڑوں کی صنعت کے بارے میں اہم معلومات اور مذہبی جھگڑوں کی تفصیلات ہیں۔
 اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قصبہ پر دو دور گزرے ہیں، قدیم دور قاسم
 آباد کے عروج و زوال پر مشتمل ہے اور جدید دور مبارک پور کی موجودہ آبادی سے متعلق
 ہے اور اس کے دونوں ادوار میں مسلمان مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے یہاں کے بارے
 میں خاموشی اختیار کی ہے۔

ضلع اعظم گڑھ کے حدود میں جن میں یہ قصبہ بھی واقع ہے، پہلے زمانے میں چار
 قومیں آباد تھیں، سیوری، بھر، راج بھر، اور چیرو، مگر ان میں راج بھروں کو غلبہ و اقتدار
 حاصل تھا، ان میں چار مشہور راجے گزرے ہیں: (۱) راجہ اسیل دیو ماہل میں، (۲) راجہ
 اجودھیا رائے کوڑیا میں، (۳) راجہ پری چھات نظام آباد میں اور (۴) راجہ گرگ دیو سگڑی
 میں، اس زمانے میں موجودہ مبارک پور کا علاقہ راجہ گرگ دیو کی عملداری میں رہا ہوگا، راج
 بھر بڑی خوشحال قوم تھی، اس کے قدیم آثار اب تک قصبہ کے ارد گرد سریاں، ملک شدنی،
 رسول پور، اساور، سکٹھی، گجہڑا، بمہورو وغیرہ میں موجود ہیں، ان کی اینٹوں، برتنوں اور مورتیوں

(۱) مردم شماری ۱۹۷۱ء کی رو سے خاص ٹاؤن ایریا کی آبادی ۲۵ ہزار سے زائد ہے، ٹاؤن ایریا کی بنی
 عمارت ۱۵ مئی ۱۹۶۳ء کو بنی تھی، ۱۵ اگست ۱۹۷۷ء میں میونسپلٹی بنی، ۱۹۹۱ء میں آبادی ۳۵۳۸۸
 ہوئی اور ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۵۱۰۸۰ ہے۔

کے ٹکڑے، سکے اور دھینے ماضی قریب تک ملتے تھے، یہ علاقہ پانچویں صدی کے آخر میں اسلام اور مسلمانوں سے آشنا ہوا اور سید سالار مسعود غازی متوفی ۸۸ھ کے امراء و مجاہدین نے یہاں پہلی بار قدم رکھا۔

اعظم گڑھ گزٹیئر میں ہے کہ سید سالار مسعود غازی کی فوجیں بہرائچ جاتے ہوئے بھگت پور میں چند دن رکی تھیں، یہ مقام مبارک پور کے شمال مغرب میں ۸ میل پر واقع ہے اور ہر سال یہاں غازی میاں کا میلہ لگتا ہے، نیز ان علاقوں میں ملک حضرات کے متعدد مزارات ہیں، جن کے بارے میں عام روایت ہے کہ یہ سید سالار مسعود غازی کے امراء و رفقاء کی قبریں ہیں، سالار پور کے نام سے قصبہ کے مغرب میں ایک علاقہ بھی مشہور ہے، اس کے بعد چھٹی صدی کے آخر میں سلطان قطب الدین ایبک نے دہلی کو دار السلطنت بنایا، پھر سلطان شہاب الدین غوری نے قنوج اور بنارس پر قبضہ کر کے بنارس سے نیپال کے سرحدی علاقوں کو زیر کیا اور یہ علاقے اس طور سے مسلمانوں کے زیر تصرف آئے کہ یہاں کے راجوں نے سلطان قطب الدین ایبک کی اطاعت منظور کر لی، غلام خاندان کی یہ سلطنت ۶۸۹ھ تک رہی، اس دور میں کڑا مانک پور مشرقی علاقوں کا دار الحکومت بنایا گیا، بل کہ اس سے آگے لکھنوتی اور بنگال کو دہلی کی سلطنت کی طرف سے مرکزیت حاصل تھی اور ۵۹۲ھ سے ۶۸۹ھ تک یہ تمام مشرقی علاقے بشمولیت ضلع اعظم گڑھ و مبارک پور دہلی کی سلطنت سے وابستہ رہے، اس دور میں یہاں اسلام اور مسلمانوں کا چرچا زیادہ ہوا اور سید سالار مسعود غازی کے دور کا بیج اس دور میں اُگنا شروع ہوا۔

اس کے بعد ۷۲۰ھ تک دہلی کے تخت پر خلجی سلاطین بیٹھے، ان کے دور میں بھی کڑا مانک پور مشرقی علاقہ کا مرکزی مقام رہا، یہاں علماء، فضلاء، مشائخ، اہل اللہ آباد ہوئے، جنہوں نے اطراف و جوانب میں اسلام کا نام بلند کیا، اسی دور میں کڑا مانک پور چچا بھتیجے کی

جنگ کا میدان بنا، یعنی جلال الدین اور اس کے بھتیجے اور داماد علاء الدین کے درمیان جنگ ہوئی اور بھتیجے نے چچا کو ملاقات کے بہانے سے بلا کر دریائے گنگا کے بیچ میں قتل کر دیا۔

اس کے بعد ۸۱۶ھ تک تغلق خاندان دہلی میں حکمران رہا، اس کے دور میں مشرقی مرکز کڑامانک پور علمی اور دینی و روحانی حیثیت کے ساتھ ساتھ صنعتی اور تجارتی حیثیت سے بھی مرکزیت حاصل کر گیا، خاص طور پر پارچہ بانی صنعت نے یہاں بڑی ترقی کی۔

مشہور مغربی سیاح ابن بطوطہ نے آٹھویں صدی میں کڑامانک پور اور اس کے ماتحت علاقوں کے بارے میں لکھا ہے:

”وتصنع بها الثياب الرفيعة، ان علاقوں میں نہایت عمدہ قسم کے کپڑے تیار ومنہا تجلب الی دہلی و بینہما کیے جاتے ہیں اور یہاں سے اٹھارہ دن کی مسیرۃ ثمانیۃ عشر یوما۔“ مسافت پر دہلی بھیجے جاتے ہیں۔

(رحلۃ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۲۵ طبع مصر)

تغلق دور میں اس صنعت کو کافی فروغ دیا گیا، فضل اللہ عمری نے ”مسالک الابصار“ میں لکھا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق کے دور میں صرف شاہی کارخانوں میں چار ہزار پارچہ بان ریشمی اور دوسری اقسام کے کپڑے تیار کرتے تھے، اس کے سوا سو سال بعد کڑامانک پور کے حضرت راجہ سید مبارک شاہ نے مبارک پور آباد کیا اور یہاں کے بعض خاندانوں کو وہاں لے جا کر مستقل طور سے بسایا اور مبارک پور کو کڑامانک پور سے علمی، دینی اور روحانی تعلق کے ساتھ ساتھ صنعت پارچہ بانی کا بھی تعلق رہا۔

اسی دور میں خواجہ بایزید بن شیخ خلیل نامی ایک بزرگ جون پور آئے اور جو ناخان نے ان کو کوڑیا پار، کبیر پور اور چک میر جاگیر میں دیا، ان کے پوتے شیخ محمد اعظم بن شیخ جمال الدین بن خواجہ بایزید نے محمد آباد میں سکونت اختیار کی اور جب سلاطین شرقیہ جون پور کا دور آیا تو

وہ ان سے وابستہ رہے، آخری دور میں شیخ غلام فرید محمد آبادی اسی خاندان میں مشہور بزرگ عالم ہوئے ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: مظہر الاحدیہ ص ۱۵۱، ۱۵۲ مطبع کاظمی پریس کان پور ۱۳۳۲ھ)

غالباً اسی دور میں چریاکوٹ میں عباسی شیوخ آباد ہوئے، جن میں بڑے بڑے علماء و فضلاء پیدا ہوئے، آخری دور میں مولانا عنایت رسول چریاکوٹی اور ان کے بھائی مولانا فاروق چریاکوٹی اسی خاندان سے تھے، تعلق دور میں دیار پورب میں ایک تازہ دم اور نئی سلطنت عالم وجود میں آئی، جس کے بعد یہ سارا علاقہ ارباب علم و فضل اور اہل کمال سے معمور ہو گیا اور پورب کے شہر و قریات مسلمانوں کے تمدنی و فکری اور صنعتی مرکز بن گئے، جس میں موجودہ ضلع اعظم گڑھ اور مبارک پور کا علاقہ بھی شامل ہے، صورت یہ ہوئی کہ ۷۹۶ھ میں دہلی کی حکومت نے خواجہ جہاں ملک سرور کو سلطان الشرق کا خطاب دے کر جون پور کی امارت دی، مگر بعد میں اس نے سلطان الشرق کا لقب اختیار کر کے جون پور میں شرقی سلطنت کی بنیاد رکھ دی، جس میں چھ سلاطین ہوئے: (۱) سلطان الشرق خواجہ جہاں ملک سرور ۸۰۲ھ (۲) سلطان مبارک شاہ شرقی ۸۰۴ھ (۳) سلطان ابراہیم شاہ شرقی ۸۴۴ھ (۴) سلطان محمود شاہ شرقی ۸۶۲ھ (۵) سلطان محمد شاہ شرقی ۸۶۲ھ (۶) سلطان حسین شاہ شرقی ۸۸۱ھ۔

شرقی سلطنت مغرب میں کول اور رابرتی تک، مشرق میں بہار اور ترہت تک اور شمال میں بہرائچ تک تھی، اس کی مشرقی حدود میں قاسم آباد بھی شامل تھا، جو تیموری دور میں مبارک پور کے نام سے مشہور ہوا، شاہان شرقیہ بڑے علم دوست اور علماء نواز تھے، خاص طور سے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا چالیس سالہ دور سلطنت دیار پورب کے حق میں فصل بہار تھا، اس زمانے میں جو نیور دہلی ثانی اور دارالعلم کے لقب سے ملقب ہوا، اسی سلطان کے دور میں حضرت شیخ محمد بن خضر فاروقی جون پوری کا خاندان سلطان پور عرف بھیرا میں آکر آباد ہوا، جسے سلطان موصوف نے مبارک پور سے متصل لہرا تک جاگیر عطا کی تھی، اس خاندان میں

بڑے بڑے علماء، فضلاء اور مشائخ پیدا ہوئے، ملا محمود جون پوری، شاہ ابوالغوث گرم دیوان اور ان کے صاحب زادے شاہ ابواسحاق اسی خانوادہ سے تھے، ۸۸۳ھ میں جون پور کی شرقی سلطنت کا چراغ گل ہو گیا اور لودھیوں کا دور آیا، جو ۹۳۲ھ تک قائم رہا۔

اس پچاس سالہ دور میں بلادِ پورب کی دینی و علمی رونق قائم رہی اور لودھیوں نے یہاں اپنے آثار چھوڑے، غازی پور میں نصیر خاں لوحانی حاکم اور حضرت شیخ محمود بن حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری میر عدل تھے، سکندر لودھی کے نام سے سکندر پور آباد ہوا، جو دیارِ مشرق میں جون پور کے بعد پھولوں کا سب سے بڑا گلستان بنا، سلطان ابراہیم لودھی کے نام پر ابراہیم پور یعنی سپاہ آباد ہوا، مبارک پور کے مشرق میں لدھوائی نامی بستی بھی لودھیوں کا پتہ دیتی ہے، سکندر پور سے تین میل کے فاصلے پر مشرق میں زاہدی پور میں حضرت مخدوم شاہ رکن الدین رکن عالم زاہدی کا مزار ہے، سکندر لودھی کے دورِ حکومت میں وہاں تشریف لائے تھے، وہاں سکندر لودھی کا ایک چھوٹا سا قلعہ دریائے گھاگرا کے متصل تھا اور اس سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر اس کی تعمیر کردہ ایک شان دار مسجد ہے، جو اب بچ کر دریائے گھاگرا میں پڑ گئی ہے، لیکن عمارت ہنوز موجود ہے۔

۹۳۲ھ میں بابر نے سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی میں تیموری (مغل) سلطنت کی بنیاد رکھی اور سلطان ظہیر الدین محمد بابر کا لقب اختیار کر کے ۹۳۷ھ تک حکومت کی، اس کے بعد اس کا بیٹا سلطان نصیر الدین محمد ہمایوں (۹۳۷ھ تا ۹۶۳ھ) دہلی کے تخت و تاج کا مالک ہوا، اسی کے دور سلطنت میں حضرت راجہ سید مبارک شاہ مانک پوری متوفی ۲ شوال ۹۶۵ھ نے قاسم آباد کے کھنڈر پر مبارک پور کی بنیاد رکھی، اعظم گڑھ گزئیٹر میں ہے کہ مبارک پور کے موجودہ زمینداروں کے مورث اعلیٰ راجہ مبارک تھے، (اعظم گڑھ گزئیٹر ۱۹۱۱ء ص ۲۶۱) یہ بیان صحیح نہیں، راجہ صاحب کی وفات مانک پور میں ہوئی اور وہیں

دفن کیے گئے، مبارک پور میں نہ وہ رہے اور نہ ان کا کوئی خاندان رہا، بل کہ ان کے ساتھ ہمارا خاندان کڑا مانک پور سے آکر یہاں آباد ہوا۔

ایک روایت کے مطابق یہ خاندان راجہ صاحب کے مورث اعلیٰ سید شہاب الدین گردیزی کے ہمراہ سلطان شمس الدین التمش کے دور میں دہلی سے کڑا مانک پور آیا اور بعد میں راجہ مبارک کے ساتھ مبارک پور آکر مستقل طور سے رہ بس گیا اور منصب قضا پر نسلاً بعد نسل فائز رہا۔

بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ کچھ مدت تک شیر شاہ سوری کے زیر تصرف تھا اور ۹۶۲ھ (۱۵۵۴ء) تک یہاں اس کے بیٹے اسلام شاہ کی حکومت رہی، نیز سلطان محمد عادل حاکم بنگال کے بیٹے بہادر شاہ کی طرف سے یہاں کوئی حاکم ۹۶۴ھ (۱۵۵۶ء) تک موجود تھا۔ (اعظم گڑھ گزیٹر ۱۹۱۱ء ص ۱۶۱)

شاہ جہاں کے دور میں (۱۰۳۶ھ تا ۱۰۶۸ھ) مبارک پور میں ایک بہت بڑے زمیندار و رئیس شیخ محمود قریشی بانسی مبارک پوری تھے، جن کو بعد میں ایک روایت کے مطابق اعظم گڑھ کے بانی راجہ اعظم شاہ نے ایک مقامی راج بھر زمیندار سے مل کر قتل کرایا تھا، ان کے پانچ قلعے تھے اور بڑے رعب و داب کے مالک تھے، اس زمانے میں بھیرامیں حضرت شاہ ابوالخیر متونی ۱۰۵۹ھ تھے، جن کے تعلقات شاہ جہاں اور نواب شائستہ سے بہت گہرے تھے، ان کی تین شادیوں میں سے پہلی شادی محمود جون پوری کی بہن سے اور دوسری شادی شیخ محمود قریشی بانسی مبارک پوری کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، اسی زمانے میں فاروقیان بھیرامیں سے ایک بزرگ مخدوم شیخ رشید بن شیخ سعید بن مخدوم بن شیخ مشید بن مخدوم شیخ بڑے بن شیخ محمود نے مبارک پور کے جنوبی جانب آبادی سے متصل سکونت اختیار کی اور اپنے نام پر اس محلے کا نام رشید آباد رکھا، جو بعد میں رواج نہ پاسکا، ان کے صاحبزادے

لطف اللہ کے دوڑ کے شیخ محمد اعظم اور شیخ عباد اللہ تھے، ان دونوں بزرگوں کی نسل سے یہاں کے فاروقی شیوخ ہیں، شاہ جہانی دور میں مبارک پور کی نئی آبادی پریسٹنٹروں سال گزر چکے تھے اور روز بروز ترقی ہو رہی تھی اور صنعتی آبادی ہونے کی وجہ سے دور و نزدیک کے مسلمان یہاں آکر آباد ہو رہے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس دور میں مبارک پور کی آبادی پرانی بستی اور پورہ خواجہ سے گزر کر مغرب کی سمت بڑھ رہی تھی اور سکٹھی کی زمینداری میں محلہ پورہ صوفی بہادر اسی دور میں آباد ہوا تھا۔

اللہ خدائی نامی کتاب کے ایک قلمی نسخہ میں ”بیاض خاطر میاں عبدالرحیم بن والی نور باف ساکن سکٹھی پورہ صوفی بہادر“ لکھا ہوا ہے، نیز اس پر بعد میں ایک تملیک اس طرح درج ہے: ”جان محمد پسر عبدالواحد ساکن پورہ صوفی بہادر ۱۲۴۴ فسلی۔“

جس طرح مبارک پور ایک خاص شخصیت کے نام پر آباد ہوا، اسی طرح صوفی بہادر کسی خاص شخصیت کا نام تھا، شاہ جہانی دور میں صوفی بہادر نامی ایک پرجوش اور بہادر فاتح تھے، جنہوں نے ۱۰۴۶ھ میں بھوج پور کی جنگ میں جو چھ ماہ تک جاری رہی، ایک قلعہ فتح کیا تھا، ”عمل صالح“ میں ہے:

”دو زبردست خان و صوفی بہادر حسب اور زور آور خان و صوفی بہادر سردار کے حکم سے الامر سردار بفتح قلعہ کالا پور شافقت بعد از محاصرہ کالا پور کا قلعہ فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا، یک ماہ آں راہہ کشش و کوشش تمام مسخر محاصرہ کے بعد اس کو طاقت آزمائی اور کوشش گردانیدند۔“ (عمل صالح ج ۲، ص ۱۸۲) سے فتح کر لیا۔ (قمر)

اس جنگ میں عبداللہ خان بہادر فیروز جنگ اور باقر نجم ثانی حاکم الہ آباد اور گورکھ پور کے زمیندار و رئیس فدائی خاں شامل تھے، شاید ان ہی صوفی بہادر کے نام پر یہ بستی بسائی گئی

تھی، جو بعد میں قصبہ کا ایک محلہ بن گئی، باقر خاں نجم ثانی جہاں گیر کے دور میں حاکم بنارس تھے، اسی دور میں خواجہ محمد صالح بنارس خاص کے حاکم ہوئے، جنہوں نے ۱۰۲۷ھ میں شاہی مسجد بہ حکم جہاں گیر بنائی اور ان کے نام پر پورہ خواجہ آباد ہوا، شاید ان ہی کے نام پر مبارک پور میں پورہ خواجہ اور خواجہ تالاب (کھجوا) بھی ہے، شاہ جہانی دور میں مبارک پور کے قریب گجھڑا میں ایک بزرگ سید کمال الدین تشریف لائے، جن کے صاحب زادے نے بہ عہد سلطان عالم گیر ۱۰۹۹ھ میں گجھڑا میں ایک شان دار مسجد تعمیر کی۔

دسویں صدی کے اواخر یا گیارہویں صدی کے اوائل میں تین افراد پر مشتمل ایک قافلہ بہ عہد سلطان جہاں گیر رسول پور میں آباد ہوا، جس میں مولانا عبد العظیم اور مولانا احمد حسین پیدا ہوئے، ۱۱۳۰ھ سے ۱۲۷۳ھ تک یہ علاقہ نوابان اودھ کے زیر تصرف رہا اور اعظم گڑھ چکھ ان اطراف کا مرکز تھا، سلطان محمد شاہ نے آغاز جلوس ۱۱۳۰ھ میں برہان الملک وزیر الممالک نواب سعادت علی خان جنگ بہادر کو اودھ کا صوبہ دار بنایا، اس کا اصل نام محمد امین پسر مرزا نصیر شمس الدین تھا، اس نے یہاں اپنی حکومت قائم کر لی، تیسرے نواب اودھ شجاع الدولہ کے زمانے میں سلطان محمد شاہ نے انگریزوں سے بکسر میں جنگ کے بعد شرائط صلح کی رو سے غازی پور کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور نواب سعادت خان متوفی ۱۲۲۹ھ کے دور میں مبارک پور میں زبردست شیعہ، سنی ہنگامہ ہوا، ایک شخص قتل کیا گیا اور مقدمہ نواب سعادت علی تک پہنچا، اس کی تفصیل واقعات و حادثات مبارک پور میں درج ہے، اسی دور میں مبارک پور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ضلع گورکھپور میں شامل ہو گیا۔ گورنر جنرل ڈلہوزی (DALHOUSIE) اور نواب سعادت علی خان کے درمیان ایک معاہدہ کی رو سے ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء (۲ رجب ۱۲۱۶ھ) میں چکھ اعظم گڑھ مع پرگنہ ماہل، منونا تھ بھجنجن ایسٹ انڈیا کمپنی میں شامل کر کے برطانیہ کے نئے ضلع گورکھپور سے متعلق کر دیئے گئے۔ (اعظم گڑھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء ص ۱۲۳)

۱۸۱۳ء میں مبارک پور پر فساد یوں کے جم غفیر نے حملہ کیا اور خوں ریز جنگ ہوئی اور جانبین کے بہت سے آدمی مارے گئے، اس میں بعض راجے بھی آئے تھے، قصبہ کے مسلمانوں نے اس جنگ میں ایک عرضداشت حاکم گورکھپور کی خدمت میں پیش کی تھی، اسی طرح اس دور میں قصبہ کے کئی مقدمات گورکھپور عدالت میں گئے تھے، بیس سال کے بعد مبارک پور ضلع غازی پور کے ماتحت ہو گیا، ۱۸۲۰ء (۱۲۳۶ھ) کی ابتدا میں دیوگاؤں، نظام آباد، ماہل، کوڑیا، تلہنی، اترولیا اور گوپال پور کے پرگنوں کو گورکھپور سے الگ کر کے جون پور میں شامل کیا گیا اور سگڑی، چکلیسر، گھوسی، سورج پور، بلہابانس قریات متو پور چریاکوٹ، محمد آباد، منونا تھ بھجن اور نتھو پور کے پرگنہ جات کو غازی پور میں ملا دیا گیا، اس نظام کے ماتحت مبارک پور بارہ سال تک ضلع غازی پور میں رہا، اس کے بعد ۱۸ دسمبر ۱۸۳۲ء (۱۲۴۸ھ) میں اعظم گڑھ کو مستقل ضلع قرار دیا گیا اور مبارک پور اس میں شامل ہوا، ضلع اعظم گڑھ کے پہلے کلکٹر کا نام مسٹر تھامسن (Mr. THOMSON) تھا، جس کی نامزدگی ۱۸۳۲ء میں ہوئی تھی، اس کے بعد ۱۸۶۱ء تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، البتہ پرگنہ منونا تھ بھجن کا تبادلہ چریاکوٹ سے تحصیل محمد آباد میں ہوا۔ (تفصیل کے لیے اعظم گڑھ گزیٹیر ۱۹۱۱ء ص ۱۲۳)

۱۹۸۸ء میں منونا تھ بھجن کو مستقل ضلع بنا کر مبارک پور کو ضلع اعظم گڑھ میں رکھا گیا ہے اور اعظم گڑھ کے مشرقی علاقہ خیر آباد، کرہاں، محمد آباد، چریاکوٹ، منو، اداری، کوپانج، پورہ معروف، اندارا، بڑا گاؤں، گھوسی، دوہری گھاٹ پر مشتمل ضلع منوبن گیا ہے۔

نگر پالیکا مبارک پور کی تاریخ

یہ قصبہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں شکل میں تھا، اس کی آبادی رفتہ رفتہ بڑھتی رہی، ۱۸۱۳ء میں ۳۰۰ آبادی تھی، پھر پانچ سال بعد بڑھ کر ۹۰۶۶ ہو گئی اور ۱۸۷۲ء میں

آبادی ۱۲۹۳ء تھی، ۱۸۸۱ء میں مقدار بڑھ کر ۱۳۱۵ء ہو گئی، پھر ۱۸۹۱ء میں ۱۲۳۷۲۱ تک پہنچ گئی، ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی ۱۵۴۳۳۳ تھی، جس میں ۱۱۴۴۲۲ مسلمان اور ۳۹۹۱ ہندو تھے، ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۰۰۰۰ تھی، ۱۹۷۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۲۵۰ ہزار تھی، ۱۹۹۱ء میں آبادی ۴۵۳۸۸ ہوئی، ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کی رو سے ۵۱۰۸۰ ہوئی، اور اس وقت اس قصبہ کی آبادی ایک لاکھ سے زائد افراد پر مشتمل ہے، یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو مبارک پور ٹاؤن ایریا کا قیام عمل میں آیا، جو یو پی ایکٹ ۱۹۰۰ء کے مطابق تھا، ۱۵ مئی ۱۹۶۳ء کو ٹاؤن ایریا کی جدید عمارت بنی، ۱۵ اگست ۱۹۷۴ء کو نگر پالیکا بنا۔

۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۸ء تک تین مرتبہ مسلسل شیخ محمد امین گرهست مبارک پور کے چیئرمین ہوتے رہے۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۲ء تک مولانا عبدالباری صاحب قاسمی ناظم جامعہ عربیہ احیاء العلوم، مبارک پور کے چیئرمین کے عہدہ پر فائز رہے۔

۱۹۵۲ء سے ۱۹۵۷ء تک شیخ محمد امین گرهست قصبہ کے چیئرمین رہے۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۸ء تک حاجی عبداللہ صاحب چیئرمین رہے۔

۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۳ء تک شیخ محمد امین گرهست صاحب چیئرمین رہے۔

۱۹۶۳ء سے ۱۹۶۵ء تک جناب عبدالحفیظ صاحب بھارتی چیئرمین رہے۔

۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک حاجی عبداللہ صاحب دوبارہ چیئرمین ہوئے۔

۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۴ء تک حاجی غلام نبی اشرفی صاحب چیئرمین رہے۔

۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۳ء تک حاجی مختار احمد صاحب چیئرمین رہے۔

۱۹۹۳ء سے ۱۹۹۷ء تک شکیلہ خاتون صاحبہ زوجہ ڈاکٹر عبدالاول صاحب

چیز مین رہیں۔

۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۱ء تک کریم النساء صاحبہ زوجہ حاجی محمد یونس صاحب چیز مین رہیں۔

۲۰۰۱ء سے ۲۰۱۷ء تک ڈاکٹر شمیم احمد صاحب تین بیچ سالہ چیز مین رہے۔

۲۰۱۷ء سے تا حال کریم النساء صاحبہ زوجہ حاجی محمد یونس صاحب چیز مین ہیں۔

ملحقات وسواد مبارک پور

بڑی آبادیوں اور شہروں کے ملحقات وسواد کی طرح اس قصبہ سے ملحق و متصل کئی بستیاں ہیں، بعض میں کئی محلے ہیں، اس موقع پر سواد مبارک پور کا مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ یہاں کے علماء و فضلاء بھی مبارک پوری ہیں، یہ قصبہ قدیم روایت کے مطابق ۲۸ محلوں کا مجموعہ ہے، جن میں ۱۴ محلے مبارک پور خاص میں اور چودہ محلے سواد میں ہیں اور ان سب کا علمی، دینی، تجارتی، معاشی، تمدنی تعلق مبارک پور سے ہے اور ان کا شمار بھی اسی میں ہوتا ہے، ان میں چند بڑے اور مشہور محلے یا بستی یہ ہیں:

سکٹھی

قصبہ سے متصل شمال مغرب میں مسلمان زمینداروں کی قدیم آبادی ہے، غالباً سلطان جہاں گیر کے زمانے میں ڈوبی ضلع جون پور کے رگ بنسی راجپوتوں میں سے ضیاء الدین اور نصیر الدین مسلمان ہو گئے اور دونوں قصبہ مبارک پور کے مغرب میں آکر آباد ہو گئے، حاکم وقت کی طرف سے ان کو جاگیر عطا ہوئی، اس کے بعد نصیر الدین نے اس سے آگے سکونت کی، جن کے نام سے غلوہ نصیر الدین پور مشہور بستی ہے، چوں کہ یہاں قدیم زمانے میں سیکٹ کے درخت بہت زیادہ تھے، اس لیے اس بستی کا نام سکٹھی پڑ گیا، یہ درخت

میں نے کوکن میں دیکھا ہے، مہوا کے درخت کے مانند ہوتا ہے، سکٹھی کے اکثر باشندے ضیاء الدین کی اولاد سے ہیں، بعض خاندان جیراج پور، اسنا، سلطان پور، محمد پور اور گجہڑا وغیرہ کے بھی ہیں، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہاں کے کئی لوگوں نے مجبور کے رجب علی کا ساتھ دیا تھا، اس لیے پینے نامی انگریز افسر اور تحصیل دار محمد آباد کے حکم سے سکٹھی کو لٹوایا اور پھٹکوا یا گیا، ضیاء الدین کی اولاد میں آخری دور میں محمد خان متوفی ۲۷ مارچ ۱۹۱۷ء مشہور آدمی تھے، جن کی اولاد میں علم و حکمت کا چرچا رہا، یہاں مولوی رجب علی اور مولوی حکیم الطاف حسین گزرے ہیں۔

سرائے مبارک

مبارک پور قصبہ کے شمال مغرب میں سکٹھی کے آگے سرائے مبارک نامی بستی ہے، غالباً یہ نام راجہ مبارک کی نسبت سے ہے اور اس کی آبادی انھیں کے دور کی ہے، جس طرح اسی زمانہ میں میر علی عاشقان کے نام پر سرائے میر (مرضی پور) آباد ہوا تھا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہاں کے حسین بخش اور برکت علی بھیم سنگھ ساکن سونا بر کے شریک تھے، یہاں بعض شیوخ خاندان آباد ہیں، ایک بزرگ کا مزار ہے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دیوان مصطفیٰ شاہ بانی مصطفیٰ آباد کے بھائی ہیں۔

مصطفیٰ آباد

سرائے مبارک کے شمال میں دو فرلانگ پر مصطفیٰ آباد شیوخ کی مشہور بستی ہے، جو حضرت دیوان شاہ مصطفیٰ کے نام سے مشہور ہے اور ان کی خانقاہ اور مزار یہاں موجود ہے، یہ آبادی پہلے جو گیا بیر نامی علاقے میں تھی، جو یہاں سے شمال میں دو فرلانگ پر واقع ہے، بعد

میں موجودہ آبادی ہوئی، شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے خسر شیخ غلام رسول یہیں کے تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہاں کے شیخ فتح قلندر اور باقر علی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، آخری دور میں اس بستی میں مولانا محمد شریف صاحب مصطفیٰ آبادی پیدا ہوئے۔

حسین آباد

قصبہ کے شمال میں پندرہ منٹ کی مسافت پر حسین آباد ہے، اس کا قدیم نام ”اودے بھان پور“ ہے، جواب تک سرکاری کاغذات میں آتا ہے، یہاں کے مسلمانوں کی زیادہ تر آبادی شیخ فقیر اللہ کی اولاد سے ہے، جو منو سے یہاں آئے، وہ پہلے موضع ملک شدنی میں آباد ہوئے، ان کی شرافت و بزرگی دیکھ کر گوجر پار کے زمیندار اودے بھان سنگھ نے ان کو اپنی زمینداری میں آباد کیا اور ایک تحریر لکھ دی، جس میں مسلمانوں کے لیے بہت سی مراعات تھیں، شیخ فقیر اللہ کی چار اولاد ہوئی، محمد قاسم، محمد مومن، نبی محمد اور محمد محمود، ان چاروں کی اولاد خوب پھلی پھولی اور ان میں دین داری اور علم کا چرچا رہا، نوابی اودھ کے دور میں شیعہ گردی کے چکر میں یہاں کے محمد حسین مہتر نے شیعہ مذہب قبول کر لیا تھا، مگر ان کے بعد یہ مذہب پروان نہ چڑھ سکا، انھیں کے نام پر اسے حسین آباد کہتے ہیں، اس کا نام حسین گنج بھی ملتا ہے، چنانچہ ۱۸۱۳ء کی جنگ میں مسلمانانِ قصبہ نے گورکھپور کی عدالت میں جو عرضداشت پیش کی تھی، اس میں ایک نام ”شیخ لال محمد ساکن حسین گنج“ ہے، ۱۹۰۴ء کے بلوہ میں حسین آباد کے چار مسلمان بھی سزایاب ہوئے تھے، شیخ عبدالعلی بن قائم بن فتح محمد، شیخ محمد علی بن مومن بن فقیر اللہ، شیخ عبدالرحمن بن بہادر، امیر علی خاں بن شبراتی بن بدھو خاں، یہاں کے مرحومین علماء میں مولانا عبدالصمد بن محمد اکبر بن مومن بن فقیر اللہ خاص شہرت رکھتے ہیں، دسویں ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ / دسمبر ۱۹۳۹ء میں حسین آباد کے شمال میں ہندو مسلم بلوہ ہوا تھا، جس میں قصبہ کے چار مسلمان شہید ہوئے تھے۔

چیونٹی

قصبہ کے پچھم چیونٹی فی الحال رذیل پیشہ ہندوؤں کی آبادی پر مشتمل ہے، اس کا اصل نام مرتضیٰ آباد ہے، غالباً یہ مصطفیٰ آباد کی معاصر بستی ہے، ”احسن الانساب بنو العباس چریاکوٹ“ میں نواب حسن علی خاں بن شیخ محمد اسلم بن شیخ غلام محی الدین کے بارے میں ہے:

”شیخ محمد اسلم منعقد شد بدختر شیخ محمد پناہ شیخ محمد اسلم کی شادی شیخ محمد پناہ عباسی چریاکوٹی عباسی چریاکوٹی ازیشاں یک پسر نواب کی بیٹی سے ہوئی، جن سے ایک بیٹے نواب حسن حسن علی خاں بہ ظہور آمدہ کد خدا شد بدختر شیخ علی پیدا ہوئے، جن کا نکاح شیخ محمد عیوض صدیقی محمد عیوض صدیقی ساکن مرتضیٰ آباد عرف ساکن مرتضیٰ آباد عرف چیونٹی متصل مبارک پور چیونٹی متصل مبارک پور“ الخ (ص: ۹۶) کے ساتھ ہوا۔ (قمر)

سریاں

قصبہ کے مشرقی شمالی گوشے میں چند فرلانگ پر سریاں نامی بستی ہے، یہاں قدیم زمانے میں راج بھر قوم کی بہت بڑی اور خوشحال آبادی تھی، اس کے آثار نمایاں ہیں، اس جگہ کو اینٹور کہتے ہیں، اس کے پاس موضع ملک شدنی ہے، یہاں قصبہ کی سب سے قدیم تاریخی یادگار ملک شدنی کا مزار ہے، کہتے ہیں گورکھپور اور کچھار کی طرف جانے والے قافلوں کے لیے یہاں کئی سرائیں تھیں، جن میں مسافر ٹھہرتے تھے۔

بعد میں کثرت استعمال سے سریاں ہو گیا، یہاں کے قدیم علمی و دینی خانوادہ شیخ عبدالوہاب سے علمی و دینی سلسلہ چلا، نیز ایک بزرگ شیخ کتوار و منو سے آکر سریاں میں آباد ہوئے، یہاں ان کی اولاد پھلی پھولی، شیخ عبدالوہاب، حافظ شاہ نظام الدین، مولانا شاہ محمد،

مولانا ممتاز علی، مولانا عبدالحفیظ اور مولانا نظام الدین یہاں کے علماء و فضلاء میں سے تھے۔

نوادہ

سریاں اور رسول پور کے درمیان بڑی بستی ہے، اس میں تین محلے ہیں، نوادہ خاص، بہلول پورہ اور چاند پورہ، یہ بھی قدیم آبادی ہے۔ اعظم گڑھ گزٹیئر میں غازی میاں کے میلے کے سلسلے میں نوادہ کا ذکر ہے، یہاں کسی زمانے میں ایک بزرگ شیخ کمال الدین تھے، جن کا کنواں ان ہی کے نام سے اب تک مشہور ہے، یہاں مولانا کرامت علی جون پوری کے دو ممتاز مرید تھے، ایک حافظ عبد الرحمن بن عبد الکریم جو بچپن ہی سے بہت نیک اور پرہیزگار تھے، حتیٰ کہ سریاں کی درگاہ دیکھنے نہیں جاتے تھے، دوسرے حافظ عباد اللہ بن کھدیرو، جن کا وصال مکہ مکرمہ میں ۱۳۲۰ھ میں ہوا۔

آخری دور میں حافظ ضیاء اللہ بن شیخ چھوٹک یہاں کے مشہور بزرگ تھے۔ شاہ ابواسحاق صاحب لہراوی کے نواسے مولانا علی احمد صاحب بھیروی متوفی ۱۳۱۲ھ سے ان کا بڑا یا رانہ تھا، صاحب نسبت بزرگ تھے، ۵ شعبان ۱۳۵۴ھ کو ستر سال کی عمر میں انتقال کیا۔

رسول پور

قصبہ کے شمال مشرق میں سریاں اور نوادہ سے دو فرلانگ پر رسول پور املوکی زمینداری میں ہے، اس کے اتر جانب راج بھر قوم کے آثار اب تک پائے جاتے ہیں اور اس علاقے کو کوٹ کہتے ہیں، قدیم زمانے میں اس جگہ جنگل تھا، ابھی جلدی تک جنگلی درخت موجود

تھے، موجودہ بستی دسویں صدی کے آخر یا گیارہویں صدی کے اوّل کی ہے، کھورہٹ کے قریب سے تین بھائی شیخ زین، شیخ جمال اور شیخ کھیدو ترک وطن کر کے یہاں آباد ہو گئے، غالب آبادی ان ہی تینوں کی اولاد پر مشتمل ہے، ادنیٰ اور معین آباد متصل ابراہیم پور کے بھی بعض خاندان ہیں، یہاں کی سرزمین سے مولانا عبد العلیم، مولانا احمد حسین، مولانا محمد شعیب اور مولانا محمد یحییٰ جیسے سربراہِ وردہ روزگار اٹھے ہیں، جن کے علم و فضل سے بڑا فیض پہنچا۔

املو اور لوہیا

قصبہ کے مشرق میں ایک میل پر املو کی مشہور آبادی ہے، جو اپنے آثار سے قدیم معلوم ہوتی ہے، یہاں مسلم زمینداروں کی اکثریت ہے، دوسرے طبقوں کے مسلمان بھی ہیں، اس کے تین محلے ہیں، املو خاص، پورہ محبت اور پورہ محمود، یہ محلہ شیخ محمود قریشی بانی مبارک پوری کے نام پر ہے، ان کی ایک کوٹ بھی یہاں تھی، ان کی چوتھی نسل میں شیخ محی الدین تھے، ان کے تین لڑکے تھے، شیخ ابراہیم، شیخ چمر اور شیخ غلام پیر، ان تینوں کی اولاد یہاں خوب پھیلی پھولی، شیخ محمود قریشی بانی کے معاصرین میں شیخ داراب بن شیخ دارتھے، ان کی اولاد بھی املو میں ہے، یہاں پیر زادہ شاہ محمد ماہ کا خاندان آخری دور تک علم و فضل کا گہوارہ رہا، ان کو موضع ملک شہنی رسول پور بیورا (کھنورا) جاگیر میں ملے تھے، ۱۸۳۶ء کے نقشہ کشتواری میں اس کا ذکر موجود ہے، اس خاندان میں آخری دور میں شاہ رشید عالم، شاہ مقصود عالم، اور مولوی حکیم شاہ فیاض عالم مشاہیر علماء میں تھے، املو کا ذکر اعظم گڑھ گز بیٹری میں ہے، یہاں ایک بزرگ شاہ غریب کا مزار ہے، قصبہ اور اطراف میں سب سے پہلے اس بستی سے مسلک اہل حدیث کو فروغ ہوا اور مولوی عبداللہ جھاؤ نے مدتوں یہاں رہ کر اس سلسلہ میں کام کیا، یہ مقام مجاہدین بالا کوٹ کا بھی مرکز تھا، اکبر غازی، الہی بخش اور جہاں گیر یہاں کے مجاہدین میں ہیں، نیز متعدد

علماء و محققین پیدا ہوئے، مولانا ابو محمد عبدالحق املوی مترجم ”تلبیس ابلیس“، مولانا نذیر احمد، مولانا قمر الدین ندوی وغیرہ مشہور عالم ہیں، شیخ فرحت حسین یہاں کے مشہور بہادر آدمی تھے، ان میں اور رام بلی سنگھ گوجر پار میں چشمک رہتی تھی، ۱۹۰۴ء میں اعظم گڑھ جیل میں فوت ہوئے، املو کے متصل لوہیا مسلمانوں کی مشہور بستی ہے۔

چکیا

املو کے جنوب میں شیخ احمد کی چھاؤنی تھی اور اس علاقے میں ان کی زمینداری کا چک تھا، بعد میں یہاں مستقل آبادی ہو گئی، یہاں کے زمیندار شیخ داراب کی نسل سے ہیں، سرکاری کاغذات میں اس کا نام چک شیخ احمد ہے، اس کے قریب نور پور، آدم پور اور پیارے پور وغیرہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔

اساور

قصبہ کے جنوب مشرق میں اساور مسلم زمینداروں کی بستی ہے، یہاں بھی راج بھر قوم کے بہت سے آثار ہیں، یہاں دوشہید واڑے ہیں، جن کا روضہ اب بھی شکستہ حال میں موجود ہے، ایک امر سے (عمر شیخ) شہید اور دوسرے سیکھندی (شیخ ہندی) شہید، اس کے قریب تختناج (تخت و تاج) نامی ایک علاقہ ہے، اس نام سے اس کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

لہرا، گجھڑا، فخر الدین پور

قصبہ کے جنوب میں سڑک کے کچھ طرف یہ تینوں بستیاں قریب قریب واقع ہیں، جن میں مسلمان زمینداروں کی آبادیاں زیادہ ہیں، لہرا مشائخ بھیرا کا موروثی تھا،

حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر کے خانقاہ اور مدرسہ بنوایا اور اس کا نام وحدت آباد رکھا، ان کے صاحب زادے شاہ ابواسحاق بھی یہیں رہے، ان کے تلامذہ میں مبارک پور کے کئی حضرات ہیں، گجہڑا میں مسلمان زمیندار اور بعض شیوخ آباد ہیں، یہاں پر شاہ جہانی دور میں بندگی شیخ کمال الدین اور ان کے صاحب زادے قاضی محمد صالح گزرے ہیں، جنہوں نے ۱۰۹۹ھ میں یہاں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی اور اسی سے متصل فخر الدین پور کی بستی ہے، ان علاقوں میں راج بھروں کی آبادی تھی، جس کے نشانات اب بھی ملتے ہیں۔

بمہور

قصبہ کے مغرب جنوب میں دو میل پر بمہور نامی بستی ہے، جو اتر اور دکن دو محلوں میں تقسیم ہے، اصل لفظ غالباً ”بامہور“ ہے، بیرونی نے ”کتب الہند“ میں اجین اور ماہورہ کے درمیان بامہور نامی ایک شہر کا تذکرہ کیا ہے، یہاں عام آبادی مسلمان زمینداروں کی ہے، یہ لوگ بڑو کھر (بڑا گھر) سے یہاں آکر آباد ہوئے، جو شمال میں کچھ دور پر ایک بڑی آبادی تھی، اس کے شمال میں دریائے ٹونس کے کنارے راج بھر قوم کی آبادی تھی، جس کے نشان اب تک موجود ہیں، رجب علی اور ان کے ساتھی یہاں کے مشہور بہادر تھے، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزی حکومت کا ضلع سے خاتمہ کر دیا تھا، جس کی وجہ سے برطانوی حکومت نے اہل بمہور کو باغی قرار دے کر ان کو لوٹا اور آگ لگائی، یہاں قدیم وجدید دونوں قسم کی تعلیم کا رواج ہے، مولوی اشرف علی اور مولوی حافظ سجاد علی، مولانا شبلی ندوی وہاں کے اہل علم میں سے تھے، بمہور کے آس پاس حاجی پور، مکرہٹا، ڈھکواں، وغیرہ مسلم بستیاں ہیں۔

مبارک پور اور اس کے سواد کے باشندوں کے لیے قدیم زمانے سے مستقل ذرائع

معاش و معیشت ہیں، قصبہ میں ریشمی کپڑے کی صنعت بہت قدیم ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں یہاں کے ریشمی کپڑے برطانیہ اور عرب ممالک تک جاتے تھے، سواد میں گزشتہ صدی تک نیل کی کاشت اور تجارت بھی عام تھی، جگہ جگہ نیل کے گودام اب بھی موجود ہیں، شکر سازی بھی ہوتی تھی، الغرض صنعت، زراعت، تجارت اور ملازمت وغیرہ وسائل معاش و معیشت ہیں۔

قصبہ اور اس کے ملحقات میں مسلمانوں کو ہمیشہ سے شان و شوکت حاصل رہی اور اس کے لیے ان لوگوں نے بڑی بڑی قربانیاں پیش کی ہیں، اندرون قصبہ کے تمام محلے کسی نہ کسی مسلمان شخصیت کے نام پر ہیں، اسی طرح یہاں کے بہت سے علاقے اور حلقے مسلم ناموں سے منسوب ہیں، جن میں مردوں کی طرح عورتوں کے نام بھی ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کئی مسلم خواتین شان و شوکت کی مالک تھیں، خاص قصبہ کے اندر محلوں میں علی نگر، پورہ خواجہ، پورہ صوفی بہادر، شاہ محمد پور، پورہ خضر، پورہ دیوان، محلہ حیدر آباد اور مقامات میں راجہ صاحب، خواجہ تالاب (کھجوا)، شاہ محمودی (سموہی)، کپورہ دیوان کا باغ، راجہ بھانٹ کا گاڑا وغیرہ مردوں سے منسوب ہیں، جو اپنے زمانے میں اہمیت کے مالک تھے، اسی طرح محلوں میں پورہ رانی، پورہ دلہن اور مقامات میں عائشہ تالاب (استلاؤ) پانا آیا کی تکیہ، ڈومنی دائی کی مسجد وغیرہ ایسی خواتین کے ناموں سے نسبت رکھتی ہیں، جن کو خصوصیت اور شہرت حاصل تھی اور قصبہ کے باہر رسول پور، حسین آباد، مصطفیٰ آباد، رسول پور بیورا، کھنورا، سرائے مبارک، فخر الدین پور، داؤد پور، سالار پور، نور پور، وغیرہ ممتاز مسلمانوں کے نام پر ہیں، اس بارے میں بھی مبارک پور ضلع کے دوسرے مقامات سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔

مذہبی فتنے

آخری دور میں کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ قصبہ کے عام مسلمانوں میں اپنے دفاع اور دین اسلام کی برتری کا شدید احساس پیدا ہو گیا اور یہ لوگ کسی بھی مقابلہ کے لیے ہر وقت تیار رہنے لگے۔

گزیٹر میں ہے کہ قصبہ کی آبادی زیادہ تر جذباتی پارچہ بانوں پر مشتمل ہے اور مذہبی دشمنی کی آگ ان میں اور قصبہ کے اطراف و جوانب کے ہندوؤں میں ہمیشہ سلگتی رہتی ہے، وقتاً فوقتاً دونوں فرقوں کے درمیان خطرناک قسم کے تصادم اور جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، خاص طور سے ۱۸۱۳ء، ۱۸۴۲ء، ۱۸۹۴ء اور ۱۹۰۴ء میں بڑے فسادات ہوئے اور ان فسادات کی نوعیت اور وجہ ایک ہی قسم کی تھی۔ (اعظم گڑھ گزیٹر ۱۹۱۱ء ص ۱۶۱)

یہاں کے عام مسلمانوں میں اپنے دفاع اور جذباتیت کی ابتدا ایسے ناگوار حالات کا نتیجہ تھی، جونوابی اودھ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی پیداوار تھی، ۱۲۲۹ھ (۱۹ اپریل ۱۸۱۳ء) میں یہاں ایک نہایت سخت اور خوں ریز جنگ ہوئی، اس وقت دہلی میں اکبر شاہ بن شاہ عالم کی گری پڑی سلطنت تھی۔

لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں کا دور حکومت تھا اور مبارک پور ۱۲ سال پہلے سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت رہ کر ضلع گورکھپور میں شامل تھا، یہ جنگ پورہ دہن میں مکان رمضان علی شاہ کے پاس ہوئی تھی، جس میں ۳۶۳۵ مسلمان شہید ہوئے اور تقریباً تین سو بلوائی مارے گئے اور آخر میں نودن، نورات تک مبارک پور لوٹا اور جلا یا گیا، اُس زمانے کے حساب سے تقریباً پچاس لاکھ روپے کا مال و اسباب لوٹا گیا، اس واقعہ کے بعد یہاں کے مسلمانوں کو حفاظت خود اختیاری کے جذبے نے جذباتی بنادیا اور بعد میں ہر ایسے موقع پر

انھوں نے بہادری دکھائی، چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جب بمبور کے رجب علی مرحوم اور ان کے دو ہزار ساتھی مبارک پور کے ہندو مہاجنوں اور تھانے کو لوٹنے کے ارادے سے قصبہ پر چڑھ آئے تو ان کو اطلاع دی گئی کہ یہاں سترہ سو بندوقیں، نو من بارود اور گولیاں تیار ہیں، اس کے بعد وہ واپس چلے گئے۔ (واقعات و حادثات مبارک پور ص ۶۴)

بشن دیال سنگھ، گنگا بشن جے پال سنگھ و ہر پال سنگھ ساکنان موضع مکہرا ضلع فیض آباد اپنے آدمی لے کر قصبہ کے پورب پوکھرا پر آئے اور سارا میدان ان کے آدمیوں سے بھر گیا، سوائے بندوق اور تلوار کے کچھ نظر نہیں آتا تھا، ان کو بھی قصبہ والوں نے دعوتِ مقابلہ دی اور مہاجنوں کو لوٹنے سے پہلے ان سے نمٹنے کو کہا تو وہ سب کے سب واپس چلے گئے، اس کے بعد بارہ گیاں کے باشندے بھییم سنگھ ساکن سونا برکی ماتحتی میں قصبہ کی طرف بڑھے اور حسین آباد کے باغ میں ٹھہرے، ادھر سے بھی گولہ بازار میں نقارہ بجا اور بے شمار آدمی مقابلے کے لیے پہنچے اور لوگوں کا انبوه کثیر دیکھ کر بارہ گیاں والے واپس چلے گئے۔

(ان واقعات کی تفصیلات ”واقعات و حادثات مبارک پور“ ص ۶۱ تا ۶۳ پر درج ہیں)

بعد میں ایسے ناگوار حالات سامنے آتے رہے کہ جذبے میں شدت آتی گئی، پھر زمیندارانہ رقابت اور ذاتی مفاد نے کئی بار مسلمانوں کے جذبات کا غلط استعمال کیا اور اپنے حریف کو شکست دینے کے لیے مذہب کے نام پر جنگ کرائی۔

چنانچہ ۱۹۰۴ء (۱۳۲۳ھ) میں گوجر پار اور مبارک پور میں جو کچھ ہوا اور جو تباہی آئی، وہ ایک مسلمان زمیندار اور ہندو زمیندار کی رقابت کا بدترین مظاہرہ تھا، ۱۸۹۳ء اور ۱۸۹۴ء میں گورکھشنی تحریک سے اس قصبہ میں بڑی بے چینی پھیلی۔

ان ناگوار حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ آس پاس کے غیر مسلم مبارک پور والوں کو دشمن سمجھنے لگے اور ان کے بارے میں معاندانہ ذہنیت کام کرنے لگی۔

مسلمانوں کے اس جذبہ، حوصلہ اور جواں مردی و بہادری کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑی حد تک ان کا ذہن لڑائی جھگڑے سے مانوس ہو گیا اور ان کی جواں مردی اور بہادری آپس میں جنگ و جدال کرانے لگی، چنانچہ ان ہی ایام میں کئی مرتبہ شیعہ سنی جھگڑے ہوئے اور آپس میں چھوٹے چھوٹے معاملات پر کشت و خون کی باری آئی، آخر میں جب یہاں مختلف مسلک کی باری آئی تو وہی پرانی ذہنیت اور جذباتیت اس میں کام کرنے لگی، چنانچہ بعد میں بریلوی و دیوبندی کی لڑائی، شیعہ سنی کے جھگڑے اسی ذہنیت کی پیداوار ہیں اور اب معاملہ اس سے آگے گزر چکا ہے، ایک ہی فرقہ کے لوگ آپس میں لڑائی جھگڑا اور شر و فساد برپا کرتے ہیں، یہ قصبہ اس المیہ میں دوسری بستیوں سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ سے سخت نقصان میں ہے، برطانوی حکومت اس صورتِ حال سے اچھی طرح واقف تھی، اس لیے ۱۸۱۳ء کی جنگ کے بعد جب مبارک پور میں تھانہ قائم ہوا تو عام طور سے یہاں مسلمان داروغہ اور تھانیدار رکھے جاتے تھے، اس سے پہلے تھانہ محمد آباد کے ماتحت صرف چوکی تھی، یہاں کے مسلمان تھانیداروں میں چند لوگوں کے نام یہ ہیں: مرزا کرم علی بیگ، میر جان علی جوینوری، خواجہ حبیب اللہ خاں، مرزا مکھو بیگ، مرزا ولی بیگ، میر رحمت علی، روشن علی، سید مبارک اشرف ساکن صوبہ بہار، مرزا محمد آغا جمعدار چوکی مبارک پور، ان میں سے بعض اہل قصبہ میں بے حد مقبول تھے، مرزا ولی بیگ سات برس تک یہاں رہے، یہ مبارک پور میں مجالس محرم منعقد کراتے تھے اور باہر سے اچھے اچھے مرثیہ خواں بلاتے تھے، ۶ صفر ۱۲۵۶ھ میں فوت ہوئے، میر رحمت علی علم طب جانتے تھے اور انھوں نے یہاں مطب جاری کر کے صد ہا مریضوں کو شفا یاب کیا۔

بعض اوقات باہر کے حکام و اعیان اور علماء یہاں کے مسلمانوں کے معاملات میں مدد کیا کرتے تھے اور حکومت و حکام سے مل کر ان کے معاملات طے کراتے تھے، ۱۲۵۰ھ

میں روضہ شاہ پنچہ میں ایک برقد از سپاہی مارا گیا، جس کا مقدمہ عظیم گڑھ عدالت سے جون پور گیا، کیوں کہ ان دنوں یہاں کانگریز جج وہیں تھا، اس مقدمہ میں مولانا کرامت علی صاحب کے ذریعے مفتی ولایت حسین، سیدنا صرعلی، ڈپٹی منصور علی خاں نے جو رسائے اعلیٰ وارا کین جون پور تھے، مقدمے کی پیروی کر کے مسلمانوں کو بری کرایا اور مفتی ولایت حسین نے مبارک پور کے لوگوں کی دعوت کی، ایک مرتبہ مبارک پور میں مولانا امانت اللہ صاحب غازی پوری نے کلکٹر کے پاس جا کر یہاں کے ایک سنگین معاملے میں بات چیت کی تھی۔

تکوینی حوادث

ان مذہبی فتنوں کے ساتھ ساتھ اس قصبہ میں بہت سے تکوینی حوادث بھی پیدا ہوئے، جن کی وجہ سے یہاں کی معیشت پر نہایت خراب اثر پڑا اور آبادی کا معتد بہ حصہ دوسرے ملکوں اور شہروں میں جا کر آباد ہو گیا، ۱۸۰۴ء، ۱۸۳۸ء، ۱۸۶۸ء، ۱۸۷۸ء، ۱۸۹۶ء اور ۱۸۹۷ء میں سخت قحط پڑا۔

گزیٹر کے بیان کے مطابق ۱۸۹۶ء کے قحط میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ایک روپے میں صرف ساڑھے دس سیر چاول، بارہ سیر گیہوں، سترہ سیر جو، پندرہ سیر چنا بکتا تھا۔ (اعظم گڑھ گزیٹر ص ۷۷)

ایک اخباری خبر کے مطابق اس زمانے میں ایک روپے کی جوار پونے آٹھ سیر، چاول پونے چھ سیر، ارسات سیر، مہو اوس سیر، لتری ساڑھے آٹھ سیر بکتی تھی۔ (اخبار لبرل اعظم گڑھ ۲۴ نومبر ۱۸۹۶)

۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء (۱۳۲۱ھ و ۱۳۲۲ھ) میں بڑا طاعون آیا، جس میں مبارک پور ویران ہو گیا، بچے کچے لوگ دوسرے علاقوں میں بھاگ گئے، اس طاعون کے بعد مولانا

عبدالعظیم صاحب رسول پوری نے ”کتاب الشہادت“ لکھی اور مولانا عبدالرحمن صاحب مبارک پوری نے ”خیر الماعون فی منع الفرار عن الطاعون“ تحریر کی اور مدرسہ احیاء العلوم سے متعلق یتیم خانہ قائم ہوا، اس کے ساتھ یہاں صنعتی زوال آیا۔

۱۸۹۶ء و ۱۸۹۷ء میں طاعون اور قحط نے ایک ساتھ تباہی برپا کی، اس دور میں ۱۸۹۳ء و ۱۸۹۴ء میں گنور کھشنی کا ہنگامہ ہوا، پھر ۱۹۰۴ء میں قحط و گرانی آئی، ساتھ ہی بڑا طاعون آیا۔ ان ناگفتہ بہ حالات نے یہاں کی معیشت و صنعت کو تباہ کر دیا اور لوگ بستی چھوڑ چھوڑ کر باہر جانے لگے، باشندگانِ قصبہ کے بلاد ہند اور ایشیائی ممالک میں منتقل ہونے کی ایک بڑی وجہ معاشی بد حالی ہے، ہندوستان کے مختلف شہروں اور دنیا کے مختلف ملکوں میں یہاں کے لوگ بہت زیادہ ہیں اور ان میں ان کی مستقل آبادیاں ہیں، اس معاملہ میں یہ قصبہ ضلع کے دیگر مقامات سے ممتاز ہے، ان حوادث و فتن میں قصبہ و سوادِ قصبہ کے تمام مسلمان شامل ہیں، اس لیے یہاں کے ہر علاقے کے لوگ باہر ملتے ہیں۔

مذہب اور فرقے

قصبہ و سوادِ قصبہ کے عام مسلمان قدیم زمانہ سے سنی حنفی مسلک پر عامل تھے، مگر آخری دور میں دوسرے مذاہب کو بھی فروغ ہوا اور یہاں کے مسلمان متعدد مسلکوں کے پیروکار ہو گئے۔

سب سے پہلے نوابانِ اودھ کے زمانے میں تشیع کو رواج ہوا، انھوں نے تقریباً ۱۴۲ سال حکومت کی، جس میں ۸۶ سال تک مبارک پور اور اعظم گڑھ کے علاقوں پر ان کی حکومت رہی، انھوں نے اپنے دور میں لہو و لعب کے ساتھ شیعیت کی تبلیغ و اشاعت کی طرف خاص توجہ کی، نوابی اودھ کا ہر نواب اور حکمران پر جوش داعی و مبلغ تھا اور اس کے لیے

بے دریغ دولت خرچ کرتا تھا۔

نواب آصف الدولہ (۱۱۸۷ھ تا ۱۲۱۲ھ) کا خاص کارنامہ ہے کہ انھوں نے شیعیت کی اشاعت میں پوری کوشش کی، ان کے نائب نواب حسن رضا خاں بڑے مذہبی آدمی تھے۔

ان کی کوششوں سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہو گئے اور ان کو جاگیریں ملیں، جو اپنی ضد پر قائم رہے، ان کی جاگیر جو شاہان مغلیہ سے چلی آئی تھی، ضبط کر لی گئی۔
(گل رعنا ص ۱۵۳)

اودھ کی سلطنت نے خاص طور سے آس پاس کے اضلاع و قصبات پر اور بعض اوقات دُور دراز مقامات پر مذہبی لحاظ سے اثر ڈالا، چنانچہ جون پور اور دیگر مقامات لکھنؤ وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ امر پایہ یقین کو پہنچ جاتا ہے۔ (مقدمہ آثر الکرام ص ۱۴)

اسی لیے دیار پورب کے بہت سے علماء و فضلاء کی اولاد بعد میں شیعہ ہو گئی، جیسا کہ اس کے نسب ناموں سے بخوبی واضح ہوتا ہے، نواب آصف الدولہ کے دور میں رمضان علی شاہ نے مبارک پور میں اپنا مشہور امامباڑہ تعمیر کیا، جو بعد میں ”مکان“ کے نام سے مشہور ہوا، ان ہی ایام میں متعدد مبلغین یہاں آئے اور انھوں نے شیعیت کی تبلیغ و تعلیم کا کام انجام دیا اور امامباڑہ تعمیر کیے، چراغ علی شاہ نے قصبہ کے مغرب میں شاہ کا پنجہ نامی روضہ بنوایا اور سیف علی شاہ نے بھی ایک امامباڑہ تعمیر کرایا تھا، یہ مبلغین باہر سے قصبہ میں تشیع کی تبلیغ و تعلیم کے لیے آتے تھے، اس زمانے میں بازار میں ”قدم رسول“ کے نام سے ایک عظیم الشان عمارت بنی، نیز قصبہ اور سوادِ قصبہ میں بہت سے امامباڑے، دالان اور چوک تعمیر ہوئے اور معافیاں دی گئیں اور خاص بات یہ رہی کہ تقریباً ہر امامباڑہ کے متولی سنی فرقے کے لوگ بنائے گئے، اس دور کے عام سنی بھی تعز یہ داری، ماتم و مرثیے میں آگے آگے رہتے تھے،

بل کہ آج تک سنیوں کا ایک طبقہ اس میں پوری دلچسپی رکھتا ہے۔

”الْأَنسُ عَلَى دِينٍ مُّلُّوْا كِهْمُ“ . لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔ (قمر)

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ شیعہ سنی دونوں مل کر تعزیه داری اور ماتم کرتے تھے، مگر سنیوں میں اپنی سنیت کا احساس بھی شدید قسم کا رہتا تھا، چنانچہ نواب سعادت علی خاں کے دور میں تبرّا کہنے پر ایک شخص کا قتل ہوا اور نواب موصوف تک مرافعہ ہوا، اسی طرح ایک مرتبہ عین عشرہ محرم کو بازار کے قدم رسول میں اسی بات پر شدید قسم کا جھگڑا ہوا، نیز ۱۸۱۳ء کی جنگ کی بنا چوک اور مندر کا جھگڑا تھی، ان واقعات کی تفصیل ”واقعات و حادث مبارک پور“ میں موجود ہے۔

۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) سے پہلے قصبہ میں اسماعیلی بوہرہ فرقہ کا رواج ہوا، جو درحقیقت شیعہ کی ایک شاخ ہے، مکان رمضان علی شاہ کے مدرسہ کے ایک مدرس مولوی ثار علی سرائے میری شیعہ حج کو نکلے، اس زمانے میں حجاج کے جہاز سورت سے بھی جاتے تھے، انھوں نے سورت میں قیام کے دوران اسماعیلی فرقہ کے داعی مطلق طیب زین الدین سے بحث و مباحثہ کے بعد اسماعیلی مذہب اختیار کر لیا اور وہیں سے مبارک پور واپس آ کر اس کی تبلیغ و تعلیم کی اور چند شیعہ خاندانوں کو بوہرہ بنایا، وہ ۱۸۱۳ء کی جنگ میں داد شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے، سنیوں، شیعوں اور بوہروں میں شادی بیاہ کا کچھ نہ کچھ سلسلہ باقی تھا، مگر اب تقریباً ختم ہے، شیعیت اور اسماعیلیت کے بعد یہاں مسلک اہل حدیث کو فروغ ہوا، ہماری تحقیق میں اس علاقہ میں اس مسلک کے علم بردار حضرت شاہ ابواسحاق لہراوی متوفی ۱۲۳۴ھ ہیں، جن پر اپنے استاد مولانا محمد فاخر الہ آبادی متوفی ۱۱۶۴ھ کا رنگ چڑھا ہوا تھا، مولانا محمد فاخر شیخ محمد حیات سندھی مدنی متوفی ۱۱۶۳ھ کے تلامذہ میں سے تھے، وہ عمل بالسنہ کے ساتھ فقہی مسائل میں مجتہدانہ شان کے مالک تھے، کتاب و سنت اور اپنے اجتہاد و تفقہ

پر عمل کرتے تھے، پھر اس مسلک کو مولوی عبداللہ جھاؤ الہ آبادی کی وجہ سے خاص تقویت پہنچی، جنہوں نے تیرہویں صدی کے آخر میں املو کو اپنی تبلیغ و تعلیم کا مرکز قرار دیا تھا۔

مولانا عبداللہ جھاؤ الہ آبادی منو آئمہ میں پیدا ہوئے اور دہلی میں شاہ اسحاق صاحب دہلوی متوفی ۱۲۶۲ھ سے پڑھا، بقول صاحب ”زہۃ الخواطر“ وہ قلیل الدرس کثیر التصنیف تھے اور ان کی کتاب میں توحید کی شیرینی اور شہد کی مٹھاس ہے تو دوسرے امور میں حنظل کی تلخی بھی ہے۔

وہ اپنے مخالفوں کے بارے میں شدید تعصب رکھتے تھے اور ان کا شدید رد کرتے تھے، ظاہری نصوص پر عمل کرتے تھے اور حنفیہ، شافعیہ اور دیگر مذاہب والوں کی تکفیر کرتے تھے۔

مولانا ابوالطیب شمس الحق صاحب نے بھی ان کے بارے میں یہ تصریح کی:

”اشاعت سنت میں ان کے بڑے مناقب ہیں، اگر ان کے اندر بعض مسائل میں

شدت اور سختی نہ ہوتی، اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے۔“ (زہۃ الخواطر، ج: ۷، ص: ۳۰۵)

مولانا عبداللہ صاحب ”جھاؤ“ کے لقب سے ان علاقوں میں مشہور تھے، انہوں نے مدتوں املو میں رہ کر اطراف و جوانب میں اس مسلک کی تبلیغ کی اور منوتک ان کا اثر پھیلا، بعد میں مولوی حکیم امان اللہ وغیرہ نے مبارک پور میں اس مسلک کو آگے بڑھایا، تراجم علمائے اہل حدیث میں ہے کہ مولانا عبداللہ کچھ مدت بعد اعظم گڑھ تشریف لے گئے، پھر موضع املو آئے، یہاں بھی جماعتیں بنائیں، املو سے بنگال کا قصد فرمایا۔ (تراجم علمائے اہل حدیث ابوبکی نوشہروی ج ۱ ص ۳۴۱)

اس مسلک میں کئی علمائے کبار اور مصنفین عظام پیدا ہوئے، ان سب کے آخر میں یہاں دیوبندی مکتب خیال کو فروغ ہوا، دراصل یہ کوئی نیا مسلک نہیں تھا، بلکہ حنفیت کے

ایک طبقے کی اصلاحی تحریک تھی، جس کا تعلق زیادہ تر رسم و رواج اور بدعات کے رد سے تھا، فقہی مسائل میں کوئی اختلاف نہیں تھا، البتہ زیادہ تر اختلاف کتاب کی عبارتوں میں رہا، اس مسلک کی ابتداء ۱۳۱۷ھ میں مدرسہ احیاء العلوم کی بنیاد کے بعد ہوئی، ابتداء میں مولانا محمود صاحب اور مولانا حکیم الہی بخش صاحب نے اپنے ساتھیوں کو لے کر اس کے لیے کام کیا، اس کے بعد ۱۳۳۶ھ سے مولانا شکر اللہ صاحب اس تحریک کے داعی و مبلغ بنے اور بڑی سرگرمی اور کام یابی سے قصبہ اور اطراف میں اس کی اشاعت کی، اس سلسلے میں بڑے بڑے معرکے ہوئے اور سخت حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔

روحانی سلسلے

راجہ سید مبارک شاہ کے مورث اعلیٰ حضرت راجہ حامد شاہ مانک پوری متوفی ۹۰۱ھ راجگان چشت میں پہلے بزرگ ہیں، جنہوں نے سلاطین شرقیہ کے دور میں جون پور آکر اس دیار میں اس سلسلے کو فروغ دیا اور یہاں کے علمائے فحول ان کی بیعت و ارادت میں آئے، جن میں مولانا حسن بن طاہر جون پوری ۹۰۹ھ مولانا الہ داد جون پوری ۹۲۳ھ خسر راجہ مبارک شاہ مولانا بہاء الدین جون پوری ۹۱۱ھ مولانا دانیال بن حسن جون پوری ۹۹۲ھ زیادہ مشہور ہیں۔

ان حضرات سے سلسلہ چشتیہ کو اس دیار میں خوب فروغ ہوا، خود راجہ مبارک شاہ بانی مبارک پور بقول صاحب گنج ارشدی ”اس سلسلے کے قدوۃ اہل اللہ و پیشوائے عرفاء اللہ تھے“ اور ”اکثر اولیائے مکمل مرید و خلیفہ آنحضرت بودند“ (اور اکثر اولیائے کاملین اُن کے مرید و خلیفہ تھے) خاص طور سے ان کے صاحب زادوں میں راجہ سید مجتبیٰ اور ان کے صاحب زادے راجہ سید احمد حلیم اللہ مانک پوری ۱۰۴۰ھ کا روحانی فیض بہت عام ہوا، راجہ سید احمد حلیم اللہ

دیوان محمد رشید جون پوری ۱۰۸۳ھ کے شیخ و مرشد ہیں اور انھوں نے اطراف جون پور میں روحانی خدمت انجام دی۔

چنانچہ ”گنج ارشدی“ میں ان کے ایک محمد آبادی مرید کا ذکر موجود ہے، آخری دور میں راجگان چشت میں کئی حضرات ان اطراف میں آباد ہو گئے، اس سے پہلے یہ حضرات یہاں آتے جاتے تھے اور مستقل قیام مانک پور ہی میں کرتے تھے، راجہ سید ابراہیم مانک پوری بھی اس دیار کے چشتی مشائخ میں سے تھے۔

ملا محمد جون پوری کے دادا شیخ بڑے صاحب ان کے مرید تھے، راجہ سید غلام نظام الدین عرف راجہ خیر اللہ مانک پوری ۱۱۲۸ھ بانی خیر آباد حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے سلسلہ چشتیہ کے شیخ ہیں، ان کے بھائی راجہ غلام معین الدین عرف راجہ دانی ۱۱۳۰ھ جون پور میں قیام پزیر تھے اور وہیں دفن ہوئے، راجہ خیر اللہ کے بیٹے راجہ مردان علی اور راجہ دانی کے بیٹے غلام احمد تھے، یہ سب حضرات بارہویں صدی کے آخر تک اس دیار میں مشیخت و روحانیت کے علم بردار رہے اور ان سے سلسلہ چشتیہ کو فروغ ہوا، مبارک پور اور اس کے حدود گویا مانک پور کے راجگان چشت کے دیار تھے، خود راجہ مبارک شاہ بانی مبارک پور نے یہاں رہ کر اس سلسلے کے فیوض و برکات عام کیے، راجہ صاحب کی مسجد کے عقب میں جو قناتی مسجد ہے، وہی راجہ صاحب کی خاص مسجد ہے، اس میں وہ عبادت و ریاضت کرتے تھے، ان کے ہمراہ مانک پور سے جو خانوادہ یہاں آکر آباد ہوا، اس میں یہ سلسلہ جاری و ساری تھا۔ شیخ علی، شیخ امام بخش، اور شیخ حسام الدین شاہ کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں وہ اس سلسلے کے اکابر میں سے تھے، حضرت مولانا کرامت علی جون پوری متوفی ۱۲۹۰ھ کے مریدین و متوسلین بھی قصبہ اور اطراف میں تھے، خاص طور سے نوادہ اور سریاں میں ان کا فیض زیادہ عام ہوا۔

ایک روایت کے مطابق وہ یہاں اکثر آتے تھے، ایک مرتبہ موضع پاہی میں وعظ فرما رہے تھے کہ نماز کا وقت ہو گیا، ہندو مسلمان سب ہی موجود تھے، آپ نے نماز اور اذان کا اعلان کیا اور اذان دی گئی، اس دن سے پاہی میں اذان کا رواج ہوا، وہ حضرت سید احمد شہید بریلوی کے خلیفہ و مرید تھے، ان کے دو ممتاز مرید حافظ عبداللہ نوادوی متوفی ۱۳۲۰ھ اور حافظ ضیاء اللہ نوادوی متوفی ۱۳۵۴ھ تھے۔

حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی متوفی ۱۳۱۳ھ کا حلقہ بیعت و ارادت بھی اس علاقے تک پھیلا ہوا تھا، جو مولانا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی کے مشہور تلامذہ میں تھے اور حضرت شاہ محمد آفاق صاحب دہلوی کے خلیفہ تھے، نیز شاہ غلام علی دہلوی سے کسب فیض کیا تھا، منشی حبیب اللہ صاحب ساکن محلہ کٹرا اور شیخ علیم اللہ صاحب املوی ان کے مریدوں میں تھے اور شیخ محمد طیب گرہست کو ان کے والد نے حضرت مولانا فضل رحمٰن کی خدمت میں لے جا کر مرید کرایا تھا اور ان کے حق میں دعا کرائی تھی اور قصبہ میں مولانا شمس الدین صاحب حسینی کے نانہال کے بزرگ حضرت شاہ صاحب کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔

آخری دور میں حضرت مولانا شاہ ضیاء النبی رائے بریلوی متوفی ۱۳۲۶ھ کے سلسلے میں ان اطراف سے کئی علماء و فضلاء شامل ہوئے، جن میں مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری بھی شامل ہیں، شاہ ضیاء النبی نے دہلی میں شاہ عبدالغنی بن ابوسعید سے پڑھ کر دیگر کتب درسیہ مفتی سعد اللہ مراد آبادی وغیرہ سے لکھنؤ میں پڑھیں اور طریقت خواجہ احمد بن محمد یلین نصیر آبادی سے حاصل کی، نیز خواجہ فیض اللہ اورنگ آبادی کے فیض یافتہ تھے، مولانا عبدالعلیم رسول پوری نے مولانا مفتی محمد نعیم فرنگی محلی سے بیعت کی تھی، مولانا امانت اللہ بن مولانا فصیح غازی پوری گزشتہ صدی میں یہاں آتے جاتے تھے، خیال ہے کہ ان کے حلقہ ارادت میں

کچھ لوگ رہے ہوں گے، پہلی بار نومبر ۱۸۷۷ء (۱۲۹۴ھ) یہاں آئے تھے اور بعد نماز جمعہ راجہ صاحب کی مسجد کے فرش پر ان کا وعظ ہوا تھا، اس وقت یہاں ایک جدید تعمیر شیوالہ کا جھگڑا چل رہا تھا اور گارز بہادر کلکٹر مبارک پور میں تھا، مولوی صاحب پالکی پر سوار ہو کر اس سے ملنے گئے اور اس سلسلے میں گفتگو کی۔ (واقعات و حادثات مبارک پور ص ۶۷ یادداشت قلمی شیخ عبد المجید)

مولانا سید محمد ظاہر رائے بریلوی متوفی ۱۲۷۸ھ اور مولانا حکیم سید فخر الدین رائے بریلوی ۱۲۷۳ھ میں مبارک پور میں آئے، حضرت احمد شہید کے خلیفہ مولانا سید محمد ظاہر (ولادت ۱۱۹۸ھ وفات ۱۲۷۸ھ) بڑے خوش تقریر اور صاحب کمالات بزرگ تھے، علوم دین کے ساتھ اردو، ہندی اور فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے اور ہندی کے صاحب دیوان شاعر تھے، ”تحريم الحرام“ ”قاطع البدعة“ ”خير المسالك“ اور ”وحدة الوجود“ کے نام سے چند رسالے بھی سپرد قلم فرمائے۔

”الشیخ العالم الکبیر محمد ظاہر بن غلام جیلانی بن محمد واضح بن محمد صابر بن آیۃ اللہ بن علم اللہ الحسنی حسینی البریلوی احد العلماء الربانین“۔ (نزہۃ الخواطر، ج: ۷ ص: ۴۵)

یوپی کے مشرقی اضلاع میں آپ کے سیکڑوں مرید تھے اور آپ کے پُر اثر مواعظ سے لوگ بدعت سے متنفر اور سنت نبوی کے دلدادہ ہو جاتے تھے۔

مولانا سید فخر الدین بریلوی متوفی ۱۳۲۶ھ، مولانا ابوالحسن علی ندوی کے دادا نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ذکر اپنی کتاب ”مہر جہانتاب“ میں یوں کیا ہے:

”ہم لوگ مولانا محمد ظاہر صاحب کے ساتھ ان کے حلقہ مریدین میں بنارس، غازی پور، اعظم گڑھ و جون پور کے سفر میں تھے، ایک شام جگدیش پور (سلطان پور) کے زمیندار کے پاس بیٹھے تھے کہ غدر ۱۸۵۷ء کی خبر پہنچی، راجہ (غالباً کنور سنگھ) نے کہا کہ اب خطرہ پیدا ہو گیا ہے، اس لیے ہم لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے اور مسافر خانہ نامی گاؤں میں ٹھہرے۔۔۔۔۔ ہم لوگ جون پور

از پیشترک ہر شدنی را بسخنہا
واگویا کنانند و نقارہ نوازند

مستقبل میں پیش آنے والے حالات کو پہلے ہی
اپنی باتوں میں ظاہر فرمادیتے ہیں اور خبردار کرنے
کی غرض سے نقارہ بجا دیتے ہیں۔ (قمر)

ان تمام روحانی سلسلوں کے باوجود قصبہ میں مشائخ کچھوچھ کا سلسلہ بیعت و ارادت ہر طرف عام تھا اور کہنا چاہیے کہ سب سے زیادہ فروغ اسی کو حاصل تھا، مبارک پور اور سکٹھی کے عام سنی مسلمان ان کی عقیدت و محبت سے سرشار تھے، ہمارے بچپن تک ان حضرات کی تشریف آوری کے ایام میں عموماً کاروبار بند کر کے ان کے معتقدین و مریدین ہمہ تن دل و جان سے ان کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔

بعد میں دیوبندی مکتب خیال کے لوگ مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانویؒ سے بیعت ہوئے، ہمارے علم میں قصبہ اور ملحقاتِ قصبہ میں مولانا مرحوم سے بیعت و ارادت کا شرف سب سے پہلے مولانا احمد حسین صاحب رسول پوریؒ کی زوجہ محترمہ رحیمہ بنت حافظ نظام الدین متوفیہ ۱۳۷۸ھ کو حاصل ہوا۔

مولانا احمد حسین صاحب مولانا تھانوی (۱۲۸۰ھ-۱۳۶۲ھ) کے دورِ شباب میں ان سے کان پور میں تعلیم حاصل کر کے اپنی زوجہ کو اپنے استاذ کے سلسلہ بیعت میں داخل کیا اور خود شاہ ضیاء النبی صاحب سے نسبت رکھتے تھے، اس کے بعد قصبہ کے کئی حضرات مولانا تھانوی کی تشریف آوری پر ان سے بیعت ہوئے اور آخر میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے سلسلہ کو اس مکتب خیال کے لوگوں میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

اضافہ: حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری جو حضرت تھانوی کے اجل خلفاء میں سے تھے، انھوں نے احیاء العلوم میں زمانہ تدریس میں یہاں قیام فرمایا اور لوگ ان کے ہاتھوں پر بیعت ہوئے، ان کی وفات کے بعد جانشین حضرت فتح پوری مولانا قاری محمد مبین صاحب یہاں تشریف لاتے رہے اور لوگ ان سے اصلاحی تعلق رکھتے تھے۔

اور حضرت مولانا شاہ محمد عبداللہ پھول پوریؒ ناظم اعلیٰ مدرسہ عربیہ بیت العلوم سرائے میرضلع اعظم گڑھ کی یہاں آمد و رفت ہوتی تھی، لوگ ان کے بیانات و ارشادات سے مستفیض ہوتے تھے۔

مکاتب و مدارس

دیارِ پورب کے دیگر علاقوں کی طرح مبارک پور اور اس کے سواد میں ماضی قریب تک خانگی مکاتب و مدارس موجود تھے، جن میں قرآن شریف، اُردو، فارسی اور عربی کی تعلیم ہوتی تھی، بہت سے گھروں کی عورتیں محلہ اور پڑوس کے بچوں، بچیوں کو تعلیم و تربیت دیتی تھیں اور حفاظ اپنے مکانات پر حفظ قرآن کی تعلیم دیتے تھے، ان ذاتی مکاتب اور شخصی مدارس سے بہت زیادہ فیض پہنچتا تھا اور پوری بستی میں علمی اور دینی فضا بنی رہتی تھی، اس دور میں میاں صاحب لقب کا ایک طبقہ تھا، جو فارسی دانی میں شہرت رکھتا تھا اور اپنے طور پر فارسی کی اونچی تعلیم

دیتا تھا، میاں صاحب جان محمد، میاں صاحب عبداللہ، میاں صاحب عبدالواحد، میاں صاحب یار علی وغیرہ اپنے اپنے زمانے کے فارسی کے مشہور معلم و مدرّس تھے اور اونچی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ ان کے یہاں سے تعلیم پا کر مدرسہ حنفیہ جون پور اور مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور وغیرہ میں جاتے تھے، سریاں میں حافظ نظام الدین کا خانگی مدرسہ خاص شہرت رکھتا تھا اور وہاں سے بہت سے حفاظ اور کئی علماء پیدا ہوئے، حافظ لعل محمد الہ آبادی متوفی ۱۳۳۷ھ (مارچ ۱۹۱۸ء) حافظ عبداللطیف امام جامع مسجد متوفی ۱۳۳۴ھ (۲۵ فروری ۱۹۱۵ء) اپنے اپنے طور پر تعلیم دیتے تھے، حافظ ہدایت اللہ صاحب متوفی ۱۳۳۵ھ (۱۶ دسمبر ۱۹۱۶ء) کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے حفاظ شاگرد ایک سو سے زیادہ ہی تھے۔

مولوی ولی محمد عرف مولوی گودا اور مولوی حکیم عبداللہ فارسی کے اونچے اساتذہ میں تھے اور باقاعدہ تعلیم دیتے تھے، ان گھریلو مدارس سے جن میں مردوں کی طرح عورتیں بھی تعلیم دیتی تھیں، بہت فیض پہنچتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مفت تعلیم کے ساتھ لڑکوں اور لڑکیوں کی بہترین تربیت ہو جاتی تھی، طلبہ و طالبات اپنے اساتذہ اور استانیوں کی نگرانی میں اخلاق و شرافت اور امور خانہ داری بھی سیکھتے تھے اور ان کے یہاں سے لکھنے پڑھنے کے ساتھ اخلاق و کردار سے مرصع اور معاش و معیشت سے واقف ہو کر نکلتے تھے اور نسلاً بعد نسل اس علمی رشتے کا احترام کرتے تھے، استاذ محمد حسن الاعظمی مبارک پوری ازہری نے ”فتی الہند و قصۃ پاکستان“ کے صفحہ ۲۰-۲۱ پر یہاں کے ان مدارس و مکاتب کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور ان کے طور طریقے اور نظام تعلیم و تربیت سے بحث کی ہے۔

افسوس کہ یہاں کے قدیم علماء و فضلاء کی طرح قدیم مدارس کے حالات بھی پردہ خفا میں ہیں اور نوابی اودھ سے پہلے کی درسگاہوں اور ان کے اساتذہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے، البتہ اس دور میں ہم کو حضرت شاہ ابواسحاق لہراوی ۱۲۳۴ھ کا مدرسہ نظر

آتا ہے، جس میں کم از کم ان کے تین مبارک پوری تلامذہ نے اکتساب علم کیا، لہر میں آج تک ایک جگہ ”مدرسہ“ کے نام سے مشہور ہے، غالباً یہی شاہ ابواسحاق صاحب کا مدرسہ تھا، جس کی بنیاد ان کے والد ماجد حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان ۸۷۸ھ نے رکھی تھی اور وہ اس میں باقاعدہ درس دیتے تھے، نوابانِ اودھ کی عمل داری کے بعد یہ پہلا مدرسہ تھا، جو ان کے اثرات سے محفوظ رہ کر جاری و ساری تھا، بعد میں یہاں نوابانِ اودھ کے مسلک کو فروغ دینے کے لیے ان کے دعاۃ و مبلغین و معلمین آئے، جنہوں نے شیعیت کی تبلیغ کے ساتھ اس کی تعلیم کا بھی معقول انتظام کیا، چنانچہ اس دور میں رمضان علی شاہ، سیف علی شاہ، چراغ علی شاہ وغیرہ یہاں کے مبلغ و معلم تھے، جنہوں نے امام باڑوں کے ساتھ مدرسوں کا اجراء کیا اور ان میں باہر سے اساتذہ و معلمین لا کر رکھے، امام باڑہ رمضان علی تعمیر کردہ بہ عہد شجاع الدولہ ۱۲۰۹ھ جو مکان کے نام سے مشہور تھا، اس میں بہت بڑا مدرسہ تھا، جس میں باہر کے کئی مدرّس تھے۔

مولوی علی حسن ”واقعات و حادثات مبارک پور“ میں ۱۸۱۳ء کی جنگ کا جو اسی مقام پر ہوئی تھی، حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اس امام باڑہ کے تین طرف بہت خوش قطع سائبان بھی تھے، اس میں ایک بڑے تبحر عالم، فاضل بے مثل بنام مولوی ثار علی مرحوم ساکن قصبہ سرائے میر برادر زادہ شیخ جان علی صاحب مرحوم خوش نویس، علوم عربی و فارسی کا درس دیتے تھے اور اسی امام باڑے میں قیام پزیر تھے۔“ (واقعات و حادثات مبارک پور ص ۱۷)

مولوی ثار علی صاحب اسی جنگ میں داؤد شجاعت دیتے ہوئے ۱۲۲۹ھ میں شہید ہوئے، نیز اسی جنگ میں امام باڑہ کے اندر دو اور عالم شہید ہوئے تھے، ایک مولوی محمد نشان اور دوسرے میر معظم حسین، غالباً یہ دونوں صاحبان بھی اسی مدرسہ میں مدرّس تھے، مسلمانوں

کی طرف سے جو عرضداشت گورکھپور عدالت میں پیش کی گئی تھی، اس میں امام باڑہ کے اندر شہید ہونے والوں کے نام درج تھے، ان میں یہ دونوں صاحبان بھی ہیں، عرضداشت میں ہے کہ ”مسمیان مولوی نشان و میر معظم حسین مسافر ان کہ دارد بودند“ غالباً یہ باہر سے یہاں تعلیم دینے کے لیے بھیجے گئے یا بلائے گئے تھے، آج تک یہ مدرسہ باب العلم کے نام سے جاری ہے اور یہاں دُور دُور تک کے طلباء آتے ہیں اور شیعہ جماعت کے زیر تصرف چل رہا ہے، قصبہ کا یہ سب سے قدیم مدرسہ ہے، اس زمانے میں ایک اور مدرسہ لالہ مہتر کے امام باڑے میں تھا، جس میں بشارت علی نامی مدرّس لڑکوں کو درس دیتے تھے، وہ گکپور جلال پور ضلع فیض آباد کے تھے۔ (واقعات و حادثات مبارک پور ص ۲۳)

اس صدی کی ابتداء میں بازار کی مسجد میں ایک مدرسہ تھا، جس میں مولوی سلامت اللہ صاحب اُردو، عربی، فارسی کا درس دیتے تھے، ۱۳۱۳ھ میں مولانا عبدالرحمن صاحب محدث نے دارالتعلیم کے نام سے ایک مدرسہ جاری کیا، جس کے پہلے مدرّس وہی تھے، یہ مدرسہ آج بھی اچھی حالت میں چل رہا ہے اور اہل حدیث مکتب خیال کا ترجمان ہے، ۱۳۱۷ھ میں احناف نے ایک مدرسہ مصباح العلوم کے نام سے جاری کیا، جس کے مدرّسِ اوّل مولانا محمد محمود صاحب معروفی متوفی ۱۳۷۰ھ اور مدرّسِ دوم مولانا محمد صدیق صاحب گھوسوی تھے، مگر کچھ دنوں کے بعد دیوبندی اور غیر دیوبندی کا اختلاف پیدا ہوا اور مولانا محمد صدیق صاحب مدرسہ کو پرانی بستی میں لے گئے اور اپنے مدرسہ کا نام مصباح العلوم ہی رکھا، جو بریلوی نقطہ نظر کا حامل رہا اور پرانا مدرسہ جو پورہ صوفی میں قائم ہوا تھا، احیاء العلوم کے نام سے اپنی جگہ پر چلتا رہا، جو دیوبندی نظریہ پر جاری رہا، بعد میں ان دونوں مدرسوں نے بڑی ترقی کی اور تعلیمی میدان میں شاندار خدمات انجام دیں، قصبہ کے چاروں مدارس اس وقت بھی اپنے اپنے طور پر کام کر رہے ہیں اور سب میں مقامی طلبہ کے علاوہ بیرونی طلبہ بھی پڑھتے ہیں۔

ان مدرسوں کی شاخ کے طور پر یا مستقل طور پر سوادِ قصبہ میں بھی کئی مدرسے چل رہے ہیں، جس کی شانِ دار عمارتیں اور مستقل مدرسین ہیں، سریاں، رسول پور، نوادہ، املو، حسین آباد اور سکٹھی میں ایسے مدارس کامیابی سے چل رہے ہیں۔

موجودہ صدی کی ابتداء میں یہاں کے اکثر طلباء مقامی مکاتب و مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور، مدرسہ حنفیہ جون پور، مدرسہ فرنگی محل لکھنؤ وغیرہ جاتے تھے، اس زمانے میں پورب کی دودرس گاہیں بہت مشہور تھیں، مدرسہ حنفیہ جون پور اور مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور اور دونوں میں قابلِ اساتذہ درس دیتے تھے، اس لیے مبارک پور کے طلباء عام طور سے ان ہی دونوں کی طرف رخ کرتے تھے، مگر بعد میں ہر مکتب فکر کے طلبہ اپنے اپنے مدرسے میں آخری تعلیم حاصل کرنے لگے۔

اسماعیلی بوہرہ کا ایک مکتب مسجد جہاں گیر پورہ دیوان میں تھا، جس کے مدرس میاں صاحب عبداللہ شفا تھے۔

اضافہ: مدرسہ مصباح العلوم سکٹھی اور مدرسہ یتیم خانہ اشرفیہ سمودھی جو بریلوی نقطہ نظر کے حامل ادارے ہیں۔

مدرسہ تحفیظ القرآن سکٹھی بھی ایک علمی ادارہ ہے، جس میں پرائمری، حفظ و تجوید کے علاوہ عربی چہارم تک تعلیم ہوتی ہے۔

علمی اور درسی سلسلے

تیرہویں صدی میں کئی علمی سلسلے اپنے فیوض و برکات کی بدولت خوب چلے اور پورے ملک میں ان کو قبولِ عام حاصل ہوا، مبارک پور میں بھی ان کے فیوض آئے اور یہاں کے علماء نے ان سے کسب فیض کیا، ان میں ولی اللہی سلسلہ خاص طور سے بہت مقبول ہوا،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ ۱۱۷۶ھ نے ہندوستان میں دین و علم دین کی تجدید و احیاء کی بنیاد ڈالی اور کتاب و سنت کو اصل قرار دے کر فقہ حنفی کو توسع و اجتہاد کی روشنی میں اختیار کیا، ساتھ ہی احسان و تصوف کی چاشنی بھی باقی رکھی، ان کے بعد ان کے صاحب زادوں میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب ۱۲۲۸ھ، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب ۱۲۳۰ھ، حضرت شاہ رفیع الدین صاحب ۱۲۳۳ھ نے کام کو آگے بڑھایا۔

شیخ عبدالوہاب سریانویؒ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واپسی پر ان کے فتاویٰ کا معتد بہ حصہ اپنے ساتھ لائے، نیز مولانا عبداللہ جھاؤ مبلغ مسلک اہل حدیث و تلمیذ مولانا شاہ اسحاق دہلوی نے یہاں اپنا سلسلہ جاری کیا، آگے چل کر خانوادہ ولی اللہی کے علوم و معارف و حلقوں میں تقسیم ہو گئے۔

ایک حلقہ نے کتاب و سنت کے ساتھ فقہ و تصوف کو بھی باقی رکھا اور ۱۲۸۲ھ میں اپنا مرکز دارالعلوم دیوبند کو بنایا اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی ۱۲۵۶ھ تلمیذ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی، حاجی امداد اللہ صاحب ۱۲۹۷ھ، مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب نے اس کی سرپرستی کی۔

ہمارے علم میں یہاں اس حلقہ کے سب سے پہلے دو عالم ہوئے، ایک مولانا احمد حسین رسول پوری، جنہوں نے مدرسہ جامع العلوم کان پور میں مولانا اشرف علی تھانوی سے تفسیر جلالین، مشکوٰۃ، صحیح بخاری، صحیح مسلم اور ہدایہ پڑھی اور ان کی زوجہ محترمہ مولانا سے بیعت ہوئیں، مولانا تھانویؒ، مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کی ۱۲۹۷ھ کے روحانی فیوض و برکات کے جامع تھے اور دوسرے مولانا حکیم الہی بخش صاحب مبارک پوری ہیں، جنہوں نے مدرسہ فیض عام کان پور میں مولانا احمد حسن کان پوری سے تعلیم حاصل کی، جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب

کے صحبت یافتہ تھے، اس کے بعد یہاں کے دیوبندی علماء اس سلسلے سے منسلک ہوئے۔
 ولی اللہی سلسلہ کا دوسرا حلقہ وہ ہے، جس نے کتاب وسنت کے ساتھ فقہی تقلید کا جوڑ
 پسند نہیں کیا اور استنباط واجتہاد کی راہ اختیار کی، اس کے ترجمان مولانا سید نذیر حسین صاحب
 دہلوی ۱۳۲۰ھ تلمیذ مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی تھے، مبارک پور میں اس حلقے کے متعدد علماء
 پیدا ہوئے، مولانا عبدالرحمن صاحب محدث، مولانا عبدالسلام صاحب، مولانا عبدالحق الملوئی،
 مولانا بخشش احمد (محمد احمد) صاحب لہراوی اور مولانا شاہ محمد صاحب سریانوی نے براہ
 راست مولانا نذیر حسین صاحب سے پڑھا اور موخر الذکر کے علاوہ سب کے سب مسلک اہل
 حدیث کے جید علماء و مصنفین میں شمار ہوئے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے تراجم علمائے اہل حدیث کے مقدمہ میں حضرت میاں
 نذیر حسین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس درس گاہ سے ایک اور نام ور تربیت یافتہ
 ہمارے ضلع اعظم گڑھ میں مولانا عبدالرحمن صاحب مرحوم مبارک پوری تھے، جنہوں نے
 تدریس و تہذیب کے ساتھ ساتھ جامع ترمذی کی شرح ”تحفۃ الاحوذی“ عربی میں لکھی۔

(مقدمہ تراجم علمائے اہل حدیث ص ۳۷)

ان حضرات کے بعد اہل حدیث مسلک کے علماء نے اس حلقہ کے اساتذہ و شیوخ
 سے استفادہ کیا۔

علمائے فرنگی محل لکھنؤ کے معقولاتی و منقولاتی سلسلے سے بھی یہاں کے اہل علم وابستہ
 رہے، اطراف مبارک پور میں اس سلسلے کے پہلے فیض یافتہ عالم مولانا شاہ محمد علی بھیروی تھے،
 جنہوں نے مدراس جاکر حضرت ملا عبدالعلی بحر العلوم سے تعلیم حاصل کی تھی، علمائے رسول پور کو
 اس سلسلہ سے خاص تعلق رہا ہے، مولانا عبدالعلیم رسول پوری نے مولانا مفتی محمد نعیم صاحب
 فرنگی محلی اور مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی ۱۳۰۴ھ سے تکمیل کر کے مفتی محمد نعیم صاحب سے

بیعت کی، مولانا عبدالرحمن صاحب محدث نے مولانا محمد سلیم پھر یہادی سے پڑھا، جو معقولات میں مولانا مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی کے شاگرد تھے، نیز مبارک پور کے مشرق و مغرب میں علمائے فرنگی محل کی دو مشہور درس گاہیں تھیں، جن میں کئی علمائے مبارک پور نے تعلیم حاصل کی۔

مدرسہ حنفیہ جون پور کے پہلے مدرس مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی والد مولانا عبدالحی فرنگی محلی تھے، پھر ۱۲۷۷ھ میں مولانا مفتی محمد یوسف فرنگی محلی نے ان کی جگہ پائی اور مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور کو مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی نے ۱۲۷۷ھ میں جاری کیا، بعد میں علمائے رسول پور اس کے صدر مدرس ہوتے رہے اور مشرق میں فرنگی محل کی علمی میراث ان کے ہاتھوں مدتوں اہل علم میں تقسیم ہوتی رہی، حتیٰ کہ خود علمائے فرنگی محل نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا، مولانا محمد شعیب رسول پوری سے مدرسہ چشمہ رحمت میں مولانا مفتی عبدالقادر صاحب فرنگی محلی اور مولانا عزت اللہ صاحب فرنگی محلی نے تعلیم حاصل کی، الغرض مدرسہ حنفیہ جون پور اور مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور کے ذریعے علمائے مبارک پور نے فرنگی محل کا فیض پایا۔

معقولات میں علمائے خیر آباد کا سلسلہ بھی یہاں خوب چلا اور اہل مبارک پور اس سے مستفید ہوئے، اس کے بانی مولانا فضل امام صاحب خیر آبادی ۱۲۴۳ھ ہیں، جو دہلی کے صدر الصدور تھے، ان کے صاحب زادے مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی بحالت اسیری ۱۲۷۸ھ میں جزیرہ انڈمان میں فوت ہوئے، ان کے تین شاگردوں سے اس سلسلے کو خوب فروغ ہوا، ان کے صاحب زادے مولانا عبدالحق خیر آبادی ۱۳۱۶ھ اور مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب رام پوری ۱۳۲۶ھ اور مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی اس کے ترجمان تھے، مولانا عبدالحق صاحب مدرسہ عالیہ رام پور میں زیادہ رہے اور مولانا ہدایت اللہ صاحب مدرسہ حنفیہ جون پور میں مدرس ہوئے، مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری نے

پہلے جون پور میں مولانا ہدایت اللہ خان صاحب سے ملا حسن، ملا جلال، میرزا ہدرسالہ مع غلام بیگی، حاشیہ بحر العلوم اور بعض دوسری کتابیں پڑھیں، پھر مدرسہ عالیہ رام پور میں مولانا عبدالحق صاحب سے مسلم الثبوت مع شرح مولانا موصوف، حمد اللہ اور شمس بازغہ پڑھی، مولوی فقیر اللہ صاحب مبارک پوری نے مدرسہ حنفیہ میں مولانا ہدایت اللہ خان صاحب سے معقولات کی تعلیم حاصل کی تھی، مولانا محمد شعیب صاحب رسول پوری اور مولانا محمد طفیل صاحب املوی نے بھی مولانا عبدالحق صاحب سے تعلیم پائی تھی اور مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی نے مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی سے پڑھ کر اس فن میں یکتاوے مثل ہوئے، مولانا شکر اللہ صاحب نے سیتا پور میں سلسلہ خیر آباد کے معقولی عالم مولانا عبد اللہ دانیال وغیرہ سے پڑھ کر ریاست مینڈھو میں مولانا ماجد علی صاحب جون پوری ۱۳۵۵ھ سے تعلیم پائی، جو معقولات میں مولانا عبدالحق خیر آبادی کے ارشد تلامذہ میں تھے، نیز انھوں نے الہ آباد میں مولانا محمد شریف صاحب مصطفیٰ آبادی سے پڑھا، جو مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی کے خاص شاگردوں میں سے تھے اور ہم کو علمائے خیر آباد کی تصانیف میں سے مرقات، شرح ہدایۃ الحکمۃ، ہدیہ سعیدیہ، الجواہر العالیہ کی تعلیم دی ہے، علمائے رسول پور پر سلسلہ فرنگی محل اور سلسلہ خیر آباد کا رنگ نمایاں رہا۔

ہمارے ضلع میں علمائے چریاکوٹ کا معقولی سلسلہ بھی خیر آباد سے کم نہیں تھا، اس گہوارے میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ریاضی، اسطرلاب، اکرمایا، مناظرہ کے ساتھ موسیقی، عربی ادب، عبرانی ادب اور اُردو ادب کی مدتوں رکھوالی ہوئی ہے اور نامی گرامی علماء پیدا ہوئے ہیں، آخری دور میں مولانا عنایت رسول چریاکوٹی ۱۳۲۰ھ اور ان کے بھائی مولانا محمد فاروق چریاکوٹی ۱۳۲۷ھ اس خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، مولانا محمد فاروق صاحب کے مبارک پوری تلامذہ میں مولانا عبدالرحمن صاحب محدث، مولانا احمد حسین صاحب رسول

پوری، مولانا ظفر حسن صاحب عینی فاروقی، مولانا محمد شعیب صاحب رسول پوری، مولانا شاہ محمد صاحب سریانوی اور مولوی فقیر اللہ صاحب مبارک پوری قابل ذکر ہیں۔

ان مستقل علمی سلاسل کے علاوہ کچھ شخصی سلسلے بھی مبارک پور میں چلے، جو آگے چل کر ولی اللہی سلسلے میں مل گئے ہیں، مثلاً مولانا سخاوت علی جون پوری ۱۲۶۲ھ اور مولانا کرامت علی جون پوری ۱۲۹۰ھ دونوں حضرات مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی اور مولانا احمد علی چریاکوٹی کے شاگرد اور سید احمد شہید بریلوی سے بیعت تھے اور مولانا سخاوت علی جون پوری کے شاگرد مولانا حسام الدین منوی ۱۳۱۰ھ تھے، جن سے حافظ عبدالرحیم صاحب اور ان کے صاحب زادے مولانا عبدالرحمن صاحب محدث اور مولانا عبدالسلام نے پڑھا اور مولانا کرامت علی جون پوری مبارک پور میں بسلسلہ تبلیغ و ارشاد آتے تھے۔

مولانا محمد شکور مچھلی شہری ۱۳۰۰ھ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی سے فیوض حاصل کر کے معقولات میں مولانا فضل امام خیر آبادی کے شاگرد تھے، ان کے بھتیجے مولانا قاضی شیخ محمد مچھلی شہری نے ان سے اور مولانا سخاوت علی جون پوری وغیرہ سے پڑھا تھا، مولانا شیخ محمد مچھلی شہری کا فیض مبارک پور میں یوں جاری ہوا کہ حافظ عبدالرحیم صاحب اور ان کے صاحب زادے مولانا عبدالرحمن صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب نے ان سے حدیث میں سند مسلسل بالا ولیہ حاصل کی، نیز مولانا محمد شکور صاحب کے تلامذہ میں مولانا قاضی محمد سلیم صاحب مچھلی شہری ۱۲۶۶ھ دارالقضاء محمد آباد کے قاضی القضاۃ تھے اور مبارک پور میں ان کے نائبین ان کی رہنمائی میں دینی خدمات انجام دیتے تھے، قاضی صاحب مرحوم کے ہاتھ کے فرامین راقم کے خاندان میں محفوظ ہیں، ان کا انتقال اعظم گڑھ میں ہوا ہے۔

مولانا ظہور الحسن صاحب فاروقی رام پوری ۱۳۴۲ھ نے مولانا ارشاد حسین

صاحب اور مولانا مفتی محمد سعد اللہ صاحب مراد آبادی ۱۲۹۴ھ سے پڑھا تھا جو کہ شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی، شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی اور مفتی صدر الدین صاحب دہلوی وغیرہ سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے اور مولانا حافظ وزیر احمد صاحب رام پوری نے مولانا شاہ محمد شاہ رام پوری تلمیذ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی اور مولانا فضل امام خیر آبادی سے پڑھا تھا اور ان دونوں حضرات سے مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری، مولانا محمد شعیب صاحب رسول پوری اور مولانا محمد طفیل صاحب ملوی نے پڑھا، علمائے مبارک پور نے صرف ہندوستان کے علمی خانوادوں اور علمی شخصیتوں سے ہی اکتسابِ فضل و کمال نہیں کیا، بل کہ ان کے شیوخ و اساتذہ میں علمائے عرب بھی ہیں، جن سے انھوں نے دینی علوم اور عربی ادب کی تعلیم حاصل کی، مولانا عبدالرحمن صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب نے علامہ شیخ حسین بن محسن انصاری یمنی سے حدیث پڑھی، جنھوں نے علامہ محمد شوکانی ۱۲۵۰ھ کے تلامذہ شیخ احمد بن محمد شوکانی، شیخ حسن بن عبدالباری الابدل اور شیخ محمد ناصر الحامزی سے پڑھا تھا، مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری اور مولانا محمد شعیب صاحب رسول پوری نے شیخ محمد طیب عرب صاحب مکی سے عربی ادب کی تعلیم حاصل کی تھی اور ان ہی کی نظرِ کیمیا اثر نے مولانا احمد حسین صاحب کو عربی زبان کا صاحب دیوان شاعر بنادیا، ملا رحمت علی صاحب اسماعیلی نے سورت میں شیخ محمد علی بن شیخ فیض اللہ ہمدانی یمنی سے عربیت حاصل کی، جو عربی کے اچھے اور زود گو شاعر تھے۔

موجودہ زمانے میں یہاں کے علماء نے جامعہ ازہر قاہرہ، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ اور نجف اشرف عراق کے عرب اساتذہ و شیوخ سے پڑھا ہے، جن میں حجازی، عراقی، شامی، مصری، افریقی وغیرہ شامل ہیں، قصبہ میں ان علمی سلسلوں کے علاوہ اثنا عشری اور اسماعیلی شیعوں کے بھی علمی سلاسل جاری تھے۔

نوابانِ اودھ کے دور میں یہاں بہت سے سنی خاندان شیعہ ہوئے اور ان کی تعلیم کے

لیے خاص طور سے باہر سے علماء بھیجے گئے، چنانچہ چراغ علی شاہ پنجابی، سیف علی شاہ، رمضان علی شاہ، مولوی ثار علی سرائے میری، مولوی بشارت علی فیض آبادی، میر معظم حسین اس دور کے شیعہ علماء و مدرسین ہیں، جنہوں نے اپنی تدریسی سرگرمی دکھائی، رمضان علی شاہ کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ نونہرہ ضلع غازی پور کے مولانا سید رمضان علی بن مولانا نجف علی ۱۲۷۴ھ ہیں، جنہوں نے اپنے والد اور دوسرے علماء سے پڑھا تھا، ان کے والد مولانا سید نجف علی غازی پوری نے لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل سے پڑھ کر مجتہد العصر سید دلدار علی صاحب سے تکمیل کی تھی، اس طبقہ میں اس زمانہ میں مولوی نرہو مبارک پوری تھے، جنہوں نے شاہ ابواسحاق لہراوی سے تعلیم حاصل کی تھی اور استاد و شاگرد میں گہرے روابط و تعلقات تھے، بعد میں یہاں کے شیعہ علماء نے ناظمیہ کالج لکھنؤ، مدرسۃ الواعظین لکھنؤ، جوادیہ کالج بنارس، جامعہ سلطانیہ لکھنؤ وغیرہ کے اساتذہ سے پڑھا اور بعضوں نے نجف اشرف میں عراق کے شیوخ سے تحصیل و تکمیل کی۔

اسماعیلی بوہروں میں گزشتہ دور میں تین اہل علم تھے، مولوی ثار علی سرائے میری جنہوں نے اس مسلک کو قبول کر کے یہاں رائج کیا، دوسرے شیخ عبدالحکیم اور تیسرے ملا رحمت علی۔

آخر الذکر نے ممبئی اور سورت میں اسماعیلی علماء و اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، جن میں بعض عرب علماء و مشائخ بھی تھے، باشندگان مبارک پور کی ایک بڑی تعداد ۱۸۵۷ء کی جنگ، خشک سالی، بے روزگاری اور طاعون کے علاوہ مختلف وجوہات کی بنا پر ملک اور بیرون میں آباد ہوئی اور برہان پور، مالیگاؤں، دھولیہ، بھینڈی، بمبئی، حیدر آباد، عدن، حجاز، ملیشیا، انڈونیشیا وغیرہ میں مستقل طور سے سکونت اختیار کی، ان میں بھی علماء، فضلاء، شعراء اور اُدباء پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنے اپنے شہر اور ملک کے اساتذہ سے استفادہ کیا، مگر ان کے بارے میں ہماری معلومات نہایت ہی محدود ہیں۔

اضافہ: اور اب دیوبندی مکتب فکر کے طلبہ عموماً عربی پنجم کی تعلیم حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند کا رخ کرتے ہیں اور وہاں کے مشائخ و اساتذہ سے کتاب و سنت کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

علمائے مبارک پور کے تصنیفی کارنامے

اس ضلع میں بہت سے مردم خیزہ قصابات و دیہات ہیں، مگر کسی ایک قصبہ میں اتنے زیادہ مصنف پیدا نہیں ہوئے، جتنے کہ مبارک پور اور سوا دیوبند کے پور میں گزرے ہیں اور اس وقت بھی پائے جاتے ہیں۔

بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ پورے ضلع کا تصنیفی سرمایہ ایک پلے پر رکھا جائے اور علمائے مبارک پور کے تصنیفی کارنامے دوسرے پلے پر رکھے جائیں تو ان کا پلہ بھاری ہو جائے گا۔

یہاں کے علماء میں تدریس و تعلیم کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا خاص ذوق رہا ہے جو دوسرے مقامات کے اہل علم سے ان کو ممتاز کرتا ہے اور اس اعتبار سے ہم اس بستی کو بجا طور پر ”نیشاپور ہند“ کہہ سکتے ہیں۔

حدیث، فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ، تاریخ، سیرت، رجال، سوانح، ادب، زہد و رقائق، طب، مناظرہ، ہیئت وغیرہ کے موضوعات پر یہاں کے مصنفوں نے عربی، فارسی، اردو اور گجراتی زبانوں میں چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں لکھی ہیں، ان کی متعدد عربی تصانیف ہندوستان سے گزر کر پورے بلادِ عرب بل کہ عالم اسلام میں مقبول ہوئیں اور اہل علم اپنی تصانیف میں ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

اس وقت بھی مبارک پور میں ”صاحب تصانیف کثیرہ“ علماء و فضلاء موجود ہیں، اس

سلسلے میں یہاں کے علمائے اہل حدیث اور علمائے رسول پور ممتاز ہیں، جن میں تقریباً ہر عالم نے درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس فضیلت میں یہاں کے علماء باوقار مقام رکھتے ہیں، ان کی تصانیف میں علم و تحقیق اور تلاش و تدقیق کی پوری روح پائی جاتی ہے، جو لکھا اپنے علم و فن پر اعتماد کے ساتھ لکھا، صرف نقل و اخذ پر اکتفاء نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں مستند علوم و معلومات کا خزانہ ہیں، خاص طور سے مولانا عبدالرحمن صاحب محدث، مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی، محمد حسن الاعظمی مبارک پوری ازہری اور قاضی اطہر مبارک پوری کی عربی تصانیف عرب ممالک اور عالم اسلام میں مقبولیت تامہ رکھتی ہیں، یہاں کی عربی تصانیف پر عرب ممالک کے علماء، ادباء اور شعراء نے شان دار تقریظیں اور قصائد لکھے ہیں اور عربی مجلات و جرائد میں ان پر پُر مغز تبصرے شائع ہوئے ہیں، ڈاکٹر تقی الدین ہلالی مراکشی نے ”تحفۃ الاحوذی“ پر علامہ سید محمود طرازی مدنی نے ”رجال السند والہند“ اور ”دیوان احمد“ پر اور حجاز کے مشہور محقق عالم الاستاذ عبدالقدوس انصاری مدیر مجلہ ”المنہل“ جدہ اور شیخ محمد حسن علوی مالکی مکی نے ”العقد الثمین“ پر عربی زبان میں تقاریظ و قصائد لکھے ہیں اور عرب علماء و مصنفین نے یہاں کی کتابوں سے اخذ و اقتباس کیا ہے، متعدد شارحین احادیث ”تحفۃ الاحوذی“ اور ”مرعاة المفاتیح“ سے استفادہ کرتے ہیں۔

حال میں مصر کے ایک عالم شیخ عبدالوہاب عبداللطیف نے احادیث کا ایک مجموعہ بنام ”مختارات الاحادیث والحکم النبویہ“ شائع کیا ہے، اس کے ماخذ میں ”تحفۃ الاحوذی“ بھی ہے، وہ کہتے ہیں:

”وأنفع شروحه التي رجعت إليها تحفة الأحوذی للمبارک
الغوري الهندي المتوفی ۱۳۵۳ھ“ (ص ۱۱)

اسی طرح مصر سے ایک کتاب ”الصلات القدیمة فی الهند والعرب“ شائع ہوئی ہے، جس کے ابتدائی ابواب ”رجال السند والہند“ سے مرتب کیے گئے ہیں، ”تحفة الاحوذی“ کو مدینہ منورہ کے ایک تاجر کتب نے دس جلدوں میں مصر میں طبع کرایا ہے اور بیروت کے تاجروں نے اس کا عکس لے کر چھاپا ہے، غالباً پورے ہندوستان میں یہ امتیاز یہاں کی کتاب کو حاصل ہے کہ اس کا عربی ترجمہ عرب مترجم نے کیا ہے۔

چنانچہ ”عرب و ہند عہد رسالت میں“ نامی کتاب کا ترجمہ جامع ازہر کے ایک مصری فاضل ڈاکٹر عبدالعزیز عبدالجلیل عزت نے کر کے اس کا نام ”الہند والعرب فی عہد الرسالة“ رکھا ہے، جو الهيئة المصرية العامة للكتاب قاہرہ کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔

اسی طرح استاذ موصوف نے ”ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں“ نامی کتاب کا عربی ترجمہ ”حکومات العرب فی السند والہند“ نام سے شائع کیا ہے، ”سیرت البخاری“ کا ترجمہ بھی عربی میں ہو رہا ہے، راقم کے بہت سے تاریخی مقالات کا عربی ترجمہ سرکاری رسالہ ”ثقافة الهند“ دہلی میں شائع ہوا ہے اور ایک مقالہ ”من النار جیل إلى النخیل“ جدہ کے مشہور علمی و ادبی مجلہ ”المنہل“ میں تین قسطوں میں شائع ہوا ہے اور بعض مقالات کے ترجمے انگریزی اور گجراتی زبانوں میں ہوئے اور انگریزی تصانیف میں ان کے حوالے دیئے گئے، استاد محمد حسن الاعظمی مبارک پوری ازہری کی بہت سی عربی تصانیف قاہرہ اور بیروت سے شائع ہوئی ہیں، ۱۹۳۹ء میں حکومت مصر نے جامع ازہر کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر مشہور فاطمی حاکم امیر تمیم کا دیوان شائع کیا، جسے استاذ موصوف نے مرتب کیا ہے، پھر ۱۹۵۴ء میں مصر سے شائع ہوا، ان ہی کی جدوجہد سے شاہ فاروق کے دور میں جامع

ازہر میں پہلی بار اُردو زبان کی تعلیم جاری ہوئی اور وہی اس کے پہلے معلم ہوئے۔

یہاں کے مصنفین نے ایسے نادر اور اہم موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں، جن پر لکھنے کی شدید ضرورت تھی، اسی لیے یہاں کی بہت سی کتابیں قبول عام و تمام کے مرتبے کو پہنچیں۔

کہا جاتا ہے کہ امت کے ذمے امام ترمذی کا قرضہ تھا، جسے ”تحفۃ الاحوذی“ لکھ کر مولانا عبدالرحمن صاحب محدث مبارک پوری نے ادا کیا، اُردو کیا عربی زبان میں بھی امام بخاری کی سیرت پر کوئی جامع کتاب نہیں تھی، مولانا عبدالسلام نے سیرت بخاری لکھ کر اس کی کوپورا کیا، نیز انھوں نے صنعت و حرفت کے اچھوتے موضوع پر ”تاریخ المنوال و اہلہ“ لکھ کر مسلمانوں کی معاشی و معاشرتی تاریخ میں شاندار اضافہ کیا، شہادت اور اس کے اقسام پر اُردو زبان میں مولانا عبدالعلیم رسول پوری کی ”کتاب الشہادت“ ایک نادر چیز ہے، برزخ کے حالات میں مولانا احمد حسین رسول پوری نے ”سبیل الآخرت“ جیسی اہم کتاب تصنیف کی، جس کے متعدد اڈیشن ہندو پاک میں نکل چکے ہیں، مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی نے فلسفہ اور علم کلام میں ”الافاضۃ القدسیۃ“ اور ”نسیم الکلام“ جیسی اہم کتابیں لکھیں، مولانا عبید اللہ رحمانی نے مشکوٰۃ المصابیح کی ایک شرح خاص انداز پر ”مرعۃ المفاتیح“ لکھی ہے، استاذ محمد حسن ازہری نے اپنی سینکڑوں عربی و اُردو تصانیف و تالیفات کے ذریعہ اسماعیلی مذہب کو ستر سے ظہور میں لاکھڑا کیا، ان کی سینکڑوں تصانیف میں ”المعجم الأعظم“ عربی اُردو لغت کی اہم ترین کتاب ہے، قاضی اطہر مبارک پوری نے اسلامی ہند کی قدیم تاریخ پر عربی اور اُردو میں متعدد معیاری کتابیں لکھیں اور پچھلے تمام مورخوں کو بارِ قرض سے سبکدوش کیا، ملا محمد یونس شکیب مبارک پوری نے اسماعیلی مذہب کی اہم اور بنیادی کتاب ”دعائم الاسلام“ کو پہلی بار عربی سے اُردو گجراتی میں ترجمہ کر کے شائع کیا، ان ہی وجوہ کی بنا

پر مبارک پور کی تصانیف دنیا میں مقبول ہو کر متعدد بار طبع ہوئیں اور یہاں کی عربی کتابیں حجاز، مصر و شام اور بغداد کے مشہور کتب خانوں میں ملتی ہیں اور ان کی فہرستوں میں ان کے نام ملتے ہیں، بل کہ یورپ اور امریکہ تک جاتی ہیں۔

اضافہ:

الاستاذ محمد حسن ازہری کی تصانیف:

فلسفۃ اقبال، الحیوة والموت فی فلسفۃ اقبال، حدیث الروح، اللالی الإسلامية الغالیة من أفكار اقبال، وقصة پاکستان، کشمیر جنة الأرض، الثقافة الإسلامية فی الهند و پاکستان، الوحدة فی الشرق، درر الفکاهات والحکایات، بحث فی الشیعة، اساس العربية، المکالمة العربية، القواعد العربية، الرسائل الأعظمية، المکاتیب الأعظمية، المراتة الأعظمية، النجبة الأعظمية، محاضرات عن مصر، آج کاسفر، انقلابی سفر، حیات محمد عبده، شرعی پردہ اور مسلم خواتین۔

مولانا ظفر ادیبی کی کتابیں:

اسلام کا نظریہ حیات و ممات، حیات بعد الممات، ربوبیت الہی، لفظ کلمی کا شرعی، ادبی جائزہ۔

مولانا قاری محمد زبیر صاحب کی کتابیں:

دعاء محمدی، وظائف نبوی، مختصر سوانح امام بخاری، شرح جامع الترمذی۔
مولانا مقبول احمد صاحب کی کتاب دعاء المقبول ہے۔

مولانا نجم الدین صاحب احیائی نے درج ذیل کتابیں اور رسائل تصنیف کی ہیں:
آپ تقریر کیسے کریں (حصہ اول و سوم) زلزلہ در زلزلہ، تکفیر کے پردے میں، مرد

مسلم ہوشیار، کیا لڑکیاں دوبارہ زندہ دفن کردی جائیں گی؟ مقالاتِ احیائی۔

مولانا مفتی جمیل احمد ندیری کی تصنیف کردہ کتابیں:

دیس پردیس کے شرعی مسائل، رسول اکرم ﷺ کا طریقہ نماز، رہنمائے مطالعہ و مضمون نگاری، مسئلہ ایصالِ ثواب، أسالیب الخطابة (عربی تقریر کے اصول)، طلبہ مدارس دینیہ کی رہنمائی، تقریر و خطابت، اسلامی اصطلاحوں اور قرآن پر بے جا اعتراضات، مصافحہ کا مسنون طریقہ، تقریر سیکھنے حصہ اول و دوم، موجودہ مشکل حالات اور مسلمانوں کی ذمہ داریاں، گھریلو جھگڑے اور ان کا حل قرآن و حدیث کی روشنی میں، اہل حدیث۔ چند حقائق، نکاح، جہیز، بارات اور اسلامی تعلیمات، غیر مقلدین کی مشہور کتاب ”صلوٰۃ الرسول“ میں ضعیف احادیث بے احتیاطیاں اور غلط مسائل، رضا خانی ترجمہ و تفسیر پر ایک نظر، آپ تقریر کیسے کریں؟ حصہ دوم، اہل حدیث اور تقلید و فرقہ بندی، دولت اور غربت اسلام کی نظر میں، نان و نفقہ کے شرعی مسائل۔

مولانا محمد عارف جمیل صاحب اعظمی استاذ دارالعلوم دیوبند نے کئی کتابوں کے عربی سے اردو ترجمہ اور اردو سے عربی میں ترجمہ کیا اور اردو، عربی میں تصنیف کیں:

الشیعة والقرآن، الإمامة والخلافة، الإمام محمد بن قاسم کبارایتہ، الفتنة الدجالية، هدية الداراري، تسهيل المعتصر، القصيدة الفردة شرح قصيدة البردة (اردو سے عربی) مراتی الفلاح (عربی سے اردو)، صحابہ رسول اسلام کی نظر میں (عربی سے اردو)، معیار شرعی (عربی سے اردو)، موسوعة فقهيه كويتيه (عربی سے اردو تقریباً چار ہزار صفحات)، سلفیت ایک جائزہ (عربی سے اردو)، المعتصر من آثار السنن وإعلاء

السنن (عربی)، لمحۃ عن الجامعة الإسلامية دارالعلوم دیوبند (عربی)،
الجامعة الإسلامية دارالعلوم کما یراها الشخصیات (عربی)۔

اور راقم الحروف نے درج ذیل کتابیں تصنیف کیں اور تخریج کا کام کیا:
تفسیر جلالین (تحقیق و تخریج)، اصول الشاشی (تحقیق و تخریج)، موبائل: مسائل
و آداب، شبِ برأت کی شرعی حیثیت، اکابر اہیاء العلوم، علمائے رسول پور و عظیم شخصتیں، چند
آفتاب و ماہتاب، ذکر جمیل، مشاہیر اہیاء العلوم، زلزلہ تاریخ و اسباب، قنوت نازلہ منسوخ
ہے یا محکم؟ اسلام اور امن عالم، قرآن کا پیغام خواتین اسلام کے نام وغیرہ وغیرہ، ان کے
علاوہ پچاسوں موضوعات پر مقالات لکھا ہے۔

مولانا محمد ہلال، بھوری نے درج ذیل کتابیں تصنیف و ترتیب دی ہیں:
مولانا شبلی کی اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، کسک عارض (مجموعہ کلام) کلیات
عثمان ساحر مبارک پوری، مقالاتِ احیائی، اور دیگر مرحوم علمائے کرام کی تصنیفات و تخریجات
ان کے حالات میں درج ہیں، وہاں ملاحظہ کر لیا جائے۔

شعر و ادب

ان کے علاوہ یہاں کے بعض شعراء و اُدباء کے مختصر دواوین اور ادبی تصانیف ہیں،
جیسے دیوان احمد (عربی) از مولانا احمد حسین رسول پوری، نعت محبوب از میاں صاحب عبداللہ
شفاء، قصائد نعتیہ از حافظ نظام الدین رضا، دیوان زماں، دیوان (کیفیات کیف) سہد یورام
کیف، نمود سحر از شر رمصباحی، صدر رنگ از قمر الزماں مبارک پوری، اور ”نور و سرور“ از مولانا محمد
عثمان ساحر مبارک پوری، نیز اردو جرائد و مجلات میں یہاں کے شعراء و ادباء اور علماء کے

اشعار و مقالات شائع ہوتے ہیں۔

یہ قصبہ شعر و ادب کا گہوارہ بھی رہا ہے اور یہاں ہر دور میں اچھے اچھے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے ہیں، یہاں کی اردو شاعری میں منشی حبیب اللہ حبیب، حافظ نظام الدین رضا، مولوی غلام عباس وغیرہ قدیم دور سے تعلق رکھتے ہیں، عربی شاعری میں مولانا احمد حسین رسول پوری، مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی اور ملا رحمت علی کے نام نمایاں ہیں۔

اس موقع پر ہم یہاں سے شائع ہونے والی ادبی کتاب ”صدرنگ“ کے مقدمے سے یہاں کی ادبی و شعری تاریخ درج کرتے ہیں:

یہ قصبہ ہمیشہ سے عربی علوم و فنون کا مرکز رہا ہے اور تشنگانِ علوم شرقیہ زمزمِ علم سے سیراب ہونے کے لیے ہر سال یہاں ملک کے ہر گوشے سے جوق در جوق آتے ہیں، یہاں کے چار مدارس اسلامیہ دارالعلوم اشرفیہ، احیاء العلوم، دارالتعلیم اور باب العلم مخصوص و مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور مبارک پور کی معاشرت کے یہی عناصر رہے بھی ہیں، یہاں کے باشندوں کے نظریات و عقائد از دمِ پیدائش تا وقتِ مرگ ان ہی چاروں محوروں کے گرد رقص کرتے رہتے ہیں۔

ان مدارس عربیہ کے علاوہ جس نے مبارک پور کی شہرت میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے، وہ ہے یہاں کی مشہور صنعت پارچہ بانی، اس سرزمین پر سانس لینے والے ہزاروں انسان ایسی زرتارِ دانیں بننے میں کہ سب اندامِ حسینانِ ہند کے شانوں کو تارِ حریری کا بوجھ بھی محسوس نہیں ہونے پاتا، فنکارانِ مبارک پور کے ہاتھوں کی بنی ہوئی بنارس ریشمی ساڑیوں کا رنگ، چمک دمک، یکسانیت، ہمواری اور تناسب کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے کسی بنکر کے کھر درے ہاتھوں نے بنا ہے، بل کہ وہ یہ سوچے گا کہ اس پارچہ دل فریب کی لطافت یقیناً

کسی الف لیلوی شاہ زادی کی نرم و نازک انگلیوں کے لمس کی ہی رہیں منت ہو سکتی ہے۔
اس مبارک پور نے جو علماء و فضلاء کا دینی مرکز، فنکاروں کا مولد اور اہل علم حضرات کی آماجگاہ ہے، خوش فکر و پرگو شعراء کے تین دور بھی دیکھے ہیں۔

دورِ اوّل ۱۸۶۴ء سے ۱۹۲۵ء تک کا زمانہ ہے، اس مدت میں منشی حبیب اللہ حبیب، عبداللہ شفا، قمر الزماں زماں، عبدالکریم عاشق نمایاں رہے ہیں۔

دوسرا دور ۱۹۲۵ء سے شروع ہوتا ہے اور ۱۹۴۶ء پر ختم ہوتا ہے، اس دور کے ممتاز ترین شعراء میں قاضی اطہر مبارک پوری، تبسم مبارک پوری، محمد حنیف رہبر، مظفر حسن ظفر ادیبی، مولانا محمد عثمان ساحر، فقیر اللہ، اسعد سیمابی، منشی سہد یورام کیف اور ایوب مبارک پوری ہیں، یہ دور مشاعروں، ادبی جلسوں اور نشستوں کے لیے زیادہ خوش گوار ثابت ہوا۔

دورِ اوّل کے مقابلے میں اس دور میں مشاعرے بھی زیادہ ہوئے اور سخن فہموں کی تعداد بھی بڑھی۔

تیسرا دور بڑے شد و مد، جوش و خروش اور نہایت عزم و حوصلہ کے ساتھ ۱۹۴۶ء سے شروع ہوا، جواب تک جاری ہے۔ (صدرنگ ملخص ص ۱۶ تا ۲۰)

اضافہ:

اسی سرزمین میں مولانا خلیل احمد گوہر، نذیر احمد فراز ”صاحب حرارتیں“، شرر مصباحی، جناب عبدالغنی ازہر ”صاحب نور و نغمہ“، حماد مبارک پوری، حافظ محمد عمر، غلام مصطفیٰ عزیز برقی ”صاحب شہر حیات“، کوثر مبارک پوری، جناب شاہد حسن وغیرہم نے بھی اپنی شعر و شاعری پیش کی، لہذا مبارک پور ہمیشہ سے گہوارہ شعر و ادب رہا ہے۔

علمائے مبارک پور کی عالمی شہرت

سلاطین شرقیہ جون پور کے دور سلطنت ۷۹۶ھ تا ۸۸۳ھ میں دیارِ پورب کے ہر شہر و قریہ کی طرح یہ مقام بھی علماء، فضلاء کا مسکن تھا اور اس دورِ پربہار میں یہ قصبہ خزاں رسیدہ نہیں تھا، بل کہ قاسم آباد کے نام سے علم و فضل کا مرکز بنا ہوا تھا، اس کے بعد حدود ۹۵۰ھ میں مبارک پور کے نام سے معدنِ علم و فضل ہوا، مگر جیسا کہ اعظم گڑھ گز بیٹر کے مصنف نے لکھا ہے، اس قصبہ کے بارے میں معلومات بہت کم ملتی ہیں اور مسلمان مورخوں نے یہاں کے متعلق کوئی بات نہیں لکھی ہے۔ (اعظم گڑھ گز بیٹر ص ۱۶۰)

اس لیے قاسم آباد کی طرح مبارک پور کے اربابِ فضل و کمال کے حالات بھی پردہٴ خفا میں رہے، جب کہ اس سے متصل چھوٹی چھوٹی بستیوں کے اہل علم و فن کے حالات کتابوں میں ملتے ہیں، بل کہ ان میں سے کئی لوگوں کو شخصیت سازی سے کام لے کر افسانہ بنا دیا گیا ہے اور ان کے تذکرہ نویسوں کے قلم نے بے پناہ رنگ آمیزی کی ہے۔

چریاکوٹ کے عباسی فضلاء، بھیرا کے فاروقی مشائخ، محمد آباد کے سادات و شیوخ، گھوسی کے عثمانی اہل علم و فضل، سگڑی کے سبز پوش اربابِ کمال کے تذکرے قدیم و جدید تذکرہ نویسوں کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، مگر ان ہی حدود میں واقع مبارک پور کے کسی عالم کا تذکرہ نہیں ملتا، حتیٰ کہ مذکورہ بالا شیوخ و شرفاء کے مبارک پوری خدام و تلامذہ کے نام بھی نہیں ملتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے ”حیاتِ شبلی“ کے مقدمے میں پورب کے مردم خیز قصبات کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ بالا شیوخ و سادات اور علماء و مشائخ کا تذکرہ نسبتاً تفصیل

سے کیا ہے اور یہاں کے بارے میں لکھا ہے کہ ”مبارک پور بڑا قصبہ ہے، جو پرانے زمانے سے پارچہ بانی کا مرکز ہے اور جہاں پچھلے زمانے میں چند نام ور علماء پیدا ہوئے ہیں۔“ (حیاتِ شبلی ص ۵۷)

اس پارچہ بانی کے پرانے مرکز اور اس کے حدود میں پیرزادہ محمد ماہ الملوی، شیخ محمود قریشی ہائسی مبارک پوری، شیخ عبدالرشید فاروقی، شیخ محمد مصطفیٰ صدیقی وغیرہ کے خانوادے قدیم زمانے سے آباد ہیں اور ان میں بھی اربابِ فضل و کمال گزرے ہیں، مگر ان کے تذکرے بھی ہمارے تذکرہ نویسوں کی طبقہ واریت کی نذر ہو گئے، یہ حضرات توشیوخ و سادات میں سے تھے، پارچہ بانی نہ تھے، اس کے علاوہ مبارک پور اور اس کے ملحقات و سواد میں تیموری دور کے بہت سے مشہور شہید و اڑے اور بزرگوں کے مزارات ہیں، ظاہر ہے کہ ان یادگاروں سے ممتاز شخصیتوں کا تعلق ہے اور یہ علماء و مشائخ کی قبریں ہیں، مگر ان بزرگوں کے تذکرے بھی نہیں ملتے ہیں، اس سلسلے میں غیروں کے شکوے سے پہلے اپنوں سے گلہ ہے کہ خود یہاں کے کسی صاحب علم نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اور نہ اس فرض کفایہ کی ادائیگی کی کوشش کی۔

البتہ ”تذکرہ علمائے حال“ میں یہاں کے چار عالم، ”نزہۃ الخواطر“ میں دو اور ”تراجم علمائے اہل حدیث“ میں کئی علماء کا تذکرہ ہے اور ان کے مصنفین ہمارے شکرِ یے کے مستحق ہیں۔ علمائے مبارک پور کی طرف سے بے اعتنائی کے علی الرغم آخری دور میں ان کی علمی سرگرمیوں اور تصانیف نے مبارک پور کو عالم اسلام میں باوقار علمی و دینی مقام بخشا اور وہ ہندستان کے مشہور مردم خیز قصبات میں اہم مقام کا مالک بنا، سب سے پہلے اعظم گڑھ گزیٹر کے انگریز مصنف مسٹر ڈی ایل ڈرک بروکمان نے انگریزی زبان میں مبارک پور کے عنوان

سے اس قصبہ کا تفصیلی تذکرہ کر کے اس کی تاریخ، باشندوں کے حالات، معاش و معیشت، صنعت و حرفت، حوادث و فتن اور سرکاری معاملات سے متعلق باتیں بیان کیں۔

انگریز قوم کو داد دینی پڑتی ہے کہ اس کے اہل علم جس موضوع پر لکھتے ہیں، نہایت باریک بینی اور تحقیق سے کام لیتے ہیں، گزیٹیئر کے صفحات ۱۶۰، ۱۶۱ اور ۱۶۲ پر مبارک پور کا مستقل ذکر موجود ہے، نیز جا بجا ضمنی طور سے اس کا ذکر ہے۔

اس کے بعد مولوی علی حسن بن غلام مرتضیٰ فاروقی نے ”واقعات و حادثات مبارک پور“ کے نام سے اردو میں ایک مفصل کتاب لکھی، جس میں نواب سعادت علی خاں کے زمانے سے لے کر ۱۳۰۲ھ تک تقریباً ایک سو سال کے حوادث و فتن اور اہم واقعات کا ذکر کیا ہے، جن میں شیعہ سنی جھگڑے، ہندو مسلم فسادات، ڈاکہ، قتل و غارت کے واقعات اور ۱۸۵۷ء میں یہاں کے حالات کی تفصیل درج ہے، نیز باہمی فتنہ و فساد اور جامع مسجد راجہ صاحب کی تعمیر و توسیع کی تاریخ کا بیان ہے، ضلع کی کسی چھوٹی بڑی آبادی کے بارے میں اس طرح کی کتاب نہیں لکھی گئی ہے، اس میں یہاں کے کئی اہل علم و فضل اور ارباب فن کے تذکرے اور دینی و علمی حالات بھی موجود ہیں، اس کا صرف ایک قلمی نسخہ جو مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، راقم کے پاس محفوظ ہے اور بڑے سائز کے ۹۰ صفحات میں ہے۔

استاذ محمد حسن ازہری نے اپنی عربی کتاب ”فتی الہند وقصۃ پاکستان“ مطبوعہ قاہرہ میں اپنی طالب علمی کے حالات لکھتے ہوئے مبارک پور کا پورا حال لکھا ہے، یہاں کی تعلیمی سرگرمیوں، مذہبی جلسوں، جلوسوں، کھیل کود، صنعت و حرفت کے ساتھ جغرافیائی اور طبعی، تجارتی، تمدنی اور معاشرتی حالات شرح و بسط سے درج کیے ہیں اور صفحہ ۴۷ سے صفحہ ۲۸ تک یہاں کے بارے میں اہم معلومات دی ہیں۔

مولانا عبدالرحمن محدث نے ”تحفۃ الاحوذی“ جلد اول میں مبارک پور کے محل وقوع اور اس کے حدود اربعہ کا ذکر کیا ہے، مولانا عبدالسلام نے ”تاریخ المنوال واہلہ“ جلد دوم کے صفحہ ۵۱/ اور ۵۲ پر یہاں کا مستقل و مفصل حال لکھا ہے، مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم نے ”ہندوستان کی تعلیم گاہوں“ میں مبارک پور کا ذکر کیا ہے۔ (ص ۴۳)

راقم نے اپنی کتاب ”العقد الشمین“ کے مقدمہ میں قصبہ کی مختصر تاریخ اور چند مشہور اہل علم کے نام درج کیے ہیں، نیز عرب ممالک کے مشہور شعراء نے یہاں کے علمی کارناموں اور اہل علم کی خدمات کو دیکھ کر مبارک پور کو مَهْدُ الْعِلْمِ بتایا ہے، علامہ سید محمود طرازی مدنی نے ”رجال السند والہند“ پر منظوم تقریظ لکھتے ہوئے کہا ہے:

بَقِيَتْ مَبَارَكُ پور بِالْعِلْمِ غُضَّةٌ فَضَائِكُ بِالْأَنْوَارِ دَوْمًا مَنُورُ
فَأَنْكَ مَهْدُ الْعِلْمِ كُلِّ فِتْرَةٍ فَفِيهِ جَلِيلٌ مِنْ فَنَائِكَ يَظْهَرُ
وَإِنْ لَمْ يَكُنْ إِلَّا الْمَوْلُفُ وَحْدَهُ كَفَاكَ وَهَذَا مِنْهُ لَيْسَ تَنْكَرُ
اور موصوف نے مولانا احمد حسین رسول پوری کے عربی دیوان پر تقریظ لکھتے ہوئے کہا ہے:

لَأُحْمَدُ حُسَيْنَ الْحَبَرِ دُرَّةَ عَصْرِهِ أَدِيبَ مَبَارَكُ فُورٍ سَابِقِ الْأَقْرَانِ
اور مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری کی کتاب تحفۃ الاحوذی پر شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی نے طویل نظم میں کہا ہے:

وَعْدَا سَرَاجًا لِلْهُدَايَةِ فِي مَبَارَكِ
فُورٍ، بَلْ فِي سَائِرِ الْبُلْدَانِ

اب ہم یہاں کے علماء و فضلاء اور مشائخ کے حالات شروع کرتے ہیں، ان کے ذکر میں ترتیب زمانی کا خیال رکھا گیا ہے۔

ملک شذنی ودیگر شہداء

ہماری تحقیق میں ملک شذنی رحمۃ اللہ علیہ یہاں کے قدیم ترین بزرگوں میں سے ہیں، جو پانچویں صدی میں سالار مسعود غازی^۲ (سالار مسعود غازی کی شہادت ۸۸۸ء میں ہوئی، ملک شذنی کا وصال بھی ان ہی حدود میں ہوا ہوگا) کے زمانے میں بسلسلہ جہاد شہید ہوئے، آپ کو ملک صغانی بھی کہتے ہیں، ملک شذنی درحقیقت ملک صغانی کی بگڑی ہوئی صوتی شکل ہے، یہ بزرگ علاقہ ماوراء النہر (ولایت بالہ) کے صوبہ ترمذ کے مشہور شہر صغانیان (چغانیان) کے رہنے والے تھے، مولانا عبدالسلام مبارک پوری نے بھی ”تاریخ المنوال وابلہ“ میں اسی کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ ملک شذنی کا مزار مبارک پور سے متصل ہے، غالباً یہ اسی طرف بھیجے گئے تھے اور ان کے ساتھی یہاں آباد ہوئے۔ (تاریخ المنوال ج ۲، ص ۸۱ مطبوعہ پٹنہ)

آپ کا مزار مبارک پور کے شمال مشرق میں چند فرلانگ پر سریاں نامی بستی سے متصل شمال میں ایک پُر فضا باغ میں تالاب کے پاس واقع ہے اور اسی سے متصل مغرب میں ملک شذنی نامی موضع آباد ہے، روضہ کا خطیرہ منہدم ہو کر چاروں طرف ڈھیر ہو گیا ہے اور درمیان میں کچی قبر ٹیلہ نما موجود ہے، مزار کے سرہانے قدیم زمانے کا ایک جنگلی درخت ہے، جس کی شناخت نہیں ہوتی ہے۔ چبوترہ پر مغربی جانب تین چار قبروں کے نشان ہیں، چبوترہ کی لمبائی چوڑائی ۵۴ / ۵۴ ہاتھ ہے، اطراف میں گری پڑی پکی اینٹیں راج بھر دور کے ساخت کی موٹی اور بھدی ہیں، جن سے روضہ کی عمارت کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس درگاہ اور روضہ کی حفاظت کے لیے شاہی زمانے میں معافی کی کچھ زمین تھی، نئے بندوبست میں بھی بارہ بیگمہ زمین اس کے حدود میں چھوڑی گئی ہے، یہاں ہر سال ۲۶ / رجب کو عرس ہوتا ہے، جسے عوام ملک شذنی یا ملک بابا کی درگاہ کہتے ہیں، یہ علاقہ قدیم زمانے

میں راج بھر قوم کا مرکز تھا، اس کی خوشحالی کی علامتیں اب تک پائی جاتی ہیں، غالباً اسی مقام پر ملک شہنی کی شہادت ہوئی تھی، کہتے ہیں کہ یہاں جنات کی بہت بڑی آبادی ہے اور اس سلسلے میں عوام و خواص میں بہت سے واقعات مشہور ہیں، ملک شہنی کے مزار سے متصل قبروں کے بارے میں معلوم نہیں کہ وہ کن کی ہیں، ملک شہنی کے علاوہ اس دور کے کئی حضرات کے مزارات ان اطراف میں بتائے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں سالار مسعود کے رفقاء کا حال تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے اور اسی ضمن میں ان بزرگوں کا اجمالی تذکرہ کیا جاتا ہے، جو بسلسلہ جہاد، ان اطراف میں آئے تھے۔

قدیم پرانوں سے پتہ چلتا ہے کہ کاشی راج (بنارس) اور کوشل راج (اجودھیا) کے درمیان تمسا (ٹونس) ندی سرحد تھی اور اس زمانے میں موجودہ ضلع اعظم گڑھ گھنے جنگلوں پر مشتمل تھا، جو تارک الدنیا فقیروں اور سنیا سیوں کے لیے پیٹھ بھوم (عبادت گاہ) کا کام دیتا تھا اور یہاں پر سادھو، سنت پتیا اور ریاضت کیا کرتے تھے، دریائے ٹونس کے کنارے دُرباسا، دتہ تری اور دیول مہاراج کے آشرم تھے، آج بھی مبارک پور کے مغرب میں دُرباسا، دتہ تری اور مشرق میں دیولاش ان رشیوں اور سنیا سیوں کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور ان مقامات پر ہندوؤں کے مذہبی میلے اور اشان ہوتے ہیں۔

سادھوؤں اور سنتوں کی اس روحانی سرزمین پر آفتاب اسلام کی ضیا پاشی کب ہوئی؟ اور اس ظلمت کدے میں اسلام کا نور کس زمانے میں پھیلا؟ اس کی تعیین مشکل ہے۔ البتہ یہ یقینی ہے کہ پانچویں صدی کی ابتدا میں ہی یہ علاقہ سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کے زمانے میں اسلام اور مسلمانوں سے آشنا ہو چکا تھا، خاص طور پر بنارس کی فتوحات نے ان اطراف میں بڑی اہمیت اختیار کر لی تھی، اس کے بعد حضرت مسعود غازی اور ان کے رفقاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے اس علاقے میں اسلام اور مسلمانوں کا شہرہ ہوا، سالار مسعود غازی

(ولادت ۴۰۵ھ، ۴۸۸ھ) نے دہلی فتح کرنے کے بعد اودھ میں سترکھ ضلع بارہ بنکی کو مرکز بنا کر، قنوج کڑامانک پور اور بہرائچ، بنارس وغیرہ میں جہاد کرایا، اسی دوران ان کے رفقاء موجودہ ضلع اعظم گڑھ کے علاقوں میں بھی آئے، صاحب مرآۃ الاسرار نے تصریح کی ہے۔

”و بعد ازاں ملک افضل رابا اقربائے او سالار مسعود نے ملک افضل کو ان کے رفقاء کے طرف بنارس و نواحی آں رخصت نمود آستانہ ساتھ بنارس اور اس کے نواحی میں بھیجا، جن کا او با دیگر شہداء آنجا شہرت دارد بعد ازاں روضہ دوسرے شہداء کے ساتھ ان اطراف ملک عمر و ملک طغرل رابا صاحب یشاں بطرف میں مشہور ہے، اس کے بعد ملک عمر اور ملک پرگنات بیسوارہ تعین کرد۔ رآں نواحی تردو طغرل کو ان کے رفقاء کے ساتھ بیسواڑہ کے نمایاں کردہ بشرف شہادت فائز گشتند، یہ حضرات ان علاقوں چناں چہ مقابر ملک شہید طغرل شہید وغیرہ در میں سرگرمی دکھا کر شہید ہو گئے، چنانچہ ملک قصبہ بخلور و نواحی آں زیارت گاہ خلق است عمر اور ملک طغرل وغیرہ کی قبریں مقام بخلور اور و ملک عمر شہید مذکور بغایت مردانہ خفتہ است اطراف میں زیارت گاہ ہیں، ملک عمر نہایت و تصرفی راحت دارد وہمیں در ہر شہرے و بہادرانہ شان سے آسودہ خواب ہیں اور اُن کے اثرات ظاہر ہیں، اسی طرح سالار مسعود در ہر قصبہ ملک و بہر دیہے مردم اہل اصلاح و صاحب شجاعت کارواں جابجا نصب نے ہر شہر اور ہر قصبہ میں ملک حضرات میں سے نمودہ۔ چناں چہ دریں ملک ہر جا رسیدہ ام مصلحوں اور بہادروں کو جابجا متعین کیا، چنانچہ اثرے از اصحاب الشہداء یافتہ ام وہمہ جا چہ میں ان علاقوں میں جہاں گیا ہوں ان زیارت گاہ خلق است۔“ (مرآۃ الاسرار قلمی بزرگوں کے آثار دیکھے ہیں اور ہر جگہ ان کی جداول ذکر سلطان الشہداء امیر مسعود) زیارت گاہیں موجود ہیں۔

یہاں پرگنات بیسواڑہ سے مراد گنگا اور گھاگرا کے درمیانی علاقے ہیں، مسٹرٹی۔ ڈبلیو

ٹالبورٹ نے اپنی کتاب خلاصہ حال اقوام ہند میں لکھا ہے کہ درمیان گنگا و گھاگرا کے راجپوت بکثرت ہی، اس طرف بینسواڑہ (بھینسواڑہ) یعنی ملک گوت بینس واقع ہے، بل کہ اس تمام گردونواح میں نشان ظاہر ہے کہ ایام سابقہ میں ملکیت اعلیٰ راجپوتوں کی تھی، اعظم گڑھ، غازی پور اور سون کے دوآبہ میں یہی ہیں، جہاں سے سپاہی جو بھوجپور یہ کہلاتے تھے، فوج میں آئے۔ (خلاصہ حال اقوام ہند ص ۵۱، ۵۲ مطبوعہ مطبع جیل ڈیرہ اسماعیل خان ۱۸۷۰ء) تحصیل گھوسی میں آج بھی ایک بستی بھینسواڑہ کے نام سے مشہور ہے۔

اعظم گڑھ گزنیٹر میں ہے کہ سالار مسعود غازی بہرائچ جاتے ہوئے چند دنوں تک بھگت پور میں رکے تھے۔ (اعظم گڑھ گزنیٹر ۱۹۱۱ء)

خلاصہ تاریخ مسعود میں ہے کہ آپ ۴۳۰ھ میں سترکھ آئے، تمام ملک ہند میں کوئی شہر و قصبہ و گاؤں نہیں کہ آپ کے ساتھ کا شہید نہ ہو، تمام ملک ہند میں غازیان اسلام منتشر تھے، ہر جگہ کو نور شہادت سے منور کیا، اسی وقت سے ہندوستان میں اسلام ہوا۔ (خلاصہ تاریخ مسعود ص ۷، از مولوی محمد صادق مطبوعہ غالب الاخبار ۱۲۸۸ھ)

غزانا نامہ مسعود میں ہے کہ جس جس ملک میں حضرت کے نمک خوار تھے، بڑے بڑے سردار تھے، بعد آپ کے سب نے شہادت پائی، اسلام کی بیخ جمائی، ہر شہر و دیار میں ایک نہ ایک شہید لشکر سالار مسعود ہے، قبر اس کی موجود ہے، کوئی مقام خالی نہیں ہے، کل زیر نگین ہے۔ (غزانا نامہ مسعود ص ۶۷، از مولوی عنایت حسین مطبوعہ مطبع نظامی کان پور ۱۲۸۷ء)

اور آئینہ اودھ میں ہے کہ کسی تاریخ میں سوالٹرائی کڑا مانک پور کے اور کوئی لٹرائی سید مسعود کی درج نہیں ہے، لیکن اکثر قبر گنج شہیدان دیہات و قصبات متعلقہ اضلاع رائے بریلی، سلطان پور، فیض آباد، پرتاپ گڑھ، اعظم گڑھ، جون پور، بنارس و غازی پور میں برابر پائی جاتی ہیں اور جہاں جہاں قبریں ہیں باوجود اس قدر تمادی ایام کے عام طور پر بلا کسی

اختلاف کے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں مجاہدی غازی میاں ہوا ہے اور یہ ان ہی کے ساتھی کی قبریں ہیں۔۔۔۔ ناظرین کتاب کو خیال ہے کہ ممالک مغربی و شمالی اودھ میں جہاں مقابر شہیدان ہمراہیان غازی میاں کہا جائے اس کو باور کرنے میں تامل نہ کیا جائے۔

(خلاصہ تواریخ مسعودی ص ۷، از مولوی محمد صادق مطبوع غالب الخیار ۱۲۸۸ء)

اور مولانا عبدالسلام صاحب مبارک پوری نے تاریخ المنوال میں معتبر حوالے سے لکھا ہے کہ بزمانہ سید سالار مسعود غازی ملک افضل بغرض فتح بنارس و ملک علوی نائب ان کے و ملک طاہر بمقام منو و ملک مردان بمقام شادی آباد غازی پور آئے تھے، مزارات ان کے ان مقامات پر ہیں، سترکھ (ملک اودھ) سے ملک حاجی بمقام ٹانڈہ متعین ہوئے تھے، مسعود غازی سترکھ سے پورب نہیں آئے اور حاشیے میں لکھا ہے کہ ملک شدنی کا مزار مبارک پور سے متصل ہے، غالباً اس طرف بھیجے گئے اور ان کے ساتھی یہاں آباد ہوئے۔

(تاریخ المنوال ص ۸۱)

چوں کہ سالار غازی اور ان کے رفقاء کی یہ فتوحات ان اطراف میں بالکل ابتدائی دور میں تھیں اور ان حضرات کی شہادت کے بعد ایک زمانے تک مسلمانوں نے ادھر کا رخ نہیں کیا، اس لیے ان کے کارناموں کی تفصیلات اور شہداء وغیرہ کے حالات صحیح طور سے مرتب نہ ہو سکے، اس لیے یہی روایات سب کچھ ہیں۔

ملک شدنی کے مزار کے علاوہ مبارک پور کے اطراف میں کئی مزارات ایسے ہیں، جن کے بارے میں ظن غالب ہے کہ وہ سالار مسعود غازی کے ہمراہیوں کے ہیں، چنانچہ قصبہ کے جنوب میں سمودی تالاب کے پاس ایک مجہول اور قدیم قبر ہے، یہ ”نوگڑے پیر“ کے نام سے مشہور ہے، جس پر بعد میں لمبا چوڑا چبوترہ مشرق و مغرب رخ بنا دیا گیا ہے، ایسی مجہول قبریں آس پاس کے دیگر علاقوں میں بھی پائی جاتی ہیں اور ان کو عام روایات میں سید

سالار مسعود غازی کے رفقاء سے وابستہ کیا جاتا ہے۔

چنانچہ آئینہ اودھ میں ہے کہ سیلون ضلع رائے بریلی میں ایک درگاہ موسوم پیران پروٹھ ہے، ایک احاطہ میں بڑا سا چبوترہ ہے، جس کا طول و عرض بیس فٹ اور بلندی بارہ فٹ ہے، اس کے درمیان دو قبریں ہیں، جن کا سر پچھم طرف اور پیر پورب طرف ہے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں شہید لڑتے ہوئے یہاں آ کر گرے، اس لیے اسی مقام پر مدفون ہوئے، بعد میں لوگوں نے قبر کو شمالاً جنوباً بنایا، مگر آہستہ آہستہ رخ پورب پچھم ہو گیا، واللہ اعلم، نہیں معلوم کہاں تک اس کی صحت ہے، اسی طرح بہت سے مقامات پر گنج شہیدان ہیں۔ (آئینہ اودھ ص ۳۶ و ۳۷)

مبارک پور کے نو گزے پیر کی قبر اور چبوترے کی ساخت تقریباً اسی قسم کی ہے، ہمارے بچپن میں راج بھر دور کی موٹی اور بھدی اینٹیں تھیں، اس سے زیادہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، البتہ اتنا ضرور ہے کہ بہر حال یہ کسی بزرگ کا مزار ہے۔

قصبہ کے مشرق میں چند فرلانگ پر اسادور نامی بستی ہے، اس میں اسی طرح کے دو مزارات ہیں، ایک کو مقامی زبان میں سیکھندی شہید (شیخ ہندی شہید) اور دوسری کو امر شے شہید (عمر شیخ شہید) کہتے ہیں، یہ روضے شکستہ حال میں وہاں کے تکیہ میں ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ یہ ملک طغرل کے مزارات ہوں، جن کو سالار مسعود غازی نے پرگنات بیسواڑہ میں جہاد کے لیے مقرر کیا تھا، جیسا کہ ”مرآۃ الاسرار“ کی تصریح گزر چکی ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ علاقہ گنگا اور گھاگرا کا دوآبہ ہے۔

بہر حال اغلب یہ ہے کہ یہ دونوں قبریں بھی اسی دور کے غازیوں اور مجاہدوں کی ہیں، مشہور ہے کہ قصبہ کے اطراف میں سات شہید ہیں، ان میں ”شہید مرد“ بہت مشہور ہیں، جن کا پختہ مزار قصبہ کے جنوب میں اوسر میں ہے اور اس پر نیم کا درخت ہے، ان کے علاوہ کئی

شہید واڑے، کھیتوں، میدانوں اور جھاڑیوں میں ہیں، مگر ان کی تاریخ بالکل مجہول ہے۔
گزئیٹر میں ہے کہ ضلع میں بہت سے شہید واڑے ہیں، یہ وہ جگہیں ہیں، جہاں
مجاہدین شہید ہوئے اور دفن کیے گئے، مگر لوگ ان کے واقعات بھول گئے، حتیٰ کہ اب نہ ان
کے نام معلوم ہیں اور نہ ہی شہادت کی وجہ معلوم ہے۔ (اعظم گڑھ گزئیٹر ۱۹۱۱ء ص ۱۵۷)

راجہ سید مبارک مانک پوری بانی مبارک پور

حضرت راجہ سید مبارک بن راجہ سید احمد بن راجہ سید نور بن راجہ سید حامد شاہ بن
راجہ اعز الدین بن شہاب الدین ثنی بن حسام الدین بن شہاب الدین بن زین الدین بن
امام محمد الباقر بن امام جعفر الصادق رحمۃ اللہ علیہم بانی مبارک پور ہیں۔

سلسلہ نسب میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے، آپ کے آباء واجداد و اولاد و احفاد کے
حالات عام طور سے کتابوں میں ملتے ہیں، مگر خود راجہ سید مبارک کا حال تلاشِ بسیار کے
باوجود صرف ”گنج ارشدی“ میں مل سکا ہے، سید شمس الدین اور سید شہاب الدین دو بھائی تھے،
جو سلطان شمس الدین اتمش متوفی ۶۳۳ھ کے دور میں ترکستان کے شہر گردیز سے جونواح
غزنی میں ہے، دہلی آئے، پھر سید شہاب الدین نے دہلی سے نکل کر مانک پور میں سکونت
اختیار کی، جو اس زمانے میں سلطنتِ دہلی کا مشرقی مرکز تھا۔

راجہ سید مبارک کے آباء واجداد میں حضرت راجہ سید حامد شاہ مانک پوری متوفی
۹۰۱ھ رحمۃ اللہ علیہ سب سے پہلے شاہانِ شرقیہ کے دور میں جون پور تشریف لائے، اس وقت
سے اس خانوادہ کا علمی و دینی اور روحانی تعلق دیارِ پورب سے ہوا، وہ حضرت شیخ حسام الدین
مانک پوری متوفی ۸۵۳ھ کے اجل خلفاء میں سے تھے، ان کے صاحب زادے راجہ
سید نور متوفی ۹۲۱ھ بھی صاحبِ کشف و کرامات چشتی بزرگ تھے، ان کے دولڑکے تھے،

راجہ سید احمد اور راجہ سید محمد، راجہ سید مبارک راجہ سید احمد کے صاحب زادے ہیں۔

”گنج ارشدی“ میں آپ کا تذکرہ ان القاب سے شروع ہوتا ہے:

”وصل در ذکر قدوہ اہل اللہ و پیشوائے عرفاء اللہ تعالیٰ و تبارک سید مبارک قدس سرہ

العزیز است۔“

بعض تذکرہ نگاروں نے راجہ سید مبارک مانک پوری کو راجہ سید نور کا فرزند بتایا ہے، حالاں کہ وہ آپ کے دادا تھے، جیسا کہ ”بحرِ خاں“ قلمی میں وجیہ الدین اشرف آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”موج احوال آن روح روانِ رہرواں، اہل سلوک کے روح رواں، پیروں کے رہنما،
آن رہنمائے پیران، آن برگزیدہ اللہ برگزیدہ حق تعالیٰ، ولی کامل حضرت راجہ سید مبارک،
تبارک، ولی کامل حضرت راجہ سید مبارک حضرت راجہ سید نور کے فرزند و خلیفہ تھے۔ راجہ سید
خلف و خلیفہ راجہ سید نور است۔ از اعظم مبارک اولیائے عظام اور صاحب کرامت عاشقان
اولیاء صاحب کرامت و اکابر عاشقان، در کبار میں بلند مرتبے کے مالک تھے، ان کی
تصوف و عشق مرتبہ بلند داشت، کرامتش کرامت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب ان کے
ازیں جا قیاس باید کرد کہ بسرش سید مجتبیٰ بیٹے سید مجتبیٰ کی عمر بارہ برس کی ہوئی تو راجہ
دوازدہ سالہ بود کہ آن حضرت وقت شب سید مبارک رات میں وفات پا گئے، صبح کے وقت
وفات نمود، صبح دایہ سید مجتبیٰ در عین نوحہ عین نوحہ و زاری کی حالت میں سید مجتبیٰ کی دایہ کی
وزاری بر زباں آورد کہ مجتبیٰ را ہنوز تلقین نہ کر زبان سے نکل گیا کہ ابھی سید مجتبیٰ کی پوری تعلیم
دہ بود و خود ازین جہاں انتقال فرمود، بر خور و تلقین نہیں ہوئی اور راجہ سید مبارک اس دنیا سے
این کلمہ آں حضرت زندہ شد، برخاست کوچ کر گئے، یہ سنتے ہی راجہ سید مبارک زندہ
و فرمود مجتبیٰ را تلقین نموده ازین عالم خواہم ہو کر اٹھ بیٹھے اور فرمایا کہ مجتبیٰ کی تعلیم و تلقین کے بعد

رفت۔ پس پنج سال دیگر درین عالم ماندہ
از سائر اکتساب و امانات اجداد پیران
سید مجتبیٰ را بہرہ و روتلقین نمودہ،
اجداد پیران سید مجتبیٰ را بہرہ و روتلقین نمودہ، فرمودہ حالا احتیاج
صحبت بہ تو باقی نماندہ پس ازین عالم
ملاً اعلیٰ شافت و کیفیت احوال سید
مجتبیٰ را نیز ازین قصہ باید فہمید کہ
برائے تربیت اوحق سبحانہ و تعالیٰ
پدرش را از مہمات بحیات آورد۔
(بحر زخار قلمی ص: ۳۷۵۔ مصنف مولوی وجیہ
الدین اشرف) زندگی دی۔ (قمر)

غالباً بے ہوشی اور سکتہ کو موت سے تعبیر کیا ہے، اُردو میں محاورہ ہے کہ مرکز زندہ ہوا
ہے یا مرکز بچا ہے۔
شیخ غلام عباس نے غزنامہ مسعود میں اور سید محمد صادق نے خلاصہ توارخ مسعودی
میں لکھا ہے:

”قطب الوقت حضرت راجے سید نور مانک پوری کے فرزند نہیں ہوتا تھا، آپ کی بی بی
نے نیت کی کہ اگر حق تعالیٰ مجھ کو فرزند نرینہ عطا کرے، پس میں مع فرزند بہرائچ میں
واسطے زیارت حضرت سلطان الشہداء سالار مسعود کے جاؤں، آپ کی برکت سے
حق تعالیٰ نے فرزند مبارک نام عطا کیا، (غزنامہ میں ہے کہ خدا نے فرزند ارجمند نیک

فرجام سید مبارک نام عطا فرمایا (بی بی نے سید نور کو واسطے جانے بہرائچ کے تاکید کی۔
(غز انامہ میں ہے: سید صاحب کو مستورات کی روانگی میں عذر تنگ دیتی پیش آیا)
”ایک شب سید نور حجرہ میں مشغول تھے کہ حضرت سالار مسعود اسپ خنک پر سوار
تشریف لائے، گھوڑے سے اتر کر پیش سید راجے نور کے بیٹھ کر فرمایا فرزند کو میرے
پاس لاؤ، کچھ حاجت نہیں کہ فرزند تمہارے بہرائچ میں آ کر تکلیف اٹھائیں، راجے
سید نور اٹھ کر سید مبارک طفل کو حضرت سالار مسعود غازی کے قدموں پر ڈال دیا،
حضرت سلطان الشہداء سالار مسعود نے اس کو بہت دعا دی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔“
(خلاصہ تواریخ مسعودی ص ۱۶ مطبوعہ غالب الاخبار ۱۲۸۸ء وغز انامہ مسعود ص ۵ مطبوعہ نظامی

کان پور ۱۲۸۷ء)

اس خواب یا واقعہ میں سید مبارک کو سید راجے نور کا فرزند بتایا گیا ہے، ”بحر زار“
میں بھی ”حضرت راجہ سید مبارک خلف و خلیفہ راجہ سید نور است“ لکھا ہے، مگر ”گنج ارشدی“ میں
ان کے والد سید احمد بن راجہ نور ہے اور یہی صحیح ہے۔

والد بزرگوار راجہ سید احمد آپ کی ولادت سے پہلے ہی فوت ہو گئے تھے اور عنفوان
شباب تک دادا راجہ سید نور نے پرورش کر کے تعلیم و تربیت دی اور بچپن ہی میں آپ نے
اپنے جد بزرگوار سے بیعت کر کے اسی زمانے میں خلافت حاصل کی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے والد راجہ سید احمد کے ایک بھائی راجہ سید محمد تھے اور
دونوں اپنے والد راجہ سید نور کو بہت پیارے تھے، یہ دونوں صاحب زادے مکتب میں
پڑھتے تھے، ایک دن استاد نے کسی بات پر دونوں بھائیوں کو طمانچہ مارا، جب ان کے والد
سید نور کو خبر لگی تو بہت رنجیدہ ہوئے اور کہنے لگے کہ حیدر کرار کی اولاد کو طمانچہ مارنا اچھا نہیں
ہے، یہ سب کے سب اپنی اپنی جگہ پر حیدر کرار ہیں اور یہ دونوں بچے بہادری دکھاتے ہوئے

شہادت پائیں گے، چنانچہ جوان ہونے کے بعد دونوں بھائی شاہی فوج میں ملازم ہو گئے، ان ہی دنوں ایک راجہ سے شاہی فوج کا مقابلہ ہوا اور دونوں بھائیوں نے میدان جنگ میں دادِ شجاعت دی، راجہ سید احمد اس جنگ میں شدید زخمی ہو کر میدان کارزار میں گر گئے اور ان کے والد سید نور کے بعض مریدین نے ان کو دیکھا اور وہاں سے اٹھا کر اپنے گھر لائے اور علاج کیا، جب راجہ سید احمد صحت یاب ہو گئے تو ان کے گھر روانہ کر دیا، مانک پور آنے کے بعد ان کی شادی ہوئی اور ازدواجی زندگی کا دور شروع ہوا، ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ پرانے زخم عود کر آئے، جس سے ان کا انتقال ہو گیا، اس موقع پر راجہ سید نور کے مریدوں اور متوسلوں نے ان سے عرض کیا کہ صاحب زادے عین جوانی میں لا ولد فوت ہو گئے اور آپ کی عمر کا بھی آخری وقت ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اولاد کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا، راجہ سید نور نے کہا:

”خبر زوجہ راجی سید احمد بگیرند کہ راجی سید احمد کی بیوی کی خبر لینی چاہیے، اس سے ازاں پسرے خواہد شد کہ خانہ ما از ایک بچہ پیدا ہوگا، جس سے ہمارے خاندان کا روشن خواہد گشت۔“

چنانچہ عورتوں نے پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ ایک ماہ کا حمل ہے اور اسی سے راجہ سید مبارک پیدا ہوئے، دادا راجہ سید نور اپنے اس یتیم پوتے سے بے انتہا محبت کرتے تھے اور ان کی دل جوئی کر کے نیک توقعات رکھتے تھے، پیار کی وجہ سے ان کو ”میاں ماکھو“ کہا کرتے تھے، مراہقت کے زمانے میں ایک مرتبہ راجہ سید مبارک اپنا پا جامہ دھو کر دھوپ میں سکھا رہے تھے کہ دادا کہیں سے آ گئے اور دیکھ کر بولے:

”حیاتِ ماتا بلوغ میاں ماکھو بود، از شفقت ہماری زندگی میاں ماکھو کے جوان ہونے تک حضرت راجی سید مبارک را میاں ماکھو ہے، انھوں نے ازراہ شفقت راجہ سید مبارک

فرمود: ”کومیاں ماکھو کہا تھا۔“

نیز ایک دوسرے موقع پر دادا نے اپنے پوتے کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا تھا:
 ”مرادریں خانہ دفن خواہید نمود، میاں ماکھورا کہ تم لوگ مجھے اسی مکان میں دفن کرنا کہ میاں
 احتیاج پر سیدن خواہد پر سیدہ خواہند گرفت۔“ ماکھو کچھ معلوم کرنا چاہیں تو معلوم کر لیا کریں۔
 راجہ سید مبارک کی تعلیم و تربیت کے بارے میں اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ وہ
 اپنے دادا سید نور کے مرید و خلیفہ تھے۔

”وے مرید جد بزرگوار خود حضرت راجی سید نور وہ بچپن میں اپنے دادا راجہ سید نور کے مرید
 در صغر گشت و خلافت ہم در آں ایام یافت۔“ ہوئے، اسی زمانے میں خلافت بھی پائی۔
 راجہ سید مبارک کی پہلی شادی ان کے پر دادا راجہ سید حامد شاہ مانک پوری کے شیخ
 و مرشد حضرت شیخ حسام الدین مانک پوری (متوفی ۸۵۳ھ) کے خاندان میں ہوئی، مگر ایک
 مدت تک کوئی اولاد نہیں ہوئی تو ان کی بیوی نے خوشی خوشی کہا کہ آپ دوسری شادی کر لیں،
 تاکہ بقائے نسل کا باعث ہو، راجہ سید مبارک نے کہا کہ تم ہمارے مخدوم کے خانوادے سے
 ہو، تمہارے ہوتے ہوئے دوسری شادی کسی طرح مناسب نہیں ہے، مگر جب بیوی نے بہت
 زیادہ اصرار کیا تو راجہ سید مبارک نے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر استخارہ کیا اور مرثدہ ملا کہ تمہاری
 نسبت جون پور میں میاں شیخ الہ داد کے خاندان میں ہوگی اور اس سے اولاد پیدا ہوگی۔
 چنانچہ اس بشارت کے مطابق دوسری شادی شیخ الہ داد کی صاحب زادی سے
 ہوئی اور اس سے راجہ سید مبارک کے چھ لڑکے پیدا ہوئے۔

”آخر شش پسر از دختر شیخ الہ داد متولد گشتند۔“ چھ لڑکے شیخ الہ داد کی دختر سے پیدا ہوئے۔

مولانا شیخ الہ داد جون پوری متوفی ۹۳۲ھ رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور میں جون پور کے
 اکابر علماء میں سے تھے، ایک واسطہ سے قاضی شہاب الدین دولت آبادی سے شرف تلمذ

رکھتے تھے اور راجہ سید مبارک کے پردادا راجہ سید حامد شاہ مانک پوری کے مرید تھے، ساری عمر علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس اور کتابوں کی تصنیف میں بسر کی، شرح ہدایہ، شرح اصول بزودی، حاشیہ شرح کافیہ، حاشیہ تفسیر مدارک وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔

راجہ مبارک کی دوسری شادی کے بعد بھی پہلی بیوی اور ان کے خاندان کا ادب و احترام قائم رہا اور اس کے بعد بھی راجہ خاندان کے افراد شیخ حسام الدین کے خاندان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے اور اس کو اپنے لیے باعث صداقت و سچتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ شیخ حسام الدین کے عرس کے موقع پر راجہ سید مبارک نے ایک رسی اپنے گلے میں ڈالی اور ایک دوسری رسی گائے کے گلے میں ڈالی اور اسی حال میں شیخ قاسم سجادہ نشین خانقاہ شیخ حسام الدین کی خدمت میں چلے، شیخ قاسم ان کی آمد کی خبر سن کر پیشوائی کے لیے باہر آئے، ملاقات ہوتے ہی راجہ صاحب نے کہا:

”گاؤ و مبارک ہر دو برائے قربانی حاضر۔“ گائے اور مبارک دونوں قربانی کے لیے حاضر ہیں۔ (قمر)

شیخ قاسم نے گائے لے کر ذبح کی، اس وقت راجہ صاحب نے کہا:

”گاؤ از مبارک بہتر است کہ قابل فاتحہ گائے مبارک سے اچھی ہے کہ وہ قابل فاتحہ ہے اور گشت نہ کہ مبارک۔“ مبارک کی فاتحہ نہیں ہو سکتی۔ (قمر)

اس قسم کی باتیں راجہ مبارک کے ذکر میں مل سکی ہیں، نہ ان کی تعلیم و تربیت کا پتہ چل سکا، نہ ان کے مریدین و مسترشدین کے حالات معلوم ہو سکے اور نہ ان کی روحانی اور دینی زندگی کے کچھ اہم واقعات مل سکے، البتہ ان کے کمالات و فضائل کا اندازہ ”گنج ارشدی“ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے:

”اکثر اولیائے مکمل مرید و خلیفہ آل حضرت بودند۔“ اکثر اولیائے کاملین آپ کے مرید اور خلیفہ ہیں۔

راجہ صاحب کی وفات ۲ شوال ۹۶۵ھ میں ہوئی اور مانک پور میں اپنے دادا سید

نور کے روضے میں دفن ہوئے۔

”وفات آنحضرت دوم شوال در سنہ ۹۶۵ھ آپ کی وفات دوسری شوال ۹۶۵ھ میں شصت و پنج است۔“

ہوئی۔

تاریخ وفات یہ ہے:

امام سالکان و قطب الاقطاب شہ دیں حضرت راجی مبارک
چوں زیں دنیائے دہل رحلت نمودہ بلطف حق تعالیٰ و تبارک
شده مذکور سالش گفت حامد بحق شد راجی سید مبارک

۹۶۵ھ

آپ کا مزار مانک پور میں اندرون حویلی ایک گنبد کے اندر واقع ہے، جسے بعد میں آپ کے دوسرے صاحب زادے راجہ سید مصطفیٰ نے تعمیر کرایا ہے، اس گنبد کے اندر تین قبریں ہیں، پہلی قبر راجہ سید نور کی ہے، اس کے بعد مشرق کی طرف راجہ سید مبارک کی قبر ہے، یہ دونوں قبریں سنگ مرمر کی ہیں اور ان کا فرش بھی سنگ مرمر ہی کا ہے اور حاشیہ سنگ موسیٰ کا ہے اور تیسری قبر راجہ سید مصطفیٰ ابن راجہ سید مبارک کی ہے، یہ سنگ مرمر کی نہیں ہے، بلکہ گچ کی ہے، اس گنبد کی تاریخ بناء اسی میں نقش ہے، جو درج ذیل ہے:

لہ الحمد خالق الکلونین وحدہ لا شریک لہ ثانی
قادر ذوالجلال والاکرام کہ جہاں راست قدرتش بانی
چوں موفق شدہ عنایت او بتوفیق لطف سبحانی
در زمان جلال دیں اکبر کہ بدادش خدا جہاں بانی
روضہ ساخت مصطفیٰ راجی کش چوں رضواں سرز دبدربانی
فیض بخش مروج ارواح در سر قطب ہائے ربانی

بہر سال بنائے تارتخش ہم بیک بیت گفت او معانی؟

جنت پر بنور ربانی

(گنج ارشدی قلمی جلد دوم ص ۷ تا ۱۱ کتب خانہ رشیدیہ جون پور و البلاغ بمبئی جمادی الثانیہ ۱۳۹۲ھ)

مبارک پور میں راجہ صاحب کی مسجد کے شمال میں ان کے نام سے سراسر جعلی و نقلی قبر ہے، راجہ سید مبارک کی اولاد میں ان کے چھ لڑکوں کی تصریح گزر چکی ہے، مگر کتابوں میں ان کے دو صاحب زادوں کے حالات ملتے ہیں، ایک راجہ سید مصطفیٰ اور دوسرے راجہ سید مجتبیٰ، راجہ سید مصطفیٰ اکبری دور کے باکمال علماء و مشائخ میں سے تھے، امارت و مشیخت میں ممتاز تھے، غوثی نے ”گلزار ابرار“ میں ان کا مستقل تذکرہ کیا ہے اور ۹۸۴ھ میں ان سے ملاقات کی ہے، جب کہ وہ اکبر کے ساتھ برہان پور کی طرف آئے تھے، نیز ان کے لڑکے راجہ سید محمد کو ان کا جانشین بتایا ہے۔ (اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۲۶ھ)

راجہ سید مجتبیٰ کا تذکرہ ”گنج ارشدی“ میں ہے، وہ مانک پور میں پیدا ہوئے اور اپنے والد راجہ سید مبارک سے سلسلہ چشتیہ حاصل کیا، ان کے صاحب زادے راجہ سید احمد حلیم اللہ اپنے والد کے مرید اور خلیفہ اور مشائخ چشتیہ میں بڑے مقام و مرتبہ کے بزرگ ہیں، ان کے خوارق و کرامات کو ان کے بعض تلامذہ نے ”الخوارق الاحمدیہ“ کے نام سے جمع کیا ہے، حضرت شیخ دیوان محمد رشید عثمانی جون پوری متوفی ۱۰۸۳ھ نے آپ سے طریقت و مشیخت کی تعلیم و تربیت پائی ہے، ۵ جمادی الاولیٰ ۱۰۴۰ھ میں مانک پور میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے۔ (گنج ارشدی ج ۲ ص ۶۱ تا ۶۲، نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۶۰)

راجہ سید مبارک کی اولاد و احفاد سے دیار پور ب کو بہت زیادہ علمی و روحانی فیض پہنچا، عموماً یہ مشائخ مانک پور سے ان اطراف میں آتے جاتے رہے، بعد میں ان کے بعض خانوادے ان اطراف میں مستقل آباد ہو گئے، جن کے فیوض گزشتہ صدی تک کسی نہ کسی

انداز میں جاری رہے، چنانچہ راجہ سید مبارک کے ایک پوتے راجہ سید ابراہیم بن راجہ سید یسین بن راجہ مبارک تھے، جن سے ملا محمود جون پوری کے دادا شیخ بڑے (مدفون ولید پور) بیعت تھے، کہتے ہیں کہ جنات ان کے تابع تھے، نیز راجہ صاحب کے خاندان سے راجہ سید غلام نظام الدین عرف راجہ خیر اللہ شاہ محمد آبادی متوفی ۱۱۲۸ھ بانی خیر آباد تھے، جن سے شاہ ابوالغوث گرم دیوان سلسلہ چشتیہ میں مرید تھے اور راجہ خیر اللہ کے بھائی راجہ سید غلام معین الدین عرف راجہ دانی متوفی ۱۱۳۰ھ حضرت حجتہ العارفین سراج السالکین راجہ سید ابراہیم کے مرید و خلیفہ تھے، جو غالباً ابراہیم پور کے بانی ہیں، مگر راجہ مبارک کی کوئی اولاد قصبہ مبارک پور میں نہیں رہی، وہ خود مانک پور میں فوت ہوئے اور ان کے متعلقین ان علاقوں میں آتے جاتے رہے، گزٹیر کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ وہ مبارک پور کے موجودہ شیوخ زمینداروں کے مورث اعلیٰ تھے۔ (اعظم گڑھ گزٹیر ص ۲۶۱ ذکر مبارک پور)

بل کہ ان زمینداروں کے مورث اعلیٰ شیخ محمود قریشی بآسی مبارک پوری تھے، جن کی آخری یادگار انگریزی دور میں شیخ گدا حسین تھے۔

البتہ راجہ سید مبارک کے ہمراہ راقم کا خاندان مانک پور سے یہاں آکر آباد ہو گیا اور قصبہ کی پہلی آبادی اسی خانوادہ کی ہے۔

راقم الحروف کو فارسی زبان میں اٹھارہ صفحات کا ایک قلمی رسالہ ملا ہے، جس سے راجہ سید مبارک کے بارے میں چند باتیں معلوم ہوتی ہیں، اس کے سرنامے پر یہ عبارت درج ہے: ”جواب خط سید مبارک محمد آبادی کہ جناب حاجی محمد علی صاحب نوشتہ بودند، ادام اللہ۔“ اس کے بعد رسالہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ بخد مت راجی بخد مت راجی مبارک علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ

مبارک علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ از طرف از طرف فقیر محمد علی غنی عنہ سلام کے اور جو اسلام کا

فقیر محمد علی عفی عنہ بعد سلام سنت الاسلام طریقہ ہے، آپ کے اس سوال کے جواب میں
 آں کہ سوال از اشاعت امامت و وصایت عرض ہے، جو آپ نے امامت اور وصایت کے
 کہ فرمودہ بودند معلوم نمایند کہ وصایت بارے میں کیا ہے، اس کے متعلق واقف ہوں کہ
 و امامت دوازده امام علی نبینا و علیہم اماموں کی امامت و وصایت اہل سنت و جماعت
 الصلوٰۃ والسلام نزد اہل سنت و جماعت کے نزدیک ثابت و تحقیق ہے، مگر اس معنی میں نہیں
 ثابت و مُحَقَّق است نہ بایں معنی کہ شیعہ جوشیعہ حضرات بیان کرتے ہیں، بلکہ دوسرے
 می گویند بلکہ بمعنی دیگر است، چرا کہ شیعہ مفہوم میں ہے، کیوں کہ شیعہ لفظ امامت بول کر اس
 لفظ امامت می گویند و ازاں مراد نبوت می سے نبوت مراد لیتے ہیں اور بارہ اماموں کے لیے
 دارند و دوازده امام را احکام نبوت ثابت نبوت کے احکام جیسے نزول و وحی، حرام و حلال کرنے
 می کنند از نزول وحی و تحریم و تحلیل و غیرہ کہ کے اختیارات وغیرہ، جو اس فرقہ کی کتابوں میں
 در کتب ایں فرقہ مسطور است الخ۔ بیان ہوا ہے، اس سے ثابت کرتے ہیں۔ (قمر)

اس رسالے سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ سید مبارک کو علم و تحقیق سے دلچسپی تھی اور
 انھوں نے مولانا حاجی محمد علی صاحب سے شیعوں کے عقائد کے بارے میں سوالات کیے
 تھے، اس میں ایک جگہ ان کا نام سید مبارک محمد آبادی اور دوسری جگہ راجہ مبارک علی ہے اور
 دونوں کو ملا کر پورا نام راجی سید مبارک علی محمد آبادی بنتا ہے، لفظ ”علی“ ان کے نام کا جزء نہیں
 ہے، بل کہ اضافہ ہے اور محمد آبادی کی نسبت اس لیے ہے کہ راجہ صاحب پر گنہ محمد آباد میں
 زیادہ دنوں تک مقیم تھے اور مبارک پور کی نئی آبادی جسے انھوں نے آباد کیا تھا، کوئی خاص
 شہرت نہیں رکھتی تھی۔

قاعدہ ہے کہ کسی بڑی بستی یا شہر کے قرب و جوار کے باشندے اسی کی نسبت سے
 مشہور ہوتے ہیں، گز بیٹیر میں راجہ سید مبارک کا نام مبارک پور آباد کرنے کے سلسلے میں یوں

آیا ہے، کہا جاتا ہے اس قصبہ کا نام پہلے قاسم آباد تھا، بعد میں راجہ مبارک (اعظم گڑھ گزیٹر ص ۲۶۱، ذکر مبارک پور) کے نام سے آباد ہوا، جو کڑا مانک پور کے ایک روحانی بزرگ تھے، جامع مسجد راجہ صاحب کے شمال میں ایک چھوٹی سی قناتی مسجد ہے، کہتے ہیں کہ راجہ صاحب اسی مسجد میں نماز پڑھتے اور ذکر و اذکار فرماتے تھے، اسی کے قریب ہمارا آبائی مکان بھی تھا۔

شیخ محمود قریشی بانسی

شیخ محمود قریشی بانسی مبارک پوری شاہ جہانی اور جہانگیری دور میں مبارک پور کے بہت بڑے رئیس و جاگیردار اور زمیندار تھے، ساتھ ہی مشیخت و بزرگی سے حصہ وافر رکھتے تھے، حیرت ہے کہ اتنے اہم شخص کا تذکرہ اعظم گڑھ گزیٹر تک میں نہیں ہے۔

حالاں کہ قصبہ کے بیان میں ان کی زمینداری کا ذکر ”مبارک پور خاص“ کے نام سے موجود ہے۔ (اعظم گڑھ گزیٹر ص ۲۶۱) اور نہ ہی کسی اور کتاب یا تحریر میں ان کا ذکر ہے، صرف مناقب غوثی میں ایک موقع پر ان کا نام آیا ہے، گزشتہ صدی میں ان کی اولاد میں شیخ گدا حسین تھے، ان کے بعض بیانات سے شیخ محمود کے رعب و داب کا پتہ چلتا ہے۔

چنان چہ شیخ محمد علی حسن بن شیخ غلام مرتضیٰ نے ”واقعات و حادثات مبارک پور“ میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب مکھڑا ضلع فیض آباد کے باغی بے شمار آدمی لے کر مبارک پور حملہ آور ہوئے اور ان کے سرغنہ نے شیخ گدا حسین سے بیرق (خراج زمین) طلب کیا تو گدا حسین نے اس سے کہا کہ بیرق کیا چیز ہے، میں خود چاہتا ہوں کہ تم سے کچھ حقوق زمینداری وصول کروں، کیوں کہ بزرگوار مالک پانچ قلعے کے تھے اور تم لوگوں سے دستورات اور رسومات زمینداری لیا کرتے تھے، تم لوگوں نے ہم کو کمزور سمجھا ہے تو بہت اچھا مقابلہ کرو، جو بردست ہو، وہ بیرق لے۔ (واقعات و حادثات مبارک پور ص ۶۴)

اس بیان سے ان کے مورث اعلیٰ شیخ محمود بانسی کے رئیسانہ وزمیندارانہ اثر و رسوخ کا پتہ چلتا ہے، وہ بانسی مواضعات کے زمیندار تھے، اسی لیے بانسی کی نسبت سے مشہور تھے اور ان کی مشیخت و بزرگی کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ وہ شاہ جہانی دور کے مشہور بزرگ اور عالم حضرت شاہ حاجی ابوالخیر بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ کے خسر تھے، حاجی ابوالخیر ۱۰۰۸ھ میں بھیرا میں پیدا ہوئے، سلطان شاہ جہاں اور نواب امیر الامراء شائستہ ان کے عقیدت مندوں میں تھے، دہلی سے حرمین شریفین کا سفر کیا اور ”شیر و شکر“ نامی ایک کتاب لکھی، جس میں حج و زیارت کے احکام و مناسک اور اپنے خاندان کے حالات درج کیے، ۱۲ شوال ۱۰۵۹ھ کو بھیرا میں انتقال کیا، ان کی تین بیویاں تھیں، جن میں ایک ملا محمود جون پوری کی بہن اور ایک شیخ محمود کی صاحب زادی اور ایک شیخ عبداللہ بن مخدوم اسماعیل چریا کوٹی کی دختر تھیں، جن سے شاہ اسماعیل بن حاجی ابوالخیر پیدا ہوئے، حاجی ابوالخیر، شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے پردادا ہیں، مناقب غوثی میں ہے:

”سہ زن در سلک ازدواجش درآمدہ بودند۔ اول تین عورتیں ان کے نکاح میں آئیں، دختر شیخ عبداللہ کہ از فرزند آن قدوة العارفین شیخ ایک شیخ عبداللہ بن شیخ اسماعیل کی دختر اسماعیل قدس سرہ بود..... مخدوم شاہ اسماعیل قدس جس سے مخدوم شیخ اسماعیل پیدا ہوئے، سرہ از دختر شیخ عبداللہ بود آمدہ دیگر دختر شیخ محمد دوسرے شیخ محمد کی دختر جو ملا محمود جون اخت ملا محمود جو بیوری اما از اں صدف گوہرے پوری کی بہن تھی، اس سے اولاد نہیں ہوئی بساحل سلامت نرسید دیگر دختر شیخ محمود قریشی اور تیسری شیخ محمود قریشی المعروف بانسی المعروف بانسی مبارک پوری از وہم فرزندے مبارک پوری کی دختر، اس بیوی سے بھی باقی نماند۔“ (مناقب غوثی باب ہشتم قلمی) کوئی اولاد باقی نہیں رہی۔

شیخ محمود کے بانسی مواضعات مغرب میں چک سکٹھی تک، مشرق میں املو کے

آگے نور پور اور پیارے پور تک، شمال میں رسول پور، بیورا اور موضع ملک شندی تک اور جنوب میں لہرا گجھڑا تک تھے، وہ پانچ گڑھیوں یا کوٹ کے مالک تھے، جن میں ایک مبارک پور میں جامع مسجد راجہ صاحب سے متصل جنوب میں تھی، جس کے آثار اب بھی معمولی ٹیلہ کی شکل میں پائے جاتے ہیں، اس کے گرد خندق تھی، چنانچہ اس کے جنوب میں جو گڑھی ہے، اسے آج بھی کھنک کہتے ہیں، جو خندق کی بگڑی ہوئی شکل ہے، یہ کوٹ بہت بڑی تھی اور اسی میں وہ رہتے تھے۔

شیخ صاحب بڑے رعب و داب کے رئیس اور جاگیردار تھے، اطراف و جوانب میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اسی زمانے میں مینہ نگر کے نو مسلم راجاؤں کا زور ہوا، راجہ اعظم خاں نے ۱۰۶۷ھ (۱۶۶۵ء) میں اعظم گڑھ اور اس کے بھائی راجہ عظمت خاں نے عظمت گڑھ آباد کیا، ان دونوں نئی بستیوں کے درمیان مبارک پور کی قدیم بستی تھی، جہاں شیخ محمود بانسی کے اقتدار کا طوطی بول رہا تھا اور ان کی موجودگی میں راجہ اعظم خاں اور راجہ عظمت خاں کا اقتدار نامکمل تھا، چنانچہ راجہ اعظم خاں اور شیخ محمود بانسی میں حریفانہ چشمک پیدا ہوگئی، جس کا نتیجہ شیخ صاحب کے بے دردانہ قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔

نیز اسی زمانے میں راج بھر قوم کا ایک راجہ بہیلیا نامی مبارک پور کے مغرب میں دریائے ٹونس کے اس پار دیوکھری میں تھا، جو اعظم خاں کی عمل داری اعظم گڑھ سے قریب تھا، مگر وہ شیخ محمود کے مقابلے میں زیادہ خطرناک نہیں تھا، اس لیے راجہ اعظم خاں نے اسے ملا کر شیخ محمود کو قتل کرا دیا، راجہ بہیلیا نے اپنے شان دار محل کے دکھانے اور شیخ محمود کی خوشنودی حاصل کرنے کے بہانے سے ان کو اپنے یہاں دعوت دی، اعظم خاں اس سازش میں شریک تھا، شیخ محمود حالات سے بے خبر تھے، راجہ بہیلیا کی دعوت پر اس کے یہاں چلے گئے اور راجہ اعظم خاں نے ان کو گولی مار دی۔

روایت یہ بھی ہے کہ خود راجہ بہیلیا اور اس کے آدمیوں نے محل کے اندر شیخ صاحب کو بلا کر باہر سے دروازہ بند کر دیا اور پھر نہایت بے دردی سے قتل کیا، اس کے بعد وہ طوفان برپا ہوا کہ شیخ محمود کی لاش بھی مبارک پور نہ لائی جاسکی، بل کہ وہیں دریائے ٹونس کے کنارے پر ایک نالے کے پاس ان کو دفن کر دیا گیا، جہاں آج بھی ان کی قبر موجود ہے اور وہاں عوام اس نالے کو اپنی زبان میں سکھمد بابا کا نالہ کہتے ہیں، سکھمد شیخ محمود کی بگڑی ہوئی شکل ہے، اب یہاں قبر کا نشان نہیں ہے، البتہ تھوڑی زمین خالی ہے اور بعض درخت اور جھاڑ ہیں، دیہاتی لوگ اب بھی اس پر چراغ جلا دیا کرتے ہیں اور جب کوئی جانور بیمار ہوتا ہے تو اس کے قریب لا کر پھراتے ہیں، ان کے خیال میں سکھمد بابا کے یہاں جانور آ کر صحت یاب ہو جاتے ہیں۔

شیخ محمود کی شہادت کے بعد ان کی اولاد پر بڑی تباہی آئی، راجہ اعظم خان نے ان کو تلاش کر کے قتل کرنا چاہا، مگر وہ مبارک پور سے املو کی کوٹ میں پناہ گزیں ہو گئے اور ڈرکی وجہ سے کسی نے ان کی مخبری نہیں کی، اس لیے وہ محفوظ رہے، اسی زمانہ میں اس واقعہ کی تاریخ کے طور پر یہ مثل مشہور ہوئی ”کون کہے کون بیری ہو، محمود کے بیٹے کوٹھے پر“۔ آج بھی یہ مثل املو میں عام طور سے رائج ہے، شیخ محمود کی دو بیویاں تھیں اور دونوں سے اولاد ہوئی، انھوں نے اپنی زندگی ہی میں دورانہدیشی سے کام لے کر اپنا علاقہ دونوں بیویوں کی اولاد میں یوں تقسیم کر دیا، کہ ایک بیوی کی اولاد کو چک سکٹھی، مبارک پور خاص اور رسول پور بیورا (کھنورا) دیا اور دوسری بیوی کی اولاد کو موضع ملک شدنی، املو اور پیارے پور دیا اور نور پور کی زمینداری کو دو حصوں میں تقسیم کیا، ایک نور پور بوتات اور دوسرا نور پور حاجی سرائے، نور پور بوتات (بیوتات) کا حصہ مبارک پور میں رہنے والی اولاد کو دیا اور نور پور حاجی سرائے املو میں رہنے والی اولاد کو دیا، یہ دونوں حصے اب تک سرکاری کاغذات میں ان ہی ناموں

سے درج کیے جاتے ہیں، نور پور بوتات مبارک پور کا جنوبی مشرقی حصہ ہے، جس میں ٹھاکر دوارہ اور انٹر کالج واقع ہیں اور نور پور حاجی سرائے میں چک شیخ احمد (چکیا) وغیرہ واقع ہے، املو میں محمود پورہ شیخ محمود کے نام پر ہے اور ان کی اولاد وہاں آباد ہے۔

مبارک پور میں ان کی اولاد میں آخری دور میں شیخ گدا حسین تھے، جن کے لڑکے نظام آباد جا کر زمینداری کی وجہ سے شیعہ ہو گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی، ان واقعات کو ہم نے مکرہٹا، دیوکھری، سکھمد کا نالہ اور املو جا کر معلوم کیا، خاص طور سے املو کے حاجی شیخ عبدالصمد بن شیخ عبدالمجید سے بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔

پیرزادہ مخدوم محمد ماہ املوی

حضرت مخدوم پیرزادہ محمد ماہ بن شیخ سعد اللہ بن شیخ غلام محی الدین عرف جڑاؤن بن شیخ بھورے بن شیخ محمد اسحاق بن شیخ محمد مجاہد بن شیخ عبدالواحد بن شیخ بھکاری بن شیخ محمد حافظ بن شیخ محمد داؤد بن شیخ جمال الدین بن شیخ مخدوم شاہ ظہیر الدین صدیقی املوی رحمۃ اللہ علیہ کے مورث اعلیٰ مخدوم ظہیر الدین محمد آبادی متوفی ۲۷۲۵ھ رذی الحجہ ۷۴۵ھ تھے، جن کی ولادت تاج پور سارن میں ہوئی تھی، کچھ دنوں حکومت وقت سے منسلک رہ کر حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی کے پوتے شیخ ابوالفتح رکن الدین ملتانی کی خدمت میں پہنچے اور ان سے بیعت و خلافت کا شرف حاصل کر کے دیار پورب کا رخ کیا اور محمد آباد گوہنہ میں اقامت اختیار کی، اس وقت دہلی میں تغلق خاندان حکمران تھا، ان کا مزار محمد آباد اور خیر آباد کی درمیانی شاہراہ کے شمال میں ایک اونچے ٹیلے پر ہے، جہاں ایک مسجد بھی ہے، روضہ اب تک موجود ہے، جسے آستانہ روضہ کہتے ہیں۔

پیرزادہ محمد ماہ نے املو میں سکونت اختیار کی اور حکومت کی طرف سے رسول پور،

موضع ملک شندی اور موضع رسول پور بیورا (کھنور اکھور راہ) کی جاگیر عطا کی گئی، ۱۸۳۶ء کے کاغذات میں اس جاگیر کا تذکرہ موجود ہے، الملو اور رسول پور کے درمیان میں پیرزادے کا باغ بھی مشہور ہے، پیرزادہ محمد ماہ چھ بھائی تھے، محمد ماہ، وارث علی، خضر احمد، غلام محمد، حفیظ اللہ ایک اور۔ وارث علی کے علاوہ سب صاحبِ اولاد ہوئے، پیرزادہ محمد ماہ کے لڑکے شیخ محمد علی تھے، شیخ محمد ماہ کا انتقال الملو میں ہوا۔

ہمارا خیال ہے کہ ان کا مزار رسول پور بیورا میں ہے، جو ان کی جاگیر میں تھا اور پورہ دلہن مبارک پور کے شمال مشرق میں چند فرلانگ پر پیرزادے کے نام سے جو مزار مشہور ہے، وہ انہیں کا ہے، ماضی قریب میں پیرزادہ خاندان میں شاہ مقصود عالم اور شاہ رشید عالم دو نام ور شخص گزرے ہیں، شاہ مقصود عالم کے لڑکے مولانا حکیم شاہ فیاض عالم صاحب مولانا عبدالعلیم صاحب رسول پوری کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، ان کا انتقال ۱۳۴۴ھ یا ۱۳۴۵ھ میں ہوا ہے، اسی خانوادہ سے شاہ مخدوم عالم تھے، جن کے دو لڑکے علی بخش اور ظہور عالم تھے، ان کی اولاد سارین (اہرولہ) میں اب تک موجود ہے۔ (خانوادہ ظہیریہ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: ”پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں“ از مولوی خالد کمال مبارک پوری، مندرجہ رسالہ ”البلاغ“ بمبئی ماہ شوال ۱۳۷۷ھ)

مخدوم شیخ رشید

بن مخدوم شیخ سعید فاروقی

حضرت مخدوم شیخ رشید بن شیخ مخدوم شیخ سعید بن شیخ مشید بن مخدوم شیخ بڑے بن مخدوم شیخ محمود بن مخدوم شیخ راضی معین بن مخدوم شیخ چاند بن مخدوم شیخ معروف بن مخدوم شیخ

مشید بن مخدوم شیخ محمد بن مخدوم شیخ خضر فاروقی یہ نسب نامہ مولانا ظفر حسن صاحب عینی فاروقی نے یوں ہی بیان کیا ہے۔

شیخ بڑے کے دو صاحب زادے تھے، ایک شیخ محمد جن کے صاحب زادے ملا محمود جون پوری ہیں اور دوسرے شیخ مشید جن کے پوتے شیخ رشید تھے، یہی مبارک پور میں آکر آباد ہوئے، ان کے صاحب زادے شیخ لطف اللہ تھے، جن سے فاروقیان مبارک پور کا سلسلہ چلا۔ افسوس کہ شیخ رشید بن شیخ سعید کے بارے میں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ جس علاقہ میں وہ آکر مقیم ہوئے تھے، اسے رشید آباد کہتے تھے، جیسا کہ اس خاندان کے بعض معتبر وثقہ علماء سے معلوم ہوا ہے، غالباً وہ شاہ جہانی دور میں مبارک پور میں تشریف لائے تھے۔

بندگی سید کمال الدین گجہڑا

حضرت بندگی شاہ کمال الدین رحمۃ اللہ علیہ خاندانی روایت کے مطابق شاہ جہانی دور سلطنت میں گجہڑا تشریف لائے، جو مبارک پور کے جنوب میں مشہور مقام ہے، اس زمانے میں یہاں راج بھر قوم کی بہت بڑی آبادی تھی، جس کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ آپ نے ان لوگوں میں تبلیغ اسلام کی اور ان کو مسلمان بنایا، ان میں ایک نو مسلم کا نام فخر الدین پڑا، بعد میں فخر الدین پور نامی بستی گجہڑا سے متصل ان ہی کے نام پر آباد ہوئی۔ جس میں ان کی اولاد نے بود و باش اختیار کی، بندگی کمال الدین نے گجہڑا میں انتقال فرمایا، ان کا مزار وہیں ایک روضہ کے احاطہ میں واقع ہے، نیز وہاں ان کے مریدین و متوسلین اور اہل و عیال کی کئی قبریں ہیں، یہ روضہ شاہی مسجد کے سامنے جنوب مشرق میں چھ ہاتھ کے فاصلے میں ہے، اس کی اینٹیں لکھوری ہیں، جو عام طور سے مغل دور میں استعمال ہوتی تھیں، روضہ کا یہ حصہ ویران اور جنگل نما ہے۔

قاضی محمد صالحؒ گجھڑا

آپ بندگان سید کمال الدین کے صاحب زادے ہیں، بارہویں صدی کے اوائل میں انتقال فرمایا، اپنے علاقہ کے یا کسی اور مقام کے قاضی تھے، آپ نے گجھڑا میں ایک عالی شان مسجد تعمیر کی، جو اب تک موجود ہے اور شاہی مسجد اور عالمگیری مسجد کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اس کا سن تعمیر ۱۰۹۹ھ ہے، اس کا طول تقریباً ۳۲/ ہاتھ ہے، تین در ہیں اور گنبد بھی تین ہیں، درمیانی در کے دونوں کناروں پر پانچ پانچ ہاتھ اونچے مینارے ہیں اور درمیانی دروازے کے اوپر سنگ موسیٰ کا کتبہ لگا ہوا ہے، جس پر سن تعمیر ۱۰۹۹ھ درج ہے اور مندرجہ ذیل اشعار نہایت خوش نما جلی خط میں کندہ ہیں:

در زمان شاہ عالمگیر دیں پرور کزو رونق دین محمد ہست افزوں از قیاس
شد بنا از فیض خورشید کرم للمتقین مسجدے کز نور آں انجم نماید اقتباس
حاملان عرش گفتند از کمال کیست ایں کفتم از ابن الکمال است ایں کمال حق شناس
رفت شناس بہ بیت اللہ می نازد بہ فضل ذرۃ او جش باوج آسماں کردہ مساس
سال تارخش پر سیدم زیر عقل گفت از محمد صالح است ایں مسجد احسن اساس
اس مسجد کی تعمیر و تکمیل کے بعد قاضی محمد صالحؒ کا انتقال ہوا اور اسی مسجد کے صحن میں ان کا مزار ہے، اس کا کوئی نشان باقی نہیں، مسجد کے بارے میں یہ تمام معلومات مولانا شمس الحق ساکن گجھڑا نے تحقیق کر کے ہم کو دی ہیں۔

انگارا شاہؒ

انگارا شاہ صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے، نام معلوم نہیں، قصبہ کے پچھم روضہ

کے باغ میں رہتے تھے، ان کو انکار شاہ کہنے کی وجہ جو عام طور پر مشہور یہ ہے کہ ایک دن ایک شخص نے ان سے آگ مانگی، انھوں نے سامنے ایک گڑھے کی طرف اشارہ کیا کہ اسی میں سے آگ نکال لو، اس نے کہا کہ اس میں تو پانی ہے، پانی میں سے آگ کیسے نکل سکتی ہے، یہ سن کر وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور دست پناہ سے دھکتا ہوا انکار نکال کر اس آدمی کو دے دیا، یہ واقعہ اس قدر مشہور ہوا کہ لوگ آپ کو انکار شاہ کہنے لگے اور اصل نام بھول گئے۔

ایک دن عالم جذب میں بھیڑ کے ایک درخت کو ڈنڈا مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ گر جا، گر جا، بعد میں معلوم ہوا کہ اسی دن اور اسی وقت بنارس کی لاٹ کا ایک حصہ خود بخود ٹوٹ کر گر گیا، جو بنارس میں ریلوے لائن کے شمال میں واقع ہے، اس میں ایک طرف ہندوؤں کی لاٹ اور مٹھ ہے اور دوسری طرف مسجد ہے اور دونوں مذہب کے لوگ اس جگہ مخصوص اوقات میں جمع ہو کر مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں اور بعض اوقات کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے، ان کا زمانہ اور سن وفات معلوم نہیں، اسی باغ میں ان کا مزار ہے، چند سال ہوئے کسی نے اسے پختہ بنوا دیا ہے۔

غریب شاہ مبارک پوریؒ

غریب شاہ کے متعلق مشہور ہے کہ اپنے زمانے کے صاحب کشف و کرامت اور مستجاب الدعوات بزرگ تھے، محلہ پورہ خضر میں سڑک کے پچھم طرف صحن میں ان کی قبر ہے، ”واقعات و حادثات مبارک پور“ میں اس جگہ کو غریب شاہ کا باڑا لکھا ہے، اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

دیوان مصطفیٰ شاہ بانی مصطفیٰ آباد

حضرت دیوان مصطفیٰ شاہ بانی موضع مصطفیٰ آباد یہاں کے ایک خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں اور ان کے نام پر یہ بستی مشہور ہے، آبادی کے اندر جنوبی حصے میں ”دیوان صاحب کا حجرہ“ کے نام سے ان کی خانقاہ کے نشانات اب تک موجود ہیں۔ آثار سے پتہ چلتا ہے کہ یہ خانقاہ کافی بڑی اور کشادہ تھی، حجرہ کی جگہ قدیم زمانے کا نیم کا درخت ہے اور آس پاس قبروں کے نشان ہیں، اس جگہ کو مقامی لوگ متبرک سمجھتے ہیں، دیوان صاحب کا مزار بستی کے باہر بجانب شمال واقع ہے، جہاں کھجور کے جھنڈ اور دوسرے خود رو درخت اور جھاڑیاں ہیں، قبر کا نشان اب تک موجود ہے، اس سے متصل شمال مغرب میں ایک شکستہ مسجد بھی ہے، فی الحال یہ پورا علاقہ جھاڑیوں پر مشتمل ہے۔ افسوس کہ اس سے زیادہ ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

غریب شاہ الملوئی

الملوئی شاہ غریب کا مزار وسط آبادی میں واقع ہے اور اس جگہ کو چوک غریب شاہ اور تکیہ غریب شاہ کہتے ہیں، چند سال ہوئے یہاں کی ایک قبر سے ہڈیوں کا پورا ڈھانچہ برآمد ہوا تھا۔

شاہ فضل رح کڑا

یہ شاہ فضل جن کے نام سے مشہور ہیں، محلہ کڑا کے چھٹم طرف کنویں کے اتر جانب ان کا مزار ہے، ان کی کئی کرا متیں عوام میں مشہور ہیں، معلوم نہیں کس وجہ سے ان کے نام کے

ساتھ لفظ جن کا الحاق ہوا، غالباً جنات تابع رہے ہوں گے۔
پرانا قبہ ہمارے بچپن تک موجود تھا، بعد میں کسی نے قبر کے گرد گول دیوار بنوائی ہے۔

ننگے شکر مال کڑا

شاہ فضل جن کے مزار کے سامنے سڑک کے دکن جانب نیم کے درخت کے نیچے
ننگے شکر مال کا مزار ہے، معلوم نہیں ان کا اصلی نام کیا ہے اور کس لیے ان کو ان الفاظ سے یاد کیا
جاتا ہے، ان کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ہے۔

شاہ لدھا سگری

شاہ لدھا پورہ دولہن کے رہنے والے تھے، محلہ شاہ محمد پور میں ان کی سسرال تھی،
قصبہ کے مشہور بزرگوں میں ہیں، بچپن ہی سے نہایت نیک و صالح تھے اور اسی زمانے میں
بعض خوارق کا ظہور ہوا تھا، ان کے بارے میں عوام و خواص میں کئی روایتیں مشہور ہیں، ان
کی قبر جین پور سگری میں ہے، جہاں ہر سال عرس اور میلہ لگتا ہے، غالباً وہ نوابی اودھ کے
دور میں تھے۔

۱۱ ربیع الاول ۱۲۰۱ھ دوشنبہ کو جین پور جا کر ان کے روضہ کو دیکھا اور فاتحہ
پڑھی، قبر ایک حظیرہ میں ہے، جس کے اوپر گنبد ہے، حظیرہ کے دروازہ کے اوپر کتبہ ہے،
جس میں دو سطر ہیں، چونا لگنے کی وجہ سے کتبہ پڑھانہ جاسکا، البتہ ۱۱۲۲ھ صاف نظر آیا،
جو شاہ لدھا کاسن وفات یا روضہ کی تعمیر کا سن ہے۔ (قاضی اطہر مبارک پوری)

شیخ کمال الدین نوادہ

شیخ کمال الدین ایک بزرگ اور خدا رسیدہ انسان تھے، کسی دوسری جگہ سے آکر

نوادہ میں مقیم ہو گئے تھے، وسط آبادی میں مدرسہ کے پاس کائنواں ان کی یادگار ہے اور عوام اسے سکھمال بابا (شیخ کمال بابا) کائنواں کہتے ہیں۔

ان کا انتقال نوادہ میں ہوا اور اسی کنویں کے پاس ان کی میت کو غسل دیا گیا، مغسل کا نشان ایک مصنوعی قبر کی شکل میں آج بھی موجود ہے اور قبر محلہ کٹرا میں بازار کے وسط میں نیم کے درخت کے نیچے ایک بلند چبوترے کی شکل میں ہے۔

راجہ بھانٹ

راجہ بھانٹ باہر سے آئے ہوئے کوئی بزرگ تھے، جن کے نام سے قصبہ کے کچھم اور دھن کی طرف ایک خوشنما تالاب راجہ بھانٹ کا گاڑا مشہور ہے اور گاڑے کی مسجد کے متصل اکھاڑے کے پاس ان کی پختہ قبر ہے، ہمارے بچپن میں یہ قبر اچھی حالت میں تھی، بعد میں مرمت ہوئی ہے، مشہور ہے کہ راجہ بھانٹ کوڈاکوؤں نے مار کر گاڑے میں پھینک دیا تھا اور ان کا کتا بھونکتا ہوا کبھی قصبہ میں آتا، کبھی گاڑے پر جاتا، جب لوگوں نے جا کر دیکھا تو ان کی لاش گڈھے میں پڑی ہوئی تھی، اس زمانے میں یہ علاقہ جنگلات پر مشتمل تھا، اس تالاب سے متصل محلہ پورہ رانی ہے، ہو سکتا ہے اس کو راجہ بھانٹ سے کوئی تعلق ہو۔

حضرت مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بھیروی لہراویؒ

حضرت مولانا شاہ ابوالغوث گرم دیوان بن شیخ محمد بن شیخ مخدوم اسماعیل بن شیخ حاجی ابوالخیر بن شیخ ابوسعید بن شیخ معروف ثانی بن شیخ عثمان بن شیخ محمد ماہ بن شیخ چاند بن شیخ معروف بن شیخ مشید بن شیخ محمد بن شیخ خضر فاروقی بھیروی لہراویؒ اس دیار کے ان علمائے کبار و مشائخ عظام میں سے ہیں، جن کے علمی و دینی اور روحانی فیوض و برکات کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔

آپ کے مورث اعلیٰ شیخ خضر فاروقی، حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین ملتانی کی خدمت و صحبت میں بیعت و خلافت سے سرفراز ہو کر دہلی آئے، یہیں ان کے صاحب زادے شیخ محمد پیدا ہوئے، اسی زمانے میں تیموری فتنہ نے دہلی کو شہر پر آشوب بنا دیا، اس لیے شیخ مخدوم خضر اور صاحب زادے شیخ محمد جون پور چلے آئے، اس وقت جون پور میں سلطان الشرق ابراہیم شاہ شرقی کی حکومت تھی، سلطان نے بڑے اعزاز و احترام سے آپ کی پذیرائی کی، شیخ خضر کے انتقال کے بعد شیخ محمد ان کے جانشین ہوئے، ان کے انتقال پر ان کے لڑکے شیخ مشید ان کے جانشین ہوئے تو سلطان ابراہیم نے ان کو ولید پور وغیرہ کی جاگیر عطا کی، مناقب غوثی میں ہے:

”سلطان ابراہیم از تعزیت نہایت کوفتہ شد سلطان ابراہیم شاہ شرقی شیخ محمد کے انتقال آخر الامر حضرت مشید را صدر و جانشین آں سے بہت رنجیدہ ہوا اور شیخ مشید کو ان کا مسند مختشم گردانیدہ بکمال نیاز مندی در پرگنہ محمد جانشین مقرر کر کے از راہ نیاز مندی پر گنہ آباد قریہ ولید پور با دیگر مواضع در وجہ معاش محمد آباد میں ولید پور اور دوسرے مواضع گزر مقرر داشت۔“ (مناقب غوثی باب ہشتم قلمی) بسر کے لیے مقرر کیے۔

یہ جاگیر ولید پور بھیرا اور لہرا تک تھی، جس کی آمدنی سے اس خاندان کا گزر ہوتا تھا، یہ خاندان جون پور سے یہاں آ کر مستقل طور سے آباد ہو گیا، اس میں بڑے بڑے علماء و مشائخ پیدا ہوئے، مولانا حاجی ابوالخیر متوفی ۱۰۵۹ھ شاہ جہانی دور کے علمائے کبار اور مشائخ عظام میں سے ہیں، ان کے لڑکے مخدوم شاہ اسماعیل متوفی ۱۱۰۶ھ طبقہ مشائخ میں بڑے مقام و مرتبہ کے تھے، یہ شاہ ابوالغوث کے دادا تھے۔

شاہ ابوالغوث کی ولادت شب دوشنبہ ربیع الآخر ۱۱۰۰ھ میں بھیرا میں ہوئی، ان کی والدہ ماجدہ شیخ میر خان صدیقی نتھو پوری (سپاہ) کی دختر تھیں، اس وقت ان کے دادا شیخ

اسماعیل زندہ تھے۔

زمانہ کے مطابق ان کے والد شیخ محمد نے تعلیم و تربیت کی طرف پوری توجہ کی، ان کے انتقال کے بعد شاہ ابوالغوث نے بنارس، غازی پور اور الہ آباد کا تعلیمی سفر کیا، الہ آباد میں علوم مروجہ میر سید غلام احمد بن شاہ موسیٰ عاشقان اودھی سے حاصل کیے اور سلسلہ چشتیہ میں ارشاد و تلقین شاہ فتح محمد حسینی میدانوی متوفی ۱۱۴۳ھ سے پائی اور شاہ فتح محمد ہی نے آپ کو گرم دیوان کا لقب دیا، مناقب غوثی میں تصریح ہے:

”بامرالہی از جناب ولایت مآب حضرت شاہ فتح آپ نے اپنے پیرومرشد شاہ فتح محمد کی طرف محمد مرشد خود خطاب گرم دیوان خطاب یافت۔“ سے گرم دیوان کا خطاب حاصل کیا۔

مناقب غوثی کے مصنف شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے مرید و خلیفہ ہیں، ان کی اس تصریح سے ”تذکرہ علمائے ہند“ کی وہ روایت غلط ہو جاتی ہے کہ آپ کو گرم دیوان کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات خرق عادت سے آپ کا جسم اتنا گرم ہو جاتا تھا کہ اس پر گیہوں کی روٹی پکائی جاسکتی تھی۔ (تذکرہ علمائے ہند ص ۵)

تعلیم و تلقین حاصل کرنے کے بعد شاہ ابوالغوث نے سلطان پور عرف بھیرا میں مسند ارشاد و تلقین کو زینت دی اور کچھ دنوں تک ترک و تجرید کی زندگی بسر کی، مگر خانگی امور و جاگیرداری کے کاموں کی وجہ سے یہاں سکون قلب نہ مل سکا، تو اپنے چھوٹے بھائی شیخ احمد شاہ کو زمینداری کا انتظام سپرد کر کے وحدت آباد عرف لہرا میں چلے آئے، جو آپ کے حلقہ زمینداری میں مبارک پور سے دو میل جنوب میں ایک پُر فضا مقام تھا۔

صاحب مناقب غوثی نے لکھا ہے:

”و خود مجروانہ آزادانہ از آنجا برآمد در لہرہ بہ شاہ ابوالغوث تن تنہا بھیرا سے لہرا چلے آئے اور پہلوے جنگل استقامت گرفت تنہا با محبوب جنگل کے ایک گوشے میں سکونت اختیار

حقیقی خلوت داشت۔ چنان چہ کسے از احوال
او مطلع نہ بود و این وحدت آباد عرف لہرہ جائے
است بغایت فرح ناک در عین شارع مابین
محمد آباد گوہنہ واعظم گڑھ بہ پہلوئے جنگل واقع
است، طرف جنوب موضع مذکور کہ جنگل روح
افزادہ راحت رسا بود، الآن بدستور سابق مرقع
آہوان چشم اہل شوق و ذوق است۔ حجرہ خاص
برائے عبادت بنا کر دے بے تکلف تعرضات
خویش و بیگانہ در آں زاویہ ناپرساں بفرارغ
باطن از بادۂ عرفاں تکیہ بر توکل زد۔“
کر کے عبادت الہی میں یوں مشغول ہوئے کہ
کسی کو ان کے حالات کی خبر نہ تھی۔ وحدت آباد
عرف لہرہ بڑا پر فضا مقام ہے۔ محمد آباد گوہنہ اور
اعظم گڑھ کے درمیان سڑک پر ایک جنگل کے
پہلو میں واقع ہے۔ اس کے جنوب میں نہایت
فرحت بخش جنگل ہے۔ اب بھی یہ جگہ ارباب
ذوق کے لیے بڑی پُرکشش ہے، اسی جگہ
عبادت کے لیے ایک خاص حجرہ بنوا کر خویش
و بیگانہ کے جھگڑوں سے الگ تھلگ ہو گئے اور
بادۂ عرفاں کی سرمستی میں توکل کو تکیہ بنایا۔

شاہ ابوالغوث کی شادی تھو پور سپاہ میں ان کے ماموں کی لڑکی فاطمہ بنت شیخ منور
خاں صدیقی سے ہوئی تھی، جن سے ایک صاحب زادی پیدا ہوئیں، ان کی شادی اپنے بھانجے
شیخ عبدالکیم خاں صدیقی سے کر دی، ۱۱۲۵ھ میں بیوی کا انتقال ہو گیا اور اس کے دوسرے
سال ۱۱۲۶ھ میں والدہ ماجدہ فوت ہو گئیں، شاہ ابوالغوث ان حوادث سے برگشتہ خاطر ہو کر
اپنے مرشد میر فتح محمد کی خدمت میں الہ آباد چلے گئے، انھوں نے اپنے مرید کو صبر و شکر کی تلقین
کر کے لہرہ واپس کر دیا، کچھ دنوں کے بعد شاہ ابوالغوث کی دوسری شادی شیخ غلام رسول مصطفیٰ
آبادی کی دختر سے ہوئی، ۱۱۶۳ھ میں اودھ کے حاکم چکلہ اعظم گڑھ نے آستانہ وحدت آباد لہرہ
میں شاہ ابوالغوث کے ایک آدمی کے ساتھ نازیبا سلوک کیا، جس سے آپ دل برداشتہ ہو کر
ترک وطن پر تیار ہو گئے اور اپنے مرید شمس الدین حیدری مصنف مناقب غوثی سے اس کا
تذکرہ کیا اور کہا کہ تم ہمارے خاندان کو کسی دوسری جگہ منتقل کر دینا، شدہ شدہ یہ خبر نواب فضل علی

خاں والی غازی پور تک پہنچی تو انھوں نے غازی پور تشریف لانے کی دعوت دی، آپ نے نواب کو لکھا کہ درحقیقت میں نے بیت اللہ کے سفر کا عزم کیا ہے اور اپنے متعلقین کو اس دیار ناقدرداناں میں چھوڑنا نہیں چاہتا ہوں، جب یہ سفر ہوگا تو ان شاء اللہ تعالیٰ آؤں گا۔

لہر اکے دوران قیام میں شاہ ابوالغوث نے راجہ سید خیر اللہ متوفی ۱۱۲۸ھ سے سلسلہ چشتیہ میں خلافت حاصل کی، راجہ سید خیر اللہ راجہ سید حامد مانک پوری کی اولاد میں بڑے مقام و مرتبہ کے مالک تھے، ان کا اصل نام راجہ سید غلام نظام الدین تھا اور خیر اللہ عرفیت تھی، محمد آباد گوہنہ میں رہتے تھے اور ان کے بھائی راجہ سید غلام معین الدین عرف راجہ دانی متوفی ۱۱۳۰ھ جون پور میں رہتے تھے، بسا اوقات شاہ ابوالغوث راجہ خیر اللہ کی خدمت میں لہر اسے محمد آباد جاتے اور واپس آجاتے، انھوں نے شاہ ابوالغوث کی روحانی تربیت و تعلیم میں عقیدت و محبت کی سرگرمی دکھائی، راجہ خیر اللہ اور راجہ دانی دونوں بھائی لہر آتے جاتے تھے۔

راجہ سید خیر اللہ ۷/رجب ۱۱۲۸ھ کو فوت ہوئے، اور محمد آباد گوہنہ میں دفن کیے گئے، شاہ ابوالغوث گرم دیوان ۲۵/جمادی الثانیہ ۱۱۷۸ھ بروز جمعہ بعد نماز عشاء لہر میں فوت ہوئے اور مکان کے سامنے باغ میں کھیرنی کے درخت کے نیچے دفن کیے گئے، شیخ شمس الدین حیدری نے آپ کی وفات کی دو تاریخیں لکھی ہیں:

خمسة عشرین از جماد اخیر نیم شب از آدینہ شد آگاہ
گفت ہاتف بگوش اہل سخن گشتہ محبوب حق فنا فی اللہ

۱۱۷۸ھ

دیگر

شاہ ابوالغوث آں گرامی شاہ بود در وقت خویش ظل اللہ
شرح احوال او نمی گنجند اندریں صفحہ کوتاہ

مصرع آخریں ز تار بخش بر کمالاتِ حال اوست گواہ

”نزہۃ الخواطر“ میں آپ کی تاریخ وفات ۲۶ جمادی الاخریٰ ۱۱۷۷ھ درج ہے اور ”تذکرہ علمائے ہند“ میں بھی ۱۱۷۸ء ہے، ”نزہۃ الخواطر“ میں آپ کا مولد و مدفن دونوں بھی لکھا ہے، حالاں کہ مدفن لہرا ہے۔

شاہ ابوالغوث کے خلفاء میں تین حضرات بہت مشہور ہیں، ایک آپ کے صاحب زادے مولانا شاہ ابواسحاق لہراوی، دوسرے آپ کے بھتیجے شاہ عبدالحق اور تیسرے شاہ معشوق علی غازی پوری، جہاں آپ کا مزار ہے، اس جگہ کو روضہ کہتے ہیں، مزار اور خانقاہ کا علاقہ بالکل ویران ہے، مسجد کی دیواریں کھڑی ہیں، جنوب میں خانقاہ اور مدرسہ ٹیلہ کی شکل میں مٹی کا ڈھیر ہیں، دروازوں اور کمروں کی بعض خام دیواریں اب تک موجود ہیں، صحن میں قدیم زمانے کے کھجور کے اور مختلف قسم کے درخت ہیں، یہاں پر روحانیت اور حسرت کا عجیب عالم نظر آتا ہے۔ (شاہ ابوالغوث کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: مناقب غوثی قلمی، نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۱۵، تذکرہ علمائے ہند ص ۵)

حضرت مولانا شاہ حافظ ابواسحاق محدث لہراویؒ

آپ حضرت شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے صاحب زادے اور خلیفہ ہیں۔
تعب ہے کہ مولانا شمس الدین حیدری نے ”مناقب غوثی“ میں کہیں شاہ ابواسحاق صاحب کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، حالاں کہ یہ کتاب ان کے والد شاہ ابوالغوث کے احوال و مناقب میں ہے، شاہ ابواسحاق کی پیدائش بھیرا میں ہوئی، قرآن کریم حفظ کرنے کے بعد اپنے والد محترم اور دوسرے اساتذہ سے تحصیل علم کی، جن میں مولانا قاضی عبدالصمد بن ابوالحسن چریا کوٹی متوفی ۱۱۷۱ھ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

تذکرہ علمائے ہند میں ان کے تذکرے میں تصریح ہے:

.....

”یگانہ آفاق حافظ ابواسحاق از تلامذہ اوست“۔

(تذکرہ علمائے ہند ص ۵ و ۱۲۱، اس میں غلطی سے محمد اسحاق درج ہے)

قاضی عبدالصمد چریاکوٹی نے دہلی کے علماء و مشائخ سے تعلیم حاصل کی تھی اور محمد شاہ بادشاہ نے ان کو چریاکوٹ اور اطراف و جوانب کا قاضی مقرر کیا تھا، نزہۃ الخواطر میں ہے:

”و حفظ القرآن و قرأ العلم علیٰ شاہ ابواسحاق نے قرآن مجید حفظ کر کے

ابیہ و علیٰ غیرہ من الاساتذہ“۔ اپنے والد اور دوسرے اساتذہ سے پڑھا۔

(نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۸، حاشیہ سیرت البخاری ص ۳۸،

تراجم علمائے اہل حدیث ص ۳۸۲)

”سیرت البخاری“ کے حاشیہ میں اور ”تراجم علمائے اہل حدیث“ میں شاہ صاحب کے اساتذہ و شیوخ میں مولانا شیخ محمد ناصح کا نام بھی درج ہے، جو حضرت مولانا فاخر کے ارشد تلامذہ میں تھے، ان کے اساتذہ و شیوخ میں مولانا شیخ محمد فاخر بن محمد یحییٰ بن محمد امین عباسی زائر الہ آبادی متوفی ۱۱۶۴ھ بڑے مقام و مرتبہ کے عالم ہیں، شاہ ابواسحاق صاحب نے اپنے والد اور دوسرے اساتذہ سے پڑھ کر الہ آباد کا سفر کیا اور مولانا محمد فاخر سے تکمیل کر کے سند فراغ حاصل کی اور ان ہی کے طور و طریق پر عملی اور دینی زندگی بسر کی، مولانا فاخر اپنے زمانے کے زبردست محدث تھے، اپنے چچا شیخ محمد افضل اور بھائی شیخ محمد طاہر سے کتب درسیہ کی تکمیل کی اور اپنے والد شیخ محمد یحییٰ سے فیض یاب ہو کر ۲۲ سال کی عمر میں ان کے خلیفہ ہوئے۔

۱۱۴۹ھ میں حرمین شریفین میں حاضری کے موقع پر شیخ محمد حیات سندھی مدنی متوفی ۱۱۶۳ھ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ پڑھ کر اجازت عامہ کی سند لی، اتباع سنت کا سخت اہتمام کرتے تھے، فقہی مسائل میں مجتہدانہ شان کے مالک تھے، کتاب و سنت اور اپنے اجتہاد پر عمل کرتے تھے، عمل بالحدیث پر ان کی متعدد کتابیں ہیں، ان کے تلمیذ رشید شاہ

ابواسحاق پر یہی رنگ چھایا تھا، شاہ صاحب علم و عمل کی جامعیت میں اپنی مثال آپ تھے، زہد و تقویٰ اور جادۂ شریعت ان کا شعار تھا، تذکرہ علمائے ہند میں ہے:

”مظہر محاسن اخلاق شاہ ابواسحاق ذات شاہ ابواسحاق صاحب محاسن اخلاق کے مظہر شریفش نادر روزگار ممد گرشیم صحابہ کبار بود، تھے، ان کی ذات نادرہ روزگار تھی اور اس سے زہد و تقویٰ شعارش و احراز اسرار شریعت صحابہ کبار کی یاد تازہ ہوتی تھی، زہد و تقویٰ اور و تبارش افتاد، در صحیح احادیث نبویہ علیہ الصلوٰۃ و التحیۃ ملکہ وہی داشت، و تعلیم علوم ظاہر و باطن پرداخت، دور مواظبت سنت سنیہ اند کے تغافل نمی ورزید، در امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہر صغیر و کبیر غنی و فقیر را یکساں می دید۔“ (تذکرہ علمائے ہند ص ۵)

وفقیر کی تمیز نہیں کرتے تھے۔

آپ کی تصانیف میں ایک رسالہ عربی زبان میں ”نور العینین فی اثبات رفع الیدین“ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ پٹنہ میں مولانا محمد سعید مغل پوری کے کتب خانے میں تھا۔

(حاشیہ سیرت البخاری ص ۳۸)

اور ایک روایت کے مطابق مولانا شمس الحق ڈیانوی کے کتب خانے میں تھا، بعض مصنفین نے اس رسالہ سے شاہ ابواسحاق صاحب کے الفاظ نقل کیے ہیں:

”وقلت فی ذلک لما اتبعت حدیث کے بارے میں میرا کہنا ہے کہ جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر لی تو پھر وسلم لم ابلہ نعمان مجھے امام ابو حنیفہ نعمان، امام سفیان، امام زہری کی والسفیان والزہری۔“ پرواہ نہیں ہے۔

آپ پر یہ رنگ مولانا فاخر کی صحبت اور ان کی توجہ سے غالب تھا، قرآن کے بعد صحیح بخاری اصح الکتاب قرار دے کر اس سے بہت زیادہ اعتنا فرماتے تھے، علمِ روایت کے ساتھ علمِ درایت میں بھی خداداد ملکہ کے مالک تھے۔

شاہ ابواسحاق صاحب مولانا فاخر کی خدمت و صحبت کے بعد لہر آئے اور اپنے والد ماجد سے خرقہ خلافت حاصل کر کے ان کے جانشین ہوئے اور مدت العمر یہیں رہ کر تعلیم و ارشاد میں مشغول رہے، کسی روایت سے ان کا باہر جانا معلوم نہیں ہوتا، آپ کے مدرسہ کی جگہ ماضی قریب تک لہر میں مدرسہ کے نام سے مشہور تھی، جہاں ایک زمانے میں علم و معرفت کا فیض جاری تھا اور تشنگانِ علم وہاں آکر سیراب ہوتے تھے، نزہۃ الخواطر میں ہے:

”اخذ عنہ خلق کثیر“ ایک جماعت کثیر نے آپ سے کسب علم و فضل کیا۔

(نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۹)

ان میں مولانا احمد علی عباسی چریا کوٹی متوفی ۱۱۷۲ھ کا نام سرفہرست ہے، تذکرہ علمائے ہند میں ان کے ذکر میں ہے:

”واعمال مسلوکہ درویشاں از برگزیدہ آفاق بزرگوں کے صوفیانہ اعمال و اذکار حافظ ابواسحاق حضرت حافظ ابواسحاق ساکن بھیرا گرفتہ“۔ لہر اوی سے حاصل کیے۔

نیز نزہۃ الخواطر میں یہی لکھا ہے:

”ولازم الشیخ أبا إسحاق بن أبي الغوث البیروني أخذ عنہ الأذکار میں رہ کر ان سے اذکار و اشغال کی تعلیم والاشغال“۔ (نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۴۴) تلقین حاصل کی۔

آپ کے مبارک پوری تلامذہ میں تین بزرگوں کے نام اور حالات معلوم ہو سکے ہیں، مولوی حکیم امان اللہ صاحب متوفی ۱۲۹۹ھ مولوی دھنا سے صاحب اور مولوی نرہو

صاحب، ان کے حالات بعد میں آئیں گے، شاہ ابواسحاق صاحب نے ۱۲۳۴ھ میں غازی پور میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔

شیخ غلام رسول مصطفیٰ آبادیؒ

ان کے بارے میں شیخ شمس الدین حیدری نے مناقب غوثی میں لکھا ہے:

”شیخ المشائخ شیخ غلام رسول ساکن مصطفیٰ شیخ المشائخ شیخ غلام رسول ساکن مصطفیٰ آباد عالی آباد مردے بود عالی نسب، در روزگار خود بہ نسب بزرگ تھے، اپنے زمانے میں حسب و نسب حسب و نسب سر حلقہ اعیان و اکابر بود، در کے اعتبار سے اعیان و اکابر کے پیشوا تھے، رمز و اشارات صوفیہ اہل صفادہ بستیگی تام حضرات صوفیہ کے اشارات و رموز سے پوری داشت۔“ (مناقب غوثی باب ہشتم) دلچسپی رکھتے تھے۔

اس بیان سے شیخ غلام رسول کی مشیخت و بزرگی پورے طور سے معلوم ہوتی ہے، وہ شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے خسر تھے اور ۱۱۲۵ھ کے بعد ان کی دوسری شادی ان ہی کی دختر سے ہوئی تھی، مناقب غوثی میں ہے:

”دختر آن شیخ عالی مقام در سلک مرشد حقیقی ان محترم کی دختر میرے مرشد شاہ ابوالغوث دامت برکاتہ منشط کردند۔“ کے نکاح میں تھیں۔ (قمر)

غالباً شیخ غلام رسول شاہ ابواسحاق صاحب کے نانا تھے، بارہویں صدی کی ابتداء میں مصطفیٰ آباد میں تین بھائیوں کے نام ملتے ہیں، ایک شیخ غلام نبی جو مولانا محمد شریف صاحب مصطفیٰ آبادی کے جد اعلیٰ ہیں اور دوسرے شیخ غلام امام جو یہاں کے دوسرے خاندان کے مورث اعلیٰ ہیں، ہمارا خیال ہے کہ شیخ غلام رسول ان کے تیسرے بھائی ہیں۔

رمضان علی شاہ شیعہ

شیعہ روایت کے مطابق پونے دو سو سال پہلے مولانا رمضان علی پنجاب کے علاقے سے مبارک پور آئے، یہ نوابی اودھ کا زمانہ تھا، اثنا عشری مذہب کے عالم و معلم اور مبلغ تھے۔ انھوں نے محلہ شاہ محمد پور کے باہر اتر جانب ایک امام باڑہ تعمیر کیا، جو اب مکان کے نام سے مشہور ہے۔

اس امام باڑے کی تعمیر بزمانہ نواب شجاع الدولہ ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہوئی اور اس کے اندر پنجہ و چپوترہ نواب سعادت علی خاں پسر شجاع الدولہ کے دور میں ۱۲۱۶ھ میں تعمیر ہوا، امام باڑہ کے برآمدے میں اندرونی بڑی محراب کے دائیں بائیں دونوں جانب مچھلی کی تصویر بنی ہوئی ہے، جو نوابان اودھ کا سرکاری نشان ہے اور کلمہ شہادت کے بعد یہ عبارتیں درج ہیں:

”علی ولی اللہ علی وصی رسول اللہ، لافقیٰ إلا علی لا سیف إلا ذوالفقار، لا الہ إلا أنت سبحانک إنی كنت من الظالمین، یا ابا عبد اللہ یا لیتنی كنت معهم فأفوز فوزاً عظیماً، بلغ العلیٰ (الخ) ناد علیاً مظهر العجائب والغرائب، انا مدینة العلم وعلی بابها“۔

اسی محراب کے اوپر ۱۲۰۹ھ درج ہے اور اندر شمال مغرب کے گوشے میں پنجہ اور اس کا چپوترہ ہے، جس پر ۱۲۱۶ھ اور یہ اشعار درج ہیں:

یا علی کیست کہ شرمندہ احسان تو نیست شیر خوان کرم کیست کہ مہمان تو نیست
چہ دیر است اے شفیع روز محشر ہمیں پنجہ ہمیں است حوض کوثر
مقصد کون و مکان را..... و کرم عین عنایت اینجا ست
مطلب ہر دو جہاں حاجت دل خواہ ازو پنجہ شیر خدا شاہ ولایت اینجا ست

یہی امام باڑہ شیخ رمضان علی ۱۱ اپریل ۱۸۱۳ء (۱۲۲۹ھ) کی جنگ میں مسلمانوں کا قلعہ بند مورچہ تھا، جس میں آگ لگائی گئی تھی، اسی امام باڑے کے بارے میں شیخ حسن علی مبارک پوری ”واقعات و حادثات مبارک پور“ میں ۱۸۱۳ء کی جنگ کی سلسلے میں لکھتے ہیں:

”ایک باغ پورہ لہن میں واقع ہے، اسی باغ دل کشا گلزار جان فزا میں ایک امام باڑہ تعمیر کردہ رمضان شاہ مرحوم معروف بمکان رمضان شاہ ہے اور اس قصبہ میں کیا بل کہ دوسرے قصبہ و شہر میں جو اس ضلع میں پانچ سات کوں تک گرد و نواح میں واقع ہیں، ایسی ساخت و مستحکم عمارت نہیں ہے، ایسے طغریٰ و رباعیاں اور اشعار اس میں رمضان شاہ مرحوم نے کندہ کرائے اور رنگ آمیزی کرائی ہے کہ جس کا جواب نہیں، اس کی شان میں یہ قول راست و درست ہے:

اگر فردوس بر روئے زمین است

چنین است و چنین است و چنین است

(واقعات و حادثات مبارک پور ص ۱۸۱)

۱۲۱۶ھ میں امام باڑہ و پنچہ کی تعمیر مکمل ہوئی اور ۱۲۲۹ھ میں رمضان شاہ کو مرحوم لکھا گیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بھی اسی درمیان میں فوت ہوئے۔

مولوی نثار علی اسماعیلی سرانمیری شہیدؒ

مولوی نثار علی صاحب امام باڑہ رمضان شاہ کے مدرسہ میں درس دیتے تھے اور ۱۱ اپریل ۱۸۱۳ء (۱۲۲۹ھ) کی جنگ میں داعی شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔

مولوی علی حسن نے ”واقعات و حادثات مبارک پور“ میں ان کے متعلق نادر

معلومات جمع کی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اس امام باڑہ کے تین طرف بہت خوش قطع سائبان بھی تھے اور اسی میں ایک بڑے تبحر عالم، فاضل بے مثل بنام مولوی نثار علی مرحوم ساکن قصبہ سرائے میر برادر پچازاد شیخ جان علی صاحب مرحوم خوش نویس، علوم عربی و فارسی کا درس دیتے تھے اور اسی امام باڑے میں قیام پذیر تھے، انھوں نے ایسی شجاعت و دلیری کی کہ فقط تین تہا بیس پچیس دشمنوں کو جوانوں میں بڑے جنگی اور بہادری میں مشہور تھے، فی النار کیا۔

ان سبھوں نے دیکھا کہ ہم کسی طرح شمشیر زنی میں عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے تو پشت کی جانب جا کر گولی ماری، باوصف گولی لگنے کے دو جوان قوی کو گرتے گرتے مارا، جب مولوی نثار علی نے اپنی جان کو فی سبیل اللہ نثار کیا، تب بہت سے دشمن دوڑے کہ ان کی سیف لے لیوں اور وہ بہت عمدہ، بیش قیمت اور بے مثل زمانہ تھی، جانا کہ وہ جان بحق تسلیم ہوئے، دوڑ کر چاہا کہ ہاتھ سے چھین لیں، پڑے ہی پڑے باوصف ضعف اور پریشان حالی کے ایسے ضرب لگائی کہ ان دونوں کا پاؤں کٹ گیا اور وہیں ختم ہو گئے۔

بعد ان کے ہمراہیوں نے کہ وہ دس پندرہ آدمی تھے، آکر مولوی صاحب مرحوم کی پشت پر چڑھ کر تلوار اور برچھی سے مجروح کر کے اس تیغ کو لے لیا، چنان چہ وہ شمشیر بے نظیر ایک زمین دار کے پاس ایامِ غدر تک موجود تھی۔ (واقعات و حادثات مبارک پور ص ۱۸۷) مولوی نثار علی صاحب کا مزار امام باڑہ رمضان شاہ کے صحن میں دیگر شہداء کے مزارات کے ساتھ ابھی جلدی تک نمایاں تھا، مولوی صاحب ابتدا میں اثنا عشری مذہب کے عالم و معلم تھے، بعد میں اسماعیلی فرقہ کے داعی اور مبلغ بن گئے اور ان کی وجہ سے مبارک پور میں اسماعیلی فرقہ کی ابتدا ہوئی۔

اس کی تفصیل جیسا کہ راقم سے ملا رحمت علی صاحب اسماعیلی مبارک پوری مرحوم نے بیان کیا، یہ ہے کہ ملا نثار علی صاحب حج کے ارادے سے مبارک پور سے سورت گئے، جہاں

سے اس زمانے میں حجاج کے جہاز جدہ جایا کرتے تھے، ملا نثار علی جہاز کے انتظار میں کچھ دنوں سورت میں ٹھہرے، ایک دن وہ شہر کے باہر ایک باغ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ اسماعیلی مذہب کے ایک مکاسر نے ان کو دیکھا اور سمجھا کہ یہ پڑھ لکھے آدمی ہیں، اس زمانے میں اسماعیلی فرقے کے داؤدی بوہروں کے پیشوا اور امام مستقل طور سے سورت میں رہتے تھے، اس مکاسر نے ملا نثار علی سے بات چیت کی اور اسماعیلی دعوت کی ابتدائی باتیں بتا کر چند سوالات کیے، جن کے جوابات کے لیے اسماعیلی دعوت پر لبیک کہنا ضروری بتایا، اس کے بعد وہ ملا نثار علی کو اپنے امام اور داعی مطلق کی خدمت میں لے گیا، جہاں ملا نثار علی چند دنوں قیام کر کے اسماعیلی مذہب کے پیرو بن گئے، اب وہ اثنا عشری شیعہ کے بجائے اسماعیلی شیعہ تھے، امام اور داعی مطلق نے ان سے اپنی امامت و دعوت کا میثاق لیا اور یہ کہہ کر مبارک پور واپسی کا حکم دیا کہ تمہارا حج یہی ہے کہ تم اپنے وطن جا کر اسماعیلی دعوت عام کرو اور مرکز سے تعلق قائم رکھو، چنانچہ ملا نثار علی سورت ہی سے مبارک پور واپس چلے آئے اور یہاں اسماعیلی دعوت کی بنیاد رکھی، جس سے متاثر ہو کر اثنا عشری شیعہ کے کچھ خاندان اسماعیلی ہو گئے۔

ملا صاحب نے اس کے بعد مبارک پور میں داعی مطلق کی طرف سے عامل کی حیثیت سے کام کیا اور اپنے مذہبی مرکز سورت سے تعلق قائم رکھا، غالباً ملا نثار علی صاحب کو اسماعیلی دعوت دینے والے ملا سیف الدین عبدالعلی متوفی ۱۲۲۴ھ تھے، جو اپنے زمانے میں گجرات میں اسماعیلی مذہب کے زبردست داعی و مبلغ تھے۔

اسماعیلی فرقہ کے شیعوں کا عقیدہ ہے کہ امام جعفر صادقؑ کے بعد امامت ان کے صاحب زادے اسماعیل کوہلی اور امام جعفر نے ان کی طفلی ہی میں ان پر امامت کی نص کر دی تھی، ان کے بعد ان کے بیٹے محمد بن اسماعیل بن جعفر کی طرف امامت منتقل ہو گئی، جو ساتویں امام تھے، اس کے بعد اسماعیلی ائمہ مستور ہو گئے، جو خود چھپ کر چلتے پھرتے ہیں

اور ان کے دعاۃ ظاہرہ کران کی طرف سے کام کرتے ہیں۔

چنانچہ آج کل ستر کا زمانہ چل رہا ہے اور جب ظہور کا زمانہ آجائے گا تو وہ ظاہر ہو کر دعوت کو عام کریں گے، ان کو باطنیہ بھی کہتے ہیں، کیوں کہ یہ لوگ تاویل پر عقیدہ رکھتے ہیں اور ہر ظاہر کا باطن مانتے ہیں، مثلاً نماز، روزہ وغیرہ کی ظاہری صورتیں ان کی باطنی صورتوں سے مختلف ہیں، تاویل کا علم ائمہ کے پاس ہے اور وہی ظاہر کے باطن کو سمجھتے ہیں۔

مولوی محمد نشان شہید

مولوی محمد نشان صاحب باہر کے رہنے والے تھے، غالباً امام باڑہ رمضان علی شاہ کے مدرسے میں مدرس تھے، ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۳ء) کی جنگ میں شہید ہوئے، اہل مبارک پور نے گورکھپور کی عدالت میں جو عرضداشت پیش کی تھی، اس میں شہداء کی فہرست میں پہلا نام انہی کا ہے:

”در امام باڑہ رمضان علی شاہ احداث کردہ غنڈے امام باڑہ رمضان علی شاہ کو نجس کر کے
 --- در آمدند مسمیان مولوی محمد نشان گھس آئے اور مسمیان مولوی محمد نشان و میر معظم
 و میر معظم حسین کہ مسافران بودند --- حسین کہ یہ لوگ مسافر تھے، ان کے علاوہ
 وغیرہ کسان کہ در صحن امام باڑہ بودند آں دوسرے افراد کو جو صحن امام باڑہ میں تھے، اُن
 متمردان بد شعار ہمہ را بقتل رسانیدند“۔ غنڈوں نے اُن تمام کو قتل کر ڈالا۔

اس تحریری بیان کے علاوہ ایک زبانی روایت بھی ان کی شہادت کے بارے میں ہے، جس میں ان کا نام مولوی ناس بتایا گیا ہے، وہ یہ کہ جب بلوائی دوسری بار شکست کھا کر بھاگے تو قصبہ کے بہادروں نے قسم دے کر ان کو لاکارا، بلوائی پلٹ کر سہ بارہ حملہ آور ہو گئے اور رسول پور کے متصل موضع معانی کے ایک شخص نے مولوی ناس صاحب کو پیچھے سے زخم

کاری پہنچایا، جس سے وہ یہ کہتے ہوئے زمین پر گرے کہ تم نے دھوکے سے مارا ہے، تم کوڑھی ہو کر مرو گے، چنانچہ وہ آخر میں کوڑھی ہو کر مرا۔

اس شہید کی بددعا کا اثر ابھی تک یوں ہے کہ اس کے خاندان میں کوئی نہ کوئی شخص اس مرض میں مبتلا رہتا ہے۔

یہ روایت مولانا عبدالباقی صاحب رسول پوری نے مجھ سے بیان کی ہے، ان کا مزار بھی امام باڑہ رمضان شاہ کے صحن میں دیگر مزارات کے ساتھ ہے، مگر اس کا نشان باقی نہیں رہا۔

میر معظم حسین شہیدؒ

میر معظم حسین بھی غالباً امام باڑہ رمضان علی شاہ کے مدرسہ میں درس دیتے تھے اور کسی دوسرے مقام کے رہنے والے تھے، ۱۸۱۳ء کی جنگ میں وہ بھی شہید ہوئے اور ان کی قبر دیگر شہداء کی قبروں کے ساتھ امام باڑہ مذکور کے صحن میں تھی، جس کا نشان اب باقی نہیں رہا، جو عرضداشت گورکھپور کی عدالت میں اہل قصبہ کی طرف سے پیش کی گئی تھی، ان میں ان کا نام ہے اور یہ کہ وہ بھی مولوی محمد نشان کی طرح قصبہ کے باہر سے آئے تھے۔

”و مسمیان مولوی محمد نشان و میر معظم حسین اور مسمیان مولوی نشان و میر معظم حسین مسافر مسافر ان کہ وارد بودند و محمدی و روشن و یونس تھے اور مبارک پور آئے تھے اور محمدی و روشن و یونس و بیچو و حسام و بھکن اپنے دو بیٹوں کے ساتھ، و بیچو و حسام و بھکن مع دو پسرش و موہن و قمن موہن و قمن و بھوج و دبیر و منور و ضیاء و نصر و ولان و بھوج و دبیر و منور و ضیاء و نصر و ولان و سکر و حجام و ہاشم و فاضل و بہادر وغیرہ کہ در صحن امام باڑہ بودند آن متمدان بد شعار ہمہ را بہ صحن امام باڑہ میں تھے، ان غنڈوں نے ان سب

قتل رسانیدند و جمیع اسباب قیمتی مبالغہ کو قتل کر ڈالا اور تمام قیمتی سامان اور خطیر رقم لوٹ لے گئے۔ (قمر)

خطیرہ بغارت بردند۔

شیخ چراغ علی شیبی

شیخ چراغ علی اثنا عشری شیعہ تھے، شیعہ روایت کے مطابق نوابی اودھ کے دور میں مبارک پور آئے اور یہاں تبلیغ و تعلیم میں مشغول رہ کر قصبہ کے پچھم طرف روضہ و امام باڑہ بنوایا، جو شاہ کا پنچہ کے نام سے مشہور ہے، اس میں دو روضے ہیں، ایک کے اندر ایک پتھر نصب ہے، جس پر پنچہ بنا ہوا ہے، مولوی علی حسن فاروقی ایک حادثہ کے ضمن میں اس روضہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ قصبہ مبارک پور میں جانب پچھم بستی سے باہر ایک احاطہ بہت خوش قطع ہے اور اس کے اندر روضہ مبارک معروف بہ پنچہ شریف واقع ہے، ایسی دلچسپ جگہ اس قصبہ میں دوسری نہیں ہے۔ (واقعات و حادثات مبارک پور ص ۳۳)

اس احاطہ میں اہل سنت کی قدیم عید گاہ اور قبرستان واقع ہے۔

شیخ سیف علی شیبی

شیعہ روایت کے مطابق شیخ سیف علی بھی پورنے دو سو سال قبل نوابی اودھ کے دور میں مبارک پور آئے اور اپنے مذہب کی تعلیم و تبلیغ میں مشغول ہوئے، رمضان علی شاہ کے معاصر تھے اور انھوں نے امام باڑہ رمضان شاہ کے بالمقابل جنوب میں اپنا امام باڑہ تعمیر کیا تھا، مگر وہ منہدم ہو گیا، اس کے ڈھیر اور دیواروں کے نشان ابھی تک موجود ہیں، امام باڑہ رمضان شاہ ۱۲۰۹ھ میں تعمیر ہوا تھا، غالباً اسی زمانے میں یا اس کے بعد ہی سیف علی شاہ نے اس کے قریب اپنا امام باڑہ تعمیر کرایا ہوگا۔

شیخ علی شہیدؒ نائب قاضی مبارک پور

راقم کے جد اعلیٰ حضرت شیخ علی رحمۃ اللہ علیہ قصبہ کے قدیم رئیس اور نائب قاضی تھے، ان کے آبا و اجداد مانک پور کڑا کے رہنے والے تھے، بانی مبارک پور راجہ سید مبارک مانک پوری متوفی ۹۶۵ھ کے ہمراہ ان کا خاندان وہاں سے منتقل ہو کر مبارک پور میں مستقل طور سے آباد ہو گیا اور اسی زمانے سے یہاں کی نیابت قضا کا عہدہ اس خاندان میں رہا۔

شیخ علی کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ اس خاندان میں علمی و روحانی دولت کے ساتھ دنیاوی دولت و ثروت اور مال داری بھی زمانہ قدیم سے چلی آتی تھی، ان کی پیدائش ۱۱۳۰ھ اور ۱۱۴۰ھ کے درمیان ہوئی ہوگی، خاندانی خوش حالی، مال داری اور نیابت قضا کے عہدے کے ساتھ پہلوانی اور شہ زوری میں مشہور زمانہ تھے اور اطراف و جوانب میں اس فن کے استاد مانے جاتے تھے، زہد و تقویٰ اور ذکر و شغل میں بہت آگے تھے اور اُوراد و وظائف اور معمولات پر آخری وقت تک کار بند رہے۔

انھوں نے نہایت کام یاب زندگی بسر کی، دارالقضاء محمد آباد گوہنہ کی طرف سے نائب قاضی تھے اور قصبہ و اطراف قصبہ کے جملہ شرعی امور و معاملات ان کی ذمہ داری میں دیئے گئے تھے اور وہ اپنے اسلاف کی طرح اس خدمت کو بوجہ احسن انجام دیتے تھے۔

نوابان اودھ کے بعد انگریزی عمل داری کا ابتدائی دور دیکھا تھا، شاہ ابوالغوث گرم دیوان کے معاصر تھے، غالب گمان ہے کہ دونوں بزرگوں میں علمی و دینی تعلقات استوار تھے، اسی سال سے زائد کی عمر میں پہلوانی اور اکھاڑہ کی رقابت میں شہید کر دیئے گئے، ان کی شہادت کا واقعہ مقامی اصطلاح میں ”علی شاہی“ کے نام سے مشہور ہے۔

مولوی علی حسن فاروقی نے ”واقعات و حادثات مبارک پور“ میں یہاں کا چھٹا حادثہ

”علی شاہی“ کے عنوان سے بیان کیا ہے، جس میں ان کی شہادت کی تفصیل درج ہے، ہم یہاں اس کا خلاصہ بیان کرتے ہیں:

مولوی علی حسن بن شیخ غلام مرتضیٰ فاروقی نے لکھا ہے: حادثہ ششم قصبہ مبارک پور کہ معروف بہ علی شاہی ہے۔

صورتِ حال اس واقعہ کی اس طور پر ہے کہ مسمی میاں علی ایک شخص سکنائے قصبہ مبارک پور سے، رئیس قدیم و نائب قاضی اور خلیفہ اکھاڑہ قدم رسول محلہ پورہ رانی کے کہ عمر ان کی اسی برس کی تھی، باوجود اس سن کے توئی از بس قوی کہ جوان لوگ کشتی میں عہدہ برآ نہ ہوتے، ایسے کشتی باز کہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، بل کہ ان کے شاگردین ایسے نامی گرامی ہو گئے ہیں کہ اکثر ہندوستانی ریاستوں میں ان کا نام مشہور ہے۔

سوان کی کیفیت یہ ہوئی کہ ایک روز اپنے مکان میں بیٹھے بعد نماز عصر کے وظیفہ پڑھ رہے تھے اور اسی مکان میں ایک دوسرا شخص کرایہ دار رہتا تھا اور اس کرایہ دار کا داماد واسطے رخصتی کرانے اپنی منکوحہ کے آیا تھا اور کرایہ دار کی منشا تھی کہ ابھی لڑکی کو دس پندرہ روز کے بعد رخصت کروں گا، بایں وجہ کہ رخصتی کا سامان ولوازمہ موجود نہ تھا، جب اس نے دیکھا کہ میری زوجہ کو میرا خسر رخصت نہیں کرتا، تب وہاں سے اٹھ کر اپنے مکان پر پورہ خواجہ میں گیا، اس محلہ کے ایک شخص مسمی چھوڑاڈہ ساکن بلدہ بنارس کہ اکثر لوگوں میں ناحق فساد کرا دیتا تھا، بایں وجہ ”ڈاڈہ“ کے لقب سے مشہور تھا، اس مفسد نے کہا کہ چلو ہم دو چار آدمی چلتے ہیں، تم اپنی منکوحہ کو جس طور سے ممکن ہو، رخصت کرا کے لے آؤ، غرض وہ چار پانچ مفسد آمادہ تکرار ہو کر آئے اور اس لڑکی والے سے ناحق جھگڑا کرنے لگے اور یہاں تک نوبت پہنچی کہ مار پیٹ شروع ہو گئی، جب اس نے شور کیا تو میاں علی مرحوم وظیفہ سے اٹھ کر ان کم بختوں کو منع کرنے لگے کہ فوج داری نہ کرو، اس کہنے پر چھوڑاڈہ مذکور نے ان کو ایک طمانچہ مار دیا، یہ بے چارے تو

ضعیف ہی تھے اور آنکھ سے بھی کم معلوم ہوتا تھا، ہٹ آئے اور وہ سب بھی چلے گئے۔
 لیکن جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ پورہ خواجہ کے بدمعاشوں نے میاں جی علی کو مارا ہے،
 پھر تو یہ شور و غوغا ہوا کہ الاہمان، ان کے شاگردوں نے جو کہ روضہ کے اکھاڑے کے کشتی باز
 تھے، جمع ہوئے اور قصبہ ہذا میں پانچ اکھاڑے نامی تھے، مگر ان میں قدم رسول کا اکھاڑا ہمیشہ
 سے سب پر بالا رہا اور میاں جی علی کے باعث ان کے شاگردوں نے اس اکھاڑے کو اور بھی
 نامی گرامی بنادیا اور صد ہا شاگرد تھے، جن میں سے غوثی خلیفہ اور حاجی خوشحال اور دوست خلیفہ
 اور واحد خلیفہ اور ولی اور عالم ان لوگوں نے فن کشتی میں ایسا نام پیدا کیا کہ ان کی پشت کو حالت
 کشتی میں کسی نے نہ لگایا اور نہ ان کے مقابلہ میں کوئی جوان کھڑا ہوا۔

غرض کہ ان سب نامی گرامی شاگردوں نے یہ صلاح ٹھہرائی کہ ابھی چل کے پورہ
 خواجہ کو لوٹ لو، میاں جی نے ہر چند حیلہ حوالہ کیا کہ مجھ کو کسی نے نہیں مارا ہے، جانے دو، عمل
 داری انگریز کی ہے، سب کے سب ہم لوگ تباہ و برباد ہو جائیں گے، مگر شہنی کہاں ملتی ہے؟
 وہ وقت قریب نماز مغرب کا تھا، اتنے میں کسی نے کہا کہ اس میں مردی نہیں، اس دم صبر کریں
 اور پورہ خواجہ میں ہم کہلا بھیجیں کہ تم ہوشیار رہنا، ہم علی الصباح تمہارے محلے میں آویں گے۔
 اگر تمہارے محلہ کے ایک شخص نے ہمارے خلیفہ کو طمانچہ مارا ہے تو ہم تمہارے خلیفہ کو
 مع شاگردوں کے آ کر غارت کریں گے، خبردار رہنا، اطلاعاً خبر دی جاتی ہے، خبر بھیج کر اپنے اپنے
 مکان پر چلے گئے، صبح کے وقت جتنے شاگرد پورہ رانی اور پورہ خضر وغیرہ کے تھے، سب کے سب
 لاٹھی اور لوہہ بندالے کر غریب شاہ کے باڑے میں جو پورہ خضر میں واقع ہے، جمع ہوئے اور پورہ
 خواجہ میں خبر کروادیا کہ ہم لوگ آتے ہیں، خبردار رہنا، جب اس محلہ کے لوگوں نے سنا تو وہاں
 کے لوگوں نے باخود ہا صلاح و مشورہ کر کے مع ہتھیار سب کے سب جمع ہوئے۔

حاصل کلام ٹھا کر دوارہ کے پورب طرف ایک باغ تھا اور اس میں ایک قبرستان

ہے، جب وہاں پہنچے تو مقابلہ ہوا، اکھاڑہ قدم رسول کے جوانوں کے پہنچتے ہی ایک شخص غلام نام نے ایک آواز بندوق کی سرکی، اس سے ایک شخص گوپالی نام کے ہاتھ پر گولی لگی، مع سرین کے ہاتھ مجروح ہوا، اور سرین توڑ کر وہ گولی نکل گئی، قریب تھا کہ زمین پر گر پڑے، اتنے میں دوسرے شخص نے اس کو پکڑ کر اس کے مکان پر پہنچا دیا۔

آفریں ہے اس کی ہمت پر کہ باوجود گولی لگنے کے، برابر اس شخص کو تھامے ہوئے مکان پر چلا آیا اور وہاں معرکہ میں دو آواز اور بھی پورہ خواجہ کے بندوچوں نے کی، مگر وہ دونوں آوازیں خالی تھیں، واسطے ڈرانے کے سرہوئیں، جب کہ میاں جی علی کی طرف کے جوانوں نے دیکھا کہ ان سبھوں نے بندوق، تلوار اور گڑانسا مہیا کیا ہے، تب دو تین جوانوں کو جن کا مکان معرکہ سے قریب تھا دوڑایا کہ تلوار اور ہتھیار آہنی لاؤ اور لاٹھی رکھو، وہ سب تلوار لائے اور خوب شجاعت سے مقابلہ کیا۔

مخملہ جوانوں کے مسمی خوشحال حاجی اور واحد خلیفہ اور لالو اور کوئی حجام نے ایسی داد شجاعت دی اور ایسی جوانمردی سے لڑے کہ باوصف موجودگی تلوار اور بندوق کے پورہ خواجہ کے سب کے سب گریز کر گئے، مگر ایک شخص مسمی غلام محمد ساکن شہر بنارس کو وہ چند روز سے اس محلہ میں رہتا تھا، میدان جنگ میں ثابت قدم رہا، پانچ چار جوانوں سے اب مقابلہ کیا، لیکن بالآخر پیراس کا ایک قبر میں کہ وہ خالی تھی پھسل گیا اور خوشحال حاجی نے موقع پا کر تلوار ماری اور وہ مر گیا۔

ادھر تو لوگ لڑنے میں مصروف تھے اور ادھر یہ کیفیت ہوئی کہ میاں جی علی جو خلیفہ اکھاڑہ تھے، شاگردوں نے ان کو مکان پر بٹھا کر اور تاکید کر کے آئے تھے کہ آپ مکان سے ہرگز باہر نہ نکلیں، مگر چوں کہ ان کی زندگی کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا، کیوں کر ٹھہرتے، وہ بھی آہستہ آہستہ پیچھے سے چلے آئے اور قریب ٹھا کر دوارہ کے سڑک پر جب پہنچے تو ایک شخص

واحد ولد روشن نے تنہا پا کر ایک گڑا نسا سے ان کا کام تمام کیا اور دوسرے شخص نے تلوار بھی ماری، پھر ان کے مارے جانے پر اور بھی آتش غضب کی برافروختہ ہوئی اور جس وقت میاں جی مرحوم کے شاگردوں نے سنا کہ ہمارے خلیفہ کو مار ڈالا، تب کسی کو صبر نہ رہا اور سب کے سب علی علی کر کے پورہ خواجہ کی طرف بڑھے، تاکہ قاتل کو قتل کر دیں کہ ناگاہ میر صاحب علی خاں داروغہ قصبہ مبارک پور ساکن جون پور نے مع برقداز پہنچ کر اکثروں کو گرفتار کیا اور میاں جی علی اور غلام محمد کی لاشوں کو صاحب کلکٹر بہادر ضلع اعظم گڑھ کے ملاحظہ کوروانہ کیا، بعد میں یہ مقدمہ حضور میں جناب صاحب جج بہادر ضلع گورکھپور کے سپرد ہوا، کیوں کہ جج اس وقت تک اعظم گڑھ میں نہ تھے، صرف کلکٹری تھے، لہذا بعد تحقیقات واقعی کے چھ شخص میاں جی علی کے شاگردوں میں اور دو شخص پورہ خواجہ کے رہنے والوں میں بہ میعاد سات سات برس کے مقید ہوئے، میاں جی علی کی طرف کے زیادہ آدمی قید ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ ان لوگوں نے اپنے محلے سے چڑھ کر دوسرے کے محلے میں فوج داری کی تھی، بعدہ خوشحال حاجی اور دوست محمد خلیفہ ضلع ہزاری باغ کے جیل خانے میں رہ کر اسی حالت میں قضا کیا اور باقی لوگ میعاد پوری کر کے اپنے وطن کو واپس آئے۔

(واقعات و حادثات مبارک پور ص ۲۴ تا ۲۸ و آثار و معارف ص ۳۵ تا ۳۹)

اس زمانے میں مبارک پور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ضلع گورکھپور میں تھا، ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء و ۱۲۱۶ھ میں گورنر جنرل ولزلی (WELLESLEY) اور نواب سعادت علی خاں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جس کی رو سے چکلا اعظم گڑھ کے علاقے نوابی اودھ سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت آگئے تھے اور ۲۸ دسمبر ۱۸۳۲ء (۱۲۴۸ھ) کو برطانوی حکومت نے اعظم گڑھ کو مستقل ضلع قرار دیا۔

قاضی علی کی شہادت ۱۲۱۶ھ کے بعد ہوئی، اس زمانے میں اس خانوادے کا آبائی

مکان راجہ صاحب کی مسجد کے پاس تھا اور شیخ علی وہیں رہتے تھے، ان کی تدفین آبائی قبرستان میں ہوئی، جو قصبہ کے دکھن جانب شیوالہ اور پوکھرا کے پورب لپ سڑک تھا۔

شیخ امام بخش

شیخ امام بخش صاحب قاضی شیخ علی مرحوم کے صاحب زادے اور ان کے سچے جانشین تھے، زہد و تقویٰ اور اُردو و ظائف اور اشراق و تہجد کے پابند اور نیکی و شرافت میں مشہور زمانہ تھے، قصبہ کے نائب قاضی، جامع مسجد راجہ صاحب کے مستقل امام اور سکٹھی و مبارک پور کی عید گاہ میں عیدین کے امام تھے۔

۱۲۳۴ھ میں عید گاہ کے امام مقرر کیے گئے اور والد صاحب کی شہادت کے بعد ان کی جگہ نائب قاضی ہوئے، ۱۲۵۰ھ سے ۱۲۶۱ھ تک اس عہدے پر رہے، جب کہ آپ کی زندگی ہی میں آپ کے دو صاحب زادے جناب شیخ محمد رضا اور جناب شیخ حسام الدین دوسرے حلقوں کے نائب قاضی تھے، اسی درمیان میں آپ کے پوتے جناب شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بھی اس عہدے سے منسلک تھے، شاہ ابواسحاق لہراوی متوفی ۱۲۳۴ھ کے معاصر تھے اور ان کے حلقہ قضا میں گجہڑا، لہرا بھی شامل تھا، آپ کے زمانے میں دارالقضاء محمد آباد میں تین قاضی گزرے ہیں، مولانا قاضی محمد رؤف صاحب، مولانا قاضی محمد سلیم صاحب مچھلی شہری متوفی ۱۲۶۶ھ اور مولانا قاضی محمد شاہ عالم صاحب۔

ان سب حضرات نے اپنی نیابت کی سندوں میں شیخ امام بخش کو ”دیانت آثار“ قرار دیا ہے اور ان کی خدمات پر خوشنودی ظاہر کی ہے، یہ تمام اسناد ہماری کتاب ”ماثر و معارف“ میں درج ہیں، ہندوستان میں انگریزی دور حکومت قائم ہونے کے بعد بھی ۱۸۶۴ء (۱۲۸۱ھ) تک مسلمانوں کے شرعی معاملات کا تصفیہ مسلمان قاضی ہی کرتے تھے، جن کا

انتخاب علماء کے گروہ سے کیا جاتا تھا، لیکن اس کے بعد منصب قضاء منسوخ کر دیا گیا اور عام دیوانی معاملات کی طرح شرعی معاملات بھی انگریزی عدالتوں کے حدود اختیار میں داخل کر دیئے گئے، روضہ کی عید گاہ کی امامت کی سند یہ ہے۔

سید ناصر علی مہر

”نور باقان زمینداران وغیرہ ساکنان موضع موضع سکٹھی کے انصاری اور زمیندار مطلع ہوں سکٹی بداند چوں مسمی امام بخش را بعہدہ خطبہ خوانی در عیدین ثابت مقرر و مفوض نمودہ شد لازم کہ نام زدہ را مصوب و مستقیم دانستہ ہماہان ایشاں بہ مسجد شریف حاضر شدہ نماز، خطبہ گزارند، دادا سازند کہ ایشاں دین داری ظاہر شود و مشارالہ را نیز باید کہ مردان را از حسن سلوک خود راضی شاکر دارد و بکار مرجوعہ خود حاضر و مستعد باشد، در صورت اختلاف امور دینداری دیگرے مقرر خواہد شد، دریں باب تاکید مزید بلیغ دانستہ حسب المسطور بعمل آرند۔“

موضع سکٹھی کے انصاری اور زمیندار مطلع ہوں کہ امام بخش کو عیدین کی خطبہ خوانی کے عہدے پر مقرر و مفوض کیا گیا ہے، لازم ہے کہ امام بخش دارالقضاء کی طرف سے مقرر کیا ہوا سمجھیں اور ان کے ساتھ مسجد میں حاضر ہو کر خطبہ عیدین سنیں اور نماز عیدین ادا کریں، کیوں کہ ان کی پرہیزگاری نمایاں ہے اور امام بخش کو بھی چاہیے کہ لوگوں کو اپنے حسن سلوک سے خوش رکھیں اور اپنے سپرد کیے گئے کام کے لیے حاضر و مستعد رہیں، اس سلسلے میں مزید تاکید کو اہم سمجھتے ہوئے لکھنے کے مطابق عمل کریں۔ (قمر)

اس سند کی پشت پر یہ عبارت درج ہے:

”دوازدہ ماہ اگست ۱۸۱۷ء کاغذ ہذا بہ دست شاہ محمد ساکن مبارک پور۔“

آپ نیابتِ قضاء کی جملہ ذمہ داریاں بوجہ احسن انجام دیتے تھے، قضاۃ محمد آباد نے ان کے حالات دین داری و امانت داری خود دیکھ کر اور سن کر ان کی صلاحیت و قابلیت اور دیانت آثار ہونے کی تحریری شہادت دی، قصبہ اور ملحقہ کے بارہ مقامات میں قضا کی نیابت فرماتے تھے، جس میں نکاح خوانی کے علاوہ ترویجِ رسوم دین، التزام سنت رسول، امامت جمعہ و جماعات، وعظ و تذکیر، مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ، زن و شوئی کے معاملات و قضا یا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام آپ کے سپرد تھے، جن کی ادائیگی میں یوں سعی بلیغ فرماتے تھے کہ دارالقضاء پوری طرح مطمئن رہتا تھا۔

ان کے زمانے میں جامع راجہ صاحب میں مسجد سے متعلق ایک واقعہ پیش آیا تھا، اس میں آپ کا ذکر ضمناً آگیا ہے۔

مولوی علی حسن فاروقی نے ”واقعات و حادثات مبارک پور“ میں سولہواں واقعہ فخر الدین شاہی کے عنوان سے بیان کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فخر الدین نامی ایک مفسد آدمی موضع آستانہ بھیرا سے آکر اپنی سسرال مبارک پور میں رہتا تھا، چوں کہ یہ آدمی بہت بے حیا اور بے شرم تھا، اس واسطے کوئی اس سے مزاحمت نہیں کرتا تھا، بسبب خوفِ آبرو کے اس کی باتوں کو برداشت کر جاتے تھے، نام اس کا فخر الدین ہے، مگر اس کو مخرب الدین یا فخر الشیاطین کہنا بجا ہے، اس نے اپنی مصلحت کی بنا پر جامع مسجد کی سیڑھی پر سور کے بچے کا سر کاٹ کر رکھا، یہ حرکت اس نے فجر کی نماز کے وقت کرنا چاہی، مگر ہمت نہ پڑی اور نمازی فارغ ہو کر اپنے اپنے مکان چلے گئے اور میاں جی امام بخش کہ وہ اس مسجد کی نمازِ یومیہ کے امام تھے، ان کا معمول تھا کہ نمازِ صبح کے بعد درود اور وظیفہ میں رہتے تھے اور جب آفتاب طلوع ہوتا تھا تو نمازِ اشراق پڑھ کر مکان جاتے تھے، چنانچہ وہ نمازِ صبح کے بعد مسجد میں اپنے معمولات میں مصروف تھے، جب آفتاب طلوع ہوا اور انھوں نے نمازِ اشراق ادا کی تو کہیں

کچھ نہیں تھا اور وظیفہ سے فارغ ہو کر مکان کو چلے تو دیکھا کہ وہ مفسد فخر الدین مسجد کے دروازے پر ٹہل رہا ہے اور جب آپ اوٹ میں ہوئے تو وہ بچہ خوک کو جلدی سے قدم بڑھا کر اس تختہ سنگی کے نیچے رکھ کر چل دیا، جس پر نمازی وضو کرنے کے بعد پیر رکھ کر مسجد کے فرش پر جاتے تھے، دو گھڑی دن نکلنے تک کسی کو کچھ خبر نہیں لگ سکی تو خود اس نے دو چار شخصوں کو جمع کر کے شور مچایا، قصبہ میں ہنگامہ ہوا، اور اعظم گڑھ سے گبن صاحب کلکٹر آیا اور مسلمانوں کے جوش و خروش کو دیکھ کر بھاگ گیا، جاتے ہوئے شاہ خادم علی زمیندار مبارک پور چک سکٹھی شیخ ولی محمد صاحب اور شیخ گدا حسین کو اپنے ساتھ لے جا کر حوالات میں ڈال دیا، اس وقت یہاں سید مبارک اشرف تھانیدار تھے، وہ تمام سرداران و مہتران و زمینداران مبارک پور کو جمع کر کے صلاح و مشورہ اور مفسد کی تلاش کرنے لگے اور معلوم ہوا کہ یہ حرکت اس فخر الدین کی ہے، قوم کھٹک نے بھی بیان دیا کہ فلاں شخص سے فلاں فلاں شخص نے بچہ خوک خریدا تھا اور اسے تین سال کی سزا ہوئی اور تھانیدار نے ایسا انتظام کیا کہ قصبہ وقوع فسادات سے محفوظ رہا۔

(واقعات و حادثات مبارک پور ص ۵۶ تا ۶۰، خلاصہ آثار و معارف ص ۳۴۹ تا ۳۵۴)

یہ واقعہ حدود ۱۲۶۷ھ میں رونما ہوا، اس کے بعد شیخ امام بخش صاحب نے انتقال کیا اور اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے، آپ کے نام کی نیابت قضاء کی چارسندیں ”ماثر و معارف“ میں منقول ہیں۔

شیخ محمد رضاؒ

شیخ امام بخش بن شیخ علی کے دو صاحب زادے تھے، شیخ محمد رضا اور شیخ حسام الدین اور دونوں بھائی اپنے والد کی حیات ہی میں قصبہ اور ملحقات میں نیابت قضاء کی خدمت انجام دیتے تھے۔

ابتداء میں یہ عہدہ شیخ حسام الدین کو سونپا گیا تھا، مگر بعض شرعی معاملات میں وہ دارالقضاء کے معیار پر پورے نہ اتر سکے، اس لیے ۱۲۴۷ھ میں ان کو معزول کر کے ان کے بھائی شیخ محمد رضا صاحب کو یہ عہدہ دیا گیا، مولوی قاضی محمد رؤف صاحب نے دارالقضاء سے جو سند شیخ محمد رضا صاحب کو عطا کی ہے، اس میں اس کی طرف یوں اشارہ موجود ہے:

”چوں سابق ازیں سند عہدہ نکاح خوانی بنام حسام الدین بود و حالات بہ سبب قصورات چند کہ خلاف شرع از عہدہ مذکورہ نام زدہ را موقوف کردہ بجائے شان ایشان را بعہدہ نکاح خوانی بفصلہ ذیل مقرر نمودہ شد“

قاضی محمد رؤف صاحب کی طرف سے یہ سند رمضان ۱۲۴۷ھ میں دی گئی، اس کی پشت پر ۲۰ ربیع الآخر ۱۲۵۰ھ موافق ۱۸۳۴ء درج ہے، دوسری سند قاضی محمد سلیم صاحب منصف کی طرف سے دی گئی، شیخ محمد رضا کی امانت گزاری و دیانت داری کے مکرر سماع و معائنہ کے بعد قاضی محمد سلیم صاحب نے ان کو نہ صرف سند جدید دی، بل کہ ان کا دائرہ نیابت وسیع کر دیا گیا اور مکرر ارشاد کے ذریعہ ان کو مزید اعزاز دے کر پندرہ سولہ مقامات میں نائب قاضی بنایا گیا، پورب میں پرانی بستی تک، دکھن میں سٹھیاؤں تک، کچھم میں بمبور اور حاجی پور تک اور اتر میں گوجر پار اور بنڈ بیا تک ان کے حدود قضا تھے اور وہی اس پورے علاقے کے مسلمانوں کے جملہ شرعی امور و معاملات کے ذمہ دار تھے، جن میں نکاح خوانی سے لے کر امر بالمعروف، نہی عن المنکر، امامت جمعہ و جماعات اور ہر قسم کے جھگڑے اور مقدمات کے فیصلے شامل تھے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ محمد رضا صاحب کی علمی و دینی قابلیت و بصیرت کس قدر بلند تھی، ان کی تین سندیں ”ماثر و معارف“ میں درج ہیں، جو قاضی محمد رؤف صاحب، قاضی محمد سلیم صاحب اور قاضی محمد شاہ عالم صاحب کی طرف سے دارالقضاء سے ملی تھیں۔ (ماثر و معارف ص ۳۵۵ تا ۳۵۹)

شیخ حسام الدین شاہ

شیخ حسام الدین بن شیخ امام بخش بن شیخ علی رحمۃ اللہ علیہ زہد و تقویٰ اور خدا ترسی و پارسائی میں بہت آگے تھے اور ولی کامل سمجھے جاتے تھے، آپ کی بزرگی اور ولایت کا شہرہ دُور دُور تک تھا، قاضی محمد رؤف صاحب کے دور میں مبارک پور کے نائب قاضی تھے، مگر ۱۲۴۷ھ میں ایسے واقعات ان سے ظہور پذیر ہوئے، جو خلاف شرع معلوم ہوتے تھے اور باوجود زہد و تقویٰ و طہارت و پارسائی و بزرگی کے آپ ان کی وجہ سے شرعی امور و معاملات کے ذمہ دار اور نگران نہیں بن سکتے تھے، اس لیے قاضی محمد رؤف صاحب نے ان کی جگہ ان کے بھائی شیخ محمد رضا کو نیابتِ قضا کا عہدہ سپرد فرمایا، چوں کہ شیخ حسام الدین صاحب اس واقعہ کے بعد قانونی طور سے وعظ و ارشاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دوسرے شرعی معاملات میں مجاز و ذمہ دار نہیں رہ گئے تھے، حالاں کہ ان کی زندگی ان ہی دینی کاموں میں گزری تھی، اس لیے وہ اس کے بعد درس و تدریس میں لگ گئے اور اسی دینی و علمی خدمت میں باقی زندگی گزار دی، آخر وقت میں مجذوبانہ طور پر رہتے تھے۔

لوگوں کا بیان ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے طے الارض کی کرامت سے نوازا تھا، بسا اوقات ایسا ہوا کہ لوگوں نے ان سے کہیں چلنے کے لیے کہا اور انھوں نے کہا کہ چلو میں آتا ہوں، اس کے بعد دیکھا گیا تو وہ وہاں پہلے سے موجود رہا کرتے تھے، ان کے اس طرح کے واقعات اب بھی بعض لوگ بیان کرتے ہیں، خاندانی روایات کے مطابق شیخ حسام الدین شاہ صاحب باہر کسی مقام پر مدّس تھے اور وہیں سخت بیمار پڑے تو اٹھا کر مبارک پور لائے گئے، وہ عوام و خواص میں ”حسامی بابا“ کے لقب سے مشہور تھے۔

۹/ ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ کو مبارک پور میں انتقال فرمایا، مولانا عبد العظیم

صاحب رسول پوری نے اپنی ایک کتاب میں یادداشت کے طور پر ان کی تاریخ وفات ان تاثرات والفاظ کے ساتھ درج کی ہے اور آپ کو اولیائے کاملین میں شمار کیا ہے:

”حسام الدین شاہ از اولیائے کامل مبارک پوری انتقال کردہ بمہ جمادی الاولیٰ

روز چہار شنبہ تاریخ ۹ و بقول بعض ۱۰ کہ شش گھنٹہ روز باقی بود ۱۲۹۷ھ۔“

آپ کی قبر گولہ بازار میں مسجد کے پیچھے کے صحن میں تھی، جہاں اکھاڑہ ہے، اب سے پہلے یہاں ربیع الاول یا جمادی الاولیٰ میں درگاہ اور عرس کی تقریب ہوتی تھی۔

شیخ محمد رجبؒ

شیخ محمد رجب بن شیخ محمد رضا بن شیخ امام بخش بن شیخ علی رحمہم اللہ اس خانوادہ قضاۃ و مشیخت کے خاندانی عہدہ اور روایت کے آخری فرد تھے، جن پر صدیوں کی روایت کا خاتمہ ہو گیا، انگریزی حکومت نے اسلامی عدالتوں کو بند کر کے عام قانونی عدالتیں قائم کیں، جن کی وجہ سے رہی سہی اسلامی روایت اور اس کے حاملین ختم ہو گئے، قاضی محمد سلیم صاحب نے ۱۵/رمضان ۱۲۵۱ھ کو شیخ امام بخش کو جو سند نیابت عطا کی تھی، اس میں شیخ محمد رجب کا نام بھی سرنامہ میں شامل ہے۔

ان کے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور امور شرعیہ کے سلسلے میں خاندانی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ زبردست عالم اور نہایت متقی و دین دار بزرگ تھے، ساتھ ہی اسلامی شان و شوکت کے مالک تھے، خاندانی رسم کے مطابق پاکی نشینی ان کے دور تک قائم رہی، جب ان کی پاکی نکلتی تھی تو ارباب علم و فضل اس کے دائیں بائیں چلتے تھے، عموماً جمعہ کی نماز پڑھانے کے لیے پاکی ہی پر جایا کرتے تھے، ان کے پاس خاندانی مخطوطات و نوادرات اور قلمی کتابوں کا بیش بہا کتب خانہ تھا، جسے بعد میں لوگوں نے راجہ صاحب کی مسجد کے پاس

والے کنویں میں ڈال دیا۔

البتہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف، تسبیح و عصا خاندان میں موجود تھے، مگر بعد میں یہ تبرکات و متروکات بھی ضائع ہو گئے، راقم کو ان کا مملو کہ مجموعہ خطب مولانا اسماعیل شہید محلہ پرانی بستی کی ایک مسجد سے دستیاب ہوا ہے، جو مطبوعہ ہے اور اس پر آپ کے ہاتھ کی تملیک کی تحریر اور دستخط موجود ہیں اور اس کے آخر میں آپ کے ہاتھ سے نہایت عمدہ عربی جلی خط میں خطبہ ثانیہ اور خطبہ عیدین لکھا ہوا ہے، جس پر ۱۲۹۷ھ درج ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید اور دوسرے مجاہدین کو مسلمانوں کا ایک طبقہ مورد الزام ٹھہراتا تھا اور ان کی تکفیر و تفسیق کرتا تھا، ان کی کتابوں کو گھروں میں رکھنا اور ان کو ہاتھ لگانا حرام سمجھتا تھا، اس زمانے میں شیخ محمد رجب صاحب مولانا مرحوم کے خطبات، جمعہ اور عیدین میں پڑھتے تھے، چوں کہ ۱۲۵۱ھ میں آپ کم عمر تھے، اس لیے نام کے ساتھ سند میں لفظ شیخ نہیں ہے۔

آپ کی وفات ۱۲۹۷ھ کے بعد تیرہویں صدی کے خاتمے پر ہوئی اور آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

شیخ محمد رجب صاحب کے دو صاحب زادے تھے، میاں جی حاجی لعل محمد اور میاں جی ولی محمد، میاں جی حاجی لعل محمد صاحب زندگی بھر کسی نہ کسی درجے میں خاندانی روایات کے حامل رہے، حج و زیارت کی دولت بھی پائی تھی، ان کے چار صاحب زادے تھے: (۱) میاں جی عبداللہ متوفی دوشنبہ ۱۵ رجب ۱۳۵۷ھ (۲) میاں جی حاجی اسد اللہ متوفی شنبہ ۲۵ صفر ۱۳۸۲ھ (۳) میاں جی حاجی محمد حسین متوفی ۲۵ رجب ۱۳۶۵ھ (۴) میاں جی حاجی محمد حسن صاحب جو راقم کے والد ماجد ہیں اور ابھی الحمد للہ حیات ہیں۔ (۱)

(۱) ۲۸ فروری سن ۱۹۷۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔

میاں جی عبداللہ سب بھائیوں میں بڑے تھے اور بڑے قد و قامت، رعب و داب اور سمجھ بوجھ کے آدمی تھے، میاں جی شیخ علی مرحوم کی شہ زوری اور پہلوانی کی جھلک ان میں پائی جاتی تھی، ان کا ذکر تاریخ المنوال میں ہے، ان سے چھوٹے میاں جی حاجی اسد اللہ تھے، ان میں خاندانی روحانیت کا رنگ نمایاں تھا، صوفیا اور اہل دل کی صحبت سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، ان سے چھوٹے میاں جی محمد حسین نیابت قضاء کی رہی سہی روایت کی ذمہ داری سنبھالتے تھے، نکاح خوانی، جمعہ و عیدین وغیرہ کی امامت کرتے تھے، ویسے نکاح خوانی کا کام آج بھی جاری ہے۔

میاں جی حاجی محمد حسن سب بھائیوں سے چھوٹے ہیں، اس وقت ان کی عمر ۸۲ سال کی ہے، ۱۱ ربیع الاول ۱۳۹۸ھ مطابق ۲۸ فروری ۱۹۷۸ء شنبہ کا دن گزار کر رات میں ۹ بجے انتقال فرمایا اور دوسرے دن بدھ کو بعد نمازِ ظہر روضہ میں دفن کیے گئے، میاں جی ولی محمد کے دو لڑکے ہوئے ایک میاں جی محمد شفیع مرحوم اور دوسرے میاں جی حاجی محمد عمر جو حیات ہیں۔ (ماثر و معارف ص ۳۶۰ و ۳۶۱)

تقریباً ۸۰ سال کی عمر میں شنبہ ۱۷ جمادی الثانی ۱۳۹۵ھ / ۲۸ جون ۱۹۷۵ء چھ بجے شام کو فوت ہوئے اور دوسرے دن صبح ۸ بجے روضہ میں دفن کیے گئے، اس وقت میں وطن میں تھا اور تجہیز و تکفین میں شریک رہا۔

مولانا حکیم امان اللہ

مولانا حکیم امان اللہ صاحب اپنے زمانہ میں مبارک پور کے اطباءِ حُذّاق میں سے تھے، ساتھ ہی قصبہ کے مہتر و سردار تھے، اسی لیے مرجع ہر خاص و عام تھے، حکیم صاحب مولانا عبدالسلام صاحب مبارکپوری مصنف ”سیرۃ البخاری“ کے نانا تھے اور شاہ ابواسحاق لہراوی سے شرف تلمذ رکھتے تھے۔

مولانا عبدالسلام صاحب نے ”سیرۃ البخاری“ میں ایک مقام پر حاشیہ میں لکھا ہے:
 ”ثم اعلم أن اسم جدي الفاسد میرے نانا کا نام امان اللہ تھا، وہ قوم کے بہتر
 (ابو اُمی) أيضاً كان أمان الله وكان اور سردار تھے، ساتھ ہی طبیب تھے، ان کے
 رئیس القوم طبیباً مرجعاً للخلائق یہاں لوگوں کی بھیڑ بھاڑ رہا کرتی تھی، انھوں
 متوفی ۱۲۹۹ھ وقد تلمذ علی الشيخ نے شاہ ابواسحاق صاحب لہراوی سے تعلیم
 الشهير فی الآفاق الشاہ اُبی اسحاق حاصل کی تھی، ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔
 اللہ راوی“ (سیرۃ البخاری ص ۳۸)

جیسا کہ اس عبارت سے معلوم ہوا ان کی وفات ۱۲۹۹ھ میں ہوئی۔

مولوی دھنا سے

مولوی دھنا سے صاحب کا نام معلوم نہیں، غالباً عبداللہ تھا، وہ اسی عرفیت سے
 مشہور تھے، گرہست، دھنی اور دھنا سیٹھ کے الفاظ پہلے زمانے میں قصبہ میں صاحب مال
 و ثروت کے لیے استعمال ہوتے تھے، دھنا سے دھنا سیٹھ کی بگڑی ہوئی شکل ہے، مولوی
 صاحب اس زمانے کے مالداروں میں سے تھے، اسی لیے اس لقب سے مشہور ہو گئے۔
 محلہ پرانی بستی میں مکان تھا، شاہ ابواسحاق لہراوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے
 اور اکثر کتب درسیہ ان ہی سے پڑھی تھیں، علم و عمل اور وضع قطع میں سلف کا نمونہ اور اپنے شیخ
 کا آئینہ تھے اور صاحب باطن بزرگ تھے، لمبی عمر پائی تھی، آخری وقت میں آنکھوں سے
 معذور ہو گئے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک مرتبہ اپنے دروازے کے کنویں میں گر گئے اور اندر سے آواز
 دینی شروع کی کہ میں نالی میں گر گیا ہوں، آکر مجھے نکالو، جب لوگوں نے آواز سنی تو دوڑے

ہوئے گئے اور دیکھا کہ مولوی صاحب کنویں کے اندر نہایت اطمینان سے کھڑے ہیں اور پانی معتاد سے بہت کم ہے، ان کو نکالا گیا اور کہیں خراش تک نہیں آئی تھی۔

ان کے پاس نہایت قیمتی کتب خانہ تھا، جس میں مختلف علوم و فنون کی بہت سی کتابیں تھیں، اس کی دو قلمی کتابیں مولانا عبد العظیم صاحب رسول پوری کے کتب خانے میں اب تک موجود ہیں، ایک ”تحفۂ اثناء عشریہ“ اور دوسری ”نہج البلاغت“، تحفۂ اثناء عشریہ کی زیارت راقم نے کی ہے، نہایت اچھی حالت میں ہے، خط متوسط درجے کا ہے اور نہج البلاغت کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ عربی خطاطی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے اور نہایت پاکیزہ جلی خط میں لکھی ہوئی ہے، اس قیمتی نسخہ کو مولوی صاحب نے اپنے زمانے میں چالیس روپے میں خریدا تھا، اس سے ان کے علمی ذوق کا پتہ چلتا ہے، اپنے شیخ شاہ ابواسحاق لہراوی کے طرز پر پوری زندگی بسر کی اور تیرہویں صدی کے آخر میں انتقال فرمایا، ان ہی کے صاحب زادے حافظ عبد اللطیف صاحب امام جامع مسجد راجہ صاحب متوفی ۱۳۳۴ھ تھے۔

(یہ حالات مولانا عبد الباقی صاحب رسول پوری نے بیان کیے ہیں)

مولوی نرہو

مولوی نرہو صاحب صوفی پورہ کے رہنے والے تھے، مذہباً اثنا عشری شیعہ تھے، آپ بھی شاہ ابواسحاق لہراوی کے تلامذہ میں سے تھے، استاد اور شاگرد اگرچہ مسلک کے اعتبار سے مختلف تھے، مگر دونوں میں تعلقات نہایت خوشگوار تھے، شاہ ابواسحاق صاحب اپنے اس شاگرد سے بہت بے تکلف تھے، ان کے ساتھ نہایت محبت کا برتاؤ کرتے تھے، مولوی نرہو بھی اپنے شیخ کی عقیدت و محبت میں بہت آگے تھے۔

استاد کی تعلیم نے ان کو اہل سنت والجماعت سے اتنا قریب کر دیا تھا کہ وہ بلا تکلف

و بلا تردد اہل سنت کے ساتھ ان کی مسجدوں میں نماز باجماعت ادا کرتے تھے، یہاں تک کہ اگر سنی مسجد میں اقامت ہونے والی ہوتی اور مولوی نہ ہو آجاتے تو تھوڑی دیر کے لیے اقامت روک دی جاتی، تاکہ وہ بھی وضو وغیرہ کر کے جماعت میں شریک ہو جائیں۔

ایک مرتبہ باتوں بات میں شاہ ابواسحاق صاحب نے ان سے فرمایا کہ تمہارے یہاں ایک بچہ پیدا ہوگا، جو اپنا نام لے کر آئے گا، چنانچہ چند ماہ کے اندر ان کے یہاں پوتا پیدا ہوا، جس کے ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں، بعد میں وہ چھنگا کی عرفیت سے مشہور ہوا، یہ لڑکا طبیب حاذق ہو کر چھنگا کے نام سے مشہور ہوا، بعد میں حکیم چھنگا مبارک پور سے مالگواں چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا، ۱۸۱۳ء (۱۲۲۸ھ) کی جنگ میں فساد یوں نے مولوی نہ ہو کا گھر بھی لوٹا اور ان کے بہت سے مال و اسباب لے گئے، اس کا ذکر عرضداشت میں یوں ہے:

”----- گور پرشاد جمعدار گوری پرشاد جمعدار تھانہ پرگنہ نے بھی تیس عدد تھانہ پرگنہ کہ اوہم سی عدد تھانہ مشروع کے تھان، کچھ ریشم و ستر اور پہننے والے مشروع و چیزے ریشم و ستر و پارچہ کپڑے بھی جہلی و رمضان و زہونور بانوں کے ملبوس از جہلی و رمضان و زہونور بانان گھروں سے لوٹ کر لے گیا۔ (قمر) غارت گری کردہ بود۔-----“

یہ حالات مولوی حکیم عبدالجید صاحب بکھری والے وفات بعارضۃ فاج التوار ۸/ رجب ۱۳۹۷ھ / ۲۶/ جون ۱۹۷۷ء تدفین دوشنبہ کو عائشہ تالاب اونچی تکیہ سے معلوم ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالوہاب سریانویؒ

شیخ عبدالوہاب سریانوی حضرت شاہ ابواسحاق صاحب لہراوی کے معاصر تھے،

باقاعدہ عالم نہیں تھے، مگر ارباب علم و فضل کی صحبت اور بقدرِ ضرورت تعلیم اور ذاتی صلاحیت نے آپ میں جو ہر قابل پیدا کر دیا تھا، شہیدین سعیدین کی تحریک جہاد کے ہمنواؤں میں تھے، جب کہ املو کے شیخ محمد اکبر غازی اور شیخ الہی بخش غازی اس کے شرکاء میں تھے۔

شیخ عبدالوہاب عنفوانِ شباب میں مبارک پور سے پیدل سفر کر کے دہلی شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی متوفی ۱۲۴۸ھ کی خدمت میں پہنچے اور کچھ دنوں ان کی خدمت میں رہ کر کسب فیض کیا، جب واپس ہونے لگے تو حضرت شاہ صاحب نے ان کو اپنے فتاویٰ کا ایک مجموعہ عنایت فرمایا اور کہا کہ عبدالوہاب تمہارے دیار میں ان دنوں اہل علم کی کمی ہے، اس کتاب سے تم کو اور وہاں کے مسلمانوں کو فائدہ ہوگا، اس متبرک نسخہ کے کچھ اجزاء بعد تک اس خاندان میں محفوظ تھے، جن کو شیخ صاحب کے صاحب زادے حافظ شاہ نظام الدین نے مولانا عبدالعلیم رسول پوری کو دیگر بہت سی علمی کتابوں کے ساتھ دے دیا تھا اور اب وہ راقم کے پاس محفوظ ہے۔

اس دیار کے ایک اور عالم مولوی حافظ غلام علی بن نجیب اللہ عباسی چریاکوٹی متوفی ۱۲۴۸ھ نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے دہلی جا کر تعلیم کی تھی۔

(تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۵)

جب مولوی کرامت علی جون پوری متوفی ۱۲۶۴ھ مبارک پور اور سریاں وغیرہ آئے تو شیخ صاحب رات دن کسب فیض میں لگے رہتے تھے۔

افسوس کہ ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہ مل سکیں اور مستند طریقے سے اتنا ہی مل سکا، اولاد میں جناب حافظ نظام الدین صاحب رضا سریانوی بہت بزرگ اور باخدا انسان گزرے ہیں۔ (البلاغ بمبئی ربیع الاول ۱۳۹۰ھ و صدق جدید لکھنؤ ۱۳۹۲ھ)

مولوی جان محمد

مولوی جان محمد محلہ شاہ محمد پور کے رہنے والے تھے۔

”واقعات و حادثات مبارک پور“ کی ایک تحریر سے ان کا کچھ حال معلوم ہوا ہے، ہم یہاں پر وہ عبارت نقل کرتے ہیں:

”مرزا ولی بیگ تھانیدار مبارک پور نے سات برس تک بڑے کروفر کے ساتھ تھانیداری کی اور تاریخ ۲۶ صفر شب جمعہ ۱۲۵۶ھ انتقال فرمایا، تاریخی مصرعہ ”روانہ سوئے جنت از قضا شدہ“ ہے اور ان کی تاریخ مولوی جان محمد صاحب ساکن محلہ شاہ محمد پور من مَحَلَّاتِ قصبہ مبارک پور نے یہ کہی ہے:

(رباعی)

در کشور انصاف ولی بیگ سر آمد در خلق خدا منبع فضل و ہنر آمد

از دار فناء رفتہ سوئے منزل فردوس تاریخ و فائقش بہ غم و درد برآمد

”لفظ ”بہ غم و درد“ کے عدد سے ۱۲۵۶ھ برآمد ہوتے ہیں، مرزا بیگ نے جو مجلس

قصبہ مبارک پور میں کی اور اچھے اچھے مرثیہ خواں بلائے، اس کا بیان بہت طویل ہے

اور ضرورت نقل کی نہیں ہے۔ (واقعات و حادثات مبارک پور ص ۳۵)

مولوی جان محمد صاحب علمائے شیعہ میں تھے اور تیرہویں صدی کے نصف آخر میں فوت ہوئے۔

مولوی بشارت علی فیض آبادی

مولوی بشارت علی تیرہویں صدی کے نصف اول میں تھے اور غالباً اثنا عشری

شیعہ تھے۔

”واقعات و حادثات مبارک پور“ میں حادثہ پنجم کے سلسلے میں ان کا حال صرف اتنا درج ہے کہ ایک شخص مسمیٰ بشارت علی تھے اور رہنے والے تھے، نگہور جلال پور ضلع فیض آباد کے اور اس وقت لالہ مہتر کے امام باڑے میں درس دیتے تھے۔

(واقعات و حادثات مبارک پور ص ۲۳)

مولوی عنایت اللہ امام جامع مسجد

مولوی عنایت اللہ جامع مسجد راجہ صاحب کے امام تھے، ۱۲۸۰ھ میں جامع مسجد میں تعمیر و توسیع ہوئی، اس ضمن میں ”واقعات و حادثات مبارک پور“ میں آپ کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

”واسطے وسعت و کشادگی فرش کے ایک روز مولوی عنایت اللہ جو جامع مسجد کے امام تھے، بعد نماز جمعہ کے مع چار پانچ شخص دوسرے دانش مندوں کے ان باتوں کا مذاق اور چھیڑ چھاڑ کیا اور کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ باعث تنگی فرش کے نمازیوں کو از حد تکلیف ہوتی ہے، کوئی ایسی تدبیر ہو کہ جس کے سبب سے مصلیوں کو اطمینان ہو، اور بہ سبب نشیب و فراز زمین کے بیرون فرش اکثر لوگ اپنی چادر ڈال کر شریک جماعت ہوتے ہیں، کہیں جگہ جوتا اتارنے کی باقی نہیں رہتی، اگر آپ بقدر مقدر اپنے اس بارے میں مدد کریں تو یہ تکلیف رفع ہو جائے، کیوں کہ اس کام میں ہزاروں روپیوں سے زیادہ کا صرفہ ہے، یہ رائے سب کو پسند آئی اور بروز جمعہ آئندہ بعد فراغ نماز کے بمقابلہ کل مصلیوں کے کیفیت مجوزہ کا خلاصہ بیان ہوا، ہر کسی کو یہ پسند ہوا اور بر غبت تمام ہر شخص نے حسب حیثیت چندہ دینے کا اقرار کیا اور ۱۲۸۲ھ میں ترمیم دیوار احاطہ و فرش و غسل خانہ کی ہوئی اور چاہ پختہ تیار ہو گیا۔“

(واقعات و حادثات مبارک پور ص ۸۷، ۸۸)

غازی عبدالسبحان الملوئیؒ

غازی عبدالسبحان بن بابو الملوئی، غازی محمد اسماعیل الملوئی اور غازی محمد اکبر الملوئی مجاہدین بالاکوٹ کی صفوں میں داخل ہو کر املو سے میدان کارزار کو روانہ ہوئے۔ واقف حال لوگوں کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں غازی عبدالسبحان نے خواب دیکھا کہ وہ مجاہدین کا کھانا تیار کر رہے ہیں، اسی اثناء میں ان کو غنیم کی فوج کی گولی لگی اور وہ جاں بحق ہو گئے، دوسرے دن ان کے ساتھ بعینہ یہی واقعہ پیش آیا اور وہ اسی طرح جامِ شہادت نوش کر کے شہیدوں میں شامل ہو گئے، ان کے خاندان کے لوگ املو اور لوہیا میں آباد ہیں۔ (مقدمہ اہل حدیث اور سیاست ص ۱۳)

غازی محمد اسماعیل الملوئیؒ

غازی محمد اسماعیل الملوئی محاذِ جنگ پر گئے تو آج تک ان کی کوئی خبر نہ مل سکی کہ انھوں نے جامِ شہادت کب نوش کیا۔

شیخ محمد اکبر غازی الملوئیؒ

شیخ محمد اکبر غازی الملو کے رہنے والے تھے، حضرت سید احمد بریلویؒ کی تحریکِ جہاد کے سرگرم غازیوں اور مجاہدوں میں تھے، سید صاحب کی امامت و امارت میں حدودِ افغانستان میں پانچ چھ سال تک جہاد میں حصہ لیا، یہاں تک کہ ۲۴/۲ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ میں بالاکوٹ کے مقام پر حضرت سید احمد اور حضرت مولانا اسماعیل کی شہادت ہو گئی، اس کے بعد جماعتِ مجاہدین متفرق ہو گئی، اس میں سے کچھ لوگ اسی طرف رہ گئے اور کچھ لوگ اپنے وطن چلے

گئے، شیخ محمد اکبر اپنے وطن واپس آ گئے۔

غازی محمد اکبر ملوی دومرتبہ محاذ جنگ پر گئے اور واپس آئے، تیسری مرتبہ جاتے ہوئے پٹنہ میں گرفتار ہو گئے اور ان کے بارے میں گواہی کے لیے املو سے عبدالقدیر، محمد موسیٰ اور عبدالغفار صاحبان پٹنہ گئے، ان لوگوں کی گواہی پر غازی صاحب موصوف کو قید فرنگ سے رہائی ہوئی، مگر ان کی پیشانی کو جلتے ہوئے سرخ لوہے سے داغ دیا گیا، اس کے بعد غازی محمد اکبر صاحب سرحد نہ جاسکے اور اپنے وطن میں رہ کر مجاہدین کی امدادی خدمت انجام دیتے رہے، ان کی تنہا یادگار ان کے صاحب زادے میاں جی محمد یحییٰ مرحوم تھے، جو نہایت متقی پرہیزگار انسان تھے، ان کی پوری زندگی علم دین کی خدمت میں گزری، ان کی وفات وطن سے دور موضع شاہ پور میں ہوئی، جہاں وہ تعلیم دیتے تھے۔

(مقدمہ اہل حدیث اور سیاست ص ۱۳، ۱۴)

مبارک پور، املو اور لوہیا سے مستقل اعانتی رقمیں عرصہ دراز تک مرکز مجاہدین میں بھیجی جاتی رہیں، اس کام کے لیے مولانا عبداللہ غازی پوری بارہا املو آئے، آخر میں مولوی اسد اللہ روانوی یہاں آتے اور مجاہدین سرحد کی مالی اعانت کے لیے رقوم حاصل کر کے معینہ مقامات کو بھیجتے تھے، لیکن چونکہ اس طرح کا کام نہایت رازداری سے انجام پاتا تھا، اس لیے اس کی تفصیلات کا علم نہ ہو سکا۔ (مقدمہ اہل حدیث اور سیاست ص ۱۶)

ان کے صاحب زادے میاں جی محمد یحییٰ نہایت صالح اور بزرگ انسان تھے، آخری دور میں ان پر مراق کا حملہ ہو جاتا تھا اور جب یہ کیفیت ہوتی تو مسجد میں چلے جاتے اور وہیں نماز میں مشغول رہا کرتے تھے، یہاں تک کہ مزاج میں اعتدال پیدا ہو جاتا تھا۔

شیخ الہی بخش غازی الملوئیؒ

شیخ الہی بخش الملوئی بھی حضرت سید احمد بریلوی کے ہمراہ جہاد کے لیے روانہ ہو گئے اور سرحد میں مجاہدین کی جماعت سے وابستہ ہو گئے، مگر اثنائے جہاد میں وطن واپس چلے آئے تھے، ان کے جہاد سے واپس آ جانے کی وجہ سے لوگ ان کی امامت سے بچتے تھے، ایک سو پندرہ سال کی عمر میں الملوئی انتقال کیا۔

شیخ جہانگیر غازی الملوئیؒ

آپ بھی سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد کے سرگرم غزاۃ و مجاہدین میں سے تھے، الملوئی جہاں گیر بابا کی مسجد آپ ہی سے منسوب ہے، جسے آپ نے اپنے مکان کے ایک حصے میں بنایا تھا۔

مولانا عبدالحق بن شیخ جہاں گیر الملوئی مشہور علماء میں سے تھے، جو علامہ ابو محمد عبدالحق اعظم گڑھی کے نام سے مشہور ہیں، امام ابن جوزی کی ”تلبیس ابلیس“ کا اردو میں ترجمہ ان ہی کا ہے۔

مولانا حافظ خدا بخش مہاجر مکی

مولانا حافظ خدا بخش بن شیخ حاجی سمن بن شیخ عیسیٰ مبارک پوری مہاجر مکی کا آبائی وطن گجڑا تھا، ان کے دادا شیخ عیسیٰ اپنے خاندان سمیت مبارک پور کی پرانی بستی میں آباد ہوئے، یہاں آنے پر ان کے دولڑکے شیخ سمن اور شیخ بیو خوب پھلے پھولے اور صاحب دولت و ثروت ہوئے، دینی اعتبار سے بھی یہ گھرانہ ممتاز تھا۔

حافظ صاحب کے والد حاجی سمن متمول اور مخیر تاجر تھے، غربا و مساکین کی خبر گیری کرنے میں مشہور تھے، مبارک پور کے سنگی غلطے کی تجارت تھی اور یہاں سے حیدر آباد دکن تک تجارتی سلسلہ جاری تھا، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انھوں نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا تھا، اپنے دروازے پر انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کا جھنڈا لہرایا اور اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

حافظ صاحب نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی اور کیا کیا علوم حاصل کیے، اس کے بارے میں قطعی معلومات نہیں ہیں، مگر اغلب گمان ہے کہ انھوں نے شاہ ابواسحاق لہراوی سے پڑھا ہے، ان کی کتابوں میں کریم، مامقیمان، گلستاں، بوستاں، یوسف زلیخا، میزان منشعب، شرح مآۃ عامل، پنج گنج وغیرہ بعد میں پائی گئی، اس زمانہ میں خانگی مکاتب و مدارس کا رواج عام تھا اور اس دیار میں بڑی درس گاہ شاہ ابواسحاق صاحب کا مدرسہ تھی اور یہاں کے طلباء وہیں جاتے تھے۔

حافظ صاحب باوجود دے کہ خوشحال اور متمول خاندان کے چشم و چراغ تھے، نہایت سیدھے سادے، پاک نفس، منکسر المزاج، خدا ترس، غریب نواز اور ذاکر و شاعر بزرگ تھے، کبھی کبھی ان پر جذب کی حالت طاری ہو جاتی تھی، جو بسا اوقات کئی کئی دن تک رہتی تھی، ان دنوں جوشِ عبادت اور ذوقِ بندگی بہت بڑھ جاتا تھا۔

اکثر گھر سے غائب ہو جاتے تھے اور تلاش کرنے پر اپنے آبائی وطن گجڑا کی شاہی مسجد میں معتکف پائے جاتے، یا پھر خیر آباد کے قریب ملک جعفر کے خطیرے میں ملتے، یہ دونوں مقامات اہل دل کے لیے سکون بخش تھے۔

حافظ صاحب کے بارے میں یہ بھی عام طور سے مشہور ہے کہ کبھی کبھی جب جذب کے عالم میں ہو جاتے تو گھر والے ان کو مکان میں اس لیے بند کر دیتے تھے کہ اس حال میں

باہر نہ جائیں، مگر وہ اندر ہی اندر کھیل چھت اُدھیڑ کر چھت کے اوپر چڑھ جاتے تھے اور ان کو سیڑھی کے ذریعہ اتاراجاتا تھا، حالاں کہ چھت بالکل صحیح و سالم ہوتی تھی۔

انتہائی تقویٰ و طہارت اور عبادت و ریاضت کے ساتھ حافظ صاحب نہایت کامیاب تاجر اور صاحب ثروت آدمی تھے، ان کے کاروبار میں برکت تھی اور ہر کام میں نفع ہوتا تھا، تجارت میں احتیاط اور تقویٰ کا یہ حال تھا کہ ان کے زمانے میں پیسوں کی طرح کوڑیاں بھی بازار میں چلتی تھیں، اگر کسی آدمی سے حساب و کتاب کے سلسلے میں کوڑی دو کوڑی کا معاملہ ہوتا تھا تو حافظ صاحب یا تو معاف کر کے اپنا اس کا حساب بیباق کر دیتے، یا اس سے معاف کر اکر خود اس سے سبکدوش ہو جاتے تھے۔

اپنے والد کی خدمت ان کا بہترین مشغلہ تھا، رات میں جب تک والد سو نہ جاتے، ان کی خدمت کرتے رہتے تھے، ہر نماز کے وقت ان کے لیے وضو کا پانی رکھنا اور قضائے حاجت کے لیے لوٹالے کر ان کے ساتھ میدان آنا جانا حافظ صاحب کے معمولات میں تھا۔ ضرورت مند لوگوں کی حاجت روائی کے لیے بڑے انشراح کے ساتھ قرضہ دیا کرتے تھے، مگر پہلے پوچھ لیتے کہ کب ادائیگی ہوگی، اس وقت تک کچھ نہ بولتے اور اگر وعدہ خلافی ہوتی تو اخلاقی دباؤ سے وصول کرتے، یہاں تک کہ کاروبار کے سلسلے میں اگر ان کے والد کبھی ان سے قرض لیتے تو ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرتے تھے اور جب تک وہ قرض ادا نہیں کرتے تھے، ان کی چادر یا رومال پکڑے رہتے تھے۔

نہایت خاموش، کم سخن اور ذاکر و شافل بزرگ تھے، شکوہ و شکایت اور غیبت سے بہت دُور رہتے تھے، دوسرے لوگ بھی ان کے سامنے اس قسم کی باتیں نہیں کرتے تھے، ان کے تقویٰ کا رعب ہر خاص و عام پر چھایا رہتا تھا، حافظ صاحب غربا و مساکین کے حالات معلوم کر کے خفیہ طور سے مدد کیا کرتے تھے۔

اس سلسلے میں یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ ان کے پڑوس میں ایک غریب آدمی تھا، اس کی بیوی اکثر لڑائی جھگڑا کرتی اور گھر سے بھاگ جاتی تھی، حافظ صاحب نے اس آدمی سے وجہ معلوم کی تو اس نے کہا کہ میں غریب آدمی ہوں، میرے پاس کھانے تک کا انتظام نہیں ہے اور میری بیوی مجھ سے زیورات کا مطالبہ کرتی ہے، حافظ صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے اور وہ آدمی چلا گیا، پھر کچھ دنوں کے بعد اسے کھجوا تالاب کے ایک گھاٹ پر بلایا، جہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں تھا اور اسے زیورات کی ایک تھیلی دے کر کہا کہ یہ زیورات اپنی بیوی کو دے دو، مگر اس کا تذکرہ کسی سے نہ کرنا۔

انھوں نے مکہ مکرمہ کے لیے تین بار سفر کیا، دوبار واپس آئے اور تیسری بار اپنے مقصد میں کام یاب ہو گئے، پہلی بار جب سفر حجاز کا قصد کیا تو گھر کے جملہ سامان مہیا کیے اور اہل خانہ کے آرام و آسائش کی ہر چیز زیادہ سے زیادہ خرید کر رکھ دی اور بلا کسی کو خبر کیے روپیہ لے کر نکل گئے، گھر کے لوگ ان کے معاملات میں تعرض نہیں کرتے تھے، اس لیے کسی نے ان سے پوچھ گچھ نہیں کی، مگر چند دنوں کے بعد خالی ہاتھ واپس آ گئے اور حسب معمول کاروبار میں مشغول ہو گئے، تیسری بار اسی طرح روانہ ہوئے تو منزل مقصود تک پہنچنے میں کام یاب ہو گئے اور مکہ معظمہ میں مستقل قیام اختیار کر لیا۔

حجاج سے ان کی خیریت معلوم ہوتی رہتی تھی، مگر گھر آنے کے لیے تیار نہیں تھے، چند سالوں کے بعد ان کی ایک رشتہ دار مالدار خاتون اپنے سرمائے سے اپنے نابالغ لڑکے ساتھ حج کو گئیں اور انھوں نے حافظ صاحب کو تلاش کرایا تو ایک دن طواف کرتے ہوئے نظر پڑے، انھوں نے بلایا اور بتایا کہ آپ کے بیوی بچے اور گھر والے بہت یاد کرتے ہیں، اب وطن چلنے کی تیاری کریں، کرایہ میں دیتی ہوں، حافظ صاحب نے ان باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا اور وہاں سے اٹھ کر چلے گئے، اس کے بعد تلاش کرنے پر بھی نہیں ملے۔

اس کے بعد حافظ صاحب کے رشتے کے بھتیجے حاجی محمد علی حج کو گئے اور ان کو بہت تلاش کیا، مگر نہیں ملے، ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ جمعہ کی نماز کے بعد حرم محترم میں منبر کے قریب ایک شخص بیٹھا ہوا تھا، جب میں اس کی طرف دیکھتا تھا تو وہ مجھے اشارے سے بلاتا تھا، اس وقت حافظ صاحب کا خیال نہیں آیا اور سوچا کہ یہاں مجھے کون بلا سکتا ہے، مگر بعد میں خیال آیا کہ ہونہ ہو، یہ چچا حافظ خدا بخش ہوں اور نماز کے بعد ان کو بہت تلاش کیا، مگر نہیں ملے۔

البتہ تلاش بسیار کے بعد اتنا معلوم ہوا کہ ایک ہندوستانی آدمی حافظ خدا بخش نامی مکہ کے باہر کہیں رہتے ہیں اور روزانہ حرم میں آتے ہیں، مگر ادھر چند ماہ سے نظر نہیں پڑے، حاجی محمد علی خود بھی بہت بزرگ آدمی تھے، ان کا بیان ہے کہ چچا صاحب سے میری ملاقات خواب میں ہوتی رہتی ہے اور وہ مجھے اور ادو و ظائف بتایا کرتے ہیں، اس کے سوا کوئی بات نہیں ہوئی۔

حافظ صاحب کا انتقال چودھویں صدی کی ابتداء میں مکہ مکرمہ میں ہوا، ان کی شادی محلہ پورہ رانی میں شیخ عبدالسبحان بن شیخ پکھن کی صاحبزادی مسماۃ وجہین سے ہوئی تھی، ان کے بطن سے حافظ صاحب کے دو لڑکے عبدالرحمن اور عبدالرحیم تھے۔

ثانی الذکر عنفوان شباب میں انتقال کر گئے اور شیخ عبدالرحمن نے بڑی عمر پائی، ان میں اپنے والد کی جھلک پائی جاتی تھی، تقریباً سو سال کی عمر میں ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ/ ۲۹ اگست ۱۹۵۳ء کو انتقال کیا، اس سال ایام حج میں معلوم ہوا کہ مولوی خدا بخش نے مکہ مکرمہ میں متاثر زندگی بسر کی، ان کے دو لڑکے احمد اور عبدالرحیم تھے، شیخ احمد کی صاحبزادی معلم محمود بخاری کی بیوی ہیں، جو ابھی حیات ہیں اور ان کے کئی اولاد ہیں، جیسا کہ معلم بخاری نے خود مجھ سے بیان کیا ہے۔

منشی حبیب اللہ حبیب

جناب منشی حبیب اللہ صاحب محلہ کٹرہ کے مشہور شاعر اور روحانی بزرگ تھے۔
نمود سحر میں ہے کہ تقریباً ایک صدی پہلے محلہ کٹرہ میں ایک عالم متصوف اور شاعر
فطرت شناس پیدا ہوا، جس کی رگ و پے میں علوم و فنون کا خونِ صالح جاری و ساری تھا اور
جسے دنیا منشی حبیب اللہ کے نام سے یاد کرتی تھی۔

آپ ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے اور علم و فضل آپ کا خاندانی ورثہ تھا، لیکن
انہوں نے کبھی نام و نمود کی تمنانہ کی، ایک عرصہ تک ضلع بستی میں تھانہ انچارج رہے، بعد میں
اعظم گڑھ میں سیشن جج کے پیشکار ہوئے، فارسی کے بڑے مشاق شاعر تھے، آپ کی غزلوں
پر قدسی کا رنگ غالب ہے۔

حضرت مولانا شاہ فضل رحمن گنج مراد آبادی سے نسبت بیعت و ارادت رکھتے تھے،
ایک جگہ کہتے ہیں:

گر خدا خواہی حبیب از ما سوا وارستہ شو کیں طریق حق رسی از فضل رحمان من است
شعر و سخن کی دنیا کے مشہور بزرگ مانے جاتے تھے، منشی محمد زماں صاحب زماں
مبارک پوری ان کے اخص ترین تلامذہ میں سے ہیں، پیشہ کے اعتبار سے درزی تھے، اعظم
گڑھ میں جامع مسجد کے قریب مزار ہے، نمونہ کلام یہ ہے:

دل فدائے دلبر و جان نذر جانان من است درہوائے وصل جانان ز یستن جان من است
تا خلقت آدم جلوہ نمود اندر دلم دیں من صورت پرستی، کفر، ایمان من است
محو کرد از من خیال کفر و دیں آں کس کہ گفت ہرچہ می بینی بداں کز مظہر شان من است
ما و تو واعظ متاع خود پرستی ہائے تست گم شدن از من متاع نقد عرفان من است

نیست مارا در سفر از بے نوائیہا غمے توشہ عشق و طلب در راہ سامان من است
 طعمہ محتاجگی بر بے نوائیم مکن ہرچہ ہست از روز اول زیر فرمان من است
 گر خدا خواہی حبیب از ما سوا وا رستہ شو
 کیس طریق حق رسی از فضل رحمان من است

خداوند از لطف خویش گویا کن زبانم را ز فیضان عنایت عنبر افشاں کن بیانم را
 ز عطر افشاں مضمون رنگین دول آویزم معطر کن دماغ دوستانِ مخلصانم را

کس غضب کی تھی نگاہِ شوخ اس بے پیر کی تھی ادا جس میں کسی سفاک کی شمشیر کی
 یہ رسائی ہے ستمگر آہ پر تاثیر کی دیکھ وہ ہلتی ہیں کڑیاں عرش کی زنجیر کی
 دیکھ اے قاتل شہیدِ ناز کے خوں کا مزا لے رہی ہے کس تمنا سے زباں شمشیر کی
 اپنی ہستی ہی سے جب گزرے تو کیا پرواہ میں نگ کی، ناموس کی، توہین کی، تحقیر کی
 ہو جسے اللہ کے محبوب سے الفت حبیب

فکر اسے کیا عرصہ محشر کے دارو گیر کی

(نمودِ محرص ۳۶ و ۲۱ مصنف شہرِ مصباحی، شائع کردہ انجمن تنظیم ادب مبارک پور)

ملا پیر بھائی اسماعیلی

ملا ثار علی سرائے میری کی شہادت کے بعد یہاں کے اسماعیلی فرقہ کے مذہبی پیشوا
 اور عامل ملا اور امام باڑہ رمضان علی شاہ کے مدرسہ کے مدرس تھے۔

مطوف شیخ فتح محمد مہاجر مکیؒ

مبارک پور کی خصوصیات میں سے ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کے لوگ مختلف اسباب کی بنا پر دوسرے ممالک خصوصاً بلادِ عرب میں پھیلے اور آگے بڑھے۔ چنانچہ عدن میں کئی مبارک پوری خاندان آباد ہیں، جو ماضی قریب تک یہاں آتے جاتے تھے، ان مہاجرین میں عالم، تاجر، سرکاری ملازم، آفیسر سب ہی ہیں، ان ہی میں مکہ مکرمہ میں بیت الفتی مشہور خاندان ہے، جس کو دینی اور دنیاوی حیثیت حاصل ہے، اس کے جدِ اعلیٰ مولوی شیخ فتح محمد بن شیخ احمد مبارک پوری ہیں، ان کے پوتے معلم عمر فتی مکہ مکرمہ کے مشہور اور کامیاب معلموں میں سے ہیں، ہم نے اس سال کے سفر حج میں دو شنبہ ۲/ ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ کو خاص طور سے ان سے ملاقات کر کے شیخ فتح محمد کے حالات معلوم کیے، انھوں نے زبانی اور تحریری معلومات دیں۔

ان کا بیان ہے کہ ہمارے دادا شیخ فتح محمد بن شیخ احمد اب سے تقریباً ۱۴۰ سال قبل بادبانی کشتی کے ذریعہ مکہ مکرمہ آئے اور باب عالی یعنی سلطان ترکی کی طرف سے ان کی صلاحیت اور دین داری اور علمیت کے پیش نظر مطوفی اور معلمی کی خدمت سپرد کی گئی اور اعظم گڑھ، بنارس، غازی پور، بلیا، جون پور، گورکھپور، بستی، گونڈہ، بلرام پور، احمد آباد، سورت، پٹن، بڑودہ اور سچین وغیرہ کے حجاج ان کی معلمی میں دیے گئے۔

چنانچہ اس زمانے سے لے کر آج تک یہ خدمت ان کے خاندان میں چلی آرہی ہے، ان کا بیان ہے کہ ہمارے دادا شیخ فتح محمد بن شیخ احمد پورہ خواجہ مبارک پور کے رہنے والے تھے، میں بچپن میں وہاں گیا تھا اور محمد عمر نامی چچا زاد بھائی سے ملاقات بھی ہوئی تھی، مکہ مکرمہ میں شیخ فتح محمد کے لڑکے شیخ عبداللہ تھے، جن کے دولڑکے شیخ عمر بن شیخ عبداللہ اور

شیخ حسین بن شیخ عبداللہ ہیں۔

شیخ عمر فقی کے دوڑ کے عبدالعزیز اور محمد علی ہیں اور شیخ حسین فقی کے چار لڑکے حسن، سراج، ہلال اور احمد ہیں، ان دنوں بیت الفقی مکہ مکرمہ کے متمول و محقق گھرانوں میں سے ہے، تعلیم و تجارت اور ملازمت کے ساتھ معلمی کا سلسلہ جاری ہے، معلم عمر فقی ساعات اور اجار کریمہ کے تاجر بھی ہیں، ان کی دکان مکتب عمر عبداللہ فقی، جی الشبیکہ مکہ المکرمہ، سبیل تجارتی ۲۲۴۱ کے نام سے باب العمرہ کے سامنے سڑک کے پار واقع ہے۔

ہمارے بڑے والد میاں جی حاجی اسد اللہ مرحوم کہا کرتے تھے کہ معلم عمر فقی ہمارے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ہمارا خاندان بعد میں پورہ خواجہ اور پرانی بستی میں پھیل گیا تھا اور فتح محمد اسی خاندان کے فرد تھے۔

۱۹۴۶ء میں جب وہ حج کو گئے تو معلم عمر فقی سے ملے تھے اور واپسی پر وثوق سے یہ بات کہتے تھے۔ واللہ اعلم

میاں جی جان اللہ اور مولوی نور محمد صاحب وغیرہ کا تعلق ہمارے خاندان سے ہے، جو پرانی بستی اور پورہ خواجہ میں تھے۔

مولوی غریب اللہ

مولوی غریب اللہ عرف میاں تولن مبارک پوری اثنا عشری عالم تھے۔

ان کی اولاد میں تین عالم تھے، مولوی غلام عباس، مولوی حسین اور مولوی فتح محمد، اتفاق سے تینوں مبارک پور سے ترک وطن کر کے دوسرے مقامات پر جا بسے اور ان کی اولاد وہیں پھولی پھلی، اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا، ان کے صاحب زادے مولوی غلام عباس کا تذکرہ آ رہا ہے۔

مولوی علی حسن فاروقی

مصنف ”واقعات و حادثات مبارک پور“

مولوی شیخ علی حسن بن شیخ غلام مرتضیٰ بن شیخ وصی احمد بن شیخ غلام محمد بن شیخ عباد اللہ بن شیخ لطف اللہ بن شیخ رشید بن شیخ مخدوم سعید بن شیخ مخدوم محمد بن شیخ مخدوم خضر فاروقی، ساکن محلہ پورہ رانی یہاں کے سرکاری مدرسہ میں مدرس تھے، جو موجودہ دفتر ٹاؤن ایریا میں جاری تھا، ان کا حال اس سے زیادہ معلوم نہ ہو سکا، ۱۸۸۸ء میں فوت ہوئے۔

انھوں نے ”واقعات و حادثات مبارک پور“ کے نام سے ۱۸۸۲ء میں ایک مستقل کتاب لکھی، جس میں نواب سعادت علی خاں والی اودھ کے دور سے لے کر ۱۳۰۳ھ تک مبارک پور میں رونما ہونے والے حوادث و فتن کا ذکر نہایت مستند اور مفصل طریقے پر کیا ہے، اس کتاب سے قصبہ کی بہت سی اہم تاریخی واردات اور تاریخی شخصیتوں کے بارے میں نادر معلومات ملتی ہیں، اس میں اٹھارہ اہم واقعات درج ہیں، ۱۸۱۳ء (۱۲۲۸ھ) کی جنگ اور ۱۸۵۷ء کے واقعات بھی ہیں، زبان نہایت صاف و شستہ اور طرز بیان بہت ہی دلچسپ ہے، اس کتاب کا مقدمہ ملاحظہ ہو:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ رب العالمین والصلوة والسلام علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین: بعد حمد پروردگار و نعت رسول مختار و مدح آل اطہار واصحاب کبار وائمہ ابرار کے یہ چند اوراق در بیان واقعات و حادثات قصبہ مبارک پور بفرمائش شیخ گدا حسین صاحب سلمہ نمبر وار و زمیندار کے یہ راقم محمد علی حسن بن شیخ غلام مرتضیٰ بن شیخ وصی احمد مرحوم یکے از شرفائے قصبہ مذکور رقم طراز ہے کہ زمانہ تعلیم مدرسہ میں یہ راقم بھی مدرسہ مبارک پور

میں پڑھاتا تھا، ایک روز برخوردار بلند اقبال نور بصرت شیخ غلام حیدر خلف الرشید شیخ گدا حسین صاحب موصوف بہ عمر نہ سا لگی مکتب میں سبق پڑھ رہے تھے کہ تقریباً کسی نے حادثہ رکھنی شاہی کا ذکر شروع کیا کہ ایسا حادثہ عظیم کسی نے ساکنانِ قصبہ سے کبھی نہیں سنا اور اس قدر خوں ریزی ہوئی کہ الامان والحفیظ، اس پر برخوردار مسطور نے یہ ارشاد فرمایا کہ قبل آپ لوگوں کے اور بحالت موجودگی ایسے ایسے حوادث ظہور میں آئے، ہم لوگ کیا جانیں گے، اگر تذکرہ ان حوادث کا کسی طرح سے تکلیف گوارا فرما کے تھوڑا تھوڑا قلم بند فرمائیں تو ہم لوگوں کو واقفیت ہو اور آئندہ ایک رسالہ مختصر تیار ہو جائے، چنانچہ راقم نے باوجود عدیم الفرستی شغل تعلیم وغیرہ سے حسب خواہش ان کی روزانہ دو دو ایک ایک صفحہ برابر لکھنا شروع کیا۔

ناظرین باتمکین سے التماس ہے کہ اگر کہیں خلاف محاورہ روزمرہ پائیں تو بقلم اصلاح درست فرمائیں کہ راقم ان اوراق کا محض طفل مکتب اور باشندہ دیہات کا ہے، محاورہ اُردو سے بالکل بے بہرہ ہے، واللہ ولی التوفیق و بیدہ از ممتہ التحقیق (ص: ۲-۳)۔

یہ کتاب مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہے، خط کشیدہ ہے، مگر صاف ہے، کاغذ بادامی بڑے سائز کے ۸۹ صفحات ہیں، ۱۸/صفر ۱۳۸۸ھ کو مولانا وقار احمد صاحب صدیقی متوفی ۱۳۹۰ھ رحمۃ اللہ علیہ ساکن گھوسی نے اپنے کتب خانہ سے نکال کر راقم کو عنایت فرمایا ہے۔

خلیفہ دین علی شاہ

ناپینا ہونے کے باوجود پوربی زبان میں شاعری کے خلیفہ اور استاد تھے، پورہ دلہن میں مکان تھا، ان کی نظم ”پھول“ کے نام سے بہت مشہور ہے، جس میں دنیا بھر کے پھولوں کے نام اور رنگ و بو کا ذکر ہے، یہ نظم برج بھاشا شاعری کا یوں شاہ کار ہے کہ اندھے ہونے کے باوجود انھوں نے ایسی شاعری کی ہے۔

مولوی جان محمد

مبارک پور کے مشہور اثنا عشری علماء میں تھے، ان کی قبر قصبہ کے کچھم شاہ کے پنجہ کے روضہ کی جنوبی دیوار کے مغربی گوشے میں ہے۔

ان کی وفات ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۱ھ کو ہوئی، قبر کے سرہانے بہت بڑا پتھر نصب ہے، جس پر تاریخی اشعار درج ہیں، ایک سطر میں ایک مصرعہ ہے:

۷۸۶

تاریخ از تصنیف جناب مولوی سید محمد صاحب دام ظلہ

مولوی جان محمد کہ نظیرش بجہاں چشم گردوں ہمہ دیدو ہمہ دانست محال
عالم و معدن اخلاق و عزیز دلہا زاهد و عابد و دیں پرور و بوذر بہ مثال
یک جہاں شاہد فضلش ہمہ خاص و ہمہ عام در کمالش بہ کسی ہیچ نہ قیل است نہ قال
بود بست و یکم از ماہ جمادی الاولیٰ کرد آہنگ سفر جانب رب متعال
یا الہی بجناں مسکن طیب باشد ایں دعا از من و آمین زسمک تا بہ ہلال
آتم ایں مصرعہ تاریخ بہ قبرش بنوشت شد بفر دوس جناں راہ نما پیر و آل
۱۳۱۱ھ کتبہ حسن بخش

ملا شیخ عبدالحکیم اسماعیلی

ملا شیخ عبدالحکیم اسماعیلی تیرہویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے، اپنے زمانے میں یہاں کے اسماعیلی فرقہ کے مذہبی پیشوا اور سورت کے بڑے ملا صاحب کی طرف سے عامل تھے۔

شیخ کا لفظ اس فرقہ میں دینی پیشوا کے لیے مخصوص ہے، جو ملا اور عامل سے بلند درجہ ہوتا ہے، شیخ عبدالحکیم بمبئی میں کاروبار کرتے تھے اور گجراتی زبان کے جو اس فرقہ کی عربی کے بعد دوسری مذہبی زبان ہے، اچھے عالم تھے۔

ملا رحمت علی اسماعیلی نے مبارک پور میں رہ کر گجراتی زبان انھیں سے سیکھی تھی اور وہی ملا صاحب کو تعلیم کے لیے بمبئی لے گئے اور ان کی تعلیم کا سبب بنے، شیخ عبدالحکیم کی ایک لڑکی بمبئی میں ایک اسماعیلی عالم سے بیاہی تھیں، ان اسماعیلی عالم سے راقم کی ملاقات ہوئی تھی۔

مولوی حکیم عبداللہ

مولوی حکیم عبداللہ بن شیخ بھولن بن شیخ لعل عرف لال بن شیخ عبداللطیف بن شیخ غلام محمد، پورہ دہن کے رہنے والے اور مولانا حکیم الہی بخش صاحب کے والد تھے، اپنے زمانے کے طبیب حاذق اور ماہر نباض تھے۔

طبابت کے ساتھ ساتھ گھر پر تعلیم و تدریس کا سلسلہ بھی رکھتے تھے، میاں صاحب عبداللہ شفا ساکن کٹرہ آپ کے مشہور شاگردوں میں تھے، بعد میں میاں صاحب سے حکیم الہی بخش نے فارسی پڑھی تھی، حکیم عبداللہ صاحب کی وفات شب یک شنبہ ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ میں ہوئی۔

مولانا حافظ حکیم عبدالرحیم

مولانا حاجی حافظ حکیم عبدالرحیم بن شیخ حاجی بہادر عرف بڑے حافظ صاحب مبارک پور کے مشہور علماء و اطباء میں تھے، مولانا عبدالرحمن صاحب محدث مبارک پوری کے والد ہیں۔

حفظ قرآن اور قرأت و تجوید کی تعلیم قاضی امام الدین صاحب جون پوری سے حاصل کی اور نحو و صرف و دیگر علوم کی تکمیل مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں مولانا محمد فیض اللہ صاحب منوی تلمیذ مولانا سخاوت علی صاحب جون پوری اور مولانا محمد حسام الدین صاحب منوی سے کی اور حدیث کی تحصیل مولانا قاضی شیخ محمد صاحب مچھلی شہری سے کی، جن کو مولانا شیخ عبدالحق بنارس تلمیذ قاضی شوکانی سے سند حدیث حاصل ہوئی تھی، نیز شیخ عبدالحق نے مولانا سخاوت علی جون پوری، مولانا فضل رسول بدایونی، مولانا احمد اللہ انامی تلمیذ شاہ محمد اسحاق دہلوی اور آخر میں مولانا محمد اسماعیل دہلوی اور مولانا عبدالحق دہلوی سے تعلیم پائی تھی۔

حافظ عبد الرحیم صاحب نے قاضی شیخ محمد مچھلی شہری سے سند مسلسل بالاولیہ سند منادلہ و بلوغ المرام اور سند اتحاف الاکابر حاصل کی تھی۔

یہ سندیں آپ کے امتیازات میں ہیں، چوں کہ ان کے اکثر اساتذہ و شیوخ مسلک اہل حدیث کے داعی تھے اور ترک تقلید پر زور دیتے تھے، اس لیے ان پر اپنے ان اساتذہ کا رنگ غالب رہا اور آپ نے بھی اسی مسلک کو اختیار کیا، طبابت کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی گھر پر رکھتے تھے۔

لوگوں کا بیان ہے کہ حافظ صاحب اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہوئے قاضی مبارک اور حمد اللہ جیسی معقولات کی ادق کتابیں بے تکلف پڑھاتے تھے، اس کے علاوہ نحو، صرف، عربی، فارسی اور حفظ و تجوید کا درس بھی دیا کرتے تھے۔

قصبہ کے سینکڑوں حفاظ نے ان کی شاگردی میں حفظ قرآن کی نعمت پائی، ان کے مخصوص تلامذہ میں مولانا عبدالسلام صاحب مبارک پوری مصنف ”سیرۃ البخاری“ اور حافظ شاہ نظام الدین صاحب سریانوی تھے۔

مؤخر الذکر نے اپنے استاد کی طرح زندگی بھر خانگی زندگی میں مصروف رہ کر درس

وتدریس کی خدمت انجام دی اور ان کے بعد بڑے حافظ صاحب کا لقب پایا۔
 رمضان ۱۳۳۰ھ مطابق ستمبر ۱۹۱۲ء میں انتقال فرمایا، کہا جاتا ہے کہ آپ ہی سے
 مبارک پور میں مسلک اہل حدیث کا رواج ہوا۔
 (تذکرہ علمائے حال ص ۴۳ و تراجم علمائے اہل حدیث ص ۳۹۸)

حافظ شاہ نظام الدین سریانویؒ

مولانا حافظ شاہ نظام الدین بن شیخ عبدالوہاب المتخلص بہ رضا سریانوی تیرہویں
 صدی کے نصف میں سریاں میں پیدا ہوئے اور والدین کے زیر سایہ گھر کے علمی و دینی اور
 روحانی ماحول میں پرورش پائی۔

آپ اپنے والد کے سچے جانشین تھے، زہد و تقویٰ، علم و فضل، توکل و قناعت،
 خدمت خلق، عبادت و ریاضت اور تعلیم و تعلم میں پوری زندگی بسر کی، ان کی ولایت و بزرگی
 میں کسی کو شک نہیں تھا، اخلاص و محبت کا پیکر اور سادگی و بے تکلفی کا نمونہ تھے، ابتدائی تعلیم گھر
 پر حاصل کی، اس زمانے میں مولانا عبدالرحمن صاحب محدث مبارک پوری کے والد ماجد
 مولانا حکیم حافظ عبدالرحیم کے علم و فضل کا شہرہ تھا۔

حافظ نظام الدین نے ان کی خدمت میں قرآن مجید حفظ کر کے قرأت و تجوید کی
 تعلیم حاصل کی اور ان کی درس گاہ کے ہونہار طالب علموں میں شمار ہوئے، حافظ عبدالرحیم نے
 حفظ و تجوید کی تعلیم مولانا قاضی امام الدین جون پوری سے حاصل کی تھی اور دیگر علوم مولانا
 فیض اللہ منوی، مولانا حسام الدین منوی، مولانا قاضی محمد مچھلی شہری سے حاصل کیے تھے، ان
 کے تمام شیوخ مسلک اہل حدیث کے تھے اور حافظ صاحب بھی اسی مسلک پر رہے، مگر آپ
 کے شاگرد رشید حافظ نظام الدین اپنے قدیم مسلک حنفیت پر قائم رہے اور اپنے گھر کو مدرسہ

بنا کر اطراف و جوانب میں دینی تعلیم پھیلائی اور ذاتی کاروبار کے ساتھ پوری زندگی یہی مشغلہ جاری رکھا۔

سینکڑوں حفاظ اور کئی علماء آپ کی درس گاہ سے نکلے اور کتنے لوگ دین کی ضروری تعلیم حاصل کر کے اپنے کاروبار میں مشغول ہوئے۔

ان کے تلامذہ میں دوز بردست عالم ہوئے ہیں، ایک مولانا احمد حسین رسول پوری، جو ان کے داماد بھی تھے اور دوسرے مولانا شاہ محمد سریانوی، حافظ صاحب میری والدہ مرحومہ کے جد مادری ہیں۔

حافظ صاحب ذاکر و شاعری اور روحانی بزرگ تھے، ان کے تعلقات جنات سے بھی تھے، اس سلسلے میں ان کے عجیب و غریب واقعات مشہور ہیں، بے نفسی اور خلوص کے پیکر تھے۔ ایک دفعہ بادل ناخواستہ ایک مقدمہ کی گواہی میں جانا پڑا، حاکم مسلمان تھا، اس نے آپ سے پوچھا کہ کیا آپ حافظ قرآن ہیں، حافظ صاحب نے کہا کہ مجھے اس کا دعویٰ نہیں، البتہ میرے استاد بڑے حافظ صاحب واقعی حافظ قرآن تھے، پھر حاکم نے کچھ قرآن سنانے کی خواہش ظاہر کی۔

آپ نے بھری عدالت میں قرآن سنانا شروع کیا، جب سات پارے سنا چکے تو حاکم نے معذرت کرتے ہوئے بند کرنے کی درخواست کی اور پوچھا کہ آپ کے کتنے حافظ شاگرد ہیں، جواب دیا کہ بتیس شاگرد ایسے حافظ قرآن ہیں کہ اگر قبر میں بھی ان کو قرآن سنانا پڑے تو بلا تکلف سنا سکتے ہیں۔

آپ سچے عاشق رسول تھے اور اردو زبان میں نعت خوب کہتے تھے، ان کی دو نعتیں ”نعت محبوب“ از شاہ عبداللہ صاحب شفا مبارک پوری کے آخر میں چھپی ہیں:

.....

پہلا قصیدہ نعتیہ

ہے تمنا مری یارب کہ میں کعبہ دیکھوں دل کی بر آتی ہے کب تک یہ تمنا دیکھوں
 تیرے محبوب کی جا خلد سے بھی ہے بڑھ کر کھاتا ہے جس کی قسم تو وہ مدینہ دیکھوں
 میں وہ عاجز ہوں کہ کچھ تاب تو اں مجھ میں نہیں کر مدد میری خدا یا کہ مدینہ دیکھوں
 میں گدا ہوں، تو غنی ہے، مری حاجت بر لا میرے مولا ترے محبوب کا روضہ دیکھوں
 روز میں اپنی طبیعت کو کہاں تک بہلاؤں گئے گھڑی اس دل بیتاب کو سمجھا دیکھوں
 اک زمانہ سے یہی ہے مرے دل کی حسرت آرزو ہے کہ دیارِ شہِ بطحا دیکھوں
 اپنی بخشش کا ہمیں کوئی وسیلہ ہی نہیں جز محمدؐ کے، خدایا میں مدینہ دیکھوں
 حق نے بخشی ہے انھیں دوزخ و جنت کی کلید حشر میں معنیٰ یعطیک فترضیٰ دیکھوں
 ہیں گدا اس در اقدس کے سبھی جن و بشر کر مجھے سگ در اشرف کا وہ کوچہ دیکھوں
 خاک نعلین مبارک کی اگر مل جائے دیدہ کور کو پھر دیدہ پینا دیکھوں
 اے صبا تجھ کو مبارک ہو اُدھر کا جانا میں بھی اے کاش! دیارِ شہِ والا دیکھوں
 مجھ کو پہنچا تو مدینہ میں برائے محبوب مجھ کو محبوب مدینہ ہے، مدینہ دیکھوں
 دیکھوں میں روضہ انور کو زبان پر ہو درود زندگی کا ہے وہی لطف خدایا دیکھوں
 کچھ نہ دیکھا جو مدینہ ہی نہ دیکھا اب تک مجھ کو پہنچا کہ ان آنکھوں سے مدینہ دیکھوں
 بہر بوکبرؐ و عمرؐ مجھ کو وہاں تک پہنچا صدقہ عثمانؓ و علیؓ کا درِ والا دیکھوں

اپنے اللہ سے ہر دم یہ رضا کی ہے دعا

یا خدا میں بھی ان آنکھوں سے وہ روضہ دیکھوں

دوسرا قصیدہ نعتیہ

جس نے دیکھا ہے ترا کوچہ آرائے بہشت اُس کو حاجت نہیں کرنے کی تمنائے بہشت
 سیر کوچہ تری ہے رشک تماشا ئے بہشت رشک گلزار اِرم غیرتِ گلہائے بہشت
 جو بلندی کہ مدینے کے درختوں کی ہے وہ کہاں ہے تری اے قامتِ طوبائے بہشت
 کرے در بانی ترے کوچہ کی رضواں آ کر یک نظر دیکھے جو یہ کوچہ زیبائے بہشت
 جس کے دل میں ہے تمنائے مدینہ مخفی اُس کے سر میں نہ سمائے کبھی سودائے بہشت
 کیوں نہ صدقے ہو ترے کوچہ پگزارِ جناب ہے وہ صدقے سے ترے اے مرے مولائے بہشت
 ذاتِ اکرم جو نہ ہوتی تو نہ ہوتا موجود عرش سے فرش تک اور دوزخ و نعمائے بہشت
 ترے کوچے کے تماشا سے تماشا ئے جناب ہم کو بہتر ہے نہیں اے شہِ یغمائے بہشت
 گردِ روضہ کے پھروں اور تصدق ہوں میں

آرزو ہے یہی اے سید والائے بہشت

حافظ صاحب کا دستور تھا کہ ہر سال رمضان میں تراویح پڑھانے کلکتہ جایا کرتے تھے۔

جب ۱۹۰۴ء مطابق ۱۳۲۲ھ میں آخری بار جانے کے لیے تیار ہوئے تو اپنے صاحب زادے محمد محسن مرحوم کو ساتھ لیا اور کہا کہ کلکتہ کے احباب سے اس کی ملاقات کرادوں، معلوم نہیں اب کے واپسی ہوتی ہے یا نہیں، نیز اب کے اپنے اعزہ واقارب، احباب اور تلامذہ سے اس طرح ملے جیسے کہ یہ آخری ملاقات ہو، چنانچہ واقعی آخری ملاقات ثابت ہوئی، پورا رمضان نہایت صحت و تندرستی سے گزرا، حسب معمول تراویح میں قرآن ختم کیا اور عین عید کے دن کلکتہ میں فوت ہو گئے، جس مسجد میں قرآن شریف سناتے تھے، اسی کے سامنے صحن میں دفن

کیے گئے اور قبر کے ارد گرد معمولی سی چہاردیواری بنادی گئی۔

حافظ صاحب کی وفات ۱۹۰۴ء مطابق یکم شوال ۱۳۲۲ھ کو ہوئی۔

اس حادثہ فاجعہ پر آپ کے تلمیذ اور داماد مولانا احمد حسین رسول پوری نے عربی میں ۳۳ شعروں کا مرثیہ لکھا ہے، جس میں دل کے ٹکڑے نکال کر رکھ دیئے ہیں، یہ قصیدہ ان کے دیوان میں چھپا ہے، مطلع یہ ہے:

ذکر لی لمن واراہ بالقیعان

متصدع قلبی من الاشجان

حافظ صاحب کی چھ اولاد تھی، تین ذکور اور تین اناث۔ (۱) مولانا ممتاز علی، (۲) شمشاد علی، (۳) محمد محسن، یہ عین عنفوان شباب میں فوت ہو گئے تھے، (۴) رحیمہ سب اولاد سے بڑی تھیں، یہ میری نانی ہیں، ان کے صاحب زادے مولانا محمد یحییٰ بن مولانا احمد حسین رسول پوری تھے، (۵) کلثوم اور (۶) خدیجہ، ان کے بطن سے مولانا محمد ظہیر الدین بن شیخ عبدالسبحان حسین آبادی ہیں، حافظ صاحب کے بیٹوں اور بیٹیوں کی اولاد خوب پھلی پھولی، ان کے آخری شاگرد حاجی محمد صابر سریانوی متوفی جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ تھے، جنہوں نے اپنے استاد کی یادگار میں ایک دیہات میں مدرسہ نظام العلوم قائم کر کے مدتوں اس میں درس دیا، یہ مدرسہ اب بھی جاری ہے۔

نیز سریاں میں حافظ صاحب کے مکان کا ایک حصہ آج بھی مدرسہ ہے، جہاں مقامی بچے اور بچیاں تعلیم پاتے ہیں اور ان کے گھر سے اب تک فیوض و برکات کا سلسلہ جاری ہے، سریاں کا نیا مدرسہ نظام العلوم بھی حافظ صاحب ہی کے نام پر ہے، ان کی اولاد میں علمی و دینی چرچا اب بھی پایا جاتا ہے اور ان کے تلامیذ التلامیذ اپنے اپنے طور پر دینی خدمت کر رہے ہیں۔

مولوی سلامت اللہ

مولوی سلامت اللہ صاحب دیور یا اورگورکھپور کے اطراف کے رہنے والے تھے، گولہ بازار کی مسجد میں مستقل طور سے تعلیم دیتے تھے، اس زمانے میں ان کی یہ درس گاہ مبارک پور کا سب سے بڑا مدرسہ تھی اور یہاں کے اکثر لکھے پڑھے آپ کے شاگرد تھے۔ ان کے تلامذہ میں مولوی عنایت اللہ صاحب ساکن پرانی بستی متوفی ۱۳۹۱ھ آخری عالم تھے، ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

مولوی اشرف علی بمہوری

مولانا اشرف علی بن شیخ امیر علی موضع بمہور کے رہنے والے تھے، وہ اپنے علم و فضل اور شان و شوکت میں بڑے پایہ کے بزرگ تھے، بمہور اور آس پاس کے مواضع پر ان کا اثر تھا اور ان کے حکم اور مشورہ کے بغیر کوئی اجتماعی کام انجام نہیں پاتا تھا۔ ان کی اولاد میں علم کا سلسلہ جاری ہے، ۱۳۲۷ھ میں مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

مولوی عبدالصمد مبارک پوری

مولوی عبدالصمد صاحب مبارک پور کے باشندے تھے، مگر مستقل قیام بمبئی میں تھا اور یہاں کھانڈار محلے میں ایک چھاپ خانے کے ناظم و مہتمم تھے۔
(البلاغ بمبئی ربیع الاول ۱۳۹۰ء)

مولوی حکیم امیر علی مبارک پوری سورتی

مولوی حکیم امیر علی مبارک پور میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم حاصل کی، ان کے اساتذہ کے نام معلوم نہیں۔

۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء) میں اپنے بیٹے کے مرنے پر اپنے نو سالہ پوتے محمد یسین فغّات کو لے کر سورت چلے آئے اور یہیں مستقل بود و باش اختیار کر کے پوتے کو تعلیم دلائی اور سورت ہی میں ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ء) میں انتقال کیا، ان کے پوتے محمد یسین صاحب فغّات گجرات کے استاذ الشعراء مانے گئے ہیں۔ (اخبار اردو ٹائمز بمبئی ۹ ستمبر ۱۹۶۹ء)

مولوی غلام عباس

مولوی غلام عباس بن مولوی غریب اللہ عرف میاں تولن مبارک پوری تین بھائی تھے اور عجیب بات ہے کہ تینوں الگ الگ مقام پر آباد ہوئے، (۱) مولوی غلام عباس بن مولوی غریب اللہ موضع سمبھی میں رہے اور ان کے دولڑکے بمبئی میں رہ بس گئے، (۲) مولوی علی حسین بن مولوی غریب اللہ نے بردوان کو اپنا مسکن بنایا اور (۳) مولوی فتح محمد بن مولوی غریب اللہ نے بڑھل گنج کو پسند کیا، ان کے ایک لڑکے سجاد حسین بڑا گاؤں گھوسی میں آباد ہوئے اور دوسرے لڑکے عبدالرحیم بڑھل گنج ہی میں رہے۔

مولوی غلام عباس اچھے عالم اور اچھے شاعر تھے، عباس تخلص تھا، مذہباً اشاعری تھے، ان کا مختصر حال اور مختصر نمونہ کلام ”خم خانہ جاوید“ جلد پنجم مصنفہ لالہ سری رام ایم۔ اے۔ دہلوی میں مذکور ہے، جسے ہم نقل کرتے ہیں:

مولوی عباس صاحب قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ کے باشندے ہیں، اپنے

والد سے عربی و فارسی کی تعلیم پائی، عرصہ دراز سے قصبہ سمبھی میں سکونت پزیر ہیں، علم دوست و اخلاق پرست دوست ہیں، اکثر اصحاب آپ کے فیضان علمی سے مستفید ہو چکے ہیں، عربی و فارسی میں اعلیٰ درجے کی لیاقت ہے، احادیث و آیات قرآن کو بے تکلف اردو شعر میں نظم کر دیتے ہیں، فن شعر میں آپ کو صابر نظام آبادی سے تلمذ ہے، جو حضرت ناسخ کے ارشد تلامذہ میں تھے، متعدد رسالہ جات میں آپ کا کلام شائع ہو چکا ہے، کلام بغایت بامزہ ہوتا ہے، جو پختہ مشقی کا ثبوت ہے، آپ جس طرح پرمغز شاعر ہیں، اسی طرح مشاق نثار بھی ہیں، عرصے تک اخبارات میں مضامین لکھتے رہے، غزل کے علاوہ سلام بھی کہتے ہیں، کلام جو مثنوی محمد احسن صاحب نے روانہ کیا ہے، اس کا انتخاب درج ذیل ہے:

نعتیہ

جس کو طوفانِ نوح کہتے ہیں تھا وہ طوفانِ دیدہ تر کا
نزع میں چھوڑ کر نہ جاؤ مجھے بس یہ جھگڑا ہے اور دم بھر کا
سنگِ اسود کو چومتے ہیں بشر
یہ بھی پتھر ہے کیا ترے در کا

نعت در صنعت غیر منقوط

ملک و ملک و حور کا سردار محمدؐ واللہ دو عالم کا مددگار محمدؐ
مدوح ہوا مہر و مہ و لوح سما کا اللہ کا وہ محروم اسرار محمدؐ
معصوم وہ، محمود وہ، طاہر وہ مطہر عالم کا مد اور مددگار محمدؐ
واللہ مرا ہوگا مددگار علم دار
وہ داد رس عام مددگار محمدؐ

اس کے علاوہ خم خانہ جاوید میں تیس سے زائد غزل کے متفرق اشعار اور تین ہند کا ایک مسدس نمونہ کلام کے طور پر درج ہے۔ (خم خانہ جاوید ج ۵، ص ۵۶۸ تا ۵۷۱)

عباس کے تلامذہ میں دو اصحاب کا نام معلوم ہو سکا ہے، ایک ان کے لڑکے منشی غلام حسین عاشق اور دوسرے محمد احسن اللہ عارف ساکن سمبھی ضلع اعظم گڑھ۔

حضرت مولانا ابوالعلیٰ عبدالرحمن محدث مبارک پوری

حضرت مولانا، محدث، فقیہ، مفتی حکیم ابوالعلیٰ عبدالرحمن بن حافظ عبدالرحیم بن شیخ حاجی بہادر رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی پورے عالم اسلام کے دینی اور علمی حلقوں میں مشہور و متعارف ہے اور ہمارے تعارف کی مطلق محتاج نہیں ہے۔

”تحفۃ الاحوذی“ شرح جامع ترمذی آپ کی وہ شہرہ آفاق اور مقبول کتاب ہے، جو علمائے سلف اور محدثین کی تصانیف کی ہمسری کرتی ہے، فی الجملہ آپ کے حالات درج کیے جاتے ہیں۔

آپ کے دادا حاجی بہادر قصبہ کے ممتاز شخص تھے، شنبہ ۲۸ محرم ۱۲۵۸ھ کو مبارک پور میں ایک خونی ہنگامہ ہوا، جس میں دو شخصوں کو پھانسی ہوئی، اس فتنہ و فساد میں حاجی بہادر اور حاجی جہانگیر پر بعض الزامات لگائے گئے اور اس حادثے کے بعد ان دونوں صاحبان نے حج کیا۔ (واقعات و حادثات مبارک پور ص ۴۵)

مولانا کے والد ماجد حافظ عبدالرحیم عالم باعمل اور مشہور طبیب تھے، ان کے تین لڑکے تھے، مولانا عبدالرحمن محدث، مولوی حکیم محمد شفیع اور شیخ محمد علی، مولانا عبدالرحمن لا ولد فوت ہوئے، حکیم محمد شفیع کی اولاد پھلی پھولی اور اس میں علمی و طبی سلسلہ جاری رہا اور شیخ محمد علی کے صاحب زادے مولوی محمد اصغر صاحب تھے۔

مولانا عبدالرحمن ۱۲۸۳ھ (۱) میں محلہ پورہ صوفی میں پیدا ہوئے، قرآن شریف اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں، اس زمانے میں ان کا گھر قصبہ کا مدرسہ تھا، اس کے بعد قصبہ کے اطراف کے علماء و اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، مولوی خدا بخش مہراج گنجی، مولوی محمد سلیم پھر بیہاوی متوفی ۱۳۳۴ھ مولانا سلامت اللہ جیراج پوری اور مولانا فیض اللہ منوی سے متوسطات تک تعلیم حاصل کی اور نور الانوار وغیرہ پڑھ کر مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور گئے، جو ان دنوں مشرقی یوپی کی مشہور علمی و دینی درس گاہ تھی اور اس میں نامی گرامی اساتذہ درس دیتے تھے، مولانا کے والد بھی اسی درس گاہ سے فیض یاب تھے، ان کی مرضی اور اجازت سے چشمہ رحمت گئے، جہاں مولانا حافظ عبداللہ منوی غازی پوری کے علوم دینیہ اور مولانا محمد فاروق صاحب چریاکوٹی کے علوم عقلیہ و ادبیہ کا فیض جاری تھا۔

مولانا نے ان دونوں حضرات سے متوسطات اور انتہی کتابیں تک پڑھیں اور یہیں نحو و صرف، ادب، عربیت، معانی، بیان، منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، فقہ، اصول حدیث، تفسیر وغیرہ مروجہ علوم و فنون کی تکمیل کی، یہاں پانچ سال رہ کر مولانا عبداللہ غازی پوری کے ایما پر مولانا سید نذیر حسین دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے مشکوٰۃ، جلالین، بلوغ المرام، اوائل ہدایہ، تفسیر بیضاوی، اکثر نخبۃ الفکر، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابوداؤد اور سنن نسائی کے اواخر اور سنن ابن ماجہ کے اوائل پڑھے، نیز قرآن مجید کے چھ پاروں کا ترجمہ سنا اور سند حاصل کی۔ اس کے بعد علامہ شیخ حسین بن محسن انصاری خزرجی یمانی سے صحاح ستہ، مؤطا امام مالک، مسند دارمی، مسند امام شافعی، مسند امام احمد بن حنبل، الادب المفرد، معجم طبرانی الصغیر اور سنن دارمی کے اطراف پڑھ کر ان کتابوں کی روایت کی اجازت حاصل کی اور اپنے والد کی طرح مولانا قاضی محمد بن عبدالعزیز مچھلی شہری سے ۱۳۱۳ھ میں حدیث مسلسل بالاولیت کی سند لی۔

مولانا سید نذیر حسین دہلوی کا سلسلہ سند یوں ہے، عبدالرحمن عن الشیخ السید نذیر حسین الدہلوی عن الشاہ محمد اسحاق الدہلوی عن مسند الوقت الشاہ عبدالعزیز الدہلوی عن بقیۃ السلف الشاہ ولی اللہ الدہلوی عن الشیخ ابراہیم الکردی۔

اس کے علاوہ مولانا سید نذیر حسین نے مزید تین سلاسل سے حدیث کی روایت کی ہے، جو المکتوب اللطیف اور مقدمہ عین المعبود میں مذکور ہے۔

شیخ حسین یمانی کا سلسلہ سند یہ ہے، عبدالرحمن عن الشیخ حسین بن محسن الانصاری الیمانی عن الشیخ عبدالباری الادلہل و الشیخ محمد ناصر الحازمی و الشیخ احمد بن محمد الشوکانی و کلہم عن الامام الشوکانی۔

مولانا قاضی محمد مچھلی شہری کا سلسلہ سند یہ ہے، عبدالرحمن عن الشیخ محمد المچھلی شہری الجون فوری عن الشیخ عبدالحق البنارسی، عن القاضی الشوکانی، اس کے علاوہ ان کے اور بھی سلاسل ہیں، جو امام شوکانی سے ملتے ہیں، ان کی سند حدیث مسلسل بالاولیت یہ ہے:

”قلت سمع مني أولاً هذا الحديث المسلسل بالأولية
المولوي عبدالرحمن بن الحافظ عبدالرحيم من أهل
مبارك فور فأجزته أنه يرويه عني بالشروط المعتبرة عند
مهرة هذا الفن، وأوصيه بتقوى الله في السر والعلن،
وعدم القبول بالراء في معنى الحديث واتباع السلف
الصالح في فهم مراده وأسأل الله أن يوفقه لذلك ويختم
لي وله بخير وكتبه محمد بن عبدالعزيز المدعو بشيخ
محمد بخطه في ١٣١٣ من الهجرة“ - (مقدمہ تحفۃ الاحوزی ص ۵)

اسی سند پر مولانا نے فاتحۃ الفراغ پڑھی اور ۱۳۱۳ھ میں جملہ مروجہ علوم و فنون

سے فراغت حاصل کی اور اسی سال مدرسہ دارالتعلیم کی بنیاد رکھی۔

مولانا نے فراغت کے بعد تعلیمی و تدریسی مشغلہ اختیار کیا اور مبارک پور میں مدرسہ دارالتعلیم قائم کیا، پھر بلرام پور (گونڈہ) میں ایک مدرسہ قائم کیا، کچھ دنوں اس میں تعلیم دی اور پھر وہاں سے اللہ نگر (گونڈہ) کے مدرسے میں تعلیم دی، اس کے بعد ضلع گونڈہ کے مدرسہ سراج العلوم میں تشریف لائے، جو آپ ہی کے لیے قائم کیا گیا تھا، یہاں کافی دنوں تک تعلیمی خدمات انجام دیں۔

اسی زمانے میں آپ کے استاذ مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری مدرسہ احمدیہ آرہ (بہار) کے صدر مدرس تھے، شاگرد نے استاد کی طلب پر مدرسہ احمدیہ آرہ کا رخ کیا، اس زمانے میں مولانا ابو محمد ابراہیم آروی اس مدرسہ کے ناظم تھے، انھوں نے مولانا کو مدرسہ اول مقرر کیا اور استاد و شاگرد دونوں ایک ساتھ دینی و علمی خدمت انجام دینے لگے، اس دوران میں مولانا کی علمی قابلیت کا شہرہ ہو گیا اور دُور دُور کے اہل مدارس کی نظر آپ پر اٹھنے لگی۔

چنانچہ مدرسہ دارالقرآن والسنة کلکتہ کے ناظم نے مولانا کو دعوت دی اور مولانا اپنے استاد کی اجازت و مرضی کے بعد کلکتہ چلے گئے، چند سال وہاں تدریسی خدمت انجام دی، مولانا کے تعلیمی و تدریسی سفر کی یہ آخری منزل تھی، اس کے بعد کسی مدرسہ میں نہیں گئے، بل کہ تصنیف و تالیف میں مشغول ہو گئے۔

مولانا نے ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۳ھ تک مولانا ابوالطیب محمد شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی کے یہاں تصنیفی و تالیفی کام کیے، مولانا شمس الحق عظیم آبادی، مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، انھوں نے سنن ابوداؤد کی ایک نہایت بسیط شرح غایۃ المقصود کے نام سے لکھی تھی، بعد میں ابوداؤد کی ایک مختصر شرح لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اس میں مدد کے لیے مولانا عبدالرحمن کو دعوت دی اور مولانا نے تقریباً چار سال تک ان

کے ساتھ رہ کر ”عون المعبود“ شرح سنن ابی داؤد کی تصنیف و تالیف میں پوری مدد کی، ”عون المعبود“ شائع کردہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ کے مقدمہ نگار شیخ عبدالرحمن محمد عثمان نے لکھا ہے:

”کتب العلامة أبو الطیب شمس الحق العظیم آبادی و توفر على معاونة في إكمال العلامة أبو العلی محمد عبدالرحمن بن عبدالرحیم المبارک فوری صاحب تحفة الأحوذی مُدَّة اربع سنین حتی تم على أحسن ما یكون إحاطةً و شمولاً و ایضاً، لكل مشکل و إبانة عن كل معنی نفیس“۔ (مقدمہ عون المعبود ص ۷)

”عون المعبود“ میں تعاون و اشتراک کے بعد مولانا نے ”تحفة الاحوذی“ کا کام یوں شروع کیا کہ گھر کو مدرسہ اور دارالتصنیف بنا کر تدریس و تالیف کا شغل اختیار فرمایا۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے علم و عمل سے بھرپور نوازا تھا، دقتِ نظر، حدتِ ذہن، ذکاوتِ طبع اور کثرتِ مطالعہ کے اوصاف و کمالات نے آپ کو جامع شخصیت بنا دیا تھا، خاص طور سے علمِ حدیث میں تجربہ و امامت کا درجہ رکھتے تھے، روایت کے ساتھ درایت کے مالک اور جملہ علومِ آلیہ واصلیہ میں یگانہ روزگار تھے، طب و حکمت خاندانی ورثہ میں ملی تھی، قوتِ حافظہ بھی خداداد تھی۔

بینائی سے محروم ہو جانے کے بعد بعض درسی کتابوں کی عبارتیں زبانی پڑھا کرتے تھے اور ہر قسم کے فتاویٰ لکھوایا کرتے تھے، معقولات کے زبردست عالم تھے، ایک عالم جنہوں نے مولانا سے ”تصریح“ پڑھی تھی، اپنا تاثر یوں ظاہر کیا کہ مولانا سے تصریح پڑھنے کے بعد ہی مجھے علمِ فلکیات کی حقیقت معلوم ہوئی۔

راقم طالبِ علمی کے زمانے میں ایک مرتبہ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو دریافت فرمایا کہ کیا پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ شرح وقایہ اور مرقات وغیرہ، فرمایا کہ

منطق میں بہت پیچھے ہو، اس میں محنت کرو، مولانا اپنی تصانیف میں مجتہدانہ شان رکھتے ہیں، روایت و درایت کے امام معلوم ہوتے ہیں، فقہاء خاص طور سے احناف کے بارے میں نہایت شدید رویہ رکھتے تھے اور بڑی شد و مد سے ان کا رد کرتے تھے، مگر یہ معاملہ صرف تصانیف تک محدود تھا، جو سراسر علمی و تحقیقی تھا، ہر مکتب خیال کے لوگ مولانا سے علمی مسائل دریافت کرتے تھے اور وہ ہر مسلک والے کو اس کے مسلک کے مطابق مسئلہ بتایا کرتے تھے، مولانا بھی اپنے والد ”بڑے حافظ“ صاحب کی طرح ”بڑے مولانا صاحب“ کے لقب سے متعارف تھے۔

مولانا کی زندگی سلف صالحین کا نمونہ تھی، علم و فضل، تقویٰ، طہارت، زہد و قناعت انزواء و عزلت اور سادگی میں اپنی مثال آپ تھے، دنیا میں رہ کر دنیا سے بیگانہ رہے، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، طبابت و حکمت زندگی کے مشاغل تھے، خشیتِ الہی کا غلبہ تھا۔ سنا ہے کہ جہری نماز نہیں پڑھا کرتے تھے، کیوں کہ رو دیا کرتے تھے، ان کے ایک عزیز شیخ محمد شبلی کا انتقال ہوا، مولانا نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی تو آخری تکبیر میں بے قابو ہو گئے اور مشکل سے تکبیر پوری کر سکے، اس جنازے میں راقم بھی شریک تھا، مشہور ہے کہ دس بارہ سال تک گھر سے باہر نہیں نکلے اور مکان و مسجد کے علاوہ کہیں نہیں گئے، ایسے کئی واقعات مشہور ہیں کہ قصبہ میں کہیں گئے تو راستہ بھول کر کہیں کے کہیں چلے گئے۔ تو گل کا یہ عالم تھا کہ سلطان عبدالعزیز بن عبدالرحمن آل سعود نے خاص طور سے دارالحدیث مکہ مکرمہ کی مدرّسی کے لیے گراں قدر مشاہیر پر مولانا کو طلب کیا، مگر آپ نے جواب دیا کہ میں فی الحال ”تحفۃ الاحوذی“ کی تکمیل میں ہوں، اس کے بعد سوچوں گا۔ اسی طرح دارالحدیث رحمانیہ کی صدر مدرّسی کے لیے معقول مشاہیر پر آپ کی طلبی ہوئی، مگر آپ نے گوشہ عافیت و قناعت نہیں چھوڑا۔

براہِ راست عامل بالحدیث تھے، صفات باری تعالیٰ کے سلسلے میں ماورد بہ کتاب والسنة پر ایمان رکھتے تھے، ”تحفۃ الاحوذی“ میں اس سلسلے میں ان کے خاص مختارات بھی ہیں، ان کی ہیئت یہ تھی، قدمیانہ، بدن گداز، رنگ گندی، چہرہ خوب صورت ابھرا ہوا، سفید گاڑھے کا مغلیٰ پانجامہ، نیچا کرتہ، گول ٹوپی، کندھے پر بڑا رومال، ہاتھ میں چھڑی، نزول الماء کی وجہ سے دونوں آنکھوں سے آخری وقت میں معذور ہو گئے تھے۔

مولانا کے تلامذہ کی فہرست بڑی طویل ہے، جن میں عرب و عجم کے علماء شامل ہیں، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں: مولانا عبد السلام صاحب مبارک پوری صاحب سیرۃ البخاری، شیخ عبد اللہ نجدی قومی، چند سال پہلے تک مصر میں موجود تھے، اب معلوم نہیں کہ زندہ ہیں یا نہیں، شیخ علامہ ڈاکٹر محمد بن عبد القادر تقی الدین الہلالی المراكشی حال استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، ست رقیہ بنت شیخ خلیل بن شیخ محمد بن شیخ حسن انصاری یمانی، مولانا عبید اللہ مبارک پوری صاحب مرعۃ المصانج، مولانا حکیم الہی بخش مبارک پوری، مولانا محمد محمود معروفی، مولانا شاہ محمد سریانوی، مولانا عبد الصمد حسین آبادی، مولانا نذیر احمد ملوی، مولانا عبد الجبار کھنڈیلوی جے پوری، مولانا محمد اسحاق آروی، مولانا عبد الرحمن نگر نہسوی، مولانا ابوالنعمان عبد الرحمن منوی، مولانا نعمت اللہ بردوانی، مولوی عبد الرزاق صادق پوری، مولوی محمد جعفر ٹوکی، مولوی عبد الحکیم فتح پوری، مولوی محمد اسماعیل مبارک پوری، مولوی محمد اصغر مبارک پوری وغیرہ۔

مولانا کے تبحر علمی اور علم حدیث میں مہارت پر ان کی تصانیف شاہد ہیں، یوں تو آپ کی بہت سی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف ہیں، مگر ان میں ”تحفۃ الاحوذی“ شرح جامع ترمذی کو اللہ تعالیٰ نے عالم اسلام اور عرب ممالک میں جو شہرت و مقبولیت دی ہے، شاید متاخرین علمائے ہند میں سے کسی کی کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔

اسی طرح ابکار المنن اور تحقیق الکلام آپ کے تبحر علمی کا شاہکار ہیں، نیز عون

المعجود شرح سنن ابوداؤد کی تالیف و تصنیف میں آپ کی صلاحیت نے چار چاند لگائے، آپ کی تصانیف اور ان کا مختصر تعارف یہ ہے:

(۱) تحفۃ الاحوذی: شرح جامع الترمذی مع مقدمہ پانچ ضخیم جلدوں میں ہے، پہلی جلد ۱۳۴۶ھ میں چھپی، دوسری جلد کی اشاعت کے بعد مولانا کو ضعف بصارت اور نزول الماء کی شکایت ہوئی اور آخری دونوں جلدوں کی تمییز کے لیے علماء کی ایک جماعت نے کام کیا، سیرۃ البخاری کے حاشیے میں تحفۃ الاحوذی کی حسب ذیل خصوصیات کا ذکر ہے:

(۱) جامع ترمذی کے ہر راوی کا بقدر ضرورت ترجمہ۔

(۲) جملہ احادیث کی تخریج یعنی امام ترمذی کے علاوہ کن محدثین نے کن کن کتابوں میں ان کا ذکر کیا ہے۔

(۳) امام ترمذی نے ”فی الباب“ کے عنوان سے جن احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کی مفصل تخریج، دیگر احادیث کی بھی حسب ضرورت تخریج۔

(۴) احادیث کی تخریج و تحسین میں امام ترمذی کا تساہل مشہور ہے، اس لیے ہر حدیث کی تخریج و تحسین کے متعلق دیگر ائمہ کے اقوال نقل کیے گئے ہیں اور جہاں امام ترمذی سے تساہل ہوا، اس کی تصریح کی گئی ہے۔

(۵) سند اور متن کے اشکالات کا حل اور ان کی ایضاح۔

(۶) احادیث کی توضیح و تشریح کے سلسلے میں مقلدین اور اہل اہوا کی تغلیط۔

(۷) اختلاف مذاہب کے بیان میں ہر مذہب کے دلائل بیان کر کے مذہب رائج کے ساتھ مذہب مرجوح کے حوالے دیے گئے ہیں۔

چوں کہ مولانا مسلک اہل حدیث کے پیشوا اور امام تھے، اس لیے اس شرح میں مذاہب اربعہ کے مقلدین خصوصاً علمائے احناف میں متاخرین و معاصرین کا شد و مد کے

ساتھ رد کیا ہے، پچاسوں سال پہلے رجال و اسناد اور متون و احادیث پر بحث کے ساتھ جرح و تعدیل اور تخریج احادیث کا کام بہت مشکل اور بہت ہی دقت طلب تھا، آج کل احادیث کی تخریج و فہارس پر بہتر سے بہتر قدیم و جدید کتابیں شائع ہو گئی ہیں اور ان کی مراجعت سے یہ کام نہایت آسانی سے فوراً ہو جاتا ہے۔

کنوز مفتاح السنۃ، تحفۃ الاشراف، المعجم المفہرس وغیرہ کی اشاعت و طباعت کے بعد یہ کام بہت آسان ہو گیا ہے، مولانا نے یہ خدمات اس وقت انجام دی ہیں، جب کہ ان کتابوں کا نام و نشان بھی نہیں تھا، تحفۃ الاحوذی پہلے ہندستان میں چھپی، پھر ۱۳۸۵ھ میں مدینہ منورہ کے ایک مکتبہ نے مصر میں طبع کرا کر دس جلدوں میں شائع کی، اس کے بعد ہندوستانی نسخے کا آفسیٹ فوٹو بیروت سے شائع ہوا، یہ تینوں مطبوعہ نسخے ہم نے دیکھے ہیں اور عام طور سے عرب ممالک میں بکتے ہیں۔

(۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی: اس میں علم اصول حدیث کے اہم مباحث اور جامع ترمذی پر نہایت نادر معلومات ہیں، یہ مقدمہ بجائے خود علم حدیث پر ایک مستقل کتاب ہے، مولانا نے اس کے مسودے میں جگہ جگہ بیاضات چھوڑی تھیں اور تحفۃ الاحوذی کی تکمیل کے بعد اس کی تکمیل کا ارادہ تھا، مگر اس کا موقع نہ مل سکا۔

آپ کی وفات کے بعد آپ کے تلامذہ میں سے مولانا عبدالصمد حسین آبادی اور مولانا عبید اللہ صاحب مبارک پوری نے اس کی تکمیل کی، تشنہ مباحث کو پورا کیا، بیاضات و اشارات کے ابواب و فصول تحریر کیے اور یہ مقدمہ ۱۳۵۹ھ میں شائع ہو سکا، تحفۃ الاحوذی کے ساتھ بیروت میں مقدمہ بھی آفسیٹ فوٹو پر چھپا ہوا ہے۔

مولانا نے مقدمہ میں کتب احادیث کے مخطوطات اور نوادر کے بارے میں نشان دہی کی ہے کہ فلاں کتاب یورپ اور ایشیا کے فلاں فلاں کتب خانے میں موجود ہے، یہ کام

بھی پچاسوں سال پہلے دشوار تھا اور آج جب کہ دنیا کے ہر مشہور کتب خانے کی مفصل فہرست اور کیٹلاگ مرتب ہو کر چھپ چکی ہے، گھر بیٹھے دنیا بھر کے کتب خانوں کی سیر کی جاسکتی ہے۔ چوں کہ ادھر پچھلے سالوں میں یورپ اور ایشیا میں متعدد جنگیں ہو چکی ہیں اور انقلابات آچکے ہیں، اس لیے بہت سے ممالک کے کتب خانوں پر زوال آیا اور ان کے نظام میں ابتری پیدا ہوئی، ان کی کتابیں ادھر سے ادھر ہوئیں اور بہت سی کتابیں غائب ہو گئیں، اس لیے ہوسکتا ہے کہ اس مقدمہ کی نشان دہی بعض کتابوں کے بارے میں بے محل معلوم ہوتی ہو۔

(۳) ابکار الممنن فی تنقید آثار السنن: مولانا محمد ظہیر احسن خفی نبوی بہاری متوفی ۱۳۲۲ھ نے بلوغ المرام کے طرز پر آثار السنن لکھی، جس میں فقہ حنفی کے مطابق احادیث کو جمع کیا، نیز احادیث کی تصحیح و تضعیف کی، مولانا نے اس کے جواب میں ابکار الممنن لکھی، اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

”هذه فوائد علقته على آثار السنن وعلى تعليقه
المسمى بالتعليق الحسن وعلى تعليقه المسمى بتعليق
التعليق كلها للمولوي ظهير أحسن النيموي أكرها
اعتراضات عليه ومناقشات له ومباحث معه“۔

(۴) تحقیق الکلام فی وجوب القراءة خلف الامام (اردو): یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، قرآنہ خلف الامام کے معرکہ الآراء مسئلہ پر ہے، اس میں اس کے وجوب کو ثابت کرنے کے ساتھ حنفیہ کے دلائل کے جوابات دیے گئے ہیں، دو حصوں میں ہے، پہلا حصہ ۱۳۲۰ھ میں شائع ہوا اور دوسرا حصہ ۱۳۳۵ھ میں پھر ۱۳۵۵ھ میں چھپا، مولانا کی یہ کتاب بھی ان کی اہم ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

(۵) خیر الماعون فی منع الفرار عن الطاعون (اردو): اس کے دو حصے ہیں، پہلے

میں ان احادیث و آثار کا ذکر ہے، جو طاعون زدہ مقام سے بھاگنے کے عدم جواز پر دلالت کرتے ہیں اور دوسرے حصہ میں جواز کے قائلوں کے دلائل اور ان کے جوابات ہیں۔
(۶) المقالة الحسنی فی سنیۃ المصافحۃ بالید الیمنی (اردو): اس رسالہ میں داہنے ہاتھ سے مصافحہ کو سنت قرار دیا گیا ہے۔

(۷) کتاب الجنائز (اردو): اس میں میت اور جنازہ کے مسائل اور احکام درج ہیں۔

(۸) نور الابصار (اردو): دیہات میں جمعہ کے وجوب پر یہ رسالہ ہے۔

(۹) ضیاء الابصار بتائید نور الابصار (اردو)

(۱۰) تنویر الابصار بتائید نور الابصار (اردو): یہ دونوں مختصر رسالے دراصل نور الابصار کے ابواب ہیں، جن کو مستقل نام دے کر الگ الگ شائع کیا گیا ہے۔
(۱۱) القول السدید فیما یتعلق بتکبیرات العید (اردو): یہ مختصر رسالہ تکبیرات عیدین کے بیان میں ہے۔

ان کتابوں کا ذکر مقدمہ تحفۃ الاحوذی کے آخر میں مولانا کے حالات میں موجود ہے اور تذکرہ علمائے حال میں ۱۳۱۵ھ سے پہلے آپ کی تصانیف میں رسالہ ترجمان کا ذکر موجود ہے۔ ان مطبوعہ کتب و رسائل کے علاوہ مولانا کی متعدد کتابیں اور رسائل غیر مطبوعہ ہیں، اور یہ سب اردو میں ہیں، مثلاً (۱) الدر المنکون فی تائید خیر الماعون (۲) الوشاح الابریزی فی حکم الدواء الانگلیزی (۳) ارشاد الہائم الی منع خصاء الہائم (۴) الکلمۃ الحسنی فی المصافحۃ بالید الیمنی (نا تمام) (۵) رسالہ فرائض کے بعد دعائیں ہاتھ اٹھانے کے بیان میں (نا تمام) (۶) مسائل عشر (نا تمام)۔

مولانا نے اپنے استاد سید نذیر حسین دہلوی کے فتاویٰ کو مولانا شمس الحق عظیم

آبادی کی فرمائش پر دو ضخیم جلدوں میں مرتب کیا، اس کے ساتھ اپنے استاذ مولانا عبداللہ غازی پوری کے فتاوے بھی فقہی ابواب پر جمع کیے، جواب تک چھپ نہیں سکے ہیں اور خود مولانا کے بہت سے مطول اور مختصر فتاوے کئی جلدوں میں آسکتے ہیں، جن کی طرف توجہ نہیں کی جاسکتی ہے، مجموعہ فتاویٰ نذیریہ میں بھی مولانا کے بہت سے فتاوے درج ہیں، اگر کوئی صاحب ذوق اس کی طرف توجہ کرے تو بڑا کام ہو سکتا ہے۔

آخری زمانے میں مولانا کو نزول الماء یعنی موتیابند کا مرض لاحق ہو گیا تھا اور دونوں آنکھوں سے معذور ہو چکے تھے، رجب ۱۳۵۳ھ میں تحفۃ الاحوذی کی چوتھی جلد چھپوانے کے لیے دہلی تشریف لے گئے اور اس سلسلے میں آنکھ کا علاج بھی کرایا، ایک آنکھ کا آپریشن ہوا، جو کام یاب رہا، وطن آنے کے بعد اختلاج قلب کا دورہ پڑنے لگا، نصف شعبان اور پورا رمضان بڑی تکلیف میں گزرا اور دورہ قلب کے بار بار ہونے سے امیدویاس کا عالم رہا، اسی دوران میں بخار بھی رہنے لگا، یہاں تک کہ ۱۶ شوال ۱۳۵۳ھ (۱) کو احادیث رسول کا یہ مہر درخشاں رات کے پچھلے پہر غروب ہو گیا، رحمۃ اللہ علیہ، اور اسی دن عصر کے بعد اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے، جو قصبہ کے پچھم طرف روضہ کے احاطے میں عید گاہ کی قبلی دیوار سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے، اور قبر کے سرہانے تاریخ وفات کا کتبہ نصب ہے، حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب المتوفی ۱۶ شوال ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۵ء آپ کا جنازہ جنازہ مشہودہ تھا۔

شاید مبارک پور کی تاریخ میں اس سے پہلے کسی میت کے جنازے میں اتنا بڑا مجمع شریک نہیں ہوا تھا، آپ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو: تذکرہ علمائے حال ص ۴۳، تراجم علمائے اہل حدیث، مقدمہ تحفۃ الاحوذی، مجلہ الحج مکہ مکرمہ کے دو نمبرات، معجم المؤلفین شیخ محمد رضا کمالہ، نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۲۲۲، مقدمہ مختارات الاحادیث والحکم النبویہ عبدالوہاب عبداللطیف مصری ص ۲۰۔

(۱) مطابق ۲۲ جنوری سن ۱۹۳۵ء

حضرت مولانا ابوالامجد عبدالعلیم رسول پوریؒ

حضرت مولانا حاجی حکیم مفتی ابوالامجد عبدالعلیم بن شیخ عبدالرحیم عرف باب اللہ بن شیخ جمال الدین عرف جمن بن شیخ بھکاری بن شیخ پہاڑ بن شیخ کھیدو حنفی رسول پوری مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ کے جد امجد شیخ کھیدو تین بھائی تھے، زین الدین عرف زین، جمال الدین عرف جمال اور کھیدو۔

یہ تینوں بھائی دسویں صدی کے اواخر یا گیارہویں صدی کے اوائل میں بہ عہد بادشاہ جہاں گیر کھورہٹ کے پاس موضع اماری کساری سے ترک وطن کر کے رسول پور میں آباد ہوئے، اس بستی میں ان کی اولاد پھیلی پھولی۔

شیخ عبدالرحیم عرف باب اللہ کے پانچ لڑکے تھے: (۱) یار محمد، (۲) لعل محمد، (۳) ولی محمد، (۴) عنایت اللہ، (۵) احمد حسین، ان پنج تنوں میں دو شیخین ہوئے، ایک لعل محمد جو بعد میں مولانا عبدالعلیم کے نام سے علمی دنیا میں مشہور ہوئے اور دوسرے مولانا احمد حسین جو راقم کے جد مادری ہیں۔

مولانا عبدالعلیم رسول پور میں ۱۲۷۰ھ اور ۱۲۸۰ھ کے درمیان میں پیدا ہوئے، ان کے دادا شیخ جمن باخدا اور بزرگ شخص تھے اور ایک مشہور روحانی بزرگ سے بیعت تھے، نماز ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا، نماز فجر غلس میں ادا کرتے تھے، ساتھ ہی اپنے یہاں کے خوش حال اور مال دار آدمی تھے، مولانا عبدالعلیم کی تعلیم و تربیت میں ان کے دادا شیخ جمن اور نانا شیخ چاند گرہست (محلہ پورہ صوفی مبارک پور) کا بڑا ہاتھ تھا اور ان دو بزرگوں نے ان کی تعلیم پر خصوصی توجہ کی، مولانا نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور فارسی کی تعلیم املو میں ایک میاں صاحب سے حاصل کر کے مبارک پور میں میاں صاحب جان محمد سے تکمیل کی، اس کے بعد گورکھ پور گئے اور

متوسّطات کی تعلیم حاصل کی، افسوس کہ یہاں کے اساتذہ کے نام معلوم نہ ہو سکے۔

اس کے بعد مرزا پور میں مولانا ابوالخیر معین الدین بن خیرات علی حسینی کٹروی متوفی ۱۳۰۴ھ سے چند ماہ تعلیم حاصل کی، مولانا معین الدین کٹروی نے مولانا عبدالحکیم بن عبدالب رب فرنگی محلی، مفتی ظہور اللہ اور محدث مرزا علی حسن سے تعلیم حاصل کی تھی، مرزا پور کے بعد مولانا عبدالحی فرنگی محلی متوفی ۱۳۰۴ھ کی خدمت میں لکھنؤ پہنچے اور ان سے فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت اور اسطرلاب کی تعلیم حاصل کی، پھر مولانا مفتی ابوالحیاء محمد نعیم بن مولانا عبدالحکیم فرنگی محلی سے حدیث کی تکمیل کی اور ان ہی کے ہاتھ پر بیعت کی۔

اس کے بعد بنارس میں مولانا حکیم عبدالعلی صاحب لکھنوی سے علم طب کی تحصیل کر کے ان ہی کے یہاں نسخہ نویسی سیکھی، اس زمانے کا مجموعہ نسخہ ایک بیاض کی شکل میں اب تک موجود ہے، موجز کی ابتدا ذی قعدہ ۱۲۹۴ھ میں کی تھی، جیسا کہ اس کتاب میں ان کے قلم سے درج ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ سراپائے غم اور دوسری کتابوں میں مولانا عبدالحی کے تلامذہ کے ذکر میں اعظم گڑھ کے متعدد علماء کا نام موجود ہے، مگر مولانا عبدالحکیم کا نام نہیں ہے، حالاں کہ ان کی متعدد کتابوں پر میں نے ان کے قلم سے مولانا عبدالحی سے تلمذ کی تصریح دیکھی ہے۔

مولانا نے جن شیوخ و اساتذہ سے علم حدیث کی تکمیل کی ہے، اپنی سند میں ان کے ناموں کی تصریح کی ہے، ان میں ان کے ان دونوں فرنگی محلی شیوخ کے اسمائے گرامی بھی ہیں، چنانچہ ان کی سند میں ہے:

”منہم العلامة الجلیل رحلة عصره معتمد دهره“

ذوالتصانیف الجلیلة، مجدد دین اللہ علی راس ثلاث مائة
والف شیخنا وسیدنا مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی
الکنوی ومنهم العارف الربانی فقیہ المثل والثانی
معتد العلم والعلماء ولی من اولیاء اللہ شیخنا وسیدنا
ومولانا ابوالحیا محمد نعیم الکنوی من أحفاد البلا
نظام الدین صاحب السلسلة النظامية“۔

معلوم نہیں ان کو مولانا عبدالحی فرنگی محلی کے تلامذہ کی فہرست میں کیوں نہیں ذکر کیا
گیا، فراغت کے بعد کچھ دنوں اطراف لکھنؤ کی ایک ریاست میں تعلیمی خدمات انجام دیں،
اس کے بعد قصبہ منو میں شیخ نور علی عباسی کے مدرسے میں جو ان کے مکان کے ایک حصے میں
تھا، تعلیم دی، وہیں پر شیخ عبدالمجید اسسٹنٹ کلکٹر کے لڑکوں نے آپ سے تعلیم حاصل کی اور
جب شیخ عبدالمجید کا تقرر غازی پور ہوا تو مولانا نے چشمہ رحمت غازی پور میں تدریسی خدمت
کا سلسلہ شروع کر دیا۔

اس مدرسہ کو مولانا رحمت اللہ صاحب فرنگی محلی نے ۱۲۸۶ھ میں قائم کیا تھا، اس
زمانے میں مدرسہ چشمہ رحمت میں مولانا حافظ عبد اللہ منو غازی پوری، مولانا محمد فاروق
چریاکوٹی، مولانا امانت اللہ غازی پوری اپنے ذوق اور معیار کے مطابق خدمات انجام دے
رہے تھے، مولانا کے جانے کے بعد اس فرنگی محلی درس گاہ میں وہیں کے ایک فاضل کا اضافہ
ہوا، یہاں آنے کے بعد مولانا نے متوسطات سے لے کر انتہی کتابوں تک کا درس دینا شروع
کیا، آپ کے برادر خور د مولانا احمد حسین رسول پوری نے یہیں پر ان سے ۱۳۰۹ھ سے پہلے
نور الانوار اور میبذی وغیرہ پڑھی۔

اسی زمانے میں مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحب بنارس نے ان سے حدیث پڑھ کر

سند فراغت لی، ۱۳۱۵ھ میں ان کی تعلیمی اور تدریسی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ اسی زمانے میں تذکرہ علمائے حال میں آپ کے بارے میں لکھا گیا کہ مولوی عبدالعلیم صاحب مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور کے مدرس ہیں، اکثر طلباء آپ سے مستفیض و کامیاب ہوئے اور ہوتے ہیں۔ (تذکرہ علمائے حال ص ۷۷)

مولانا چشمہ رحمت میں گئے تو آخری وقت تک اس سے جدا نہ ہوئے اور کم و بیش ۳۵ سال تک یہاں صدر مدرس کے فرائض انجام دیئے اور اس پوری مدت میں مفتی شہر بھی رہے۔

مولانا عبدالعلیم کو مولانا عبداللہ اور مفتی محمد نعیم کی شاگردی اور صحبت نے حنفی مسلک اور فقہ حنفی میں بہت ہی صاحب نظر بنادیا تھا، اس زمانے میں علمائے اہل حدیث اور علمائے احناف میں جگہ جگہ مناظرے اور مناقشے جاری تھے اور طرفین میں شدت پیدا ہو رہی تھی، منو اور مبارک پور وغیرہ میں اس زمانے میں مسلک اہل حدیث کے اچھے اچھے علماء تھے اور مولانا عبدالعلیم ان کے مقابلے میں حنفیت کے علم برداروں میں تھے۔

چنانچہ قیام منو کے زمانے ہی میں مولانا عبداللہ منو غازی پور سے چند مختلف فیہ مسائل میں تحریری مناظرہ و مباحثہ شروع ہو چکا تھا، بعد میں جب مولانا چشمہ رحمت میں پہنچے تو وہاں مولانا عبداللہ صدر مدرس تھے اور ان کی علمی شہرت عام تھی، ان ہی ایام میں شہر غازی پور میں احناف اور اہل حدیث کے درمیان آمین بالجہر اور رفع یدین پر بحث و مباحثہ اٹھ کھڑا ہوا، اور اہل حدیث اس کے لیے مصر تھے۔

اس جھگڑے میں احناف کے سربراہ مولانا عبدالعلیم اور اہل حدیث کے سربراہ مولانا عبداللہ تھے، جھگڑا ہوا، مقدمہ بازی کی نوبت آئی اور دیوانی میں مقدمہ دائر ہوا، اہل حدیث کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کے لیے مولانا ابوالطیب شمس الحق عظیم آبادی بلائے

گئے اور احناف کی طرف سے مولانا عبدالعلیم اس پر مامور کیے گئے، مقدمے کا فیصلہ احناف کے حق میں ہوا، اس واقعہ کے بعد مولانا عبدالعلیم کی شہرت و مقبولیت بہت بڑھ گئی اور کہنا چاہیے کہ میدان ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ (بہ روایت مولانا عبدالباقی صاحب فرزند مولانا) ان ہی دنوں دونوں بزرگوں میں ایک فقہی جزیہ پر اختلاف برپا ہو گیا اور یہ بحث چل پڑی کہ کسی بلند چیز پر سجدہ کرنا جائز ہے یا نہیں۔

ایک صاحب اس کے جواز کے قائل تھے اور دوسرے صاحب عدم جواز پر مصر تھے، اس میں جانبین سے اتنا شدید اختلاف ہوا کہ مار پیٹ تک کی باری آ گئی، بعد میں یہ محقق ہوا کہ شئی مرفوع پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے، البتہ شئی مرتفع پر جائز ہے۔ (بہ روایت مولانا ابوالحسن حیدری غازی پوری شاگرد مولانا مرحوم در سفر حج ۱۳۸۵ھ)

ایک مرتبہ مولانا عبدالعلیم اور مولانا احمد رضا خاں کے درمیان اذان بین یدی المنبر پر تحریری بحث و مباحثہ ہوا، مولانا عبدالعلیم قائل تھے کہ جمعہ کے دن خطبہ کی اذان منبر کے پاس ہی خطیب کے سامنے ہونی چاہیے اور مولانا احمد رضا خاں صاحب کا دعویٰ تھا کہ اذان منبر سے دور باہر ہونی چاہیے، دونوں نے تحریری دلائل پیش کیے اور مولانا نے اس موضوع پر ایک کتاب ”درۃ التاج الأنور فی أذان الجمعة عند المنبر“ کے نام سے ۱۳۲۷ھ میں تحریر فرمائی، اور جب حج و زیارت کو گئے تو پورے عالم اسلام کے فضلاء و علماء سے مل کر اس بارے میں ان کا تعامل معلوم کیا اور پتہ چلا کہ ہر ملک میں جمعہ کے خطبہ کی اذان منبر کے پاس ہوتی ہے، بعد میں سفر نامہ حجاز میں اس کو بیان کیا۔

اس سلسلہ میں یہ بات دلچسپ ہے کہ مولانا احمد رضا خاں اور مولانا عبدالقادر بدایونی میں اسی مسئلے پر بحث چلی اور جمعہ کی اذان ثانی کے مسئلے پر بریلی اور بدایوں کے علمی و دینی مرکزوں میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا، تو اتحاد عقائد اور مولانا احمد رضا خاں کے

مولانا عبدالقادر سے شرف تلمذ رکھنے اور ان کی مدح میں قصیدہ کہنے کے باوجود معاملہ تفسیق و تضلیل تک پہنچ گیا۔

مولانا احمد رضا خاں کو علمائے بدایوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور مقدمہ بازی تک نوبت آگئی، نواب حامد علی خاں والی رام پور کی حکمت عملی نے اس قضیے کو جیسے تیسے ختم کرایا۔ (فاران کراچی ماہ اپریل ۱۹۶۷ء ص ۲۹)

مولانا عبدالعلیم اپنے زمانے میں اس دیار کے زبردست فقیہ، اصولی، مفتی اور حنفی عالم تھے، علوم عقلیہ و نقلیہ میں جامع المعقول والمنقول اور علم کلام میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، طب و حکمت میں اپنی مثال آپ تھے، ذہانت و طباعی بلا کی تھی، علمی و فقہی مباحث و مناقشات میں حصہ لیتے تھے، ان کو اپنے علم و تحقیق پر پورا اعتماد تھا اور دوسرے اہل علم بھی ان کی تحقیقات پر مطمئن تھے۔

طب و طبابت میں حداقت و مہارت کا یہ حال تھا کہ روتے ہوئے مریض کو معمولی معمولی دواؤں سے تھوڑی دیر میں ہنسا دیتے تھے، ان کے طبی چٹکے مشہور تھے، خطاطی اور خوش نویسی میں کمال حاصل تھا اور ہمہ اقسام کے خطوط پر پوری قدرت رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک مشہور عالم سے بحث و مباحثہ کی باری آئی تو سب سے پہلے ان سے سوال کیا کہ فلک اول کا محرک کون ہے؟ یہ سنتے ہی اس عالم نے کہا کہ منقولات کی بحث میں معقولات کی بات فضول ہے اور اسی پر مناظرہ ختم ہو گیا اور گویا فتح حاصل ہو گئی، میں نے اپنے بچپن میں ان کو دیکھا ہے، مگر شکل و صورت ذہن میں باقی نہیں رہی۔

اس دور میں مبارک پور میں تدریس و تصنیف کے جید علماء موجود تھے اور اپنے اپنے انداز میں خوب کام کر رہے تھے، یہ دور علمی و دینی اعتبار سے عصرِ ذہبی تھا، ان میں مولانا عبدالرحمن صاحب، مولانا عبدالسلام صاحب، مولانا عبدالعلیم صاحب اور ان کے برادرِ خورد

مولانا احمد حسین صاحب، مولانا ظفر حسن صاحب عینی اور مولانا محمد شریف صاحب مصطفیٰ آبادی آسمانِ علم و تحقیق کے آفتاب و ماہتاب تھے۔

مولانا عبدالعلیم کے علمی و فقہی تبحر کا شہرہ دور دور تک تھا اور ان کے پاس طلبہ کھینچ کھینچ کر آتے تھے، خاص طور پر فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ کے پڑھانے میں یکتا مانے جاتے تھے، کم و بیش چالیس سال تک مروجہ علوم و فنون کا درس دیا اور تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا، ان کی درس گاہ سے ہزار ہا طلبہ فارغ ہو کر نکلے۔

ان میں سے چند علماء کے نام یہ ہیں: مولانا مفتی محمد ابراہیم بناری متوفی ۱۳۸۴ھ، مولانا احمد حسین رسول پوری، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا شاہ محمد سریانوی، مولانا شیخ محمد عباسی منوی صدر قانون گو، گورکھپور، مولانا ابوحسن حیدری غازی پوری، مولانا محمد طفیل املوی، مولانا حکیم شاہ فیاض عالم املوی، مولوی حکیم الطاف حسین سکٹھوی، مولوی نور محمد امام جامع مسجد مبارک پور۔

مولانا نے تعلیم و تدریس، افتاء، طبابت کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا اور متعدد کتابیں لکھیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اساس التوحید: ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے، جسے فراغت کے بعد ۱۳۰۴ھ میں اس زمانے کے ذوق کے مطابق فارسی زبان میں لکھا، یہ کتاب علم کلام و عقائد میں ہے، مختصر ہونے کے باوجود نہایت مفید اور اہم کتاب ہے، صاحب معارف الموارف (الثقافة الاسلامیة فی الہند) نے اس کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

”اساس التوحید مختصر بالفارسی فی العقائد للمولوی

عبدالعلیم بن باب اللہ المبارک فوری صنفہ ۱۳۰۴ھ۔

(الثقافة الاسلامیة فی الہند ص ۲۴)

یہ کتاب دوسری بار ۱۳۱۲ھ میں چھپی اور اس زمانے میں بمبئی کے مشہور کتب خانوں کی فہرست میں اس کا نام ملتا ہے۔

(۲) سید التخریج مسی بہ توضیح الفرائض: یہ کتاب علم الفرائض والمواریث میں مختصر ہونے کے باوجود نہایت جامع، مفید اور سہل ہے، اس کا سن تالیف ۱۳۱۹ھ ہے، اس میں اردو زبان میں فرائض کے بیچ در بیچ مسائل کو نہایت آسان پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

(۳) التبصرہ فی تحقیق الاشربہ: یہ رسالہ حقہ وغیرہ (دخان) کی حلت و حرمت اور کراہت کی بحث میں ہے۔

(۴) کتاب الشہادت: یہ کتاب اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ اس میں ایک خاص موضوع پر احادیث و آثار کو نہایت جامعیت اور تحقیق کے ساتھ مختلف ابواب میں جمع کیا گیا ہے، اس اہم کتاب کی تصنیف کا باعث مبارک پور میں ۱۳۲۱ھ و ۱۳۲۲ھ کا وہ قیامت خیز طاعون ہے، جس سے ہزاروں گھر کے چراغ گل ہو گئے، مولانا محمد و صلوة کے بعد مقدمہ میں لکھتے ہیں:

”معلوم ہو کہ کچھ دنوں سے ہندوستان میں طاعون کی آسمانی بلا اس طرح عالم گیر ہے کہ صد ہا خاندان کو برباد کر دیا اور ہزاروں مکان کے چراغ گل کر دیئے، جس سے صد ہا یتیم و بیس گلی کوچوں میں بلک رہے ہیں اور ہزاروں بیوہ و لاوارث آہ و نالہ دل خراش سے سامعین کے کلیجوں کو پاش پاش کر رہے ہیں، جب ۱۳۲۱ھ میں یہ بلا اعظم گڑھ کے اطراف و نواحی میں پہنچی تو وہاں کی بھی یہی حالت ہوئی کہ ہزاروں مکانات بے مالک ہو گئے، جن میں کوئی چراغ کا جلانے والا نہ رہا، اور یتیمی و لاوارثین کی حالت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے، پس اکثر برادرانِ دینی و ایمانی خاص کر یادگار سلف

نمونہ خلف جناب ملکی صفات حافظ عبداللطیف صاحب امام و خطیب جامع مسجد مبارک پور (متوفی ۱۳۳۴ھ / ۲۵ فروری ۱۹۱۵ء) نے اس فقیر ابوالامجد محمد عبدالعلیم اعظمی سے فرمائش کی کہ اگر طاعونی شہداء اور جو لوگ شہادت کی نعمت سے شرف یاب ہوئے ہیں، ان کے باب میں کوئی رسالہ لکھا جاتا تو مصیبت زدوں کے زخم کا مرہم ہوتا، اس واسطے میں نے ان لوگوں کا حال جو شہادت کی موت سے شرف یاب ہوئے ہیں، کتب احادیث وغیرہ سے تلاش کر کے نہایت آسان زبان میں اس رسالہ کو مرتب کیا اور ان کا نام ”کتاب الشہادۃ“ رکھا۔ (کتاب الشہادۃ ص ۲، ۳)

یہ کتاب مولانا کے تلمیذ رشید مولوی شیخ محمد عباسی صدر قانون گو کے اہتمام و ارشاد سے ۱۳۳۲ھ میں گورکھپور میں چھپی تھی، خدا کی شان کہ کتاب الشہادت لکھنے والے کی موت بھی شہادت کی ہوئی۔

(۵) الخطب المنبریہ من الآیات القرآنیہ: اس مجموعہ خطب کو قرآنی آیات سے مرتب کیا گیا ہے، جو نہایت مقبول ہوا۔

(۶) درۃ التاج الانور فی اذان الجمعة عند المنبر: جیسا کہ گزر چکا ہے ۱۳۲۷ھ میں لکھی، اس رسالے میں جمعہ کی اذان ثانی کا منبر کے سامنے ہونا ثابت کیا گیا ہے اور کتب احادیث و فقہ اور تعامل امت سے اس کے دلائل دیئے گئے ہیں، ۱۶ صفحات میں غوثیہ پریس غازی پور میں ماہ اگست ۱۹۰۹ء میں چھپی۔

(۷) سفر نامہ حجاز: حج و زیارت کے دوران مولانا نے ممالک اسلامیہ سے آئے ہوئے علماء و فضلاء سے مل کر جمعہ کی اذان ثانی کے بارے میں ان کا تعامل معلوم کر کے اس رسالہ میں بیان کیا ہے۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ آپ کی کئی علمی و تحقیقی اور فنی تصانیف غیر مطبوعہ موجود

ہیں، ان میں سے جن کتابوں کے مسودات ہم نے دیکھے ہیں، یہ ہیں:

(۱) اصول فقہ: یہ اصول فقہ میں اردو زبان میں غالباً پہلی کتاب ہے، جو نہایت جامع اور مفید ہے، اس پر سن تصنیف ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ درج ہے، اسی سال آپ کا وصال ہوا، یہ آپ کی آخری تصنیف ہے، اچھی خاصی ضخیم اور نہایت عمدہ کتاب ہے، اے کاش! یہ کتاب چھپ جاتی اور ہمارے مدارس اسلامیہ کے کام آتی۔

(۲) الدوحة الناضرة في علم المناظرة: فن مناظرہ وجدلیات سے مولانا کو شروع ہی سے دلچسپی تھی اور اپنے معاصرین سے علمی انداز میں بحث و مباحثہ کا سلسلہ جاری رکھتے تھے، اس لیے فن مناظرہ کے اصول و فروع سے اچھی طرح واقف تھے، اس کتاب میں اردو زبان میں اس فن کے جملہ مباحث نہایت سلیس انداز میں درج ہیں، اس کے مسودہ پر تاریخ تصنیف یوم جمعہ ۲۶ شوال ۱۳۲۴ھ ہے۔

(۳) الفريدة الوضعية في الحكمة الالهية: یہ کتاب عربی زبان میں الہیات پر ہے اور ان چند نادرا اور مخصوص کتابوں میں سے ہے، جو آخری دور میں اس فن پر لکھی گئی ہیں، دقیق سے دقیق تر مسائل و مباحث کو نہایت سہل انداز میں بیان کیا گیا ہے اور عربیت و ادبیت کا اعلیٰ معیار سطر سطر سے نمایاں ہے، یہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت جامع ہے، اسی زمانے میں ان کے معاصر اور ہم وطن عالم مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی نے ”الأفاضة القدسية في المباحث الحکمیة“ لکھی، جو طبع ہو کر مشہور و مقبول ہوئی۔

(۴) رواة البخاری المجر و حون: یہ کتاب بھی عربی زبان میں ہے اور صحیح بخاری کے بعض رجال و رواة پر امام دارقطنی کے انداز میں نقد و نظر ہے، اس موضوع سے قریب ترا بن حبان کی کتاب ”المجر و حین من المحدثین“ ہے، جو چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

(۵) مجموعہ فتاوائے علیہی: یہ مولانا کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے، جو کئی ضخیم جلدوں میں ہے، اس میں آخر فتویٰ پر یکم اپریل ۱۹۲۱ء (۱۳۴۰ھ) درج ہے اور اس کے ایک سال کے بعد ۲۲/۱ اپریل ۱۹۲۲ء (۱۳۴۱ھ) کوریل کے حادثہ میں ان کا وصال ہوا۔

ان کے شاگرد مولوی حکیم احمد حسین غازی پوری نے ایک سفر میں مجھے بتایا ہے کہ مولانا بنارس تشریف لے جا رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ تھا، اوڑھیٹاڑ جٹکشن پر غازی پور سے آنے والی ٹرین کھڑی تھی، جس میں ہم لوگ بیٹھے تھے کہ یک بارگی میں نے دیکھا کہ ڈبے کی چھت پھٹ گئی اور آسمان نظر آیا، اس کے بعد بنارس اسپتال میں مجھے ہوش آیا اور مولانا عبدالعلیم صاحب اس قدر شدید زخمی ہوئے کہ آخر تک وہ ہوش میں نہ آ سکے، ان کا سر پھٹ گیا تھا اور بنارس اسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا۔

یہ واقعہ ۲۲/۱ اپریل ۱۹۲۲ء (۱۳۴۱ھ) کا ہے، محلہ کچی باغ میں بناؤ شہید کے مزار کے قریب بلندی پر دفن کیے گئے۔

حضرت مولانا حکیم ابوالہدیٰ عبدالسلام مبارک پوری

حضرت مولانا حکیم ابوالہدیٰ عبدالسلام بن شیخ خان محمد بن شیخ امان اللہ بن شیخ حسام الدین مبارک پور کے مشہور علمائے دین میں سے تھے، جنہوں نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ساتھ حکمت و طبابت میں زندگی بسر کی۔

مولانا کا خاندان قصبہ میں بڑی عزت و شہرت کا مالک تھا اور اس میں علم و فضل کا چرچا بہت پہلے سے چلا آتا تھا۔

ان کے والد شیخ خان محمد بڑے نیک اور متقی آدمی تھے، قرآن حکیم، ادعیہ، ماثورہ اور

دینی مسائل سے خاص طور سے شغف رکھتے تھے، ان کی ولادت ۱۲۸۹ھ میں اور وفات یوم یکشنبہ ۱۸/رجب ۱۳۴۲ھ (۲۴ فروری ۱۹۲۴ء) میں عین نماز مغرب کی اذان کے وقت ہوئی اور مولانا کے نانا حکیم امان اللہ صاحب شاہ ابواسحاق لہراوی کے شاگرد رشید تھے۔

(سیرۃ البخاری ص ۳۸)

تذکرہ علمائے حال میں لکھا ہے کہ مولوی حکیم سلامت اللہ (عبدالسلام) صاحب مبارک پوری کی ولادت مبارک پور میں ۱۲۸۹ھ میں ہوئی، کافیہ، شافیہ تک مولوی حافظ عبدالرحیم بن حاجی بہادر مبارک پوری اور دیگر علماء سے پڑھا، پھر شرح تہذیب اور شرح جامی مولانا عبدالرحمن بن حافظ عبدالرحیم صاحب مبارک پوری سے پڑھا اور شرح وقایہ مولانا حسام الدین صاحب منوی سے پڑھ کر بقیہ کتب مولانا عبدالرحمن مبارک پوری اور مولانا حافظ عبداللہ صاحب منوی غازی پوری سے پڑھ کر دہلی گئے اور مولوی عبدالحق صاحب ولایتی مدرّس مدرسہ فتح پوری سے تحصیل علم کرنے کے بعد مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی سے صحاح ستہ، تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، نخبۃ الفکر پڑھی اور ان سے ہی علم حدیث کی سند اجازت حاصل کی۔

نیز مولانا شیخ حسین عرب سے حدیث کی اجازت عامہ حاصل کر کے مولانا شیخ محمد صاحب مچھلی شہری سے اجازت حدیث مسلسل بالاولیہ حاصل فرمائی اور طب و حکمت کی تعلیم حکیم عبدالولی بن حکیم عبدالعلی صاحب لکھنوی سے پائی۔ (تذکرہ علمائے حال ص ۲۹)

آپ کا سلسلہ سند ہر سہ شیوخ سے یوں ہے:

(۱) عبدالسلام عن الشيخ السيد نذير حسين

المحدث الدهلوي في ۱۳۰۹ھ عن الشيخ المكرم في

الافاق الشاه محمد اسحاق، عن مسند الوقت الشاه

عبدالعزیز عن بقية السلف الشاه ولي الله، عن الشيخ
ابي طاهر المدني عن الشيخ ابراهيم الكردي، الخ۔

(۲) عبدالسلام عن الشيخ حسين بن محسن
الأنصاري في ۱۳۰۹ھ في دهلي لما نزل به، عن الشيخ
حسن بن عبدالباري الأهدل ومحمد ناصر الحازمي
وأحمد بن الشوكاني وكلهم عن الشوكاني۔ الخ

(۳) عبدالسلام عن الشيخ محمد المجهلي شهري في
۱۳۱۳ھ عن الشيخ عبدالحق البنارسي عن القاضي
الشوكاني۔ الخ۔ (سيرة البخاري ص ۴۴۸)

مولانا عبدالسلام کے اکثر اساتذہ وشيوخ اہل حدیث مسلک کے تھے اور خود
مولانا بھی اسی مسلک کے زبردست عالم تھے، انھوں نے اپنی کتاب سيرة البخاري میں جگہ
جگہ ان شيوخ کا تذکرہ کر کے ان کے افادات درج کیے ہیں، مثلاً ناصر الدین احمد المنیر کے
بارے میں لکھتے ہیں، ”یہ لفظ بہ تشدید یاء واقع ہے، هذا ما أفاد شيخنا الشيخ
حسين عرب اليميني رحمة الله عليه۔ (سيرة البخاري ص ۴۴۸)

ایک جگہ لکھتے ہیں: ”شيخنا المحترم استاذ الاساتذہ جناب مولانا حافظ عبداللہ صاحب
غازی پوری نے بھی (مقدمہ صحیح مسلم کی) ایک شرح طویل اور نہایت مفید لکھی ہے، جس کا نام
”البحر المواج“ ہے۔ (سيرة البخاري ص ۱۸۹)

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کو اپنے اساتذہ وشيوخ سے کیسا علمی
و دینی تعلق ہوا کرتا تھا اور اس تعلق سے وہ کس قدر فیض اٹھاتے تھے۔

مولانا نے مروجہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کے بعد تعلیم و تدریس اور تصنیف

وتالیف میں زندگی بسر کی، پندرہ سال تک صادق پور پٹنہ کے مدرسہ میں تعلیم دی اور اسی دوران میں اپنی مشہور کتاب ”تاریخ المنوال واہلہ“ تصنیف کی، تین سال تک مدرسہ فیض عام میں مدرس رہے، اس کے بعد ضلع گونڈہ کے ایک مدرسہ میں چار سال تک پڑھایا۔

آخر میں مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں تشریف لے گئے اور یہیں زمانہ تعلیم و تدریس میں ۲۸/رجب ۱۳۴۲ھ/۲۴ فروری ۱۹۲۴ء میں انتقال فرمایا، آپ کی تدریسی قابلیت و خدمت کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا، چنانچہ آپ کی وفات کے بعد مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ نے اخبار اہل حدیث میں آپ کی تدریسی خدمات کا یوں اعتراف کیا ہے:

”آہ! عبدالسلام مرحوم مولانا موصوف صحیح معنوں میں ایک عالم، علوم کے مدرس تھے، مدرسین کی تلاش میں جب نظر پڑتی تو آپ ہی پر پہلے پڑتی“۔ (اخبار

اہل حدیث مورخہ ۳۰/رجب ۱۳۴۲ھ/۷ مارچ ۱۹۲۴ء، بحوالہ تراجم علمائے حدیث)

مولانا تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور تحقیق کا کام جاری رکھتے تھے اور ہر دور میں کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے، چنانچہ مدرسہ صادق پور کے دوران قیام میں تاریخ المنوال جیسی معرکہ الآراء کتاب لکھی، جس نے علمی اور تمدنی حلقوں میں حرکت پیدا کر دی۔

ایک زمانہ میں اخبار اہل حدیث امرتسر میں ”تراجم علمائے اہل حدیث“ کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع ہوا تھا، جو ۳۰/اگست ۱۹۱۸ء سے ۱۷/اگست ۱۹۲۲ء (۱۳۳۷ھ سے ۱۳۴۱ھ) تک جاری رہا، جس میں بیاسی علماء کے سوانح حیات شائع ہوئے، ان میں ایک تہائی تراجم و سوانح مولانا عبدالسلام نے تحریر فرمائے تھے، ۱۳۲۹ھ میں ”سیرۃ البخاری“ جیسی عظیم الشان کتاب لکھی، جو اپنے موضوع پر واحد کتاب ہے، مولانا نے ”کتاب التمدن“ کے نام سے ایک سلسلہ تصنیف و تالیف شروع کیا تھا، جس کے دو حصے تھے، دوسرا حصہ

”تاریخ المنوال وابلہ“ کے نام سے چھپا، مگر اس پر مصنف کی حیثیت سے نام اپنے صاحب زادے عبید اللہ مبارک پوری کا رکھا، جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی اور شائع ہوئی، مسلمانوں کے عرفی شرفاء میں پیشہ ور برادریوں خصوصاً پارچہ بانوں کے بارے میں نہایت حقارت آمیز خیالات پائے جاتے تھے اور ان کی ابھرتی ہوئی صلاحیت اور علمی، تمدنی اور اخلاقی ترقی کو دیکھ کر وہ چراغ پا ہوتے تھے۔

جس کی وجہ سے اس طبقہ کے بعض علم و فضل احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنے کو چھپاتے تھے، مگر مولانا نے کمال جرأت سے کام لے کر اسلامی مساوات اور تاریخی واقعات و حقائق کی روشنی میں تحقیق و تلاش کے بعد یہ کتاب لکھی اور اس کا نہایت خوش گوار نتیجہ نکلا، اس کتاب میں اپنے وطن مبارک پور کے انصاری مسلمانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

”دینی تعلیم کا شوق بہت ہے، ان کے اپنے متعدد مدرسے ہیں، شیعہ، سنی کے مدرسے علیحدہ، شیعوں میں دو جماعت اسماعیلیہ (بوہری)، اثنا عشریہ، سنیوں میں اہل حدیث، حنفی، حنفیوں میں دیوبندی، رضا خانی، سب کے مدارس علیحدہ، جامع مسجد نہایت شان دار، جمعہ کی جماعت بہت بڑی ہے، یتیم خانہ بھی ہے، مبارک پور میں ۲۸ محلے ہیں اور ان ہی سے مملو ہیں، دیگر اقوام ان کے خدام ہیں، حضرات شیخ انصاریوں کے جیسا کہ ابھی ہم لکھ آئے ہیں، متعدد مدارس ہیں اور علوم دینیہ کی طرف بڑی توجہ ہے، اسی وجہ سے سند یافتہ علماء، فضلاء، مدرسین، مصنفین، حفاظ قرآن کی کثرت ہے، جابجا دور دراز جگہوں میں یہاں کے لوگ مدرس ہیں، طبیب ہیں، مفتی ہیں، افسوس یہ ہے کہ زمانہ حال کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں ہے اور دولت مندوں میں بجز تجارتی تعلیم کے علوم انگریزی یا علوم دینیہ کا شوق نہیں ہے۔“ (تاریخ المنوال ج ۲ ص ۵۱)

یہ کتاب مطبع احمدی پٹنہ میں چھپی ہے۔

”سیرت البخاری“ مولانا کی علمی و تاریخی اور تحقیقی کاوشوں کا شاہکار ہے، ان کے

معاصر علامہ شبلی نعمانی نے ۱۳۰۹ھ میں ”سیرت النعمان“ لکھی تو اس کے مضامین و معلومات کی وجہ سے اہل حدیث طبقہ میں برہمی پھیل گئی اور اس کے جوابات لکھے گئے، جن میں ”حسن البیان“ نامی کتاب بھی ہے، مولانا عبدالسلام بھی ”سیرۃ البخاری“ میں ہم عصر نعمانی اور صاحب سیرۃ النعمان کے مد مقابل ہیں اور ”سیرۃ البخاری“ کے دوسرے حصے میں اپنے ہم عصر نعمانی اور ان کی کتاب ”سیرۃ النعمان“ پر کڑی تنقید کی ہے۔

اس سلسلے میں بعض مقامات پر حنفیوں اور عراقیوں کے بارے میں بڑی شدت آگئی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوانح عمری نہیں ہے بل کہ مناظرے کی کتاب ہے، اس کا احساس خود مولانا کو بھی تھا، چنانچہ مقدمہ میں فرماتے ہیں:

”ہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس کتاب میں کچھ ایسے مضامین بھی ملیں گے، جن سے عام لوگوں کو چنداں دلچسپی نہ ہوگی، کیوں کہ وہ تاریخی حیثیت سے الگ محدثانہ یا فقیہانہ رنگ کے ہوں گے۔“

اس کے باوجود ”سیرۃ البخاری“ اردو زبان میں اپنی جامعیت اور معیار کے اعتبار سے پہلی کتاب ہے اور اس کتاب سے حضرت امام بخاریؒ کی سوانح عمری کا قرضہ امت کے سر سے ہلکا ہو گیا ہے، یہ کتاب پہلی بار ۱۳۲۹ھ میں بڑے آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی، اس کے تیرہ سال کے بعد مولانا کا انتقال ہوا اور دوسری بار ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی، تیسری بار آفسیٹ فوٹو کے ذریعہ پاکستان میں شائع ہوئی اور مصنف کے صاحب زادے مولانا عبید اللہ صاحب کے فرمانے کے مطابق ”سیرۃ البخاری“ کا ترجمہ عربی زبان میں ہو رہا ہے، ان دواہم کتابوں کے علاوہ مولانا نے اور بہت کچھ لکھا ہے، چنانچہ ”تراجم علمائے اہل حدیث“ کے سلسلے میں بہت سے علماء کے سوانح لکھے، جو اخبار اہل حدیث میں شائع ہوئے، کتاب التمدن کے دو حصے تھے، دوسرا حصہ ”تاریخ المنوال“ کے نام سے ۱۹۱۴ء میں چھپا،

پہلا حصہ معلوم نہیں لکھا یا نہیں۔

اسی طرح ”سیرۃ البخاری“ میں متعدد مقامات پر اس کے حصہ ثالثہ کا وعدہ ہے، جس میں علم حدیث کی تاریخ و تدوین، اس کی حجیت اور شیعوں اور دیگر فرقوں کے اعتراضات کے جوابات کا بیان ہوگا۔

ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ان شاء اللہ حصہ ثالثہ میں جب ہم ان کو نقل کریں گے تو خود اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ (ص ۲۶۸)

ایک جگہ حدیث میں شدت اختیار و اہتمام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ”گوہم نے اس بحث کو بخوف طوالت حصہ ثالثہ کے لیے رکھا ہے تاہم کسی قدر عرض کر دینا ضروری ہے۔“ (ص ۳۴۰)

اسی طرح صفحہ ۳۴۶ پر حصہ ثالثہ کا حوالہ درج ہے، مگر بعد میں اس حصہ کا پتہ نہ چل سکا کہ مولانا کو اس کی تکمیل کا موقع مل سکا یا نہیں، تراجم علمائے اہل حدیث میں ہے کہ آپ کی ایک کتاب تصوف میں بھی ہے، جو ابھی طبع نہیں ہو سکی ہے۔ (ص ۴۰۰)

ایک مرتبہ مبارک پور میں آنے جانے والے ایک پیر صاحب سے مولانا کی مڈ بھیڑ ہو گئی تھی اور پیر صاحب نے ”نوک تیر بر جگر بے پیر“ نام کی ایک کتاب لکھی تھی، شاید اسی قضیہ نامرضیہ کے سلسلے میں مولانا نے علمی اور دینی انداز میں تصوف پر کوئی کتاب تحریر کی ہو۔

ہم ”سیرۃ البخاری“ سے تصوف کے بارے میں مولانا کی تحقیق پیش کرتے ہیں۔ اس سے ان کا نقطہ نظر معلوم ہونے کے ساتھ ان کا طرز نگارش اور زبان و اسلوب بھی معلوم ہوگا اور اندازہ ہوگا کہ مولانا اردو زبان کے نہایت اچھے انشاء پرداز، ادیب اور مصنف و نقاد تھے، ”سیرۃ البخاری“ میں جہاں امام بخاری کو علمائے زمرہ صوفیاء میں شمار کیا ہے۔

مولانا نے لکھا ہے کہ امام بخاری کو طبقہ صوفیہ میں شمار کرنے کو دو جماعتیں حیرت

کی نگاہ سے دیکھیں گی، ان میں جماعت موجودہ صوفیوں کی ہے، اس لیے کہ موجودہ زمانہ کے عملی تصوف اور موجودہ صوفیت پر نظر کرتے ہوئے یہ جملہ کہ امام بخاری مانے ہوئے کامل صوفی تھے، نہایت بے جوڑی بات معلوم ہوتی ہے۔

امام بخاری کے دربار میں نہ عرس تھا، نہ محفلِ قوالی، نہ تصویری شیخ، نہ آنکھیں بند کرنی، نہ چلہ کشی، نہ رسمِ گاگر نہ مردوں سے مدد مانگنی، نہ کوئی درگاہ، نہ قیل، نہ مریدوں کے نذرانے پر گزارہ، نہ قبروں کا چڑھاوا، نہ قیامِ مولد، نہ مجلسِ مولود کی ہیئتِ کدائی، نہ گلے ملا ملا کر غزلیات گانے، نہ اہلِ حال کا اچھل کود، نہ وحدت وجود کا عقیدہ، نہ صلوٰۃ غوثیہ، نہ مراقبہ کشفِ قبور، بل کہ صرف احادیثِ رسول ﷺ کا درس، اسی کی پابندی، اسی کا چرچا تھا، جو موجودہ تصوف کی بیخ و بنیاد کا استیصال ہے۔

دوسری جماعت اہل حدیث کی ہے، امام بخاری کی نسبت یہ جماعت یقین کرتی ہے کہ وہ سیرتِ رسول ﷺ کے دلدادہ تھے، اسی کی تدوین و اشاعت و پابندی میں اپنی عمر کا سارا حصہ تمام کر دیا، بدعات سے محترز تھے، اسی وجہ سے جس قدر فرقے نئے نئے پیدا ہو گئے تھے، اس کو امام صاحب بدعتی اور محدث کہتے تھے، اور ان کا رد نہایت جوش سے صحیح بخاری میں لکھا ہے، یہاں تک کہ اعمال کے جزو ایمانی ہونے کا صراحۃً حدیثوں میں تذکرہ وارد ہوا ہے، اس وجہ سے جو اس کا قائل نہ ہوتا، اس کو امام صاحب مُرجی کہتے، امام صاحب کی اس طرزِ زندگی پر نظر کرتے ہوئے کیوں کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ صوفی تھے، کیوں کہ تصوف بھی ایک محدث چیز ہے، امام صاحب کو صوفی کہنا امام صاحب کے دامنِ تقدس پر بدعت کا دھبہ لگانا ہے، اس میں کہاں تک ہے کہ تصوف جس نے آج اپنے اتباع کو حد سے زیادہ بدنام کر رکھا ہے، کسی زمانے میں بڑی خیر و برکت اور بہت ہی محمود چیز تھی۔

احکام شرعی کی سختی سے پابندی، ایثارِ نفس، ہدایتِ مخلوق میں سعی کرنی رسول اللہ ﷺ

کی سنتوں کی پیروی کا شوق، مصائب پر صبر و استقامت، جہاد کے لیے ہمہ تن مستعد رہنا اپنے نفس کا انتقام نہ لینا، مکارم اخلاق کا پھیلانا، دنیا سے بے رغبتی، پابندی تقویٰ، بدعات سے اجتناب، غرض شریعت نے جن باتوں کو عزم امور (تاکیدی باتیں اور اصلی مقاصد) فرمائی ہیں، انہیں کا اصلی مرقع تھا، ان کو کون محمود نہ کہے گا؟ اصحاب رسول اللہ ﷺ انہیں باتوں سے اکسیر اور مس سے کندن بن گئے اور ان کا تصوف نام رکھنا، اصطلاح جدید تو بیشک ہے، لیکن مقصود واضح ہو جانے پر چنداں مضائقہ نہیں ”ولا مشاحۃ فی الاصطلاح“

(سیرۃ البخاری ص ۱۴۰ و ۱۴۱)

ایک موقع پر حاشیہ میں صوفی صافی امام محی الدین ابن عربی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے: ”یہ برتاؤ اہل الرائے کا محدثین کے ساتھ ہمیشہ جاری رہا اور گیارہ سو برس کے تجربے نے ثابت کر دیا، غالباً دنیا کے قیام تک یہی برتاؤ رہے گا، صوفی صافی امام محی الدین ابن عربی نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے، فتوحات مکیہ میں فرماتے ہیں کہ امام آخر الزماں کے دشمن یہی ہوں گے۔“ (ص ۳۶۴ و ۳۶۵)

مولانا مرحوم بے نظیر مدرس اور بے مثال عالم ہونے کے ساتھ نہایت اچھے مصنف وادیب اور مؤرخ و نقاد تھے، تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کا نہایت سترا انداز رکھتے تھے اور مبارک پور کے علماء و مصنفین میں اس بارے میں امتیازی شان کے مالک تھے، آپ کی وفات بصورت شہادت دارالحدیث رحمانیہ کی مدرسہ کے زمانے میں ۱۸ رجب ۱۳۴۲ھ / ۲۴ فروری ۱۹۲۴ء کو دہلی میں ہوئی۔

ایک روز چاندنی چوک میں سڑک پر جا رہے تھے کہ گھنٹہ گھر کے سامنے (اب گھنٹہ گھر باقی نہیں رہا) ایک گھوڑے سے دب کر اس قدر زخمی ہوئے کہ جانبر نہ ہو سکے اور دہلی میں دفن کیے گئے، رحمۃ اللہ علیہ۔

اس حادثے سے دو سال پہلے ۱۹۲۲ء میں مبارک پور کے مشہور خفی عالم و مصنف مولانا عبدالعلیم رسول پوری ریل کے حادثے میں زخمی ہو کر بنارس میں فوت ہوئے اور وہیں دفن کیے گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بزرگوں کو شہادت کی موت عطا فرمائی، مولانا عبدالسلام صاحب کے حالات تذکرہ علمائے حال ص ۲۹، نزہۃ الخواطر ص ۱۶۱ ج ۸، تراجم علمائے اہل حدیث وغیرہ میں ملاحظہ ہوں۔

حضرت مولانا احمد حسین رسول پوریؒ

حضرت مولانا حکیم حاجی احمد حسین بن عبدالرحیم عرف باب اللہ بن شیخ جمال الدین عرف جمن بن شیخ پہاڑ بن شیخ کھیدو خفی رسول پوری مبارک پوری اعظمی رحمۃ اللہ علیہ خانوادہ علمائے رسول پور کے ثانی اثنین اور وہاں کے دوسرے علمی سلسلے کے واسطۃ العقد اور راقم کے جدِ مادری ہیں، اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔

۱۲۸۸ھ میں رسول پور میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان عہد جہاں گیری میں رسول پور آکر آباد ہوا اور دین و دیانت، علم و فضل اور دنیاوی دولت و ثروت میں نمایاں رہا، آپ کے دادا شیخ جمن باخدا بزرگ تھے، نانہال محلہ پورہ صوفی قصبہ مبارک پور میں تھا، نانا شیخ چاند گرہست دین دار اور صاحب ثروت آدمی تھے اور بڑے بھائی مولانا عبدالعلیم اس دیار کے مشہور مفتی و فقیہ اور مدرس و مصنف تھے، ان کو اپنے اس سب سے چھوٹے بھائی سے بہت پیار تھا، ایک مرتبہ مولانا نو دس سال کی عمر میں سخت بیمار پڑے اور زندگی سے مایوسی ہو گئی تو مولانا عبدالعلیم نے اللہ تعالیٰ سے دعاء کی کہ بار الہا! احمد حسین کو حیات دیدے اور اس کے بدلے میرے بچے امجد علی کو اٹھالے، چنانچہ وہ صحت یاب ہو گئے اور جب امجد علی نو دس سال کے ہوئے تو ان کا انتقال ہو گیا۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم اس زمانہ کے دستور کے مطابق گھر پر ہوئی، اس کے بعد سریاں میں حافظ شاہ نظام الدین سے عربی و فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، بعد میں حافظ صاحب کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی، یہاں سے مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور گئے، جہاں اپنے برادر بزرگ مولانا عبد العظیم رسول پوری سے نورالانوار اور میندی وغیرہ پڑھی اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے شافیہ، قطبی، تلخیص المفتاح اور سبجہ معلقہ وغیرہ کی تعلیم پائی۔

اس زمانے میں مدرسہ چشمہ رحمت کے بعد دیار مشرق میں دوسرا علمی مرکز مدرسہ حنفیہ جون پور تھا، جو مولانا ہدایت اللہ خان رام پوری کی وجہ سے مرجع بنا ہوا تھا۔

مولانا نے ۱۳۰۹ھ سے ۱۳۱۳ھ تک مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب سے ملا حسن، ملا جلال، رسالہ میرزا ہدیم حاشیہ غلام یحییٰ، حاشیہ بحر العلوم اور دیگر علوم و فنون کی کتابیں پڑھیں، پھر یہاں سے مدرسہ جامع العلوم کان پور گئے، جہاں مولانا شاہ اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰ھ-۱۳۶۲ھ) کے علم و فضل کا شباب سرگرم عمل تھا۔

آپ نے مولانا تھانوی سے ہدایہ، جلالین، مشکوٰۃ، صحیح بخاری اور صحیح مسلم پڑھیں اور کتاب و سنت میں ان سے خصوصی تلمذ کر کے، مستند و معتبر علم حاصل فرما کر، دینی علوم و فقہ و حدیث میں سلسلہ ولی اللہی سے منسلک ہوئے۔

اس کے بعد مدرسہ عالیہ رام پور گئے، جو نواب کلب علی خاں اور نواب حامد علی خاں کی علمی قدردانی کی وجہ سے علوم و فنون کا مرکز تھا، یہاں آپ نے مولانا عبدالحق خیر آبادی، مولانا ظہور الحسن فاروقی رام پوری اور مولانا حافظ وزیر علی محدث رام پوری سے بقیہ کتابیں پڑھیں، اور ادب و عربیت کی تعلیم مولانا شیخ محمد طیب عرب مکی سے حاصل کر کے عربی ادب اور عربی شاعری میں یوں کمال پیدا کیا کہ دیار مشرق میں عربی شاعری میں کوئی دوسرا ان کا ہمسر نہیں تھا، نیز وہیں مولانا حکیم محمد حسین خاں صاحب سے طب و حکمت کی تعلیم پائی اور ان

کے مطب میں نباضی کر کے طب کی سند لی۔

قیام رام پور کے زمانے میں فلکیات و ریاضی میں مہارت تامہ حاصل کی اور ایک کرہ بنایا، جس میں دوائر صغار اور دوائر کبار بنائے۔

الغرض ۱۳۲۰ھ میں مروجہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل سے فارغ ہو کر اور روحانی و احسانی سلسلہ میں مولانا شاہ ضیاء النبی صاحب رائے بریلی کے ہاتھ پر بیعت کی، جب کہ آپ کی زوجہ محترمہ آپ کے استاذ مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت تھیں۔

فراغت کے بعد ہی مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں تعلیمی خدمات پر مامور ہو گئے اور ۱۳۲۰ھ سے ۱۳۲۳ھ تک یہاں تعلیم دی، اس کے بعد اپنے بڑے بھائی مولانا عبدالعلیم کی طلب پر مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں عربی کے مدرس ہوئے اور ۱۳۲۶ھ تک تدریسی خدمات انجام دیں۔

اس درمیان میں آپ کی علمی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور مختلف مقامات سے طلبی آنے لگی، چنانچہ ڈھاکہ سے بھی آپ کی طلبی کے خطوط آنے لگے اور آپ نے ۱۳۲۶ھ میں ڈھاکہ کو اپنا علمی مرکز بنایا، اس زمانے میں ڈھاکہ علم و فضل اور علماء و فضلاء کا مرکز تھا، مولانا کرامت علی صاحب جون پوری اور ان کے خاندان کے علماء کے ارشاد و تبلیغ کی وجہ سے تمام بنگال دینی فضا سے معمور تھا اور نواب سلیم اللہ صاحب کے خاندان سے مشرقی تہذیب پروان چڑھ رہی تھی۔

اس زمانے میں مبارک پور کے دو فضلاء ڈھاکہ کو گلزارِ علم و فن بنارہے تھے، شمس العلماء مولانا ظفر حسن عینی فاروقی مبارک پوری اور مولانا احمد حسین رسول پوری مبارک پوری۔

نیز اس ضلع کے شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ بندوی وہاں موجود تھے، مولانا احمد

حسین نے سب سے پہلے مدرسہ حسینیہ ڈھاکہ میں صدر مدرس کی حیثیت سے تعلیم و تدریس

کی خدمت انجام دی، وہاں سے علیحدگی کے موقع پر مدرسہ کے مہتمم نے آپ کے بارے میں اپنے یہ تاثرات تحریر کیے:

”برترک تعلقش انگشت بدندان گرفتیم و ہم اُن کے ترکِ تعلق پر انگشت بدندان ہیں اور
بصد حسرت دوا عیش کردیم و دولت گرانمایہ بصد حسرت اُنھیں رخصت کر رہے ہیں اور بیش بہا
گم کردیم، جملہ کارکنان مدرسہ بر حسن دولت ضائع کر رہے ہیں، تمام اراکین مدرسہ ان
کارگزاری اوشاں شہادت می دہیم۔“ کی اچھی کارگزاری کی گواہی دیتے ہیں۔ (قمر)
اس کے بعد اسی مدرسہ میں مولانا حفیظ اللہ صاحب بندوی صدر مدرس ہوئے، پھر
ڈھا کہ یونیورسٹی میں چلے گئے۔

مولانا مدرسہ حسینیہ سے علیحدہ ہو کر مدرسہ حماد میں، پھر مدرسہ دارالعلوم میں
صدر مدرس ہوئے، ڈھا کہ کے ان تینوں مدارس میں تعلیمی خدمت انجام دینے کے بعد ایک
سال مدرسہ عالیہ ہوگئی میں صدر مدرس رہے، پھر مدرسہ اسلامیہ ڈھا کہ میں چار سال تک
نظامت و مدرّسی فرمائی اور یہیں کے دوران قیام میں ۱۳۴۲ھ میں حج ادا فرمایا، واپسی پر
مدرسہ اسلامیہ ڈھا کہ میں تقریباً دس سال تک رہے، اس کے بعد انجمن اسلامیہ گورکھپور میں
چھ سال تک صدر مدرس رہ کر ۱۳۵۷ھ میں وہاں سے مستعفی ہو گئے، یعنی ۱۳۲۰ھ سے
۱۳۵۷ھ تک کامل ۳۷ سال مسلسل درس و تعلیم کا مشغلہ جاری رکھا اور ایک دن بھی اس سے
جدانہ ہوئے اور اسی کے ساتھ تصنیف و تالیف اور طبابت و حکمت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

مولانا جملہ علوم و فنون میں ماہر تھے اور ہر فن کو بلا تکلف نہایت بہتر طریقے پر
پڑھاتے تھے، منقولات میں فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث، علوم ادبیہ، معانی، بیان اور
معقولات میں منطق، فلسفہ، ریاضی، فلکیات، علم کلام، مناظر، مرایا، اکر، اسطرلاب کے ماہر
تھے، ہیئت اور فلکیات میں خاص طور سے تبحر کا درجہ رکھتے تھے اور طب و حکمت میں تو

مجتہدانہ حیثیت کے مالک تھے، علم الاودیہ اور علم العقاقیر سے بھی اچھی طرح واقف تھے، ان کی تدریسی خدمات کا ابتدائی زمانہ بنارس اور غازی پور میں گزرا اور چھ سال تک ان علاقوں میں تعلیم دی۔

ظاہر ہے کہ اس مدت میں سینکڑوں طلبہ نے ان سے کسب فیض کیا ہوگا، مگر ان کے نام اور حالات معلوم نہ ہو سکے۔

البتہ مولانا مفتی محمد ابراہیم بناری کو مولانا نے حدیث کی جو سند دی ہے، اسے ہم نے دیکھا ہے، اس کے بعد مشرقی بنگال اور ڈھاکہ کے مختلف مدارس میں تعلیم دی، وہاں عام طور سے ان کی درس گاہ سے ہر سال ستر، اسی طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلتے تھے، ایک سال ایک سو تیس طلبہ فارغ ہوئے۔

ان کی بیاض میں ان کے بہت سے ایسے تلامذہ کے نام اور پتے موجود ہیں، جنہوں نے ان کی خدمت میں رہ کر فراغت پائی، مشرقی بنگال میں ان کے تلامذہ اکثر مقامات پر مدرسوں، اسکولوں، کالجوں میں معلم و مدرس تھے، ڈھاکہ یونیورسٹی میں بھی پروفیسر اور لیکچرار تھے۔

آج بھی ان کے تلامذہ کا تعلیمی و تدریسی سلسلہ مشرقی بنگال میں قریہ قریہ اور شہر شہر پھیلا ہوا ہے اور ان کے علمی و دینی فیوض و برکات جاری ہیں، مولانا کا قد لانا، بدن چھیرا، ناک کھڑی، رنگ گندمی تھا۔

بڑے چاق و چوبند آدمی تھے، ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول رہا کرتے تھے، کبھی بے کار نہیں رہتے تھے، دن میں سونے کے بالکل قائل نہیں تھے، پیدل چلنے کے عادی تھے، رات کے ہر حصے اور ہر موسم میں بلا تکلف تن تنہا چلتے تھے، چھٹیوں میں مکان تشریف لاتے تو آتے ہی کوئی نہ کوئی مستقل کام نکال لیتے۔

ویسے دوا سازی، کتب بینی اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ یہاں جاری رہتا تھا، سادگی، شرافت نفس اور زہد و تقویٰ کا نمونہ تھے، کبھی ان کو کسی سے بلند آواز سے بات چیت کرتے نہیں سنا گیا، چہ جائے کہ کسی سے لڑائی جھگڑا ہو، ان کے یہاں غصہ اور خفگی کے نام کی کوئی چیز نہیں تھی، گھر کے اندر انتہائی سادگی مگر باہر عالمانہ وقار کا خاص اہتمام کرتے تھے۔

کیا مجال کہ گھر سے باہر گھریلو لباس میں نکلیں، سر پر سفید عمامہ، سفید کمانی کا چشمہ، رنگین پھول دار اور کھلی دار انگرکھا، بڑے پائے کا پانچامہ، ہاتھ میں چھڑی، کاندھے پر بڑا سا رومال، باہر آتے جاتے وقت یہ ان کی ہیئت کدائی ہوتی تھی، سبک رفتار بلا کے تھے، تھوڑی دیر میں کئی کئی میل نکل جاتے تھے، خطاطی اور خوش خطی کے ہمہ اقسام کے ماہر تھے، اپنی تصانیف کی طباعت کے وقت کتابت خود فرماتے تھے، عربی، نسخ، نستعلیق وغیرہ کے بہترین کاتب تھے اور استاذانہ نظر رکھتے تھے، ان کے قلم دان میں کئی اقسام کے قلم ہی نہیں ہوتے تھے، بلکہ سرمہ کی شیشی، سوئی دھاگا، عطر کی شیشی، چاقو، بٹن، پیسے وغیرہ بھی اس میں رہا کرتے تھے، مختلف قسموں اور رنگوں کی سیاہی اور روشنائی خود تیار کرتے تھے۔

گھر آتے تو مریضوں کا تانتا بندھ جاتا تھا، مرکبات و معاجین، کشتہ جات، عروق اکثر خود تیار کرتے تھے، علم الادویہ اور دوا سازی سے خوب واقف تھے۔

آپ کا گھر یتیموں کا مسکن تھا، ان کی پرورش کر کے تعلیم و تربیت سے آراستہ کرتے اور اپنے بچوں کی طرح ان کی شادی کر کے ہر قسم کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھتے تھے اور ہر ضرورت پوری کرتے تھے، چوں کہ پورے گھر میں زوجین کے علاوہ ایک صاحب زادی اور ایک صاحب زادے ہی سب کچھ تھے، خود باہر رہتے تھے اور صاحب زادی مبارک پور میں رہتی تھیں، اس لیے یتیم بچوں اور بچیوں سے گھر میں رونق رہتی تھی، خود شاہ ضیاء النبی رائے بریلوی سے بیعت تھے اور ان کی زوجہ محترمہ مولانا شاہ اشرف علی تھانوی (۱۲۸۰ھ-۱۳۶۲ھ) سے بیعت تھیں، زوجین

میں سے ایک کو حضرت تھانوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا اور دوسرے کو مولانا شاہ ضیاء النبی صاحب سے شرفِ بیعت، مبارک پور میں حضرت تھانوی سے تلمذ و بیعت کا یہ شرف اسی گھرانے کو سب سے پہلے حاصل ہوا اور اس کے بعد یہاں کے لوگ ان سے واقف ہوئے۔

مولانا کا مکان تقریباً پچاس سال تک رسول پور کا واحد مدرسہ تھا، جہاں گاؤں بھر کے لڑکے لڑکیاں پڑھتے تھے، اس مدرسہ کی معلمہ ان کی زوجہ محترمہ (میری نانی مرحومہ) رحیمہ بنت حافظ نظام الدین سریانوی تھیں، جو ایک علمی اور دینی خاندان کی پروردہ اور تربیت یافتہ تھیں، اس مدرسہ میں قاعدہ، پارہ، قرآن شریف، راہِ نجات، مفتاح الجنۃ، تعلیم النساء، حکایات الصالحین، صبح کا ستارا کے علاوہ کریمیا اور مقیمیا بھی پڑھانے کا رواج تھا، وہ پورے گاؤں میں ملانی چچی کے لقب سے مشہور تھیں اور بچوں، بچیوں سے لے کر بوڑھوں اور بوڑھیوں تک کی استاد تھیں، لوگ ان کا دل سے احترام کرتے تھے، ملانی چچی صرف معلمہ ہی نہیں تھیں، بل کہ وہ بچوں اور بچیوں کی بہترین تربیت بھی کیا کرتی تھیں اور ان کو امورِ خانہ داری سے پوری طرح واقف کراتی تھیں۔

اکثر مقدمات ان کے گھر آیا کرتے تھے اور بعض میں وہ خود اٹھ کر جایا کرتی تھیں، بوقتِ ضرورت اپنے دست و پا سے بھی معاملات ٹھیک کیا کرتی تھیں، ان کی ڈانٹ اور مار سے ہر چھوٹا بڑا ڈرتا تھا، کیوں کہ وہ اپنے حق کے استعمال میں چھوٹے بڑے کا فرق نہیں کرتی تھیں اور نہ کسی کے ساتھ رورعایت کرتی تھیں۔

ان کی دعا میں بڑا اثر تھا، عام طور سے صبح و شام ان کے یہاں بچے، بچیاں اور دوسرے مریض دعا کرانے آتے تھے، بعض اوقات خود بھی دعا کرنے چلی جاتی تھیں، صبح کو تلاوتِ قرآن کے بعد اور رات کو عشاء کے بعد اور ادو وظائف و معمولات کا سلسلہ آخری عمر تک جاری رہا۔

آج بھی ان کے بڑے بوڑھے شاگرد اپنی ملائی چچی کو یاد کر کے دو آنسو بہا لیتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں، مرحومہ بڑی عابدہ، زاہدہ اور بزرگ خاتون تھیں، وہ ایمان عجاز کی چلتی پھرتی تصویر تھیں، دنیا سے اس یقین پر گئی ہیں کہ ان کے لیے جنت میں گھر پہلے سے تیار ہے، مرحومہ میری نانی ہیں اور میں نے ان کا دودھ پیا ہے، مجھ سے بے انتہا محبت کرتی تھیں۔

تقریباً اسی سال کی عمر میں جمعۃ الوداع ۲۶ رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ کو فوت ہوئیں اور شب قدر میں دفن کی گئیں، میری والدہ مرحومہ حمیدہ متوفیہ سہ شنبہ ۲۲ رذی قعدہ ۱۳۵۲ھ نے بھی اپنی والدہ مرحومہ کے انداز پر زندگی بسر کی اور ہمیشہ گھر پر بچوں اور بچیوں کو تعلیم دیتی رہیں۔

ہم یہاں ایک خواب اور اس کی تعبیر درج کر رہے ہیں، جس سے نانا مرحوم، نانی مرحومہ اور والدہ مرحومہ کی دینی زندگی پر روشنی پڑتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کے لیے بلندی درجات کی امید ہے۔

جس زمانہ میں نانا مرحوم ڈھاکہ میں مدرس تھے، میری والدہ مرحومہ نے ایک خواب دیکھا، جسے ان کی خدمت میں لکھ کر تعبیر دریافت کی، اس وقت نانا مرحوم نے کیا جواب دیا؟ معلوم نہیں، مگر ۱۳۴۲ھ میں جب حج کو گئے تو وہاں سے اس کی تعبیر کے بارے میں مفصل خط تحریر فرمایا، یہ خواب اور اس کا تعبیری جواب والدہ مرحومہ کے قرآن شریف میں مدتوں محفوظ رہا:

”جناب پچا صاحب دام ظلہ!“

السلام علیکم

میں نے ایک خواب دیکھا ہے، جس سے طبیعت بہت پریشان ہے، آج یہ

خواب آپ کو لکھ رہی ہوں، آپ تعبیر لکھ کر روانہ کریں تاکہ مجھے اطمینان ہو، میں نے خواب دیکھا ہے کہ قیامت قائم ہے، تمام خلق اللہ میدانِ محشر میں جمع ہے اور ہر طرف نفسی نفسی کا عالم ہے، ہر شخص دوسرے سے بیگانہ ہے، میں ادھر ادھر دیکھتی ہوں، کوئی اپنا نظر نہیں آتا، اتنے میں میری نظر ایک مکان پر پڑی، جو نہایت چمک دار صاف و شفاف بنا ہوا ہے، اس میں چند حضرات نہایت اطمینان سے بیٹھے ہیں، ان میں آپ بھی ہیں، میں آپ کو دیکھ کر دروازہ کھڑکھڑی ہو گئی تاکہ آپ مجھے بھی اندر بلا لیں، مگر آپ نے جب نظر اٹھا کر دیکھا تو کہا کہ یہاں تمہارے لیے جگہ نہیں ہے، البتہ میں تمہیں گھر دلاؤں گا، تم اطمینان رکھو، میں تمہارے لیے انتظام کر دوں گا، اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

نانا مرحوم ۱۳۴۲ھ میں حج کے لیے تشریف لے گئے تو وہاں سے یہ پہلا خط اپنی صاحبزادی کو لکھا:

”نور چشمی حمیدہ سلمہا!

بعد دعا کے معلوم ہوا کہ جس وقت بیت اللہ پر میری پہلی نظر پڑی، فوراً تمہارا خواب یاد آ گیا اور اس کی تعبیر بھی سمجھ میں آ گئی، کہ میں نے تم کو جنت میں گھر دلانے کا جو وعدہ کیا ہے، اب اس کو پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے، چنانچہ عمرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بیت اللہ شریف کا سات طواف کر کے دو رکعت نماز پڑھی اور اس کا ثواب تمہارے نامہ اعمال میں شامل کر دیا اور تمہاری والدہ (یعنی بیٹی کی والدہ) کے لیے بھی بیت اللہ شریف کا سات طواف کر کے دو رکعت نماز پڑھ کر اس کے نامہ اعمال میں اس کا ثواب شامل کیا، میں نے تم کو گھر دلانے کا جو وعدہ کیا تھا، اسے آج پورا کر دیا، اب اس گھر کو آباد رکھنا نہ رکھنا تمہارا کام ہے، خوب سمجھ لو

کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر ایک پیہ بھی نہیں بل سکتا اور نفع و نقصان صرف اس کے قبضے میں ہے، اس اعتقاد اور اس عمل سے اس گھر کی آبادی ہے اور اس کے خلاف کرنے میں اس کی بربادی ہے، میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، اب تم دونوں کا کام ہے کہ اسے آباد رکھو یا نہ رکھو۔ (احمد حسین از مکہ معظمہ)

نانی مرحومہ اور والدہ مرحومہ دنیا سے اس عقیدے پر گئی ہیں کہ ان کے لیے جنت میں گھر پہلے ہی سے موجود ہے۔

مولانا مرحوم علوم و فنون میں جامع و کامل ہونے کے ساتھ زہد و تقویٰ اور کتاب و سنت کی اتباع میں بھی پیش پیش تھے، عالم باعمل اور عامل باعلم کا مجمع البحرین تھے، محبت رسول ﷺ سے سرشار رہا کرتے تھے، مدینہ منورہ اور شہدائے احد کے مناقب و فضائل میں ایک کتاب لکھی تو اس کی چوتھائی قیمت فقراء مدینہ پر وقف کی۔

حج کے موقع پر مکہ مکرمہ سے اپنے ذوق کے مطابق بہت سی کتابیں خریدیں، جن میں کئی مجلد تھیں، بعد میں ان کی جلدیں خراب ہوئیں اور دوبارہ تجلید کی باری آئی تو وہی حرم محترم والی دفتیاں خاص طور سے تاکید کر کے لگوائیں اور فرمایا کہ یہ حرم سے آئی ہیں، اس میں خیر و برکت ہے، رسول اللہ ﷺ کے نام مبارک بنام شاہ مصر مقوس کا عکسی فوٹو اپنے کپڑوں کے اندر صندوق میں رکھتے تھے اور جب کوئی خاص آدمی آتا تو خاص طور سے اسے دکھاتے تھے، آپ کی صاحب زادی یعنی والدہ مرحومہ کو خاندان ہی کے ایک صاحب نے ایک پیشہ درپیر سے بیعت کرایا، جب مولانا ڈھاکہ سے تشریف لائے اور اس کی خبر ہوئی تو شجرہ منگا کر چاک کر دیا اور فرمایا کہ تم یہ بیعت توڑ دو، یہ دنیا دار پیر ہیں، ان سے کوئی فیض نہیں پہنچ سکتا، گھر پر ہمیشہ تاکید فرماتے کہ دروازے سے کوئی بھوکا نہ جائے۔

چنانچہ سائل، دوست احباب اور رشتہ دار میں سے کوئی شخص ان کے یہاں سے

بغیر کچھ کھائے پیے واپس نہیں ہوتا تھا، وہ مکان پر ہوں یا باہر اس معمول میں کوئی فرق نہیں آتا تھا، کئی یتیم بچوں اور بچیوں کو پالا، ویسے بھی کبھی کبھی یتیموں کی دعوت کیا کرتے تھے۔ اس موقع پر تاکید رہا کرتی تھی کہ ان کے سامنے سے روٹیاں نہ اٹھائی جائیں، چنانچہ جب یتیم کھا کر جانے لگتے تو وہ روٹیاں اٹھا لیتے تھے، یہ تماشا آپ کے لیے بڑا خوش منظر ہوتا تھا اور جب وہ روٹی کے لیے آپس میں جھگڑا کرتے تھے تو ان کی اس ادا پر بہت خوش ہوتے تھے، مرؤت اور شرافتِ نفس کا یہ عالم تھا کہ جس نے جو مانگا، گھر میں رہا تو اٹھا کر دے دیا، ان کی اس شرافت سے بعض لوگ غلط فائدہ اٹھاتے تھے، بعض اوقات اس زمانے کے لحاظ سے بڑی بڑی رقم مضاربت کے طور پر دوسروں کو دے دیا کرتے تھے اور جب آخر میں وہ نقصان دکھا دیتے تو خاموش رہ جاتے۔

ان کے صاحب زادے مولانا محمد یحییٰ مرحوم کا خیال تھا کہ اس طرح والد صاحب پسماندہ رقم کو امداد کے طور پر لوگوں کو دیا کرتے تھے، اس لیے کبھی تقاضا تک نہیں کرتے تھے، ان تمام نیک کاموں میں ان کی اہلیہ مرحومہ بھی ان ہی جیسا ذہن و مزاج رکھتی تھیں اور گاؤں بھر کے لوگ بلا تکلف ان کے یہاں سے ضرورت کی چیزیں لے جایا کرتے تھے، عاریت اور منگنی دینے کے لیے خاص طور سے مختلف قسم کی باکار اور بے کار چیزیں الگ رکھی رہتی تھیں، جو صرف گاؤں محلہ کے کام آتی تھیں۔

ان کے دوست و احباب کا حلقہ محدود تھا اور ان سے انتہائی بے تکلفی، خندہ پیشانی اور مکارمِ اخلاق سے پیش آتے تھے، ڈھا کہ میں نواب سلیم اللہ صاحب اور ان کے خاندان سے خصوصی تعلقات تھے، نیز ڈھا کہ کے ایک معمر بزرگ حضرت شاہ عبداللہ صاحب رمنہ میں رہتے تھے، ان کی عمر بہت زیادہ تھی اور تجربات و مشاہدات بھی تھے، شاہ صاحب بھی ان پر بہت مہربان تھے، نواب صاحب اور شاہ صاحب کے بہت سے واقعات بیان کیا کرتے

تھے، بہت سے اب تک مجھے یاد ہیں، کتابوں کے عاشق تھے۔

ان کا کتب خانہ جملہ علوم و فنون کے نوادرات سے پُر تھا، بڑی بڑی الماریوں میں کتابیں نہایت قرینے اور حفاظت سے رہتی تھیں، کتاب خریدتے وقت اس بات کا خاص لحاظ رکھتے تھے کہ ان کا کاغذ سفید، چکنا اور چمک دار نہ ہو، فرماتے تھے کہ ایسی کتاب کے مطالعہ سے آنکھ کی روشنی پر مضر اثرات پڑتے ہیں، اسی لیے ان کے کتب خانے میں کئی کتابیں سرخ اور سبز رنگ کے کاغذ کی تھیں، بچپن میں جب میں نانہال جاتا تھا تو کچھ پتہ نہ چلنے کے باوجود اسی کتب خانے اور الماریوں میں پڑا رہتا تھا، اسی زمانے سے مجھے کتابوں کا ذوق ہوا، جو آگے چل کر کام آیا، واقعہ یہ ہے کہ میرا یہ علمی ذوق میرے نانہال کی دین ہے، جو والدہ کے ذریعہ مجھے نصیب ہوا ہے۔

مولانا مرحوم مبارک پور کے ان علمائے مصنفین میں سے ہیں، جنہوں نے پوری زندگی تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور تحقیق و مطالعہ میں بسر کی، انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں کئی ایک مطبوعہ اور کئی ایک غیر مطبوعہ ہیں، مطبوعہ تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) تحفة الاحباء فی فضل المدینة و مناقب سید الشهداء:

یہ اسی نام کی ایک کتاب کا اردو ترجمہ ہے، جس میں مدینہ منورہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب درج ہیں، یہ کتاب غالباً آپ کی پہلی تالیف ہے، ڈھاکہ میں اردو ٹائپ میں چھپی تھی، اس کے سرورق پر درج تھا کہ اس کتاب کی چوتھائی قیمت فقراء مدینہ پر وقف ہے۔

(۲) أحسن المبررات فی ہدیة الأحياء إلی الاموات:

اصل رسالہ عربی زبان میں مولانا شیخ احمد بن شیخ عثمان مکی کا ہے، جو ۱۲۷۷ھ میں

مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۶ھ میں ہندوستان آکر کتاب و سنت کی تعلیم حاصل کی، وہ حضرت شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مراد آبادی کے مرید تھے، جب مولانا ۱۳۴۲ھ میں حج کے لیے گئے تو مکہ مکرمہ میں شیخ موصوف سے ملاقات کر کے اس کتاب کے ترجمے کی اجازت حاصل کی، ان میں مُردوں کے لیے ایصالِ ثواب پر احادیث و آثار درج ہیں، اس کی طباعت کے لیے کتابت اپنی دیگر کتب کی طرح خود ہی فرمائی ہے، ایک صفحہ میں ایک طرف متن اور دوسری طرف ترجمہ درج ہے۔

(۳) القلائد من الفرائد فی شرح الفرائد:

علمِ معانی و بیان میں ملا محمود جون پوری متوفی ۱۰۶۲ھ کی کتاب ”الفرائد“ اپنے محتویات و مضامین اور اسلوبِ بیان کے اعتبار سے نہایت ہی اہم اور مفید کتاب ہے، مگر بعض مقامات بہت مشکل ہیں، مولانا نے عربی میں اس کی شرح ”سط الفرائد“ کے نام سے لکھی، پھر طلبہ کی سہولت کے پیش نظر اسے اختصار کر کے فارسی میں حاشیہ کے طور پر لکھا، جو عربی متن کے نیچے درج ہے، اس کے عربی متن اور فارسی شرح کی کاپی نویسی بھی خود آپ نے ہی کی ہے۔

(۴) حاشیہ ملتقى الابرار (عربی):

علامہ شیخ ابراہیم حلبیؒ کی کتاب ”ملتقى الابرار“ فقہ حنفی میں نہایت جامع اور مختصر کتاب ہے، اس کی مشہور شرح ”مجمع الانهر“ ہے، مولانا نے اس میں سے بقدر نصاب حصہ الگ کر کے اس کا حاشیہ تحریر فرمایا اور خود ہی کتابت کی۔

(۵) حاشیہ قصیدہ بردہ و قصیدہ فرزوق (عربی):

امام شیخ بوسیری رحمۃ اللہ علیہ کا قصیدہ بردہ نہایت متبرک قصیدہ ہے، جس کو بطور وظیفہ کے پڑھا جاتا ہے اور مشہور شاعر فرزوق کا امام زین العابدینؑ کی مدح میں قصیدہ بہت

مشہور ہے، مولانا نے ان دونوں قصائد کا عربی میں مختصر حاشیہ لکھا، یہ کتاب ڈھاکہ میں چھوٹے سائز پر ٹائپ میں چھپی ہے۔

(۶) سبیل الآخرت:

مولانا کی یہ نہایت مقبول کتاب ہے، جس میں عالم برزخ کے حالات اُردو زبان میں بیان کیے گئے ہیں، اس کتاب نے بہت سے لوگوں کو فکر آخرت میں لگا دیا ہے، مولانا کی مطبوعہ تصانیف میں یہ کتاب سب سے بڑی اور اہم ہے، راقم کے علم میں اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، دو بار حضرت مصنف نے خود کتابت کر کے گورکھپور سے شائع کیا تھا، تیسری بار مولانا محمد عیسیٰ الہ آبادی خلیفہ مولانا تھانویؒ نے یوں شائع کیا کہ امام سیوطی کی کتاب ”شرح الصدور فی احوال الموتی والقیور“ کا ترجمہ شروع کیا اور معتد بہ حصہ کے ترجمہ کے بعد ”سبیل الآخرت“ پر نظر پڑی تو ترجمہ کر کے اس کو شائع کیا اور مقدمہ میں لکھا کہ ایک معتد بہ حصہ اس کا ترجمہ ہوا تھا کہ اتفاقاً ”سبیل الآخرت“ مؤلفہ مولوی احمد حسین صاحب مبارک پوری دستیاب ہوئی، جس میں مولوی صاحب نے روایات معتبرہ شرح الصدور سے نیز دیگر معتبر کتابوں سے جمع کیا تھا، مولوی صاحب کے لیے دل سے دعا نکلی کہ انھوں نے ہمارا کام ہلکا کر دیا۔

چنانچہ میں نے مستقل ترجمہ بند کر دیا، مگر مولانا محمد عیسیٰ صاحب نے سبیل الآخرت کے بجائے اس کا نام شرح الصدور رکھا، نیز مولانا تھانوی (۱۲۸۰ھ-۱۳۶۲ھ) کے بعض مواعظ کا اضافہ کر کے اصل کتاب میں کہیں کہیں معمولی توضیح کیا اور کتاب کے اندر مولانا کا نام دے کر لکھا کہ یہ کتاب ان ہی کے نام سے شائع ہو رہی ہے، اس کا پہلا ایڈیشن الہ آباد میں، دوسرا ڈھاکہ میں اور تیسرا نہایت آب و تاب کے ساتھ کراچی میں شائع ہوا ہے، مگر کسی کے سرورق پر نہ مولانا کا نام ہے اور نہ ”سبیل الآخرت“ کا نام ہے، البتہ

کتاب کے اندر تصریح ضرور ہے، راقم نے اس کے پانچوں ایڈیشن دیکھے ہیں، اس کتاب کی یہ مقبولیت حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے حسن نیت اور اخلاص کا ثمرہ ہے۔

(۷) تجہیز الاموات:

سبیل الآخرت کی تصنیف کے بعد مولانا نے رسالہ تجہیز الاموات تحریر فرمایا، جس میں نہایت جامع طور سے مردوں کی تکفین و تدفین کے مسائل فقہ کی معتبر و مستند کتابوں سے بیان کیے ہیں، یہ کتاب بھی اپنے باب میں نہایت مفید اور ضروری ہے اور سبیل الآخرت کی پانچوں اشاعتوں میں اس کے آخر میں چھپی ہے اور چھٹی بار راقم نے اسے بمبئی میں الگ سے طبع کرایا ہے۔

(۸) مجربات احمدی:

مولانا طب و حکمت میں بے نظیر تھے اور فقیروں اور سنیا سیوں تک سے مل کر ان کے طبی چٹکے اور مجربات حاصل کرتے تھے، اس کتاب میں ان کے خاص خاص مجرب نسخے درج ہیں اور سر سے لے کر پیر تک کے جملہ امراض کا علاج بیان کیا ہے، یہ کتاب بڑے کام کی ہے اور اس کے نسخے عموماً تیر بہ ہدف ہیں، خود کتابت کر کے گورکھپور میں طبع کرائی تھی، مولانا کی یہ آخری تصنیف ہے۔

یہ آٹھ تصانیف فقہ، ادب، معانی و بیان، زہد و تقائق اور فن طب پر ہیں، جو ان کی زندگی میں شائع ہوئیں، اس کے علاوہ آپ نے قدماء کی بعض اہم کتابیں شائع کی ہیں، مثلاً امام رازی کی ”لباب الاشارات“ کتابت کر کے بنارس سے شائع کی، اسی طرح بعض کتابوں کے منتخبات چھاپ کر شائع کیے۔

(۹) دیوان احمد:

یہ آپ کے عربی اشعار کا مجموعہ ہے، جسے میں نے اور مرحوم ماموں صاحب نے ۱۳۷۷ھ میں بمبئی میں چھپوایا ہے، اس کے کل ۴۸ صفحات ہیں۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ اور کئی اہم کتابیں اور حواشی تصنیف کیں اور بعض کتابوں کے مسودات تیار کیے، ان میں ذیل کی کتابیں قابل ذکر ہیں:

- (۱) منطق میں حاشیہ سلم العلوم۔
 - (۲) اصول فقہ میں حاشیہ مسلم الثبوت۔
 - (۳) فلسفہ میں حاشیہ میبذی، یہ ہر سہ حواشی مکمل نہ ہو سکے۔
 - (۴) الخطب المندبّیہ من الحکمۃ العلیّیۃ: یہ کتاب جمعہ اور عیدین کے خطبات میں ہے، اس میں احکام شرعیہ کے اسرار کا بیان ہے اور اکثر عبارت از قسم نثر عاری اور بعض مُسَجَّع ہے۔
 - (۵) التحصیل والتکمیل (اُردو): تعلیم المتعلم کے انداز میں نہایت عمدہ کتاب ہے اور اسی نام سے رسالہ ”البلاغ“ بمبئی میں قسط وار پوری شائع ہو چکی ہے، جس سے دوسرے رسائل نے شائع کیا۔
 - (۶) کتاب الفروق فی اللغة (عربی): علم اللغة میں یہ کتاب جدید طور پر تصنیف فرمائی تھی، جس میں صرف چھ سات ابواب قائم کیے تھے اور ایک ایک لفظ کے ہزاروں مترادف الفاظ جمع کیے تھے جیسے: ”باب أسماء الرجال“، ”باب أسماء النساء“، ”باب أسماء الأسد“، ”باب أسماء الأعضاء“ وغیرہ۔
- ان ابواب میں ایک ایک لفظ پر بہت سے مترادفات جمع کر دیئے تھے، لیکن درحقیقت وہ مترادف نہ تھے اور ہر لفظ میں وصفی اختلاف ضرور ملحوظ تھا، ان ہی وصفی اختلاف و فروق کو ہر لفظ کے ضمن میں بیان فرمایا تھا، اس عظیم اور اہم کتاب کی طباعت کے لیے حسب عادت کتابت بھی خود ہی شروع کر دی تھی، ابھی کتابت ۸۷ صفحات تک پہنچی تھی کہ کسی ظالم نے کتاب کا اصل مسودہ ہی غائب کر دیا اور یہ اہم کتاب معدوم ہو گئی۔

ہوگئی، کتابت شدہ کاپیاں میں نے دیکھی ہیں، حمد و صلوة کے بعد ابتدا یوں تھی: ”الجملة الاولى في اسماء الرجال التي تخصهم باختلاف لغوتهم باب الالف“۔
یہ جملہ ۸۲ صفحات میں ختم ہوا تھا، اس کے بعد ”الجملة الثانية في اسماء النسوة التي تخصهن باختلاف لغوتهم باب الالف“۔

اس باب کی کتابت کے درمیان کسی نے اصل مسودہ چرا لیا تھا۔

(۷) سبیل الآخرت: عالم برزخ کے حالات میں ہے، اس کے بعد کے حالات کے لیے مولانا نے دوسری کتاب لکھنے کا ارادہ فرمایا تھا اور اسی سلسلے میں بہت سا مواد بھی فراہم کر لیا تھا مگر اس کام سے پہلے ان کی زندگی کی کتاب بند ہوگئی۔

آخر کے چند سالوں میں گھر پر زیادہ رہنے لگے تھے اور تصنیف و تالیف اور طبابت کے مشاغل رکھتے تھے، ایک مرتبہ ایک دوست کے علاج کے لیے بڑھل گنج گئے، واپسی پر جین پور میں مولوی عبدالرحمن صاحب کے یہاں رات بسر کی، صبح ہوتے ہوتے دو تین دست آئے اور طبیعت قدرے سست ہوگئی اور قریب ہی عظمت گڑھ میں اپنے بھتیجے مولوی حکیم عبدالمجید کے یہاں گئے، یہاں دست کی کثرت ہوگئی اور دن بھر یہ سلسلہ جاری رہا، اسی حال میں رات گزر گئی اور صبح سات بجے ۲۶ رجب ۱۳۵۹ھ کو وہیں انتقال فرما گئے اور بڑے بھائی مولانا عبدالعلیم کی طرح آپ کو بھی مکان سے دور ہریضہ میں شہادت کی موت نصیب ہوئی۔

المبیطون شہید، حدیث میں آیا ہے اور وہاں سے میت چارپائی پر رسول پور میں لائی گئی، مولانا کی موت کی خبر قصبہ مبارک پور اور اطراف و جوانب میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور اسی روز شام کو چار بجے رسول پور کے اپنے آبائی باغ میں دفن کیے گئے، قبر کی پہلی رات شب معراج تھی، مدرسہ احیاء العلوم بند کر دیا گیا اور ہزاروں عوام، علماء اور طلبہ

جنازہ میں شریک ہوئے، رحمۃ اللہ علیہ۔

عظمت گڑھ میں جب ہیضہ کا شدید حملہ ہوا تو رائے ہوئی کہ آپ کو انجکشن دیا جائے، جب اس کی اجازت طلب کی گئی تو فرمایا کہ زندگی بھر میں نے انگریزی دوا استعمال نہیں کی، اس کی سیال دواؤں میں الکل ہوتا ہے، معلوم نہیں زندگی باقی ہے یا نہیں، میں قبر میں حرام چیز لے کر جانا نہیں چاہتا۔

اس واقعہ میں ارباب عزیمت کے لیے بڑی عبرت ہے، راقم اس زمانے میں مراد آباد میں تعلیم کا آخری سال پورا کر رہا تھا، مبارک پور کے مشہور اسماعیلی عالم جناب ملا رحمت علی صاحب نے مولانا مرحوم کا یہ مرثیہ کہا ہے:

والهفتا صرف الزمان إلانكد ينعي لنا فقد الفريد الاوحد
لهفي على فقد العليم المتقى المرتقى احمد حسين الازهد
في الدين والدنيا سعيداً عاش، قد مات شهيداً بالقضاء الاسعد
قدمات في عظمت كد ثم نُفل نحو رسول بور حيث المولد
في اليوم ظل ثاوياً في قبره بالليل اسرى عبده في المسجد
اخلف نجلاً واحداً يحيى به يبقى له اذكى ثناء سرمدى
يارب قدس روحه والطف به

واغفر له بالمصطفى محمد

اور حجاز مقدس کے مشہور عالم وادیب اور شاعر الشیخ السید محمود المدنی مدرس الحرم المدنی نے آپ کے عربی دیوان پر منظوم تقریظ لکھتے ہوئے آپ کے فضائل و مناقب میں یہ اشعار کہے ہیں:

لأحمد حسين الحبر دُرّة عصره أديب مباركفور سابق الاقران

حریری اقلیم البلاغۃ من غذا بتائید رب العرش محمود سبحان
 لقد جمع الله محاسن کلها لاجداده کانوا ائمة ازمان
 توارثها عنهم و اورث بعده لاحفاده الغرا لکرام ذوی الشان
 سعی لبنی الاسلام طول حیاته بوعظ وارشاد ودرس و تبیان
 وکان اماماً فی العلوم، مؤیداً من الله منصوراً باوضح برهان
 مضی و توفاه المہین لیلۃ زہت کان فیہا المصطفیٰ ضیف رحمن
 ومات ولكن لم یمت بعد علمہ

علیہ من المولیٰ سحائب رضوان

منظومہ تقریظ کتاب ”خزینۃ العقیان“ مؤلفہ محی مولوی احمد حسین صاحب

سلمہ اللہ تعالیٰ:

وہ چہ خوشا صلّ علی حبّذا ہر دو جہاں نقدِ روانم فدا
 برضے منتخب روزگار رشک دہ لعبتِ چین و تار
 جلوہ فزائے خرد و فہم و ہوش نطق دہ ناطقہ و خود خموش
 زلف کش لیلیٰ زیبا طراز پردہ کشائے بسرو و حجاز
 زیور منشور کلام عرب گوہر منظوم نظامِ ادب
 یعنی ہماں نامہ سلکِ گہر
 در عجم از بحر عرب جلوہ گر

(منقول از دیوان ظفر عینی مبارک پوری قلمی)

مولانا کا خاندان چار افراد پر مشتمل تھا، زوجین، صاحب زادی محترمہ حمیدہ اور
 صاحب زادے محترم مولانا محمد بیگی، صاحب زادی میری والدہ مرحومہ نے ان کی زندگی ہی

میں سہ شنبہ ۲۲/ذی قعدہ ۱۳۵۲ھ کو انتقال کیا، بعدہ آپ نے ۲۶/رجب المرجب ۱۳۵۹ھ میں وصال فرمایا، پھر زوجہ محترمہ میری نانی صاحبہ جمعۃ الوداع ۲۶/رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ میں وفات پائی اور آخر میں میرے ماموں مولانا محمد یحییٰ صاحب نے دوشنبہ ۱۱/صفر ۱۳۸۷ھ میں انتقال کیا، رحمہم اللہ وغفرلہم۔

مولانا احمد حسین صاحب کے حالات کے لیے مقدمہ دیوان احمد، رسالہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۵۰ء، رسالہ البلاغ بمبئی تعلیمی نمبر ونیز بابت ماہ فروری ۱۹۷۰ء ملاحظہ ہو۔

حضرت مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی

حضرت مولانا حکیم محمد شریف بن شیخ خدا بخش بن شیخ فتح قلندر بن شیخ حسین علی بن شیخ غلام نبی صدیقی مصطفیٰ آبادی رحمۃ اللہ علیہ یہاں کے علمائے مصنفین میں جامع المعقولات والمنقولات عالم تھے۔

ان کا وطن مصطفیٰ آباد سواد مبارک پور میں بجانب شمال مغرب ایک میل پر واقع ہے، مولانا کے دادا شیخ فتح قلندر اپنے زمانے کے بڑے رعب و داب کے رئیس و زمیندار تھے، ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، اس علاقہ میں بھیم سنگھ ساکن موضع سونا برکی رہنمائی میں یہ تحریک چلی تھی، جس میں بارہ گیاں (بارہ گاؤں) کے زمیندار و سردار شریک تھے، ان ہی میں شیخ فتح قلندر بھی تھے، مولوی حسن علی نے ”واقعات و حادثات مبارک پور“ میں لکھا ہے کہ شیخ فتح قلندر و باقر علی زمینداران موضع مصطفیٰ آباد، و حسین بخش و برکت علی ساکنان موضع سرائے مبارک یہ سب کے سب سردار تابع بھیم سنگھ ساکن موضع سونا برکی تھے اور یہ سب کے سب تھانہ مبارک پور کو لوٹنے آئے تھے۔ (واقعات و حادثات مبارک پور ص ۶۶)

مولانا کے والد شیخ خدا بخش بھی بڑے زمیندار اور رئیس تھے اور اطراف کے زمینداروں میں شہرت رکھتے تھے، اتوار ۲۹ مئی ۱۹۰۴ء (۱۳۲۲ھ) میں چک سکٹھی میں اتر جانب پوکھرے کے باغ والی مسجد میں سور کا سردیکھا گیا، مسلمان برہم ہو گئے اور قصبہ مبارک پور کے اندر باہر سخت فساد ہوا، جسے مقامی اصطلاح میں گور کچھنی کہتے ہیں، مسلمانوں نے جوش میں آ کر بہت کچھ کر ڈالا، بعد میں ان کو سزا بھگتنی پڑی، عام لوگوں کا خیال تھا کہ یہ ہنگامہ بابورام بلی سنگھ زمیندار گوجر پار اور شیخ خدا بخش ولد فتح قلندر زمیندار مصطفیٰ آباد کی باہمی زمیندارانہ رقابت کا نتیجہ تھا۔ (یادداشت قلمی شیخ عبدالحجید، پورہ صوفی)

مولانا کی ولادت بارہویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، اس کے بعد مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری کی خدمت میں رہ کر شرح جامی تک پڑھا، اس کے بعد گھر والوں کی اطلاع کے بغیر مدرسہ حنفیہ جون پور چلے گئے، جہاں مولوی ہدایت اللہ خاں صاحب مرجع بنے ہوئے تھے، وہاں مولانا ہدایت اللہ اور دیگر اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مولانا محی الدین صاحب (دریہ پان الہ آباد) کی خدمت میں تحصیل علم کی اور وہاں سے ٹونک جا کر مولانا برکات احمد بہاری ٹونکی سے جملہ معقولات و منقولات اور طب و حکمت کی تکمیل کی، مولانا برکات احمد اپنے تلامذہ کو طب کی تعلیم بھی دیا کرتے تھے کہ اس فن کے ذریعہ اہل علم خدا کی مخلوق کی خدمت کر کے اپنی زندگی بسر کر سکتے ہیں، ٹونک میں مختلف دیار کے طلباء کا ہجوم رہا کرتا تھا، جس میں نامی گرامی طلبا ہوا کرتے تھے اور مولانا کے ان سے تعلقات تھے، ان ہی میں مناظر احسن گیلانی بھی تھے، جن سے مولانا کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے اور آخر میں دارالعلوم معینیہ اجمیر میں مولانا گیلانی کی دوستی کام آئی۔

مولانا فراغت کے بعد شمس الہدیٰ کالج پٹنہ میں صدر مدرس مقرر کیے گئے، اسی

زمانے میں خانقاہ مجیدیہ پھلواری کے سجادہ نشین حضرت مولانا شاہ بدرالدین سے بیعت ہوئے، شمس الہدیٰ کے بعد مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد میں تدریسی خدمت انجام دی، یہاں مولانا جم کر تقریباً بیس سال تک پڑھاتے رہے۔

اسی دوران میں تحریک خلافت میں شامل ہو کر مدرسہ کو ملنے والی سرکاری رقم بند کر دی، اس وقت مولانا محی الدین نواسہ مولانا فخر الدین الہ آبادی مدرسہ کے ناظم و مہتمم تھے، مدرسہ سخت مالی دشواری میں مبتلا ہوا، مگر مولانا اپنے موقف پر اڑے رہے اور تعلیم کے ساتھ مدرسہ کا نظم بھی سنبھالتے رہے اور اس طرح محنت و کوشش کی کہ جب مدرسہ کو دوبارہ مولانا محی الدین کے حوالے کیا تو اخراجات سے زیادہ رقم موجود تھی۔

اسی زمانے میں سرشاہ سلیمان (جج فیڈرل گورنمنٹ آف انڈیا) سے مولانا کی رسم وراہ ہوئی، سرشاہ سلیمان نے اس زمانے میں ایک عالم سے ملا محمود جون پوری کے ایک رسالے کا ترجمہ کرایا اور الہ آباد کے علماء کی خدمت میں نقد و نظر کے لیے بھیجا، سب نے ترجمہ کو صحیح بتایا، مگر مولانا نے اپنے صاحب زادے اعجاز احمد اور بھتیجے سمیع اللہ کے نام سے ایک رسالہ اس کے اغلاط میں تحریر فرمایا (یہ دونوں صاحبان اس زمانے میں مدرسہ مصباح العلوم میں زیر تعلیم تھے) اور اسے سرشاہ سلیمان کی خدمت میں بھیج دیا۔

اس واقعہ سے سرشاہ سلیمان مولانا کے علم و فضل کے معترف ہو گئے اور ہمیشہ لحاظ کرتے رہے، چنانچہ جس زمانے میں وہ مسلم یونیورسٹی کے ذمہ دار تھے اور مولانا مدرسہ مصباح العلوم سے مستعفی ہو چکے تھے، انھوں نے مولانا کو لکھا کہ مسلم یونیورسٹی میں دینیات کے پروفیسر کی ضرورت ہے، آپ درخواست روانہ کر دیں، میں منظور کرادوں گا۔

چنانچہ مولانا نے ان کے کہنے پر درخواست روانہ کر دی، مگر اسی دوران سرشاہ سلیمان یورپ کے سفر پر روانہ ہو گئے اور اس جگہ پر دوسرے عالم کا تقرر ہو گیا، مولانا کی

تدریسی خدمت کا زیادہ تر حصہ مدرسہ مصباح العلوم میں گزرا، وہاں سے علاحدگی کے بعد مختلف مدارس میں رہے۔

چنانچہ کچھ دنوں مدرسہ مظہر العلوم بنارس اور وطن میں رہے، اس کے بعد دارالعلوم معینیہ اجمیر تشریف لے گئے، جن دنوں اپنے وطن مصطفیٰ آباد میں تھے، خانقاہ مجیبیہ پھلواری کے موجودہ سجادہ نشین مولانا شاہ امان اللہ اور ان کے بھائی مولانا شاہ عون احمد صاحب پٹنہ سے یہاں آکر مولانا سے تعلیم حاصل کرتے تھے، مولانا شاہ عون احمد صاحب نے راقم سے اس دور کے حالات بیان کیے ہیں اور مولانا کے ایک عربی قصیدے کی نقل عنایت کرنے کا وعدہ کیا، جسے مولانا نے اپنے مرشد مولانا شاہ بدرالدین صاحب کے متعلق کہا ہے، وطن میں مولانا کافی دنوں رہے۔

یہ ہماری طالب علمی کا زمانہ تھا اور سالانہ امتحان لینے کے لیے آتے تھے اور مبارک پور بازار میں ان کے صاحب زادے حکیم اعجاز احمد صاحب نے مطب جاری کیا تھا، جس میں مولانا بھی تشریف لاتے تھے، دارالعلوم معینیہ اجمیر کے لیے صدر مدرس کی ضرورت تھی اور چوں کہ اسے ریاست حیدرآباد سے مالی امداد مل رہی تھی، اس لیے حیدرآباد سے مولانا مناظر احسن گیلانی نے مولانا کو وہاں کی صدر مدرس کی پیش کی۔

اس سلسلے میں یہ بات دلچسپ ہے کہ مولوی حفیظ اللہ رضوی مبارک پوری ان دنوں حیدرآباد میں مستقل طور سے رہتے تھے، مولانا مناظر احسن گیلانی سے ان کے تعلقات تھے اور وہ مدرسہ مصباح العلوم میں مولانا محمد شریف صاحب کے قریبی تلامذہ میں سے تھے، اس لیے جب مولانا مناظر احسن گیلانی کے یہاں مولانا کا تذکرہ آیا تو ہم وطنی کی وجہ سے مولانا گیلانی نے مولوی حفیظ اللہ سے ان کا حال اور خط و کتابت کا پتہ معلوم کیا، بہر حال مولانا دارالعلوم معینیہ اجمیر میں صدر مدرس ہوئے، مگر وہاں ان کے خلاف یہ فتنہ اٹھا کہ وہ

صدر مدرسہ کی استعداد نہیں رکھتے ہیں، طلباء سے درس میں اعتراض کرائے جانے لگے اور کہا جانے لگا کہ مولانا منطق اور فلسفہ کے زبردست عالم ہیں مگر حدیث و فقہ میں ان کو درک نہیں ہے، یہاں تک کہ یہ شکایت حیدر آباد لکھی گئی اور وہاں سے ایک ذمہ دار عالم آئے اور مولانا کے درس میں شریک ہو کر طلباء کے اعتراض اور مولانا کے جوابات کا منظر دیکھنے کے بعد مولانا سے کہا کہ آپ اطمینان سے پڑھائیں، اب آپ کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا، یہ عالم حیدر آباد سے مولانا گیلانی کے مشورے سے بھیجے گئے تھے۔

خود مولانا فرماتے تھے کہ میں نے زندگی بھر افلاطون اور جالینوس کی باتیں کیں، مگر اب مجھے معلوم ہوا کہ علم کیا ہے، ایک زمانے میں جب کسی طالب علم کے بارے میں سنتا تھا کہ وہ صدر، شمس بازغہ پڑھتا ہے تو میرا دل باغ باغ ہو جاتا تھا، مگر اب معلوم ہوا کہ بخاری اور ہدایہ کا پڑھنا پڑھانا آسان نہیں ہے۔

مولانا نہایت قوی ہیکل آدمی تھے، قد دراز، رنگ سانولا، سر بڑا، پیشانی چوڑی، آنکھیں بڑی، داڑھی گھنی دراز، اونچا پانچامہ، نیچی شیروانی، کاندھے پر بڑا رومال ہوتا تھا۔ بڑے رعب و داب کے انسان تھے، ساتھ ہی اخلاق و شرافت کے پیکر تھے، نہایت ملنسار، مشفق اور بامروت بزرگ تھے، ان کی بات چیت سے ان کی علمی قابلیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔

آخر عمر میں اوراد و وظائف سے شغف بہت بڑھ گیا تھا اور خانقاہ مجیبہ کی نسبت عملی طور سے ظاہر ہو گئی تھی۔

امام شاذلی کی ”حزب البحر“ کا وظیفہ اکثر اپنی دکان میں بھی پڑھا کرتے تھے، مولانا سے مولانا شکر اللہ صاحب نے مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد میں ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں، اس لیے وہ ہمارے استاذ الاستاذ تھے اور نانا مرحوم مولانا احمد حسین صاحب سے مولانا کے تعلقات

نہایت استوار و خوشگوار اور برادرانہ تھے، اس لیے مجھ پر بہت زیادہ شفقت فرماتے تھے، جس زمانے میں مصطفیٰ آباد میں مقیم تھے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا، ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ آپ عربی قصائد مجھے عنایت فرمائیں میں ہندوستان کے عربی شعراء کے کلام اور حالات جمع کر رہا ہوں، وعدہ فرمایا، مگر افسوس کہ اس کا موقع نہ مل سکا۔

ایک مرتبہ مولانا شکر اللہ صاحب کے ایک مد مقابل نے ان پر جھوٹا مقدمہ دائر کر دیا، حاکم بھی مولانا کا مخالف تھا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ سزا سنانے کی باری آگئی۔ اسی دوران میں معلوم ہوا کہ اس حاکم کی بیوی مولانا محمد شریف کی شاگردہ ہے یا اس سے عزیز داری ہے، جب مولانا سے اس کا تذکرہ کیا گیا تو فوراً اس حاکم کے بنگلے پر پہنچے اور اس سے فرمایا کہ کل سے تم مسلمانوں کی نماز جنازہ اور جمعہ و جماعت کی نماز پڑھانا، میں نے سنا ہے کہ تم مولوی شکر اللہ کو جیل میں ڈالنے والے ہو، اس لیے مذہبی فرائض تم کو انجام دینے ہوں گے۔

حاکم رات میں فیصلہ لکھ چکا تھا، مگر مولانا کی باتیں سن کر ان کے سامنے اپنے فیصلہ کو پھاڑ دیا۔

علمائے خیر آباد معقولات کے ساتھ عربی کا بہت سہرا ذوق رکھتے تھے اور ان متضاد صفات کی جامعیت میں وہ خاص مقام کے مالک تھے، مولانا بھی اس خیر آبادی امتیاز کے مالک تھے اور منطق و فلسفہ میں یکتائے زمانہ ہونے کے ساتھ عربی ادب کا نہایت سہرا ذوق رکھتے تھے، جس پر ان کی عربی کی تصنیفات گواہ ہیں، ساتھ ہی عربی زبان کے بلند پایہ شاعر تھے، خاص طور سے قصائد میں کمال رکھتے تھے۔

مولانا نے شنبہ ۲ ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ / ۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو فجر کے وقت جھوٹائی ٹولہ لکھنؤ میں وفات پائی، جہاں ان کے داماد ڈاکٹر محمد یوسف مقیم تھے اور خیر کے تکیہ میں دفن

کیے گئے، مولانا کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں:

(۱) الإفاضة القدسية في المباحث الحکمیة:

عربی زبان میں حکمت و فلسفہ کی اہم کتاب ہے، جسے ۱۳۶۲ھ میں قیام الہ آباد کے زمانے میں اپنے استاذ زادے مولانا حکیم حافظ سید فخر الدین بن مولانا محی الدین الہ آبادی کے حکم و اشارہ پر تصنیف کیا تھا، اس کتاب میں متن اور شرح دونوں مولانا کے قلم سے ہیں، متن کے لیے قلت اور شرح کے لیے اقول کی علامت ہے، مقدمہ میں اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

”وبعد فيقول العبد المفتقر إلى ربه الباري محمد
شريف المصطفى آبادي ان هذه تحفة حكيمة لأرباب
العلم وعشاق الحكمة مشتملة على متن وشرح اوردت
فيها من علومهم الادبية والطبية والالهية مسيباً
للمتن الاضافة القدسية شرح المباحث الحکمیة“۔

ابتداء میں فلسفہ کی تاریخ لکھی ہے، جس میں معقولات کے اپنے دونوں اساتذہ مولانا محمد ہدایت اللہ خان رام پوری اور مولانا حکیم ابوالبرکات احمد ٹونگی کا والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے، یہ کتاب عالم، فاضل کے سرکاری نصاب میں مدتوں شامل رہی، مولانا عبد العليم رسول پوری نے الہیات میں ایک کتاب عربی میں ”الفريدة الوضعية في الحكمة الالهية“ لکھی، جو افسوس کہ طبع نہ ہو سکی۔

(۲) نسيم الكلام في تأييد شريعة خير الانام:

یہ کتاب علم کلام میں عربی زبان میں ہے اور اپنے موضوع پر جامع ہے، مدتوں داخل درس رہ چکی ہے، فی الحال اس کا نسخہ پیش نظر نہیں ہے۔

(۳) جواہر الحکم فی شرح السلم:

منطق کی مشہور کتاب سلم کی شرح حاشیہ کے طرز پر فارسی زبان میں ہے، جس میں سلم کے مباحث کو نہایت آسان پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

(۴) رموز حکمت:

یہ کتاب اردو زبان میں فلسفہ و حکمت میں ہے، اس کا بھی کوئی نسخہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔

(۵) سوال و جواب نور الانوار:

اصول فقہ کی مشہور کتاب نور الانوار کے مشکل مقامات کا بہترین حل ہے، یہ کتاب بھی عربی میں ہے۔

(۶) سوال و جواب قطبی و میر قطبی:

منطق کی مشہور کتاب قطبی یعنی شرح شمسہ اور اس کے حاشیہ میر سید شریف جرجانی کے مشکل مقامات کا سوال و جواب کی صورت میں آسان حل عربی میں۔
مولانا کی غیر مطبوعہ تصانیف میں حاشیہ تفسیر بیضاوی کا پتہ چل سکا ہے، رموز حکمت کے علاوہ مولانا کی تمام کتابیں میری نظر سے گزری ہیں اور کئی میرے کتب خانے میں موجود ہیں، مولانا کے یہ حالات راقم کی ذاتی معلومات کے علاوہ مولانا کے صاحب زادے مولوی حکیم اعجاز احمد صاحب سے معلوم کر کے لکھے گئے ہیں۔

مولانا کے مرشد حضرت مولانا شاہ بدرالدین قادری متوفی ۱۳۴۳ھ نے ”نصوص الحکم“ اور ”الفتوحات المکیة“ سے متعلق اشکالات کے حل پر ایک مستقل کتاب تصنیف کی، جس پر مولانا نے یہ منظوم تقریظ لکھی ہے:

خلیجیٰ هل هذا مقالٌ لقائلٍ انجم یمانٍ ام صباح الثواصلِ

اذا الكوكبُ الدُّرِّيُّ في كبد السماء ام الشمس طلعت في لجين المناهل
 اذاك كتاب محكم بالدلائل ام السيف سيف الحق في كل باطل
 اذاك بيان مبطل سحر بابل مقر دراری غامضات المسائل
 لعمری هو الريحان في الروض فائحاً بل العروة الوثقى نجاۃ القبائل
 وكيف من اقتنصت يداه نجومه عفيف، صدوق، ماله من مماثل
 هو البدر في الاشراق والنور والهدى فشتبيهه بالبدر تحصيل حاصل
 فطين محياً وجهه إذا نظرته لا بصرت نور الله بين الهياكل
 هو المصقع الفطن اللبيب المبجل فقيه، حكيم، حاكم بالفواصل
 حوى الفضل والاتقان والزهد والنهى فلو قلت بحراً اين شط السواحل
 وعامل علم الفضل والزهد والتقى وكشف سر الحق روح الافاضل
 قدم سيدي مانبه الصبح طائراً وما هيج الاشواق قطع المراحل
 ولا زلت قطباً ثابتاً نيرا الهدى ولا زلت بدرأ كاملاً غير اقل
 ويا رب فاغفر ان ذنبى احاطنى طالت ذنوب كالغيوث هواطل
 اروح وروحي قد تروح الى الهوى فيارب لا تنس وخذ كف غافل
 وصل على خير البرية كلها
 والله ما يبقى المدين بحامل

حضرت ملا ابوالطیب رحمت علی اسماعیلی

حضرت ملا ابوالطیب رحمت علی بن شیخ محمد علی اسماعیلی مبارک پوری یہاں کے علمی
 و تصنیفی دور شباب کے نمایاں عالم و ادیب ہیں، عربی زبان کے زبردست ادیب و شاعر اور

اپنے مذہب کے جید عالم ہیں۔

انھوں نے ایک زمانے تک ممبئی میں رہ کر بوہرہ قوم کے ایک طبقہ کی قیادت کی اور ملاسیف الدین طاہر کے خلاف ۱۹۱۷ء کے غلہ کیس میں فریق مخالف کی قیادت کی، ممبئی میں کالا ملا کے لقب سے مشہور تھے، مصر و شام اور حجاز کے اسفار کیے۔

علم و تحقیق میں پوری زندگی بسر کی اور آخری وقت تک مبارک پور میں اپنے مذہب کے پیشوا رہے، غلہ کیس میں ناکام رہنے کے بعد ملاسیف الدین طاہر کی بیعت توڑ کر مستقل طور سے مبارک پور بازار میں ایک چھوٹی سی دوکان کر لی اور ملا صاحب کے مخالف گروہ کے ساتھ کام کرنے لگے، مگر بعد میں پھر ملا صاحب سے بیعت کر کے ان کی طرف سے مبارک پور کے عامل تسلیم کیے گئے۔

گولہ بازار میں ان کی چھوٹی سی دوکان پر بچوں کے ذوق کی اکثر چیزیں ملتی تھیں اور غلیل کے ربڑ اور مچھلی کے کانٹے وغیرہ کے لیے لڑکے ملا کی دوکان پر چلے جاتے تھے، چنانچہ بچپن میں، میں نے سب سے پہلے آپ کو اسی دوکان پر ان ہی تقریبات میں دیکھا، پستہ قد، سیاہ رنگ، گداز بدن، چشمہ ناک پر اور لباس بوہرہ ملاؤں کا ہوتا تھا، وہ اپنا مذہبی لباس آخر تک استعمال کرتے رہے، ان کی اس وضع میں فرق نہیں آیا، چوں کہ عربی زبان کے بہت بڑے ادیب و شاعر تھے اور عرب ممالک کی سیر و سیاحت کر چکے تھے، اس لیے ان کی مجلس بڑی معلوماتی ہوتی تھی، میں طالب علمی کے زمانے میں ان کے یہاں زیادہ آتا جاتا تھا، وہ مجھ سے بڑے بے تکلف ہو گئے اور مجھ پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔

چنانچہ انھوں نے اپنی خاص مذہبی کتابیں جو لکھ کر پڑھی جاتی ہیں، مجھے پڑھنے کو دیں اور میں اسماعیلی مذہب سے براہ راست ان کی کتابوں سے واقف ہوا، مجھ پر ان کے اعتماد کا یہ حال تھا کہ جب بیمار ہوتے تو بوہروں کے نکاح پڑھانے کے لیے مجھے بھیج دیا

کرتے تھے، کہتے تھے کہ نکاح نام ہے شاہدین عدلین کے سامنے مہر پر ایجاب و قبول کا، اس کے لیے مذہبی عالم کی ضرورت نہیں ہے، مجھے ان کی علمی صحبت سے ادب و عربیت میں بہت فائدہ حاصل ہوا ہے اور مدرسہ احیاء العلوم میں مدرسے کے زمانے میں ان کے کئی لڑکوں نے مجھ سے عربی کی تعلیم اور اہل سنت کی فقہ کی تعلیم حاصل کی۔

کہتے تھے کہ مذہبی اصطلاحات اور مسائل عام طور سے ایک ہی قسم کے ہیں، اگر کہیں کوئی اختلاف ہے تو اسے اپنی کتاب میں دیکھ لیں گے، ان کی دو بیویاں تھیں، ایک مبارک پور کے سنی خاندان سے، دوسری غالباً بھوپال کی بوہرہ خاندان سے، دونوں سے اولاد کا سلسلہ چلا۔

ملا صاحب تیرہویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوئے، ان کا مکان پورہ دیوان میں تھا، خوش قسمتی سے ان کی ایک خودنوشت مختصر سی سوانح عمری گجراتی زبان میں ملی ہے، جو بمبئی میں چھپی ہے، ملا صاحب نے یہ کتاب دراصل ملا سیف الدین طاہر کے منصوص علیہ نہ ہونے پر لکھی ہے، مگر اس میں ابتدائی حالات درج کیے ہیں، ہم یہاں اس کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

انھوں نے لکھا ہے کہ میں رحمت علی بن محمد علی قصبہ مبارک پور ضلع اعظم گڑھ کا رہنے والا ہوں، میرا تعلق بوہرہ قوم سے ہے اور پیشہ منیہاری ہے، میں تیرہ سال کی عمر میں اُردو اور گلستاں پڑھ کر شیعوں کی مجلسوں میں بحور الغمہ کی روایات سناتا تھا، میرے والد صحیفہ اور قرآن کے علاوہ اور کچھ پڑھنا نہیں جانتے تھے، صحیفہ گجراتی زبان میں تھا، وہ مجھ سے کہتے کہ تم اسے پڑھو اور سمجھو تو معلوم ہو کہ تم نے کچھ لکھا پڑھا، عام طور سے ہماری مذہبی کتابیں گجراتی میں چھپتی ہیں، ان ہی ایام میں شیخ عبدالحکیم مبارک پوری اپنے لڑکے کی شادی کے لیے مبارک پور آئے تو میں ان سے گجراتی پڑھنے لگا، انھوں نے میری ذہانت دیکھ کر والد صاحب

سے کہا کہ اس بچے کو میرے ساتھ روانہ کر دو، والد صاحب بہت خوش ہوئے اور ان کے ہمراہ مجھے بمبئی بھیجے پر راضی ہو گئے۔

والد صاحب نے اپنی بہن کی لڑکی سے شیخ صاحب کے لڑکے کی شادی کر دی، میری والدہ نے کان کی بالی فروخت کر کے پانچ روپے کا انتظام کر دیا، جو میرے کرائے کے لیے کافی تھا، اس زمانے میں بمبئی کا پورا کرایہ دس روپے تھا۔

شیخ صاحب نے بمبئی میں مجھے اپنے یہاں کام پر رکھا، پھر میرے کہنے پر سیٹھ نور بھائی چھانٹن کے یہاں کر دیا تاکہ میں کھانے پینے پر بچوں کو تعلیم دوں، ان ہی ایام میں شیخ سلیمان جی سے ”میزان الصرف“ پڑھنے لگا، اسی درمیان میں سیٹھ سر آدم جی پیر بھائی نے ملا حسام الدین صاحب کو کراچی سے بمبئی بلایا، وہ پہلے جونی مسجد میں مقیم تھے، پھر ان کو چرنی روڈ اسٹیشن کے سامنے سینی ٹوریم میں جگہ دی گئی، شیخ سلیمان مجھے ان کے پاس میثاق کے لیے لے گئے اور ان کے حوالے کر دیا، انھوں نے مجھے محمد برہان الدین کے حوالے کیا، محمد برہان الدین نے سیٹھ سر آدم جی پیر بھائی کو بلا کر مجھے ان کے حوالے کیا اور کہا کہ اس لڑکے کو اپنے مدرسہ میں رکھو، میں اس مدرسہ میں پانچ سال تک رہا، یہاں میرے استاد ملا محمد علی خوشنویس رام پوری تھے، انھوں نے مجھے ہدایۃ النحو پڑھائی، اس کے بعد شیخ عبدالقادر تلواری رام پوری سے تذکیرات کی کتابیں پڑھیں۔

بعدہ شیخ یوسف علی بن شیخ مومن کپڑونجی سے جو کہ عربی زبان کے ادیب و شاعر تھے، دیوان سیدنا عبداللہ اور دوسری کتابیں پڑھیں، پھر ملا فضل حسین کے حلقہ درس میں گیا، جو تاریخ اور ادب پڑھاتے تھے، بعد میں جب وہ سر آدم جی کے مدرسہ سے نکل کر مرغی محلہ میں شیخ عبدالحسین ریشم والا کے یہاں چلے گئے تو میں وہاں بھی ان سے ملنے کو جایا کرتا تھا، اسی زمانے میں سیدی محمد بھائی ولی اللہ بن سیدی عبدالعلی ولی اللہ جادرہ والا سینی ٹوریم میں درس

دینے آئے، میں ان کے سبق میں حاضر ہوتا رہا، ایک اور عالم شیخ حسین مانڈوی کچھ والے ادیب و علامہ تھے، میں نے ان سے دیوان ابن ہانی پڑھا اور شیخ ابراہیم بھان پوری جو کہ شیخ محمد علی حمید الدین کے آخری شاگرد تھے، وہ علم العروض اور علم البدیع میں میرے استاد تھے۔ جس زمانے میں ملا صاحب سر آدم جی کے مدرسے میں زیر تعلیم تھے، علامہ شبلی نعمانی مصر و شام کے سفر سے واپس آئے اور سینی ٹوریم میں ان کے لیے استقبالی جلسہ ہوا، جس میں ملا رحمت علی صاحب نے خیر مقدمی قصیدہ عربی زبان میں سنایا، جب اس مصرع پر پہنچے ”ومن أشبالنا شبلي“ تو علامہ شبلی نے ان کی طرف دیکھ کر پوچھا کیا نام ہے اور کہاں کے رہنے والے ہو؟ ملا صاحب نے کہا أبو الطیب علی المبارک فوری (ابو الطیب مشہور شاعر متنبی کی کنیت ہے) یہ سن کر علامہ شبلی بہت مسرور ہوئے، یہ واقعہ ملا صاحب نے خود مجھ سے بیان کیا تھا، میں نے سر آدم جی کے مدرسے میں ملا صاحب کے رہنے کی جگہ جا کر دیکھی ہے۔

ملا صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے بعد میں بمبئی سے سورت کا علمی سفر کیا اور وہاں شیخ جعفر بھائی، شیخ عبداللہ بھائی، شیخ محمد علی بن شیخ فیض اللہ ہمدانی یمنی، شیخ داؤد بھائی اور چمن بھائی سے تعلیم حاصل کی، یہ تمام شیوخ و اساتذہ نص نہ ہونے کو بڑے شد و مد سے بیان کرتے تھے، یعنی موجودہ داعی مطلق (ملا سیف الدین طاہر) پر امام مستور نے اپنی طرف سے نص نہیں کی ہے کہ وہ اسماعیلی دعوت و امامت کو سنبھالیں، بل کہ وہ خود ہی داعی بن گئے ہیں۔

ایک دن میں سیدی محمد بھائی ولی اللہ کے سبق سے اٹھ گیا تو انھوں نے مجھے اپنے گھر بلا کر اس کا سبب دریافت کیا، میں نے عرض کیا کہ اس قسم کے دینی علوم و معارف کا پڑھنا پڑھانا ولی الامر کی اجازت کے بغیر حرام ہے، اس پر ان کی آنکھ میں آنسو آ گئے اور کہنے لگے، میاں پڑھ لو، پڑھ لو، ورنہ اس سے محروم رہو گے، تمہارے گناہوں کی وجہ سے صاحب

الامر مستور ہیں اور جو لوگ تمہارے سامنے ظاہر ہیں، وہ غیر منصوص ہیں۔

اس واقعہ کے بعد میں ان کے سبق میں برابر شریک ہوتا رہا، شیخ محمد علی بن شیخ فیض اللہ ہمدانی یمنی نے مجھے عربی ادب کی تعلیم دی، جب وہ مکہ مکرمہ گئے تو میں بھی تحصیل علم کی غرض سے ان کا ہم سفر رہا، انھوں نے کئی سال تک مکہ مکرمہ میں نہایت سادہ زندگی بسر کی، بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے راتوں کو طواف کرتے تھے اور غلاف کعبہ پکڑ کر زار و قطار روتے تھے، اس کے بعد انھوں نے شہر طوس کا سفر کیا، میں نے ایک واقعہ سے بدل ہو کر ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور شیخ صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ طوس گئے، وہاں ایک عورت سے علمی و دینی گفتگو کے بعد اس کے امام مستور ہونے کے چکر میں رہے، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عورت نزاریہ ہے، اور یہ امام نہیں ہو سکتی، شیخ صاحب نے قیام طوس کے زمانے میں ایک قصیدہ لکھا تھا، جس کا ایک مصرع یہ ہے: ج

نحن علی دعائم الاسلام

زمانہ طالب علمی میں پانچ سال تک میرے گھر سے خطوط آتے رہے اور میں ان کو بغیر پڑھے بکس میں رکھتا رہا۔

ایک مرتبہ ایک دوست نے مجھے گھر کا خط دیتے ہوئے کہا کہ اسے پڑھ لو، میں نے پڑھا، اس میں لکھا تھا کہ ہم تم کو پانچ برس سے برابر خط لکھتے ہیں، مگر تم نے آج تک کسی خط کا جواب نہیں دیا، اب ہم نے سمجھ لیا ہے کہ تم دنیا سے گزر چکے ہو، یہ بات میرے دل پر نشتر کی طرح لگی اور دو دن کے بعد ملا برہان الدین کے قدم بوس ہو کر وطن جانے کی اجازت چاہی، انھوں نے مجھے سید عبد علی محی الدین کے پاس بھیج دیا، وہ میرا امتحان لے کر ملا صاحب کی خدمت میں لیوا گئے اور میرے بارے میں گفتگو کی، ملا صاحب نے ملائیت کی سند اور اس کے لوازم کے ساتھ مبلغ ساٹھ روپے نقد وطن جانے کے لیے عطا کیے اور میں خوشی خوشی وطن آیا اور

کچھ دن مبارک پور میں قیام کرنے کے بعد بمبئی آکر ملا محمد برہان الدین کے قدم بوس ہوا۔ ملا صاحب نے دریافت کیا کہ تم کو اب کاروبار کرنا ہے یا مزید علم حاصل کرنا ہے، میں نے عرض کیا کہ کاروبار کی ضرورت ہے، آپ نے فرمایا کہ شہر کے کسی مدرسے میں لگ جاؤ، چنانچہ میں نے اپنے ایک دوست تراب علی کے ساتھ چچہ بچک کی چال میں مدرسہ قائم کر کے تعلیم شروع کر دی، اس کے بعد آدم جی بھائی رنگون والا نے مسجد میں ایک مدرسہ قائم کیا اور میں وہاں تعلیم دینے لگا۔

اسی درمیان میں ایک جگہ بڑی عمر کے تاجروں کو عربی کی ابتدائی تعلیم دینے لگا اور دو، دو بجے رات تک انبیاء کے واقعات اور فتوحات کی داستانیں بیان کرتا تھا، ان مجالس میں اپنے شیوخ و اساتذہ کی زبانی سنے ہوئے واقعات کو بیان کرتا، ساتھ ہی موجودہ داعی پر امام مستور کی طرف سے نص نہ ہونے کی تفصیل بتاتا تھا۔

ملا صاحب نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ بمبئی میں بسر کیا اور چوں کہ داعی وقت کے امام مستور کی طرف سے منصوص علیہ ہونے کے قائل نہیں تھے، اس لیے فتنہ باغیہ اور آزاد پارٹی کے رہنما بن کر سیفی محل کی طرف سے مطعون رہے، استاذ محمد حسن مبارک پوری اعظمی نے تاویل دعائم الاسلام کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ امام مستور سے دعوت کا اتصال تینتالیسویں داعی مطلق ملا عبد علی سیف الدین تک قائم رہا، ان کے بعد ۱۲۵۶ھ میں عبد القادر نجم الدین بن طیب زین الدین نے داعی مطلق محمد بدر الدین کو زہر دے دیا اور یہ دعوت حقیقت سے صورت میں بدل گئی اور وراثت کے طور پر دو خاندانوں میں چلنے لگی، ایک عبد القادر نجم الدین، دوسرے ان کے بھائی عبد الحسین حسام الدین۔

یہ سیف الدین طاہر متوفی ۱۳۸۵ھ کے دادا تھے، حالانکہ دعوت کی نص عبد الحسین حسام الدین کے بھائی طیب زین الدین کے حق میں تھی (مقدمہ تاویل دعائم الاسلام

ج ۱۵ ص ۲۵) اور ایک جگہ یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ھولاء جمیعا لیسوا من سلالۃ الائمۃ (ص ۲۲) یعنی یہ موجودہ دعاۃ سب کے سب ائمہ کے خاندان سے نہیں ہیں۔

ملا رحمت علی بھی اس خیال سے اتفاق کرتے تھے، ۱۹۱۷ء میں باغی بوہروں کی طرف سے ملا سیف الدین کے خلاف غلہ کیس چلا، یعنی اوقاف، مذہبی رقوم، زکوٰۃ وغیرہ قومی ملکیت پر صرف ملا صاحب اور ان کا خاندان کیوں قابض رہے، ملا رحمت علی کئی سال بڑی کام یابی سے اس مقدمے میں رہنمائی کرتے رہے، مگر آخر میں ناکام ہوئے تو ان کے خلاف فضا پیدا ہو گئی اور وہ یہاں سے مبارک پور جا کر منیہاری کی دکان کرنے لگے، امام منصوص کی تلاش میں انھوں نے مصر و شام وغیرہ کا متعدد بار سفر کیا، عالم اسلام کے مشاہیر سے مل کر ان سے سوالات کیے۔

چنانچہ ایک مرتبہ کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کے پاس پہنچے اور ان سے دریافت کیا کہ آپ امام منصوص تو نہیں ہیں؟ ملا رحمت علی اور خواجہ حسن نظامی دونوں امام الزماں کی تلاش میں رہتے تھے اور اس بارے میں دونوں کی خط و کتابت رہا کرتی تھی، ملا صاحب نے مجھے خواجہ حسن نظامی کے بعض خطوط دکھائے تھے۔

ملا صاحب کے یہاں ان کی مذہبی کتابوں کے علاوہ علمی و ادبی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا، میں نے طالب علمی کے زمانے میں دیوان ابونواس، دیوان ابن ہانی، العقد الفرید اور ان کی مذہبی کتاب دعائم الاسلام کا مطالعہ ان ہی کے کتب خانے کی بدولت کیا، آخری دنوں میں بیمار رہا کرتے تھے، ایک مرتبہ عصر کے بعد مجھے بلوایا، میں حاضر ہوا تو انھوں نے کہا کہ مجھے اٹھاؤ، چنانچہ ان کو بٹھایا گیا، انھوں نے کہا کہ انسان کی روح بڑی وفادار ہوتی ہے، تمام حواس و جوارح جواب دیتے ہیں، مگر روح آخر تک ساتھ رہتی ہے، اس کے بعد میں صبح حاضری کا وعدہ کر کے واپس آیا اور جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ رات کے آخری حصے میں

ملا صاحب انتقال فرما گئے۔

تاریخ وفات ۱۷/ جون ۱۹۴۴ء ہے، ملا صاحب مدرس و مصنف اور عربی و گجراتی کے کام یاب شاعر تھے، خود فرماتے تھے کہ میں ایک زمانے میں ایک گھنٹہ میں پچاس ساٹھ اشعار کے عربی قصائد کہا کرتا تھا، اگر ان کے عربی اشعار و قصائد جمع کیے جاتے تو اچھا خاصا دیوان بن جاتا، ان کی مطبوعہ تصانیف یہ ہیں:

(۱) سوانح خودنوشت: یہ رسالہ گجراتی زبان میں ہے، جس میں ملا صاحب نے اپنے ابتدائی حالات بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ داؤدی بوہرہ کے موجودہ امام و داعی ملا سیف الدین طاہر غیر منصوص تھے، یعنی ان کی امامت و دعوت پر امام مستور کی طرف سے نص نہیں تھی، اس کی ابتداء میں ملا صاحب کا فوٹو بھی ہے۔

(۲) آئینہ حق نما: مشہور اسماعیلی داعی احمد نیشاپوری کی کتاب ”ابو خیرۃ الکافیہ“ کا اردو ترجمہ ہے، ۱۳۲۶ھ میں طبع ہوا تھا۔

(۳) ضیاء الحق: ملا صاحب کی مستقل تصنیفات میں سے ہے۔

(۴) وصیت نامہ: گجراتی زبان میں منظوم رسالہ ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ بھی ان کے متعدد رسائل ہیں، جن میں سے بعض کی تمییز راقم نے طالب علمی کے زمانے میں کی تھی اور وہ طبع ہوئے تھے۔

شمس العلماء حضرت مولانا ظفر حسن عینی فاروقی

حضرت مولانا ظفر حسن بن شیخ نجیب اللہ بن شیخ احمد علی بن شیخ محمد مکرم بن شیخ محمد اعظم بن شیخ لطف اللہ بن شیخ مخدوم رشید بن شیخ مخدوم سعید بن شیخ مخدوم مشید بن شیخ بڑے بن شیخ مخدوم محمد فاروقی مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ تیرہویں صدی کے نصف آخر میں

محلہ رانی پورہ، مبارک پور میں پیدا ہوئے، شیخ محمد بن شیخ خضر فاروقی جون پوری کی اولاد سے تھے، جن کا خاندان سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانے میں ولید پور، بھیرا اور لہرا وغیرہ میں جاگیردار ہوا اور بعد میں بھیرا میں مستقل بود و باش اختیار کی، ملا محمود جون پوری متوفی ۱۰۶۲ھ، صاحب شمس بازغہ شیخ بڑے کے پوتے تھے۔

مولانا ظفر حسن نے اپنا خاندانی شجرہ مرتب کر کے شائع کیا تھا، جس میں اپنا نسب نامہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچایا تھا، مگر شیخ محمد بن خضر فاروقی جون پوری کے بعد مشتبہ معلوم ہوتا ہے، ان کے آباء و اجداد میں شیخ مخدوم رشید نے مبارک پور میں اقامت اختیار فرمائی اور رشید آباد نام رکھا، مولانا ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے اور نانا مرحوم مولانا احمد حسین صاحب سے ان کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے، دونوں حضرات ڈھاکہ میں تعلیمی مشاغل رکھتے تھے، تلاش بسیار اور کوشش مسلسل کے باوجود ان کے حالات مجھے نہ مل سکے، ان کی تعلیم کہاں ہوئی؟ اور کن کن اساتذہ سے پڑھا؟ کچھ معلوم نہیں۔

البتہ بعض روایات سے پتہ چلا کہ انھوں نے مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور علامہ شبلی نعمانی سے تعلیم حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند سے استفادہ کیا تھا، خاندانی رئیس وزمیندار ہونے کے ساتھ زبردست عالم اور ذہانت و ذکاوت میں بے مثل تھے، حکومت کی طرف سے ان کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا، اچھے شاعر تھے اور عینی تخلص کرتے تھے، ان کا قلمی مجموعہ کلام میرے کتب خانے میں محفوظ ہے، جس میں اردو، عربی اور فارسی کے اشعار ہیں، زیادہ تر نعت اور مناقب سے متعلق ہیں۔

ان کا کتب خانہ نہایت شان دار اور نوادرات پر مشتمل تھا، انتقال کے بعد ان کے بھائی مولوی ولی الحسن صاحب مرحوم نے اس کو مدرسہ احیاء العلوم پر وقف کر دیا، مولانا مرحوم کی کوئی مستقل تصنیف کا پتہ نہ چل سکا، البتہ ان کا مرتب کردہ خاندانی شجرہ انساب ان کی علمی

یادگار ہے، نیز نانا مرحوم کی کتاب سبیل الآخرت طبع اول پران کی تقریظ موجود ہے اور مجموعہ اشعار قلمی بیاض کی شکل میں ہے، مولانا کی وفات مبارک پور میں ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء میں ہوئی اور جامع مسجد راجہ مبارک شاہ کے جانب شمال والے احاطے میں دفن کیے گئے، جو اُن کا آبائی قبرستان ہے۔

نعت

بحر وحدت کے ہیں دندانِ پیبر موتی صدفِ نور کے ہیں یا کہ منور موتی
جابجا عارضِ گلگوں پہ عرق ہیں اُن کے یا چلے آتے ہیں تھم تھم کے معطر موتی
پچ سنبل کو ہے اور رشک میں ہے مشکِ ختن دیکھ کر زلفِ معنبر کے برابر موتی
حبذا فرقِ مبارک پہ شبِ سرا میں خوب گنجینہٴ رحمت کے نچھاور موتی
صاف آئے صدفِ مُطلبی سے ہو کر حضرتِ فاطمہؑ و حضرتِ حیدرؑ موتی
آپ ہیں قلزمِ ذخائرِ نبوت، لیکن اہلِ بیتِ نبویؑ ہیں زرو گوہر موتی
چشمِ شیدائے جمالِ نبویؑ میں کیا ہے؟ شوکتِ قیصری و گوہرِ احمر موتی
خسروِ چرخِ چہارم ہے شریکِ محفل یاسرِ شمع پہ روشن ہے مدور موتی
عرصہٴ حشر میں ہم آئے گے پیشِ داور جملہٴ کلمہٴ طیب کا پہن کر موتی

رباعی

جب منزلِ قبر میں بسیرا ہوگا وحشت ہوگی بہت اندھیرا ہوگا
نیکی کا وہاں چراغ ہوگا روشن عینیِ قرآنِ رفیقِ تیرا ہوگا

تو خداوندِ درویشمِ خدایا خود آ بانقشبائے برویشمِ خدایا خود آ
سُکرِ وحدت نہ دہد یاریِ استادِ گیم پابہ زنجیرِ جنونیمِ خدایا خود آ

جوشِ بحر و شبِ تار و رہِ نا پیدا مادریں ورطہ خونیم خدایا خود آ
محضوری جناب تو نشائیم آخر بندہ سخت زبونیم خدایا خود آ
عینیم بندہ ناکارہ کہ از بارِ گنہ سرنگوں بخت نگونیم خدایا خود آ

منظوم خط بنام حاجی مظہر علیم انصاری صاحب

تو خداوند درویش خدایا خود آ بانقشبائے برویشم خدایا خود آ
صبا حقوقِ عزیزاں اگر نگہداری برو بحضرتِ حاجی علیم انصاری
پس از نیاز سلاّم کہ رسمِ اسلام است بگو کہ اے گہرِ کان لطف و غم خواری
بیادِ صحبتِ دیرینہ رت کشم صہبا بہ چہ تم کہ بیادم چرائی آری
دلِ ربودی و یادم بہ نامہ نہ کنی ہمیں وفاست ہمیں است طرزِ دلداری
گزشت آنچہ گزشتہ از شکایت نیست مگر بگوئی کہ کے عزم انجمن داری
درونِ سینہ ما شعلہا ست دریادت دو چشم ما بہ فراق تو در گہر باری

حضرت مولانا ابو محمد عبدالحق ملوی

حضرت مولانا ابو محمد عبدالحق بن شیخ جہاں گیر غازی ملوی مترجمِ تلبیس ابلیس
رحمۃ اللہ علیہ علامہ ابو محمد عبدالحق اعظم گڑھی کے نام و نسبت سے اہل علم میں مشہور ہیں۔
ان کے والد شیخ جہاں گیر حضرت سید احمد کی تحریک جہاد کے سرگرم غازیوں میں
سے تھے، املو میں ان کی مسجد ان کے نام سے مشہور ہے۔

افسوس کہ ان کے حالاتِ زندگی بھی معلوم نہ ہو سکے، صرف اتنا معلوم ہوا کہ وہ
مولانا سید میاں نذیر حسین دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور فراغت کے بعد مدرسہ
میاں صاحب واقع پھانک جش خاں میں تعلیمی خدمت انجام دی اور وہیں انتقال کیا، کسی

بات پر گھر سے خفا ہو کر دہلی چلے گئے تو پھر مبارک پور نہیں آئے۔

ایک مرتبہ ان کے بھائی حافظ محمد اسحاق ان کی ملاقات کے لیے دہلی گئے، اس وقت وہ اپنے سیدھے سادے لباس میں تھے تو مولانا نے ان کو تنبیہ کی کہ شہر میں دیہاتی لباس میں نہیں آنا چاہیے، مسلک کے اعتبار سے اہل حدیث تھے اور نہایت ذی علم اور نیک نفس عالم تھے، ان کے علمی تجربہ اور حدیث و فقہ اور افتاء میں وسعت علمی کا پتہ فتاویٰ نذیریہ سے چلتا ہے، جس میں ان کے بہت سے فتاویٰ درج ہیں اور بہت سے فتاویٰ پر دستخط ہیں، فتاویٰ نذیریہ میں عام طور سے تین عبدالحق کے نام سے ملتے ہیں: (۱) ابو محمد عبدالحق لودیانی (۲) محمد عبدالحق ملتانی (۳) اور ابو محمد عبدالحق اعظم گڑھی، یہی مولانا عبدالحق مبارک پوری الملوٰی ہیں، جن کے بہت سے مستقل فتاویٰ اس کتاب میں درج ہیں اور ان کے آخر میں حررہ محمد عبدالحق اعظم گڑھی عفی عنہ لکھا ہے، کہیں صرف عبدالحق اور کہیں محمد عبدالحق اور کہیں ابو محمد عبدالحق ہے، اس طرح کے فتاویٰ جلد اول کے صفحات ص ۴۴۶، ص ۴۵۵، ص ۴۹۶، ص ۵۰۵، اور جلد ثانی کے ص ۹۹، ص ۱۹۳، ص ۱۹۷، ص ۲۰۱، ص ۲۵۵، ص ۲۹۷، ص ۲۵۳، ص ۳۹۱ وغیرہ پر موجود ہیں، جلد اول کے ص ۳۱۶ پر فقیر محمد عبدالحق ۱۲۹۵ھ درج ہے، اگر ان کے فتاویٰ یکجا کیے جائیں تو مستقل تصنیف ہو جائے، ان کی تصنیفی یادگار میں امام ابن جوزی متوفی ۵۵۷ھ کی شہرہ آفاق کتاب ”تلبیس ابلیس“ کا ترجمہ اسی نام سے ہے جو دو بار چھپ چکا ہے، ہندوستان اور کراچی کے نسخے ہم نے دیکھے ہیں، ناشر کتاب نے مولانا کے ترجمے کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ترجمہ علامہ ابو محمد عبدالحق اعظم گڑھی کا ہے، ترجمہ ایک حد تک آزاد اور کسی قدر مفید اشارات کے ساتھ کیا گیا ہے، جس سے مترجم کی وسیع النظری کا پتہ چلتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فاضل مترجم نے اُردو دواں طبقہ پر بہت بڑا احسان کیا کہ ان کے

سامنے ایک گراں قدر باب کھول کر رکھ دیا اور آخرت کی کامرانی اور فائز المرامی کا راز ان کو سمجھا دیا۔ (ص ۳ و ۴)

مولانا عبدالحق نے اس کتاب کی ابتداء میں دس صفحات میں امام جوزی کے حالات نہایت سلیقہ مندی سے جمع کیے ہیں اور اسی کے آخر میں لکھا ہے کہ آپ کے حالات زندگی پندرہ صفحات میں تفصیل کے ساتھ طبقات ابن رجب میں مذکورہ ہیں، جن میں بڑے بڑے علمی معرکوں کا بھی بیان ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو سوانح نگاری کا بھی خاص ذوق تھا، ہم مولانا کے ترجمے کی چند ابتدائی سطریں نقل کرتے ہیں، جن سے ان کی مہارت اور ذوق کا پتہ چلتا ہے، لکھتے ہیں:

”شیخ امام عالم ربانی جمال الدین ابوالفرج عبدالرحمن بن علی بن محمد بن علی معروف بابن الجوزی الحسنبلی واعظ بغدادی نے فرمایا حمد وثنا اعلیٰ شایان حضرت باری تعالیٰ ہے، جس نے ترازوئے عدل عقلا کے ہاتھوں میں سپرد فرمائی اور انبیائے برگزیدہ بھیج کر مطیعین کو ثواب کی خوش خبری سنائی اور منکرین کو عذاب الہی سے ڈرایا اور ان پر سچی کتابیں نازل فرما کر ٹیڑھی جہنمی راہوں سے راہ راست کی تمیز صاف صاف فرمائی اور ہر قسم کی عملی شریعت بغیر نقص و عیب کے کمال کو پہنچائی، میں ایسے شخص کی طرح اس کی حمد کرتا ہوں، جس کو یقین ہے کہ وہی مسبب الاسباب ہے اور اس کی وحدانیت کی گواہی ایسے مخلص کی طرح ادا کرتا ہوں، جس کی نیت میں نہ کچھ شک ہے نہ ارتیاب ہے اور یہ گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں، خاتم النبیین احمد مجتبیٰ بکمال عبودیت ازلی مقبول ہیں، جن کو رب عزوجل نے ایسے وقت مبعوث فرمایا، جب ایمان کے چہرے پر کفر نے اپنا پردہ لٹکایا تو اس

سراج المنیر آفتاب رسالت نے نور ہدایت سے تاریکی کو مٹایا اور امر حق کے چہرے سے باطل کا پردہ اٹھایا اور بندوں کے لیے جو پیغام اترا اس کو صاف صاف بیان کیا اور قرآن مجید کی مشکلات کو واضح کر دیا، آخر ان کو ایسے صاف ہموار روشن راستے پر چھوڑا ہے، جس میں نہ اونچا کھالی ہے، نہ دھوکا ہے۔ صلی اللہ علیہ و علیٰ جمیع الال وکل الأصحاب وعلی التابعین بأحسن الیٰ یوم الحشر والحساب تسلیماً کثیراً کثیراً“۔ (ص:۱)

اس صاف و سلیس زبان و عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو عربی زبان کے غامض معانی و مطالب کو واضح طور سے بیان کرنے میں اُردو بان پر کس قدر قدرت حاصل تھی، یہ کتاب پونے سات سو صفحے میں چھپی ہے، مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے مبارک پوری تلامذہ میں غالباً سب سے قدیم الوفات ہیں۔

حضرت مولانا محمد احمد لہراویؒ

حضرت مولانا حکیم محمد احمد صاحب لہراوی کا قدیم نام بخشش احمد ہے، بل کہ عوام میں اسی نام سے مشہور تھے، مگر وہ اپنا نام محمد احمد لکھتے تھے، تذکرہ علمائے حال میں مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے تلامذہ کی فہرست میں ان کا نام بخشش احمد ہی ہے۔

(تذکرہ علمائے حال ص ۹۳)

ان کی پیدائش لہرا میں تیرہویں صدی کے نصف آخر میں ہوئی، ابتدائی حالات معلوم نہ ہو سکے، اہل حدیث مسلک کے مشہور علماء میں سے تھے۔

زہد و تقویٰ، سادگی، علم و فضل اور نیکی و بزرگی میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، اتباع سنت اور پیروی سلف میں بہت آگے تھے، ان کی سسرال سکٹھی میں تھی، زمانہ طالب علمی

میں پہلی بار میں نے ان کو وہیں دیکھا اور ان کی مجلس میں بیٹھا، اس وقت وہ تبرک ہو چکے تھے، اسی سال کے لگ بھگ عمر رہی ہوگی، پستہ قد، ہلکا پھلکا بدن، اونچا تہہ بند، نیچا کرتا، قوتِ سماع سے بڑی حد تک محروم ہو چکے تھے، آلہ مکبر الصوت ہر وقت ہاتھ میں لیے رہتے تھے اور دوسروں کی بات سنتے وقت اسے اپنے کان پر رکھ لیا کرتے تھے، آواز نہایت پست تھی، بہت تیز چلتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک رات میں نے لہر میں گزاری اور مغرب کی نماز ان کی امامت میں ادا کی، سب سے پہلے میں نے ان ہی کو مغرب کی اذان کے بعد سنت پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔
تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کسی سفر میں کسی مسافر کا لوٹا بھول کر لیتے آئے یا وہ خود بھول گیا اور لقطہ کے طور پر اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔

ان کے صاحب زادے کا بیان ہے کہ تقریباً بیس سال سے وہ لوٹا گھر میں رکھا ہوا ہے، والد صاحب فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس کا مالک تلاش کرتے کرتے آجائے تو اسے دے دیا جائے گا۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے اور طالب علموں کی دینی تربیت پر خاص نظر رکھتے تھے، ان کے ساتھ بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے، علم نحو و صرف میں ان کے دور سائل ہیں، ایک ”الطریقة المرضیة“ عربی زبان میں اور دوسرا ”جامع النحو“ اردو میں، تقریباً اسی سال کی عمر میں راجہ پور سکروور میں پنج شنبہ ۱۵ شوال ۱۳۶۸ھ میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے، میرے ماموں مرحوم مولانا محمد یحییٰ صاحب نے عربی میں ان کی تاریخ وفات لکھی ہے، جو درج ذیل ہے:

سبعنا صوت ناعٍ صاح یوماً هلموا قد مضی من عالمینا
وذا الباضی محمد احمد من اجلّاء العباد، وعابدینا

یٰنَا جِی رَبِّہِ فِی کُلِّ وَقْتٍ وَّ فِی اللَّیْلِ یَخِرُّ لَہِ الْجَبِیْنَا
 یَقُومُ اللَّیْلَ طَوَّاً فِی صَلَوةٍ یَصَلِّیْہَا لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ
 وَاخْلَفَ وَاحِداً وَلَدًا مَسِیَّ بِمَقْصُودٍ لَہِ مِنْ صَاحِبِیْنَ
 بِہِ یَبْقٰی فِضَائِلُہِ الْجَمِیْلَہِ وَبَاقِ اسْمِہِ فِی ذَاکِرِیْنَ
 تَوَفَّاهُ الْمَوْتُکُلَّ وَقْتُ ظَہْرِ وَقَدْ کَانَ الْخَمِیْسَ لَہِ قَرِیْنَ
 تَنْصَفُ شَہْرَ شَوَّالٍ بِنَقْصٍ خَمِیْسَ خْتَمَہُ کَانَ یَقِیْنَ
 فِصَادِفٍ وَسَطَہِ وَخْتَامَ شَہْرِ وَاوَلِہِ وَعِیدَ الْمُسْلِمِیْنَ
 وَیَوْمَ وَفَاتِہِ وَلِقَاءَ رَبِّہِ تَرْحَبُہُ الْمَلَائِکَةُ اِجْمَعِیْنَ
 وَارْخَتْ السُّنْبِیْہَہُ مِنْ غَرِیْبٍ فَقُلْتُ: بِفَضْلِہِ فَقَدْ الرَّهْمِیْنَ

حضرت مولانا حکیم الہی بخش صاحب

حضرت مولانا حکیم الہی بخش بن حکیم عبداللہ بن شیخ بھولن بن شیخ لعل محمد عرف لال بن شیخ عبداللطیف بن شیخ غلام محمد مبارک پوری نے اپنی قلمی یادداشت میں اپنا شجرہ نسب یوں بیان کیا ہے، ضلع کے مشہور اطباء اور ماہر حکماء میں سے تھے اور بڑی سمجھ بوجھ کے عالم تھے، علمی استعداد بہت اچھی تھی۔

ان کی ولادت محلہ پورہ دلہن میں حدود ۱۲۸۰ھ میں ہوئی۔ (۱)

ان کے والد حکیم عبداللہ مشہور طبیب اور عالم تھے، ان سے قرآن مجید اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کر کے مولوی ولی محمد عرف مولوی گودا اور اپنے والد کے شاگرد میاں صاحب عبداللہ شفا ساکن کٹرا سے فارسی کی تکمیل کی، جو ایک صوفی منش بزرگ اور فارسی کے اچھے عالم ہونے کے ساتھ اُردو اور ہندی کے اچھے شاعر بھی تھے اور جب مولانا عبدالرحمن

(۱) حکیم صاحب سن ۱۲۸۰ھ/سن ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔

محدث مبارک پوری ۱۳۱۳ھ میں فارغ ہو کر مبارک پور آئے تو ان سے فنون کے علاوہ حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں، اس کے بعد کان پور مدرسہ فیض عام میں مولانا احمد حسن صاحب کان پوری، مولانا حافظ نور محمد صاحب پنجابی اور مولانا عبدالوہاب صاحب بہاری سے پڑھ کر معقولات و منقولات کی تکمیل کی، مولانا حکیم فیض اللہ صاحب سے علم طب حاصل کیا اور ۱۳۱۷ھ میں فارغ ہوئے۔

مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں، مولانا احمد حسن کان پوری کا اصل وطن بٹالہ ضلع گورداس پور تھا، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی کے مرید اور صحبت یافتہ بزرگ تھے، مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی تلمیذ حضرت مفتی عنایت احمد کوری مصنف ”تواریخ حبیب اللہ و علم الصبیغہ“ سے حدیث کی سند حاصل کی اور مولانا حافظ نور محمد پنجابی نے ملتان میں مولانا عبدالرحمن بن مولانا عبید اللہ سجادہ نشین سے پڑھ کر مولانا عبدالقدوس تلمیذ مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے ”فاتحۃ الفراغ“ پڑھی تھی اور مولانا عبدالوہاب بن شیخ احسان علی بہاری کو حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے شرف تلمذ حاصل تھا اور وہ معقولات میں تبحر کا درجہ رکھتے تھے۔

ان تمام حضرات کے خرمین علم و فضل سے مولانا الہی بخش نے فیض اٹھایا تھا، ابتدائی عمر میں پڑھنے کی طرف توجہ نہیں تھی اور جوانی تک لالہ بالی پن میں رہے۔ اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ میرا پہلا لڑکا محمد شفیع بن الہی بخش تھا، اس کا تولد ۱۳۰۱ھ یا ۱۳۰۲ھ میں ہوا اور اسی میں ہے کہ ۱۳۱۷ھ میں فراغت کے سال ان کے لڑکے عبدالباری پیدا ہوئے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ فراغت کے وقت پختہ عمر کو پہنچ گئے تھے، اسی سال ۱۳۱۷ھ میں مدرسہ احیاء العلوم کا اجراء ہوا، جس کے آپ پہلے ناظم مقرر کیے گئے اور تقریباً

بیس سال تک خدمت انجام دی، مدرسہ ہذا کے پہلے مدرس مولانا محمد محمود معروفی تھے، جو نو روپے ماہوار پر تعلیم دیتے رہے، مدرسہ مختلف عمارتوں میں منتقل ہوتا رہا، یہاں تک کہ اس کی موجودہ عمارت تیار ہوئی، ۱۳۳۶ھ میں مولانا شکر اللہ صاحب دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر آئے تو مولانا الہی بخش نے نظامت کی ذمہ داری ان کے سپرد کر دی، جب مدرسہ میں طلباء کی تعداد زیادہ ہو گئی تو مولانا کی اہلیہ مرحومہ متوفیہ ۱۳۲۱ھ نے اپنا مکان مدرسہ کے لیے پیش کیا، ۱۳۲۰ھ اور ۱۳۲۱ھ کے بڑے طاعون میں جب ہزاروں بچے یتیم ہو گئے تو مولانا اور اراکین مدرسہ نے اس سے متعلق یتیم خانہ جاری کیا، جہاں ان کی تعلیم و تربیت کے ساتھ قیام کا بھی انتظام تھا۔

مولانا نے اپنا آبائی پیشہ طبابت جاری کر کے خلق اللہ کو فائدہ پہنچانے کے ساتھ تعلیم و تدریس میں بڑی مفید خدمات انجام دیں۔

چنانچہ مولانا محمد محمود صاحب معروفی کے تلامذہ میں سے چند لوگوں نے آپ سے بھی تعلیم حاصل کی، مثلاً مولوی فقیر اللہ بن حاجی حبیب اللہ ساکن پورہ دیوان، مولوی حکیم عبدالحمید بن حاجی رحمت اللہ بن عبدالسبحان ساکن پورہ رانی، مولوی حکیم محمد سعید بن شیخ محمد عالم ساکن پورہ صوفی، مولوی عبداللہ ساکن پورہ دلہن، مولوی عبدالرحمن بن شیخ محمد قاسم ساکن پرانی بستی اور مولوی عنایت اللہ ساکن پرانی بستی۔

افسوس کہ ان میں سے کوئی سند فراغت حاصل نہ کر سکا، بعض کی عمر نے وفات کی اور اکثر کاروبار میں لگ گئے۔

مولانا حکیم الہی بخش آخری دور میں مستقل طور سے شہر اعظم گڑھ میں مطب کرتے تھے اور ضلع کے طبی بورڈ کے صدر تھے، ۱۳۵۶ھ میں مبارک پور میں انتقال کیا (۱) اور پورہ دلہن میں اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

(۱) ۱۷ ربیع الثانی سن ۱۳۵۶ھ / ۲۷ جون سن ۱۹۳۷ء کو انتقال کیا۔ (فتاویٰ احیاء العلوم ص ۱۹)

حضرت مولانا شکر اللہ مبارک پوری

حضرت مولانا حاجی قاری مفتی استاذ العلماء محمد شکر اللہ بن شیخ عبدالواحد ناظم مدرسہ احیاء العلوم یہاں کے ایک علمی و دینی دور کے خاتم اور دوسرے علمی و دینی دور کے بانی ہیں۔ آپ کے والد قصبہ کوپانج کے باشندے تھے، بعد میں مبارک پور آکر یہیں مستقل طور سے بس گئے، ان کے ترک وطن کے مختلف اسباب بیان کیے جاتے ہیں، واللہ اعلم۔

مولانا محلہ پورہ رانی میں چودھویں صدی کی ابتداء میں پیدا ہوئے، (۱) ان کے واقعات و حالات زیادہ تر ذاتی معلومات پر مبنی ہیں، جن کو اثنائے درس میں بیان فرمایا کرتے تھے اور کچھ پرانے کاغذ سے ماخوذ ہیں۔

قرآن شریف اور اردو کی تعلیم اپنے گھر اور محلہ میں حاصل کی، اس کے بعد ۱۳۱۷ھ میں مدرسہ احیاء العلوم کا اجراء ہوا تو اس میں داخل ہو کر مولانا محمد محمود معرونی متوفی ۱۳۷۰ھ سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، فرماتے تھے کہ میں نے بہت سے اساتذہ سے پڑھا، مگر مولانا محمد محمود صاحب جیسا پڑھانے والا کسی کو نہیں پایا۔

مشکل سے مشکل تر بات کو نہایت سہل اور آسان انداز میں طلبہ کو سمجھاتے تھے، خود مولانا کا یہی طریقہ تھا، فرماتے تھے کہ یہ طریقہ میں نے مولانا محمود سے سیکھا ہے، ان دنوں مولانا کے گھریلو حالات نہایت ابتر تھے اور معاشی فکر زیادہ رہتی تھی، اس لیے صبح دو گھنٹہ گھر میں کام کر کے مدرسہ جاتے تھے اور مدرسہ سے واپس آکر رات کو بھی کام کرتے تھے۔

فرماتے تھے کہ شام کو میدان کی طرف آتے جاتے منطق کی مشہور کتاب ”تہذیب“ کو زبانی دہرایا کرتا تھا، اس زمانے تک شاہ محمد پور میں محرم کے ایام میں مجلسیں بھی پڑھتے تھے۔

(۱) آپ کی ولادت سن ۱۳۱۳ھ یا سن ۱۳۱۴ھ/ سن ۱۸۹۵ء یا سن ۱۸۹۶ء کے آس پاس ہوئی۔

(مشاہیر احیاء العلوم ص ۴۴)

تعلیمی شوق اور خانگی مشاغل کی کش مکش میں نحو و صرف وغیرہ کی تعلیم مدرسہ میں مولانا محمد محمود سے حاصل کی، گھر کے لوگ تعلیم سے ہٹا کر کام پر لگانا چاہتے تھے، آخر بغیر خبر کیے الہ آباد جا کر مدرسہ مصباح العلوم میں مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی کے حلقہ درس میں شامل ہو گئے، ان ہی ایام میں اتفاق سے مولانا حکیم الہی بخش ناظم مدرسہ احیاء العلوم الہ آباد گئے اور راستہ میں ان سے مولانا کی مڈ بھڑ ہو گئی، انھوں نے مکان چلنے پر اصرار کیا، آخر اس شرط پر راضی ہو گئے کہ گھر پر مجھے تعلیم سے نہیں روکا جائے گا، اب بھائیوں کی طرف سے پوری آزادی مل گئی اور مولانا (لہر پور) سیتا پور کے ایک مدرسہ میں چلے گئے، جہاں خیر آبادی معقولات کا دریا بہہ رہا تھا، آپ نے وہاں معقولات و منقولات کی تعلیم کے ساتھ فن تجوید اور قرأت کی بھی تعلیم حاصل کی، یہاں مولانا حیدر حسن شاہ اور فیض اللہ صاحب سے شرح مطالع، توضیح تلوتح، الافق المبین وغیرہ پڑھیں، نیز یہاں کے اساتذہ میں سے مولانا عبداللہ دانیال سے تعلیم پائی، یہاں ان کے ایک دوست مولوی احمد علی تھے (مولانا ابوالوفا صاحب شاہ جہاں پوری) مولانا نے ان کو دارالعلوم دیوبند جانے کا مشورہ دیا اور خود وہاں سے ریاست مینڈھو علی گڑھ چلے گئے، جہاں مولانا ماجد علی جون پوری معقولات و منقولات کا درس دے رہے تھے، معقولات میں خیر آبادی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے اور حدیث کا درس مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے حاصل کیا تھا، مولانا نے ان سے کسب علم کیا، چوں کہ ان کے یہ تمام اساتذہ معقولات میں خیر آبادی سلسلے سے وابستہ تھے، اس لیے علمائے خیر آباد کا بہت احترام کرتے تھے۔

ایک مرتبہ اثنائے درس میں بات نکلی تو فرمایا کہ جب میں اپنے اساتذہ کے لیے ختم قرآن اور ایصال ثواب کرتا ہوں تو میں علمائے خیر آباد کو بھی خاص طور سے شامل کرتا ہوں، وہ حضرات دوسروں کی طرح بدعات و خرافات کے بارے میں تشدد نہیں کرتے تھے۔

ان کا انداز فکر معقولاتی تھا، میں نے مولانا سے مرقاۃ، تہذیب، شرح تہذیب،

شرح جامی، ملا حسن، ہدیہ سعیدیہ، الجواہر العالیہ، میبذی، حمد اللہ اور قاضی مبارک پڑھی ہیں اور معقولات میں آپ کے واسطے سے میرا سلسلہ بھی علمائے خیر آباد سے ملتا ہے۔

اس کے بعد مولانا ماجد علی جون پوری کی درس گاہ سے نکل کر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کا امتحان دیئے بغیر داخل ہو گئے، ہم طالب علموں سے جب اس واقعہ کو بیان فرماتے تو ہم لوگ اس کی ترکیب پوچھتے، مگر آخر تک اسے نہیں بتایا، اس زمانے میں دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب۔ (۱)

مولانا حافظ محمد احمد صاحب، مولانا شاہ محمد انور صاحب کشمیری اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی (۲) کا فیض جاری تھا، آپ نے ان ہی اساتذہ و شیوخ سے تعلیم حاصل کی، اپنی ٹھوس استعداد اور سمجھ بوجھ کی وجہ سے تمام اساتذہ کی نظر میں وقیع تھے، عام طور سے سالانہ امتحانات میں اعلیٰ نمبروں میں کامیاب ہوئے اور اسی امتیازی کامیابی پر ان کو دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک گھڑی انعام کے طور پر عطا ہوئی، جو مولانا تک نہیں پہنچ سکی، ۱۳۳۶ھ میں دارالعلوم سے سند فراغت حاصل کی، وطن آئے تو مولانا حکیم الہی بخش صاحب نے مدرسہ احیاء العلوم کی نظامت سپرد کر دی اور ۱۳۳۶ھ سے لے کر ۱۳۶۱ھ تک یعنی ربع صدی کی مدت تک مبارک پور اور اطراف میں وہ علمی، دینی، اصلاحی، تبلیغی، تعلیمی، قومی، ملی، سیاسی کارنامے انجام دیئے، جو صدیوں کے کام پر بھی بھاری ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کا اصلاحی، دینی اور سیاسی رنگ آپ پر کچھ اس طرح چڑھ گیا تھا کہ اسی مکتب فکر و خیال کے سرگرم ترجمان بن کر زندہ رہے، اسی درمیان میں اللہ تعالیٰ نے ظاہری خوش حالی اور دولت مندی سے بھی نوازا اور پہلے کا دور پریشانی ختم ہوا، جس سے اس جواں سال

(۱) یہ تسامح ہے، شیخ الہند اُس زمانے میں ۱۹۱۷ء میں مالٹا میں اسیر تھے۔

(۲) یہ بھی تسامح ہے، حضرت مدنی اُس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں استاذ نہیں ہے۔ (تاریخ دارالعلوم

دیوبند ج ۲ ص ۲۰۹)

اور جواں حوصلہ عالم کو کام کرنے کی کھلی فضا ملی، ۱۳۳۶ھ (۱۹۱۸ء) میں آپ مبارک پور آئے تھے، پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) ختم ہو چکی تھی، مگر ہندوستان اور پورے عالم اسلام میں بے چینی عام تھی، اسی دوران میں رولٹ بل آیا اور ستیہ گرہ کی بنیاد پڑی۔

پھر ۱۹۱۹ء میں ولایتی مال اور کپڑے کے بائیکاٹ کی تحریک چلی، اس وقت خلافت کمیٹی اور کانگریس میں چولی دامن کا ساتھ تھا، تحریک خلافت میں مولانا نے جوش و خروش سے حصہ لیا، سمرنا فنڈ، انگورہ فنڈ کے لیے مسلمانوں سے چندے وصول کر کے خلافت کمیٹی کو دیا، جلسوں جلسوں کا اہتمام کیا، باقاعدہ عدالت قائم کر کے خود حاکم کی حیثیت سے فیصلے سنانے لگے، اس عدالت میں بہت سے پرانے مقدمات طے کیے گئے۔

بالآخر ۱۹ جون ۱۹۲۳ء (۱۳۴۱ھ) کو بدلیسی مال کے خلاف ستیہ گرہ کرنے پر مولانا اور دوسرے پانچ اشخاص گرفتار کیے گئے اور ان کو چھ چھ ماہ کی قید ہوئی، اسی دوران میں شدھی سنگھٹن کی تحریک چلی اور مسلمانوں میں ارتداد کی وبا پھیلانے کی کوشش کی گئی تو مولانا نے اطراف و جوانب میں وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری کیا اور دیہات دیہات مکاتیب قائم کیے، جب فلسطین کو وطن یہود بنانے کا اعلان ہوا تو عربوں کی حمایت میں پیش پیش رہ کر احتجاجی جلسے جلوس کیے، دعائیں کیں، کرائیں، آخری دور میں جب لکھنؤ میں مدح صحابہ کی تحریک چلی تو اس میں بڑے والہانہ انداز میں پورے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا۔

انگریز دشمنی ان کے خمیر میں تھی اور سامراجی اقتدار کے خلاف ہمیشہ سرگرم رہے، سیاست میں کانگریس اور جمعیت علماء ہند سے وابستہ رہے، مولانا کی نظامت کے وقت مدرسہ دینا بابا کی مسجد میں تھا، سب سے پہلے مدرسہ کی مستقل عمارت کا کام کیا، اینٹ کے لیے قصبے کے باہر بھٹہ کا انتظام کیا، درخت کٹوائے اور مزدوروں کو جمع کیا اور سخت گرمی اور لو کے زمانے میں رات دن کر کے اینٹ تیار کرائی، اس کام میں ان کے رفیق مولانا نعمت اللہ صاحب

ساتھ ساتھ رہتے تھے اور دوسرے اراکین بھی پوری دلچسپی لیتے تھے۔

۱۳۳۷ھ میں دیوبندی جماعت کا جمعہ علیحدہ ہوا اور دینا بابا کی مسجد میں جمعہ ہوتا رہا، یہاں تک کہ آپ نے اپنی نگرانی میں مستقل جامع مسجد تعمیر کرائی اور ۱۳۵۹ھ (یکم جون ۱۹۴۰ء) کو ایک عظیم الشان جلسہ میں اس کی بنیاد پڑی، یہ مسجد فن تعمیر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، نیز قصبہ کے باہر دکن جانب عظیم الشان عید گاہ تعمیر کرائی، جو ۱۳۵۷ھ میں مکمل ہوئی۔

ان دونوں مسجدوں کے لیے قصبہ سے لاکھوں روپے کا چندہ ہوا، مدرسہ، جامع مسجد اور عید گاہ مولانا کی تعمیری یادگار ہیں، مولانا نے مدرسہ احیاء العلوم کے ذریعے زیادہ سے زیادہ تعلیمی و اصلاحی خدمات انجام دیں اور بدعات و خرافات کے خلاف نہایت بے باکی سے جنگ کی، معاشرتی اور سماجی اصلاح کے لیے سینہ سپر ہوئے، اس وقت قصبہ پر بعض خاندانوں کا کافی اثر و رسوخ تھا، جن کی وجہ سے اصلاحی کاموں کے مقابلے میں نہایت سخت حالات سامنے آئے، مقدمہ بازی، دبدو جنگ اور سازش، غرض ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنا پڑا، مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں پیدا ہوئی۔

بریلوی جماعت اور شیعہ جماعت سے سخت مقابلہ رہا، مناظرہ بازی کی نوبت آئی، کئی کئی مہینے جانبین سے تقریری مقابلے ہوتے رہے اور مولانا اپنی جماعت کو لے کر مقابلے میں ڈٹے رہے، نہایت کامیاب و اعظ تھے، ان کے وعظ میں بڑا اثر تھا، ایک موضوع پر بلا تکلف تین تین چار چار گھنٹے تقریر کرتے تھے، موت، حیات، شادی بیاہ، ذات برادری کی غلط رسموں میں بھی ان کا اصلاحی کارنامہ ہے، علمی استعداد نہایت ٹھوس تھی، ہر علم و فن کی کتابیں بلا تکلف پڑھاتے اور خوب پڑھاتے تھے، افہام و تفہیم میں خداداد ملکہ حاصل تھا۔

آخری دور میں جب دوسری مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں، یہ سلسلہ منقطع ہو گیا، منطق، فلسفہ اور دیگر علوم و فنون کی منتہی کتابیں بلا مطالعہ اس طرح پڑھاتے کہ مشہور مدرسین

بھی نہیں پڑھا سکتے تھے، ابتدا میں دورہ حدیث کی تعلیم بھی دیتے تھے، چنانچہ ان کی درس گاہ سے سند فراغت پانے والے کئی علماء پیدا ہوئے، فرمایا کرتے تھے کہ غبی سے غبی طالب علم کو ایسا پڑھا سکتا ہوں کہ وہ ہر فن کو بخوبی سمجھ جائے۔

مولانا کتاب پڑھا دینے کے قائل نہیں، بل کہ کتاب کے ذریعے فن پڑھاتے تھے، فرماتے تھے کہ آج کل مدرسوں میں کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اور ان کے الفاظ و عبارات اور ضامرومراجع پر زور دیا جاتا ہے، حالاں کہ ان میں جو فن ہے، اس کی تعلیم دینی چاہیے۔

شرح جامی کے سخت مخالف تھے اور کہتے تھے کہ اس قسم کی کتابوں سے فن نہیں آتا، بل کہ الفاظ و عبارات اور طرز ادا میں ذہن الجھ کر رہ جاتا ہے، ہمارے درس نظامیہ میں مشکل پسندی کے دور کی کتابیں داخل ہیں، ان سے باریک بینی ضرور پیدا ہوتی ہے، مگر اس سے پہلے نفس فن کا پورے طور سے سمجھنا ضروری ہے، اسی لیے قدام ہر فن کی کوئی مختصر سی کتاب زبانی یاد کر لیا کرتے تھے۔

ان کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے عبارت پڑھواتے تھے، پھر پوری عبارت کا مطلب نہایت آسان اور مختصر طریقے سے سمجھا دیتے تھے اور آخر میں ترجمہ کرا دیتے تھے، کسی مشکل مقام آنے سے دو ایک دن پہلے بتا دیا کرتے تھے کہ فلاں مقام آ رہا ہے، جو ہماری درس گاہوں میں بہت مشکل سمجھا جاتا ہے اور اس پر کئی کئی دن تقریریں ہوتی ہیں، مگر میں اسے اس طرح پڑھاؤں گا کہ پوری کتاب میں سب سے آسان سبق یہی معلوم ہوگا۔

چنانچہ واقعی ایسا ہی ہوتا تھا اور ہم لوگ جب اسے پڑھ کر اٹھتے تھے تو آپس میں کہا کرتے تھے کہ یہ کون سا مشکل مقام ہے، ہدیہ سعیدیہ، ملاحسن، حمد اللہ، قاضی مبارک مزہ لے لے کر پڑھاتے تھے اور فنی اشکالات پر خوب تقریر فرماتے تھے، ان کی پڑھائی ہوئی کتابیں جب بھی مجھے پڑھانی پڑی ہیں، بے تکان پڑھایا ہے اور آج بھی ان کو اسی طرح

پڑھا سکتا ہوں، ہدیہ سعیدیہ اور ملا حسن میں نے بارہا مولانا کے طرز پر پڑھایا ہے، کافیہ کا ”شش منہا“، شرح جامی کا ”حاصل محصول“، تہذیب کا ”ضابطہ“، ملا حسن کا ”جعل اور پنچہ“، حمد اللہ کا ”امور عامہ“، میبذی کی ”شکل عروسی و شکل ہماری“ وغیرہ، مشکل مباحث کو پانی کر دیا کرتے تھے اور ان کو اس طور سے سمجھا دیا کرتے تھے کہ کتاب میں سب سے آسان بحث وہی معلوم ہوتی تھی۔

اسباق کے درمیان کبھی کبھی غیر متعلق مگر دلچسپ باتیں بھی چھیڑ دیا کرتے تھے اور پورا وقت اسی میں ختم ہو جاتا تھا تو فرماتے تھے کہ یہ بھی تعلیم میں داخل ہے، اس سے ذہن و مزاج بنتا ہے، ان کے رعب داب کا یہ حال تھا کہ اچھے اچھے لوگ ان سے آنکھیں نہیں ملا سکتے تھے، مگر بعض اوقات اسباق میں کھلتے تو انتہائی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔

مہینے میں دو ایک بار تمام طلبہ کو دارالافتاء میں جمع کرتے اور ایک ایک کے بارے میں جو کمزوریاں معلوم ہوتیں غیظ و غضب کے لہجے میں ان کی طرف اشارہ کر کے سخت سے سخت سزا دینے کی دھمکی دیتے اور معلوم ہوتا تھا کہ آج کسی کی خیر نہیں ہے، پھر خود ہی اپنے غصے کو ٹھنڈا کرتے اور بات کا موضوع بدل کر طلبہ و مدرسین کی ذمہ داریوں کو بیان کرتے، ان کے فضائل و مناقب کا ذکر کرتے اور پھر نوبت یہاں تک پہنچتی کہ وہ اپنے ہر طالب علم کو نہایت معزز و محترم اور زندگی میں کامیاب دیکھنے کی تمنا کرتے اور یہ کہ ان کی ہمت افزائی اور علمی و ذہنی پرورش میں سب کچھ کرنے کو تیار ہیں اور ان کو اپنے عزیز طلبہ سے بڑی بڑی توقعات ہیں۔

وہ برملا کہتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے طلبہ مضمون نگاری، شعر و شاعری، وعظ و خطابت کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کی معلومات بھی رکھیں، مگر شرط یہ ہے کہ پہلے تعلیم کو اس کے حقوق و آداب کے ساتھ حاصل کریں۔

مولانا اپنے طلبہ سے بے انتہا شفقت و محبت کرتے تھے اور ان کی عزت نفس اور خودداری کا لحاظ کرتے تھے، قصہ میں کہیں سے طالب علموں کے بارے میں شکایت آتی تو سمجھا بھجا کر معاملہ رفع دفع کر دیتے، مگر طلبہ کی عزت پر آنچ نہیں آنے دیتے تھے، کہتے تھے کہ اگر میرے طلبہ پر کسی نے آنکھ اٹھائی تو اس کی خیر نہیں ہوگی، میں ان کو غلطیوں پر سزا دوں گا، مگر کسی باہر والے کو ایک لفظ کہنے کا حق نہ دوں گا۔

مولانا نے اپنے عزیز طلبہ کی علمی و ذہنی تربیت کے لیے جمعیتہ الطالبہ قائم کرائی، جس میں تاریخ و ادب اور دیگر علمی موضوعات کی ہزاروں کتاب موجود تھیں، ادبی، مذہبی اور سیاسی جرائد و مجلات آتے تھے اور طلبہ ان کو پڑھتے تھے، ”الاحیاء“ کے نام سے طلبہ کا قلمی رسالہ نکلتا تھا، ہفتہ واری تقریریں ہوتی تھیں۔

جہاں مولانا کا وعظ ہوتا تھا، طلباء ساتھ ساتھ رہتے تھے اور ان سے پہلے تقریر کیا کرتے تھے، جب کسی رسالے میں اپنے شاگرد کا کوئی مضمون یا اشعار دیکھتے تو بے انتہا خوش ہوتے تھے، اُسے بلا کے شاباشی دیتے تھے۔

راقم اُن کا سب سے آخری شاگرد ہے، جسے مرقات سے لے کر حمد اللہ اور قاضی مبارک تک پڑھایا ہے، اس کے بعد پھر کسی کو نہیں پڑھایا۔

بسا اوقات مصروفیات کی وجہ سے فرصت نہیں ملتی تھی تو عصر کے بعد مدرسہ کے صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر مغرب تک پڑھایا کرتے تھے، وہ بہترین معلم و مدرّس اور مربی و مصلح تھے، طلبہ کے ساتھ نرمی اور گرمی حسب مواقع کرتے تھے، مفتی بھی تھے اور ہر قسم کے فتاویٰ کے جوابات نہایت تحقیق سے تحریر فرماتے تھے، ان کے فتاویٰ ضخیم جلدوں میں جمع ہو سکتے ہیں، ان کے ساتھ مخلصوں کی ایک جماعت تھی، جو ان کی ہر بات کو بلا چون و چرا تسلیم کرتی تھی، وقت، روپیہ، پیسہ، محنت سب کچھ خرچ کرنے میں خوشی محسوس

کرتی تھی، وہ ہر کام اپنی صوابدید سے کرتے تھے، مگر پہلے جماعت کے اعیان سے مشورہ کر لیا کرتے تھے، کوئی کام بغیر جماعتی مشورہ کے نہیں کرتے تھے۔

ان کو عام و خواص سے کام لینے کا سلیقہ خوب معلوم تھا، وہ ہر ایک طبقہ اور فرد سے یوں ملتے تھے، جیسے اس سے زیادہ ان کا تعلق کسی دوسرے سے نہیں ہے، وقتاً فوقتاً خود لوگوں کے مکان پر چلے جاتے تھے۔

مولانا نے اپنے اخلاص، عزم و حوصلہ اور سلیقہ مندانہ قیادت سے کئی لاکھ روپے اپنی چھوٹی سی جماعت سے وصول کر کے مسجد، مدرسہ، عیدگاہ اور جماعتی کاموں اور دینی کاموں میں خرچ کیے، زندگی بھر مدرسہ یا جماعت سے ایک پیسہ نہیں لیا، بل کہ اپنی ہی دولت خرچ کی، اس معاملے میں ان کے بڑے بھائی جناب حاجی محمد زاہد^(۱) مرحوم بہت حوصلہ مندانہ دل و دماغ رکھتے تھے اور خوب خرچ کرتے کراتے تھے، کتنے دینی رسالوں، اداروں اور افراد کی ذاتی طور سے بڑی بڑی رقم سے امداد کیا کرتے تھے۔

ان کی سخاوت سے بہت سے افراد اور ادارے آگے بڑھے ہیں، دینی اور اصلاحی کاموں میں انتہائی جری اور نڈر تھے، بڑے بڑے حکام تک کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ان کے مخالفین پیٹھ پیچھے ان کی برائیاں بیان کرتے، مگر جب وہ سامنے آ جاتے تو کسی کی مجال نہیں ہوتی تھی کہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔

قد میانہ، رنگ گندمی، بدن گداز، آنکھیں بڑی اور سرخ، عام طور سے گاڑھے کا کرتا پاجامہ پہنتے تھے، کندھے پر بڑا سا رومال ضرور ہوتا تھا، راستہ چلتے تو نگاہ نیچی رہتی اور جس راہ سے گزرتے لوگ دائیں بائیں ہو جاتے یا پھر سلام و مصافحہ کرتے۔

مخالف سے مخالف تر آدمی کی مجال نہیں کہ ان کو تنہا پا کر کوئی نازیبا جملہ سنا سکے، یہ ان کے علم و عمل کا رعب داب تھا۔

(۱) حاجی محمد زاہد صاحب کا انتقال ۱۹۴۲ء کے آس پاس ہوا۔

جج وزیارت کی دولت سے بھی بہرہ ور اور مشرف تھے، جاتے وقت جہاز میں برطانوی حکومت کے خلاف تقریر کی، جس کی تحقیقات بعد میں ہوتی رہی، فرماتے تھے کہ حرم شریف میں ایک مصری خاتون جو فن تجوید و قرأت میں امامت کا درجہ رکھتی تھی، بڑی خوش الحانی اور فنی مہارت کے ساتھ نقاب کے اندر قرآن حکیم کی تلاوت کیا کرتی تھی اور حجاج اس کی قرأت سننے کے لیے بیتاب رہتے تھے۔

مجھے اس کا لہجہ اس قدر پسند آیا کہ میں نے بعد میں وہی لہجہ اختیار کر لیا، مولانا مستند اور جید قاری تھے اور ان کا وہی مخصوص لہجہ تھا، جو حرم شریف سے لائے تھے، بڑی بے ساختگی اور بے تکلفی سے قرآن حکیم پڑھا کرتے تھے، مگر سننے والوں کا جی چاہتا تھا کہ وہ پڑھتے رہیں اور یہ سنتے رہیں، مولانا اپنے عزم و حوصلہ اور کام کی دھن میں اپنی مثال آپ تھے، انھوں نے پچیس سال کے قلیل عرصے میں بے شمار دینی، علمی، اصلاحی خدمات انجام دیں، وہ علمائے دیوبند کے انتہائی درجہ معتقد تھے، ان کے سوا دوسروں کو بہت کم خاطر میں لاتے تھے۔

افسوس کہ ان کو بعض مقامی جھگڑوں میں بھی حصہ لینا پڑا اور ان میں جوش و خروش کے ساتھ سامنے آئے، جس کی وجہ سے ان کی اصلاحی کوششوں کو طرح طرح سے بدنام کیا گیا اور اس میں رکاوٹ آئی۔

۱۳۵۹ھ میں جامع مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، مولانا دن بھر مزدوروں کے ساتھ رہا کرتے تھے اور اس کے جملہ امور و معاملات پر نظر رکھتے تھے، ان کو جامع مسجد کی تعمیر کا شوق عشق کی حد تک پہنچ گیا تھا، اس کے ساتھ مدرسہ کے مشاغل، جماعتی معاملات اور دوسرے کام میں رہا کرتے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ صحت گرنے لگی اور دق کا موذی مرض لاحق ہو گیا، ابتداء میں اپنے استاد مولانا محمود صاحب معروفی کا علاج کیا، پھر لکھنؤ تشریف لے گئے، مگر مسجد کے خیال سے

بہت جلد واپس آ گئے۔

اب اس قابل نہیں رہ گئے تھے کہ چل پھر سکیں، شدتِ مرض وضعف کے ایام میں کبھی مدرسہ میں لے جانے کا تقاضا کرتے یا کبھی مسجد میں لے جانے کو کہتے اور ان کی خواہش پوری کی جاتی تھی، آخری دنوں میں گھر ہی پر رہے اور دو شنبہ ۵ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ^(۱) میں چاشت کے وقت داعی اجل کو لبیک کہا۔

وصال سے چند منٹ پہلے تک کلمہ شہادت زبان پر جاری تھا اور انگلیاں بار بار آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں، اسی دن قبل مغرب سموہی کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے، رحمۃ اللہ علیہ۔

مولانا کے وصال کا دن مبارک پور میں یومِ غم اور جنازہ مشہودہ تھا، مولانا عبد الرحمن صاحب محدث مبارک پوری کے بعد یہ دوسرا جنازہ تھا، جس میں اس قدر مسلمان جمع ہوئے تھے، ان کے مزار کے سرہانے یہ کتبہ نصب ہے:

”هذا قبر مجي السنة الشيخ الحاج مولانا شکر اللہ
المبارک فوری رحمہ اللہ تعالیٰ۔ المتوفی یوم الاثنين فی
۵ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ۔“

وفات کی خبر پورے ملک میں پھیل گئی اور اخبارات و رسائل نے تعزیتی مضامین لکھے اور ان کے محاسن و فضائل کا کھلے الفاظ میں تذکرہ کیا، بہت سے مدارس بند کیے گئے اور ایصالِ ثواب کے لیے ختم قرآن ہوا اور اطراف ملک کے علماء و فضلاء اور مشائخ نے دعائے مغفرت کی، ایک صاحب نے تاریخ وفات یہ نکالی ہے: ”سلام الرحمن علیکم ادخلوا الجنة“ ۱۳۶۱ھ۔

مولانا مرحوم کی وفات کے بعد ایک رات میں نے یہ مبارک و مسعود خواب دیکھا

(۱) مطابق ۲۳ مارچ سن ۱۹۴۲ء (مشاہیر احياء العلوم ص ۶۲)

کہ ایک میدان میں جنوباً و شمالاً ایک دریا بہہ رہا ہے، اس کے مشرقی کنارے پر ایک پُر فضا باغ ہے اور وہاں رسول اللہ ﷺ کا جنازہ قبلہ رخ یوں گزر رہا ہے کہ اس کا مغربی شمالی پایہ امام بخاری کے کاندھے پر ہے، مغربی جنوبی پایہ حضرت امام مسلم اپنے کاندھے پر لیے ہوئے ہیں اور مشرقی جنوبی پایہ چند دیگر محدثین و ائمہ دین کے ہاتھوں میں ہے اور شمالی مشرقی پایہ حضرت مولانا شکر اللہ صاحب اپنے سینہ پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے ہیں اور سینہ اوپر کی جانب ابھرا ہوا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بڑا وزن ہے اور اسے پوری طاقت سے سنبھالے ہوئے ہیں، تمام فقہاء و محدثین و ائمہ دین سفید ریش، سفید پوش اور طویل القامت ہیں اور مولانا خوب تندرست و توانا ہیں، صرف خانہ دار تہہ بند پہنے ہوئے ہیں، باقی تمام جسم عریاں ہے، حتیٰ کہ سر پر ٹوپی بھی نہیں ہے۔

سینے کے بال صاف نظر آرہے ہیں، مولانا مرحوم کے پیچھے تھوڑے ہی فاصلے پر میں اور مولانا شمس الدین صاحب حسینی دونوں چل رہے ہیں، میں نے مولوی شمس الدین سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کا جنازہ مبارک جارہا ہے، چلو ہم لوگ بھی مولانا سے کہہ کر اس سعادت میں شریک ہو جائیں، پھر ہم دونوں جلدی جلدی آگے بڑھے اور مولانا سے اپنی خواہش ظاہر کی، مولانا نے پیچھے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور فرمایا کہ جب تم لوگ یہاں مستقل طور سے آؤ گے تو اس میں شریک ہونا، ابھی میرے پیچھے چلے آؤ۔

میں تدوین سیر و معازی کی ترتیب میں بڑی الجھن میں تھا، پہلے باب کے بعد کام آگے نہیں بڑھتا تھا، مضامین کی ترتیب سمجھ میں نہیں آتی تھی، حالاں کہ معلومات یکجا تھیں، اسی حال میں پندرہ صفر ۱۴۰۹ھ کی رات میں جو شب پنجشنبہ تھی، خواب دیکھا کہ میں مولوی محمد عثمان صاحب اور مولوی شمس الدین صاحب ایک مکان میں کھڑے ہیں، صحن چھوٹا سا ہے، اوپر چاروں طرف مکانات بنے ہیں، جس کی وجہ سے صحن میں روشنی بہت کم ہے، اس صحن کے

جنوبی حصہ میں برآمدہ ہے، جس کے مغربی گوشے میں اوپر کوزینہ جاتا ہے۔

ہم لوگ برآمدہ میں گئے تو دیکھا کہ اوپر سے مولانا شکر اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اتر رہے ہیں، رنگ پہلے سے صاف، بدن چھریرا ہے اور سفید کرتا پا جامہ بدن پر ہے، نیچے اترے اور میرا بایاں ہاتھ اپنے دائیں ہاتھ میں لے کر پہلو میں دبائے ہوئے اوپر چلنے لگے، میں نے بھرائی آواز میں کہا کہ بیس بائیس سال کے بعد ملاقات ہو رہی ہے، مولانا کچھ نہیں بولے اور اس طرح مجھے لے کر اوپر گئے، جہاں لمبا چوڑا ہال ہے اور جنوبی حصہ میں برآمدہ نما مکان ہے، شمال مغربی دیوار سے متصل تخت اور میز ہے، جس پر کچھ پرانے تکیے پڑے ہوئے ہیں، مولانا مغربی شمالی گوشہ میں تخت پر بیٹھ گئے، میں ان کے پاس دائیں جانب بیٹھا، کہا کہ یہیں کچھ دائیں جانب لڑکوں کو پڑھاتا ہوں۔

میں نے کہا کہ آپ کے بعد میں نے بہت تکلیف اٹھائی ہے، اس پر بھی کچھ نہ بولے، مولوی شمس الدین صاحب جو کچھ دُور بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے وہیں سے مجھ کو مخاطب کر کے کہا کہ کتاب کے بارے میں کیا پوچھنا ہے؟ ان کا یہ جملہ سن کر مولانا نے فرمایا کہ وہ ہو گیا، اس کے بعد ان سے ہم میں سے کسی کی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

اللہ کے فضل و کرم سے اس خواب کے بعد تدوین سیر و مغازی کا مرحلہ آسان ہو گیا ہے کہ پندرہ دن کے اندر یکم ربیع الاول ۱۴۰۹ھ تک پانچوں ابواب کی ترتیب مکمل ہو گئی اور نظر ثانی کے بعد کورس درست کرنا رہ گیا۔

۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ / ۱۴ دسمبر ۱۹۹۰ء جمعہ کا دن گزار کر شنبہ کی رات میں خواب دیکھا کہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوں، رخ شمال کی طرف ہے، سامنے شمالی مشرقی کونے میں باریش دو تین آدمی بیٹھے ہیں، میں ان سے بات کر رہا ہوں، اتنے میں دیکھا کہ مولانا شکر اللہ صاحب شمالی مغربی حصہ میں سامنے چٹائی پر آکر بیٹھ گئے، نہایت آزرده خاطر،

معمولی لباس اور سر نیچا کیے ہیں، جیسے بہت زیادہ احساس کمتری میں مبتلا ہیں، کچھ بولتے نہیں، بس خاموش سر نیچا کیے پڑے ہیں، اتنے میں مجھے خیال آیا اور ان کی حالت پر افسوس ہوا، فوراً اٹھا اور ان کو مشرقی جانب اپنے سامنے تکیہ وغیرہ دے کر بیٹھایا، اس کے بعد کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا۔

ادھر تقریباً ہفتہ بھر سے مدرسہ احیاء العلوم میں فتنہ و فساد برپا ہے، طلبہ و باورچی میں مار پیٹ، کئی طلبہ کا اخراج اور نیا پورہ اور پورہ دلہن کے لوگوں کا مدرسہ میں آکر مار پیٹ کرنا اور تھانہ پولیس کی باری، نیز جماعتی زندگی میں انتشار۔
یہ سب باتیں میرے خیال میں مولانا مرحوم کو عالم ارواح میں تکلیف دے رہی ہیں۔

افسوس کہ وفات کے وقت مولانا کے کوئی اولاد نہیں تھی۔

حضرت مولانا محمد نعمت اللہ

استاذی حضرت مولانا محمد نعمت اللہ بن حافظ عبدالسبحان بن شیخ پکھن، ساکن محلہ پورہ رانی مدرسہ کے معاملات میں مولانا شکر اللہ کے دست راست اور عمر میں ان سے بڑے تھے۔
ان کا خاندان کسی زمانے میں منو سے ترک وطن کر کے مبارک پور میں آباد ہوا، جہاں اسے بڑی خوشحالی اور فارغ البالی نصیب ہوئی اور خوب پھلا پھولا، آپ کے والد حافظ عبدالسبحان صاحب نیک کاموں میں آگے تھے، ۱۲۸۲ھ میں جامع مسجد راجہ صاحب کی مرمت و توسیع کے لیے جمعہ کی نماز کے بعد ابتدائی مشورہ ہوا اور طے پایا کہ لوگ حسب استطاعت مدد کریں، تو اسی وقت مسجد میں حافظ عبدالسبحان صاحب اور علیم اللہ گریست نے پچاس روپے دینے کا وعدہ کیا۔ (واقعات و حادثات مبارک پور ص ۸۷)

اس زمانے کا پچاس روپیہ آج کل کے ہزاروں روپے سے زیادہ قیمت واہمیت رکھتا تھا۔

مولانا نے چودھویں صدی کی ابتداء میں آنکھیں کھولیں اور عیش و تنعم میں پروان چڑھے، قرآن مجید اور اردو وغیرہ کی تعلیم گھر اور محلہ میں حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ احیاء العلوم میں داخل ہو گئے، جو ۱۳۱ھ میں ان کے مکان کے قریب کندھی کے کنویں کے پاس جاری ہوا تھا اور مولانا محمد محمود معروفی اس کے پہلے مدرس تھے، آپ نے مولانا محمود سے عربی کتابیں پڑھیں، ان دنوں گھر کے بعض لوگ بسلسلہ تجارت کانپور میں رہتے تھے، مولانا کانپور چلے گئے۔

وہاں جامع العلوم اور فیض عام دو مدرسے چل رہے تھے، ان میں سے کسی ایک میں پڑھنے لگے، پھر وہاں سے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، ساتھ ہی اور دو مبارک پوری طالب علم تھے، ایک مولوی عنایت اللہ اور دوسرے مولوی شکر اللہ، اس زمانے میں دارالعلوم میں مولانا محمود حسن صاحب جامع ترمذی، (۱) مولانا حافظ محمد احمد صاحب صحیح مسلم، مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیری سنن ابن داؤد، مولانا حسین احمد صاحب مدنی (۲) تفسیر بیضاوی پڑھاتے تھے۔ مولانا نے ان اساتذہ و شیوخ کی خدمت میں یہی کتابیں پڑھنی شروع کیں، مگر کچھ دنوں کے بعد وہاں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی، جس سے دارالعلوم میں بڑی ابتری پھیل گئی اور طلبہ ادھر ادھر چلے جانے لگے، مولانا بھی وطن چلے آئے اور کچھ دنوں کے بعد پورہ معروف کے ایک مدرسہ میں تعلیم دینے لگے اور وہاں کئی سال تک رہ کر عربی کی کتابیں پڑھائیں، پھر جب مولانا شکر اللہ صاحب مدرسہ احیاء العلوم کے ناظم ہوئے تو آپ بھی اسی مدرسے سے منسلک ہو گئے اور مدرسہ کی تعمیر میں دونوں بزرگوں نے یکساں حصہ لیا۔

اس زمانے کے واقعات اکثر بیان کیا کرتے تھے، جب کہ مدرسے کی مستقل

(۱) یہ تسامح ہے، کیوں کہ اس زمانہ میں مولانا محمود حسن صاحب مالٹا کے جیل میں اسیر تھے۔

(۲) یہ بھی تسامح ہے، جیسا کہ ماقبل میں گزر چکا ہے۔

عمارت کے لیے قصبہ کے باہر اینٹ کا بھٹہ جاری کیا گیا، اس میں جلانے کے لیے درخت کٹوائے گئے، رات دن ایک کر کے کئی لاکھ اینٹ تیار کی گئی، گرمی کا زمانہ، لو کی شدت اور دوپہر کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اپنے کاندھوں پر لکڑیاں لاد لاکر بھٹے کے پاس لاتے تھے، دھوپ میں گھنٹوں گھنٹوں کھڑے ہو کر مزدوروں کے ساتھ کام کرتے تھے، غرض کہ مدرسے کی عمارت میں مولانا شکر اللہ کی طرح مولانا نعمت اللہ نے خونِ پسینہ ایک کر کے خدمت و اخلاص کا قلعہ تیار کیا۔

اس کے بعد مدرسہ میں فارسی کے مدرس کی حیثیت سے رہے اور انتقال کے چند سال پہلے تک علمی و دینی خدمت انجام دیتے رہے، ۱۳۳۷ھ میں جب جمعہ علیحدہ ہوا تو جامع مسجد کے دیوبندی طبقے کے خطیب و امام بنائے گئے اور آخر تک یہ خدمت بوجہ احسن انجام دیتے رہے، بہترین قاری تھے، اپنے محلہ کی مسجد (کپورہ دیوان کے باغ کی مسجد) کے پنج وقتہ امام تھے، بہترین خطاط و خوش نویس تھے اور خط نسخ و نستعلیق اور خط عربی جلی و خفی نہایت عمدہ لکھتے تھے، مبارک پور میں خوش خطی ان پر ختم ہو گئی۔

مدرسہ کے طلبہ اُردو و عربی خوش خطی آپ ہی کے یہاں لکھتے تھے، ساتھ ہی ہندی اور انگریزی بہترین لکھتے تھے، میں نے فارسی کی پوری تعلیم مدرسہ میں آپ ہی سے حاصل کی ہے اور عربی خوش خطی کی مشق بھی آپ سے کی ہے، مولانا شکر اللہ صاحب جب مبارک پور کے باہر کہیں جاتے تو مدرسے کی نگرانی آپ کے ذمے ہوتی تھی، بڑے ذہین و طباع اور بذلہ سنج بزرگ تھے، بچوں سے محبت اور ان پر شفقت کرنے میں مشہور تھے، سادگی، شرافت، صبر و شکر کے پیکر تھے۔

گردشِ زمانہ سے آخر میں گھریلو معاملات بگڑ گئے تھے اور کنبہ بڑا تھا، مدرسہ سے صرف بیس روپے تنخواہ ملتی تھی، جو اس وقت کے تمام مدرسین سے زیادہ تھی، اسی پر گزر بسر

فرماتے تھے اور آخر میں کچھ ایسے معاملات سامنے آئے کہ مدرسہ کی مدرسسی سے سبکدوش کر دیئے گئے اور بڑھاپے میں کئی سال تک مختلف فرموں میں بھی کھاتہ لکھ کر گزر بسر کرتے رہے۔

افسوس کہ پوری زندگی مدرسہ کی خدمت کرنے کا انجام بہت تکلیف دہ رہا، مگر اس زمانے میں بھی صبر و شکر اور توکل و قناعت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا، اگر مولانا کے پاس بھی دولت رہی ہوتی تو وہ بھی اپنے دوست مولانا شکر اللہ کی طرح کامیاب عالم اور مصلح ہوئے ہوتے اور بڑھاپے کی وجہ سے فارسی نہ پڑھا سکنے کے الزام میں مدرسسی سے علیحدہ نہ کیے جاتے۔

آپ کا کتب خانہ اگرچہ مختصر تھا، مگر اس میں بہت ہی نادر و نایاب کتابیں تھیں، لغت میں کتاب التعریفات جرجانی اور مختار الصحاح رازی کو سب سے پہلے میں نے آپ ہی کے کتب خانے کی بدولت دیکھا، مختار الصحاح اتنی پسند آئی کہ رمضان ۱۳۵۳ھ میں بمبئی سے منگوا یا۔

اس زمانے میں اس کی قیمت ایک روپیہ تھی، اس کے بعد کئی طلبہ نے منگایا، حالاں کہ اس وقت تک اس کے سمجھنے کی استعداد نہ تھی، میرے کتب خانے کی سب سے پہلی کتاب یہی ہے۔

کسی زمانے میں رنگون اور برما تشریف لے گئے، وہاں کے واقعات کبھی کبھی بیان کرتے تھے، اپنے طلباء کی ذہنی تربیت کے لیے پہیلیاں بچھایا کرتے تھے۔

چوں کہ بہت اچھے خوش نویس تھے، اس لیے اکثر طلبہ ان سے آیۃ الکرسی وغیرہ لکھا کر اپنے گھر میں رکھتے تھے، قدمیانہ، بدن گداز، رنگ گورا، آنکھیں بڑی، وجیہ و شکیل آدمی تھے، کھادی کا کرتا، پانچامہ پہنتے تھے، معاملہ فہمی اور اصابت رائے کے مالک تھے، ان کی درس گاہ کے سینکڑوں طلبہ عالم و فاضل بنے۔

ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع ہے، یوم سہ شنبہ ۲۸ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ کو انتقال کیا اور حیدرآباد کی پچھم والی مسجد کے دھن جانب اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مولانا شکر اللہ صاحب کی وفات کے تقریباً ۱۴ ماہ بعد آپ کا بھی انتقال ہو گیا اور مدرسہ کے دونوں معمار دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مولوی ولی محمد صاحب

مولوی ولی محمد صاحب اور حاجی ولی اللہ صاحب دو بھائی تھے، ان کا آبائی مکان پورہ رانی میں کپورہ دیوان کے باغ کے پورب دھن والی گلی میں تھا، مولوی ولی محمد صاحب کی تعلیم کہاں ہوئی؟ کچھ معلوم نہیں۔

البتہ اپنے زمانے میں وہ مبارک پور کے علماء میں شمار کیے جاتے تھے، مولانا حکیم الہی بخش اور مولوی عنایت اللہ نے ان سے دیوان غنی تک فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی، نیز ان کے فارسی کے تلامذہ میں موضع داؤد پور کے ایک زمیندار اور رئیس بسنت بابو تھے، جنہوں نے جاگیردارانہ ور نیسانہ رعب داب کے باوجود اپنے بڑھاپے تک اپنے استاذ کے کوچے کا یوں احترام باقی رکھا کہ قصبہ میں آتے جاتے ہم طالب علموں اور بچوں کو دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا کرتے تھے کہ یہ میرے استاذ کے محلے کے ہیں۔

ان کے بھائی حاجی ولی اللہ صاحب نہایت بزرگ، متقی اور نیک انسان تھے، آخری دور میں ان کا ذریعہ معاش کتابوں کی تجارت تھا، ہفتہ میں دودن اتوار اور جمعرات کو بازار میں قدم رسول کے چبوترے پر دوکان لگاتے تھے، باقی دنوں میں کاندھے پر کتابوں کی گٹھری لے کر دیہات دیہات گھومتے تھے۔

ترکی حکومت کے زمانے میں میاں بیوی حج کو گئے تو دس بارہ سال تک مکہ مکرمہ میں مجاور حرم محترم رہے اور کفاف کے لیے کچھ کسب معیشت کا سلسلہ جاری کیا، یہ شریف مکہ حسین ہاشمی کا زمانہ تھا، واپس آ کر پوری زندگی تقویٰ طہارت اور کسب حلال میں بسر کی،

بڑے تن و توش کے آدمی تھے، شکل و صورت سے سرحدی پٹھان معلوم ہوتے تھے، آواز بہت گرجدار تھی، بہت کم سخن تھے، گاڑھے کا مغلی پانجامہ اور نیچا کرتا اور سفید عمامہ ان کا عام لباس تھا، اپنے کام سے کام رکھتے تھے، میں بچپن میں اکثر بازار کے دن ان کی کتابوں کی دوکان پر جا کر بیٹھا کرتا تھا اور خاموشی سے کتابیں الٹا رہتا تھا۔

میراذوق و شوق دیکھ کر انھوں نے مجھے تفسیر چشتی منظوم کا ایک قلمی اور نادر نسخہ دیا تھا، جو آج بھی میرے کتب خانے کی زینت ہے، یہ کتاب اب تک غیر مطبوع ہے، اس کا سن تالیف ۱۱۹۲ھ ہے، حاجی ولی اللہ صاحب ۱۳۵۱ھ کے بعد فوت ہوئے۔

مولوی حکیم محمد شفیع

مولوی حکیم محمد شفیع بن مولانا حافظ عبدالرحیم بن حاجی بہادر مبارک پوری مولانا عبدالرحمن محدث کے بھائی ہیں۔

ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد حافظ عبدالرحیم سے پڑھ کر اپنے بھائی مولانا عبدالرحمن صاحب سے بقیہ کتابیں پڑھیں اور ان ہی سے طب و حکمت کی پوری تعلیم حاصل کر کے مطب جاری کیا اور قصبہ کے کام یاب و مشہور اطباء میں شمار ہوئے۔

مولوی حکیم غلام رسول فاروقی

مولوی حکیم غلام رسول صاحب فاروقی محلہ پورہ رانی کے رہنے والے تھے۔ ابتداء میں دہلی میں رہ کر طبابت کی اور تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، پھر کلکتہ جا کر اپنا مطب جاری کیا، بڑے بیدار مغز اور فعال آدمی تھے۔

۱۳۱۷ھ میں مدرسہ احیاء العلوم کا قیام ہوا تو انھوں نے اس سلسلے میں ایک کمیٹی

بنائی، جس میں یہاں کے شیعہ سنی، بریلوی دیوبندی وغیرہ سب ہی شریک تھے۔
اس کا مقصد یہ تھا کہ مدرسہ میں ہر طبقہ اور فرقہ کے بچے بلا تکلف تعلیم حاصل کریں،
ایک مرتبہ مدرسہ کے سالانہ امتحان کے لیے انھوں نے غازی پور سے مولانا عبدالعلیم رسول
پوری کو بلایا تھا، دارجلنگ میں بھی کافی عرصے تک رہے، وہاں کی ”انجمن اسلامیہ“ ان ہی کی
قائم کردہ ہے۔

مولوی محمد یعقوب

مولوی محمد یعقوب بن شیخ عبداللہ بن شیخ قیام الدین بن شیخ لعل محمد، محلہ پرانی بستی
کے رہنے والے تھے، مولانا احمد حسین رسول پوری کے ہم سبق تھے، ان کے والد مال دار
آدمی تھے، گھر پر تعلیم کا انتظام کیا اور اسٹاذ کو ایک روپیہ ماہوار دیتے تھے۔
اس کے بعد مولوی محمد یعقوب نے باہر جا کر تعلیم مکمل کی، یہ نہ معلوم ہوسکا کہ کہاں
پڑھا، اس زمانے میں مبارک پور کے اہل علم عام طور سے چشمہ رحمت غازی پور کا رخ کیا
کرتے تھے، ہوسکتا ہے کہ انھوں نے وہیں تکمیل کی ہو۔
ان کے والد بسلسلہ تجارت حیدرآباد دکن میں رہتے تھے، اس لیے فراغت کے
بعد وہ بھی حیدرآباد چلے گئے اور وہیں کسی مدرسے میں مدرس ہوئے۔
مگر افسوس کہ تقرری کے پندرہ دن کے بعد عین جوانی میں وہیں انتقال کر گئے،
ان کا انتقال ۱۳۱۸ھ کے حدود میں ہوا تھا۔

مولوی قمر الدین ندوی الملو

مولوی قمر الدین بن شیخ علیم اللہ بن شیخ حسن علی ندوی الملو کے والد شیخ علیم اللہ

انسپکٹر پولیس اور حضرت مولانا فضل رحمن صاحب گنج مراد آبادی سے بیعت تھے۔
 شریف الطبع اور نیک آدمی تھے، مولوی قمر الدین ندوی، مولوی محمد طفیل الملوٰی کے
 ہم درس تھے، بعد میں انھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہو کر سند فراغت حاصل
 کی، مولانا سید سلیمان ندوی کے معاصر تھے، بڑے ذہین و طباع عالم تھے۔
 افسوس کہ جوانی ہی میں انتقال کر گئے۔

مولوی حکیم شاہ فیاض عالم الملوٰی

مولوی حکیم شاہ فیاض عالم بن شاہ مقصود عالم بن شاہ ظہور عالم بن شاہ مخدوم عالم
 بن شاہ امید علی بن شاہ ابراہیم شاہ پیر زادہ محمد ماہ الملوٰی کے خاندان سے تھے، جو اس دیار میں
 قدیم روحانی خانوادہ تھا، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، مولوی محمد طفیل الملوٰی کے ہم سبق تھے،
 ان کے ساتھ مولانا عبدالعلیم رسول پوری سے نحو و صرف کی تعلیم حاصل کی، پھر باہر جا کر علوم
 مروجہ کی تکمیل کی، طب و حکمت میں اچھی نظر رکھتے تھے۔

ابتداء میں خاندانی روایت کے مطابق بیعت و ارشاد کا سلسلہ جاری کیا، مگر چوں کہ
 یہ چیز ان کی افتادِ طبع سے میل نہیں کھاتی تھی، اس لیے جلد ہی اس کو چھوڑ کر سوسو بازار میں
 مطب جاری کیا۔

جہاں ان کے اور ان کے والد کے مریدین و متوسلین تھے اور وہیں مستقل طور سے
 اقامت اختیار کر لی، یہاں تک کہ وہیں غالباً ۱۳۵۶ھ میں انتقال کیا۔

مولوی حکیم الطاف حسین سکھٹھوی

مولوی حکیم الطاف حسین خاں بن حاجی الہی بخش خاں سکھٹھی مبارک پور کے رہنے

والے تھے، ابتدائی کتابیں اپنے محلہ اور مبارک پور میں پڑھ کر مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور گئے اور مولانا عبدالعلیم رسول پوری اور دوسرے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، اسی زمانے میں طب و حکمت کی تعلیم بھی حاصل کر کے کچھ دنوں باہر مطب کرتے رہے، مگر جلد ہی سکٹھی چلے آئے اور یہیں مطب کرنے لگے۔

مدرسہ چشمہ رحمت سے فراغت کے بعد جب کچھ دنوں کے لیے باہر گئے تھے تو ان کو بعض نہایت مجرب عطائی نسخے مل گئے تھے، جن میں وہ خاص شہرت رکھتے تھے، میں ایام طالب علمی میں شدید قسم کے آشوب چشم میں مبتلا ہو گیا تھا تو حکیم صاحب نے بڑی توجہ سے میرا علاج کیا، میں کئی ماہ تک صبح ان کے یہاں آنکھ میں دوا لگوانے جایا کرتا تھا۔

۱۶ دسمبر ۱۹۲۹ء (۱۳۴۸ھ) کو سکٹھی میں فوت ہوئے اور روضہ کے قبرستان میں عید گاہ کے سامنے دفن کیے گئے۔

مولانا شاہ محمد سریانویؒ

مولانا شاہ محمد بن حاجی محمد اسماعیل بن شیخ کتوار و سریانویؒ کے دادا شیخ کتوار و منو سے ترک وطن کر کے سریاں میں آباد ہوئے، ان کی دستخط میں نے سریاں کے ایک مکان کے بیچ نامہ پر دیکھی ہے۔

مولانا شاہ محمد چودھویں صدی کی ابتداء میں سریاں میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم حافظ شاہ نظام الدین بن شیخ عبدالوہاب سریانوی کے مدرسہ میں ان ہی سے حاصل کی، ان دنوں حافظ صاحب کی ذات اطراف و جوانب کے طلبہ کا مرجع تھی، حافظ صاحب کی دینی و روحانی تعلیم و تربیت کا کچھ ایسا رنگ چڑھا کہ مولانا کو اونچی تعلیم کا داعیہ پیدا ہوا، اس وقت مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری ۱۳۱۳ھ میں فارغ ہو کر وطن میں تعلیمی خدمت انجام

دے رہے تھے اور ان کے یہاں طلبہ کا جھوم رہتا تھا، چنانچہ مولانا شاہ محمد نے بھی ان سے ابتدائی کتب درسیہ پڑھیں۔

پھر یہاں سے مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور گئے اور مولانا عبد العظیم رسول پوری، مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور دوسرے اساتذہ سے پڑھا، اس کے بعد دہلی جا کر مولانا سید نذیر حسین صاحب کے مدرسہ میں داخل ہو گئے اور ان سے حدیث و تفسیر کی تعلیم حاصل کی، نیز اُن ہی ایام میں ڈپٹی حافظ نذیر احمد دہلوی متوفی ۱۳۲۱ھ سے دیوان حماسہ پڑھا اور عربی ادب کی تعلیم حاصل کی۔

حضرت میاں صاحب دہلوی کے مبارک پوری تلامذہ میں مولانا عبد الرحمن صاحب، مولانا عبدالسلام صاحب، مولانا محمد احمد صاحب لہراوی، مولانا عبدالحق الملوئی اہل حدیث مسلک کے تھے، مگر مولانا شاہ محمد صاحب پر مولانا عبد العظیم اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کے تلمذ سے حنفیت کا رنگ باقی رہا، فراغت کے بعد پوری زندگی زہد و قناعت، صبر و توکل، تعلیم و تدریس اور دوسرے علمی و دینی مشاغل میں بسر کی۔

علم و عمل کے امتزاج کا نمونہ تھے، قوت لایموت پر پوری زندگی بسر کی، بڑے متوکل اور متواضع اور نہایت نیک نفس عالم تھے، شرافت و سادگی ان کے چہرے بشرے اور لباس سے نمایاں ہوتی تھی، عام طور سے گاڑھے کے کرتے پانچامے میں رہتے تھے، کبھی کبھی کالی شیر وانی اور سفید عمامہ بھی پہن لیا کرتے تھے، وہ نیک نفسی میں سلف صالحین کی یادگار تھے۔

کچھ مدت کے بعد منبع العلوم خیر آباد میں تعلیمی خدمت انجام دی، پھر گھر ہی پر رہے، اس سے پہلے آپ نے شیخ الدلائل مولانا عبدالحق مہاجر مکیؒ کی تفسیر ”الاکلیل علی المدارک“ کی طباعت و اشاعت اور اس کے مسودات کی ترتیب و تکمیل میں نہایت سلیقہ

مندى سے خدمت انجام دی، آخری ایام میں اپنے استاذ مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری کے یہاں زیادہ آتے جاتے تھے۔

اور ”تحفۃ الاحوذی“ کی تبیض کے سلسلے میں جو خدمت کر سکتے تھے، کرتے تھے، دونوں بزرگوں میں علمی تعلقات بہت خوش گوار تھے، ان کے تلامذہ میں مولانا محمد ہارون مبارک پوری مشہور عالم تھے، ان کا ذاتی کتب خانہ تھا، جس میں فقہ، حدیث اور دوسرے علوم و فنون کی اہم کتابیں تھیں۔

اکثر اوقات مطالعہ اور کتب بینی میں مصروف رہا کرتے تھے، عمرت کے باوجود انھوں نے اپنے لڑکوں کو دینی تعلیم دلائی، ان کے چھوٹے بھائی حاجی محمد صابر صاحب (متوفی جمادی الاولیٰ ۱۳۹۰ھ) بھی حافظ نظام الدین صاحب کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور بڑے بھائی کی طرح بڑے نیک اور متقی بزرگ تھے، مولانا شاہ محمد صاحب نے ۱۳۶۰ھ میں انتقال کیا، اس وقت ان کی عمر ستر سال کے لگ بھگ رہی ہوگی، سریاں میں دفن ہوئے۔

مولوی نور محمد امام جامع مسجد

مولانا نور محمد بن شیخ جمن امام و خطیب جامع مسجد راجہ شاہ، چودہویں صدی کی ابتداء میں پورہ خواجہ میں پیدا ہوئے، سلسلہ نسب میں اوپر جا کر ہمارے خاندان سے مل جاتے ہیں، ابتدائی تعلیم اپنے گھر اور محلے میں حاصل کر کے عربی اور فارسی کی تعلیم علمائے رسول پور سے حاصل کی۔

اس کے بعد چشمہ رحمت غازی پور میں مولانا عبدالعلیم رسول پوری صدر مدرس اور دوسرے علماء و اساتذہ سے تعلیم حاصل کر کے سند فراغت لی، مولوی حکیم الطاف حسین سکھوی اور مولوی نور محمد دونوں صاحبان چشمہ رحمت میں ہم سبق تھے۔

۲۵ جنوری ۱۹۱۵ء (۱۳۳۴ھ) کو امام جامع مسجد راجہ صاحب حافظ عبداللطیف کا انتقال ہوا تو مولوی نور محمد صاحب نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کے بعد جامع مسجد ہذا کے مستقل امام و خطیب مقرر کیے گئے اور آخر تک یہ خدمت انجام دیتے رہے، ساتھ ہی مدرسہ مصباح العلوم میں فارسی کے مدرس کی حیثیت سے تعلیمی خدمت بھی کرتے رہے۔

فن تاریخ گوئی کے ماہر تھے، اردو اور فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے، ”سبیل الآخرت“ اور ”مغربات احمدی“ وغیرہ کے آخر میں ان کی منظوم تاریخ درج ہے۔

پرانی وضع قطع کے عالم تھے، بڑے خوش الحان تھے، میلاد کی محفلوں میں مثنوی مولانا روم اور قصیدہ بردہ کے اشعار نہایت خوش الحانی سے پڑھتے تھے، ایک زمانے تک وہ ایک جماعت کے سربراہ عالم کی حیثیت سے رہے، مگر کبھی کسی بحث و مباحثہ میں نہیں پڑے اور نہ ہی جھگڑے لڑائی سے دلچسپی لی، وہ علمائے رسول پور کے یہاں میاں صاحب نور محمد کے نام سے مشہور تھے۔

چوں کہ ہمارے خاندان سے ان کا تعلق تھا، اس لیے کہ وہ رشتہ داری کی طرح ہمارے گھر آیا کرتے تھے، نانا مرحوم وغیرہ سے تلمذ کی وجہ سے اور بھی آمد و رفت رکھتے تھے، ان کے کوئی اولاد نہیں تھی، آخر وقت میں بڑھاپے کی وجہ سے مدرسہ سے معزول کیے گئے تو ہمارے گھر آئے۔

اتفاق سے نانا مرحوم مولانا احمد حسین صاحب رسول پوری تشریف فرما تھے، صلاح ٹھہری کہ مولوی نور محمد صاحب مدرسہ احیاء العلوم میں فارسی کے معین مدرس بنادیے جائیں، مولوی صاحب اس پر بالکل آمادہ ہو گئے۔

یہاں تک کہ نانا مرحوم نے مولانا شکر اللہ صاحب سے گفتگو کی اور مولانا فوراً اس کے لیے تیار ہو گئے کہ وہ ہمارے مدرسہ میں آئیں اور تعلیم دیں، ابھی یہ بات چل رہی تھی کہ

مدرسہ مصباح العلوم کے ذمہ داروں کو اس بات کا پتہ چل گیا اور انہوں نے مولوی نور محمد صاحب کو مدرسہ میں برائے نام رکھ کر ان کی تنخواہ جاری رکھی، یہ باتیں میرے سامنے ہوئی تھیں۔

آخری دور میں وعظ و تبلیغ کے سلسلے میں جبل پور گئے تھے، اسی سفر میں کہیں چڑھتے اترتے گر گئے اور کمر وغیرہ میں کافی چوٹ آئی، گھر آنے کے بعد کچھ دنوں بیمار رہے، آخر اسی بیماری میں فوت ہوئے، غالباً ان کی وفات ۱۳۶۰ھ کے حدود میں ہوئی اور بندر ہی باغ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مولوی رفیع الدین

مولوی رفیع الدین صاحب کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ ۱۳۱۷ھ میں جب مدرسہ احیاء العلوم کا اجرا ہوا تو وہ اس کے محصل مقرر کیے گئے اور مدرسہ کی طرف سے کلکتہ وغیرہ چندہ وصول کرنے جایا کرتے تھے، اس سے زیادہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

مولوی رفیع الدین صاحب کا تذکرہ شیخ عبد المجید بن حافظ عبد الرحمن بن عبد الوہاب ساکن محلہ پورہ صوفی نے اپنی ذاتی یادداشت میں ۱۹۰۴ء (۱۳۲۲ھ) کے بلوہ کے سلسلہ میں کیا ہے، ہم ان کا پورا بیان درج کرتے ہیں، جو معلومات سے خالی نہیں، وہ لکھتے ہیں:

”۲۹ مئی ۱۹۰۴ء بروز اتوار یہ جو مبارک پور میں بلوہ ہوا، عجیب تھا، بڑے بڑے لوگوں کا اشارہ تھا اور چھوٹے لوگوں نے یہ سمجھا کہ سرکاری انتظام کی وجہ سے کچھ نہیں ہوگا، اگر لوگ یہ جانتے کہ ہم لوگ جلد بازی میں ظلم کر کے سزا پائیں گے تو ہرگز ہرگز ایسا نہ کرتے، چک سکٹھی کی زمینداری میں پوکھرے کے پاس باغ کی مسجد میں ایک سرسور کا دیکھا گیا، مسلمان برہم ہو گئے، مگر یہ نہ سوچا کہ یہ فعل کس کا ہے، یہ سور کا سر جناب خدا بخش ولد فتح قلندر میاں مصطفیٰ آباد کا فعل تھا، اس نے ایسی بدعنوانی اس

غرض سے کی تھی کہ بابورام بلی سنگھ گوجر پاروالے سے رنجش تھی، اس نے سوچا کہ سورکا سر رکھ کر مبارک پور کے مسلمانوں کو بھجھا دیں گے کہ یہ فعل رام بلی کا ہے، اس کے بعد ہم الگ ہو جائیں گے اور رام بلی سے بدلہ بھی مل جائے گا، مگر ایسا الٹا ہوا کہ مسلمانان مبارک پور اسی روز ۵ بجے دن سے گرفتار ہونے لگے، جو گرفتار ہوتا فوراً اعظم گڑھ اس کی چالان ہو جاتی، یہاں تک کہ گولہ بازار میں سوائے عورت کے مسلمان مرد نظر نہیں آتے تھے، بڑے بڑے صاحب بہادر ٹھا کر دوارہ میں مقیم تھے، ہر جگہ پولیس تعینات تھی، جو لوگ نہیں ملتے تھے، ان کے مکان کی تلاشی ہوتی تھی، پورہ دیوان میں مولوی رفیع الدین صاحب کے مکان میں انسپکٹر حلقہ موہن سنگھ، داروغہ دوست محمد خان (۱) پولیس کے دس بارہ جوان اور چوکیدار (۲) وغیرہ سب زیادہ لوگ داخل ہوئے اور تلاشی لی اور ہمارا قرآن مجید اندر سے آنگن میں پھینک دیا اور موہن سنگھ نے پیر سے مسلا، ہم لوگ وہاں موجود تھے، یہ دیکھ کر نہایت دل دکھا، اس وقت یہاں تھانہ نہیں تھا، چوکی تھی، تفصیل قیدیوں کی یہ ہے: (۱) میاں خدا بخش ولد فتح قلندر مصطفیٰ آباد، ڈھائی برس قید سخت اور دوسو روپیہ جرمانہ، اسی کا یہ سب فعل تھا۔ (۲) حاجی عبدالحق ولد ولی محمد پورہ رانی، دو برس قید سخت، چار سو روپیہ جرمانہ۔ (۳) عبداللہ ولد میاں جی لال محمد (۳) محلہ پورہ صوفی، دو برس قید سخت، پچاس روپیہ جرمانہ۔ (۴) طبیب ولد حبیب اللہ خونی محلہ پرانی بستی، دو برس قید سخت، چار سو روپیہ جرمانہ۔ (۵) عبدالحق ولد جان محمد محلہ شاہ محمد پور، دو برس قید سخت۔ (۶) فرحت حسین موضع املو، تین برس قید سخت، چھ سو روپیہ جرمانہ، قید خانہ میں انتقال کیا۔

(۱) غالباً بندول کے تھے کلکٹر کے ساتھ گوجر پارندی کے کنارے گائے کی ہڈیاں وغیرہ دفن کرائیں پھر تنہا نکلا کر دوسری جگہ چھپا دیا، تاکہ نہ مل سکیں۔

(۲) راگھو نام تھا۔

(۳) راقم کے سب سے بڑے والد ۱۵ رجب ۱۳۵۷ھ میں فوت ہوئے۔ (قاضی اطہر)

کل ۱۹ آدمی قید ہوئے اور ۱۹ دسمبر ۱۹۰۴ء بروز سوموار سزا ہوئی، ان ۱۹ قیدیوں میں سے یہ چند مشہور لوگوں کے نام ہیں، ان کے علاوہ حسین آباد کے چار آدمی عبدالغنی ولد قائم ولد فتح، محمد علی ولد مومن ولد فقیر محمد، عبدالرحمن ولد بہادر، امیر علی خان ولد شہرانی ولد بدھو بھی قیدیوں میں تھے۔

مولانا حافظ عبدالعزیز

ابوالحسن مولانا حافظ عبدالعزیز بن مولانا عبدالسلام بن خان محمد صاحب، مولانا عبدالسلام مبارک پوری کی چار اولاد ذکور میں سب سے بڑے اور قدیم الوفاۃ ہیں، مولانا عبدالرحمن مبارک پوری اور مولانا عبداللہ غازی پوری وغیرہ سے پڑھا تھا، اخبار اہل حدیث امرتسر میں مضامین لکھتے تھے اور اپنا نام ابوالحسن عبدالعزیز خلف اکبر مولانا عبدالسلام صاحب مبارک پوری لکھتے تھے، حافظ قرآن، ذہین و فطین، شیریں بیاں، خوش الحان اور پاکیزہ خصلت عالم تھے، مشرقی بنگال کے ضلع بوگرا کے مقام کدوان میں مستقل قیام کرتے تھے، کبھی کبھی وطن بھی آتے تھے، انھوں نے اخبار اہل حدیث امرتسر میں ”بھیانک آتشزدگی“ کے عنوان سے ایک خبر شائع کی کہ میرے گھر کا سارا اثاثہ اور سامان اور کتب خانہ جل گیا۔ ان میں احقر کے پاس لندن کے مطبع عکسی کی مطبوعہ معریٰ جمائل شریف بھی تھی، جس میں احقر نے حفظ کیا تھا، بہت ضروری گزارش ہے کہ مطبوعہ مطبع عکسی جمائل جہاں سے بھی ہو اور جس طرح بھی دستیاب ہونا ممکن ہو، احقر کو مطلع فرمائیں تو علاوہ واجبی ہدیہ کے مستحق انعام بھی ہوں گے، احقر اس کے لیے سخت بیتاب و بیقرار ہے۔

اس پر مولانا ثناء اللہ امرتسری لکھتے ہیں، میرے پاس ایک جمائل لندن کی ہے، وہ آپ کو تا حصول دیگر مستعار بھیجتا ہوں، خدا آپ کو صبر دے اور آپ کی مدد کرے، آپ کو

معلوم ہوگا کہ بنگال کی بستیوں میں آگ کا لگ جانا ایک معمولی بات ہے، اس لیے کتب خانہ کسی خاص جگہ رکھنا چاہئے، ”اب بجز انّا للہ کہنے کے کیا چارہ۔“

ایک مرتبہ اخبار اہل حدیث میں ”یادگار سیدنا نذیر حسین“ کے عنوان سے لکھا کہ مولانا شبلی کا انتقال ہوا اور ان کی یادگار میں دارالمصنفین قائم ہوا ہے، مولانا حالی کا انتقال ہوا اور پانی پت میں ایک بڑے پیمانے پر انجمن کا قیام ہوا ہے۔

افسوس کہ مولانا سید نذیر حسین کی یادگار ہم اب تک کوئی قائم نہ کر سکے۔

مولانا مرحوم نے اپنے والد ماجد کی حیات ہی میں ۱۳۳۹ھ میں انتقال کیا، غالباً اولاد زینہ نہیں ہے، البتہ دختری اولاد میں کچھ افراد بنگال میں موجود ہیں۔

(ترجمان دہلی کیم و پندرہ فروری ۱۹۷۳ء)

مولوی عنایت اللہ

مولوی عنایت اللہ بن حاجی نور محمد بن باب اللہ بن محمد عمر کا خاندان گجھڑا سے آکر مبارک پور میں آباد ہوا، غالباً محمد عمر پہلے آئے تھے، پرانی بستی (کھجوا پر) کے رہنے والے تھے، خاندانی دولت مند تھے، زندگی بھر تجارت سے متعلق رہے۔

منشی مہدی علی خاں سے اُردو اور حساب پڑھ کر ابتدائی کتابیں مولوی سلامت اللہ سے گولہ بازار کی مسجد کے مدرسہ میں پڑھیں اور دیوان غنی مولوی ولی محمد عرف مولوی گودا سے پڑھا، اور مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں فارسی کی تکمیل کر کے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں مولانا محمد محمود سے میزان سے لے کر شرح جامی، ہدایہ، میر قبطی، حمد اللہ، مشکوٰۃ وغیرہ پڑھی۔ آخر میں دارالعلوم دیوبند گئے اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے جامع ترمذی، مولانا حافظ احمد صاحب سے صحیح مسلم، مولانا شاہ محمد انور صاحب سے سنن ابوداؤد اور

مولانا حسین احمد صاحب سے تفسیر بیضاوی پڑھی۔

اسی دوران میں وہاں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی، اس لیے ایک ہفتہ مدرسہ امینیہ میں مولانا کفایت اللہ سے پڑھا اور وطن چلے آئے، اس کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا اور تجارتی کاروبار میں مشغول ہو گئے۔

مدرسہ احیاء العلوم کے رکن اور جماعتی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، اصابت رائے اور صاف گوئی میں مشہور تھے۔

حفظ و ذہانت کا یہ حال تھا کہ بڑھاپے میں درس اور کتاب کی باتیں کیا کرتے تھے، جمعہ ۶/ ذی قعدہ ۱۳۹۱ھ (۲۴/ دسمبر ۱۹۷۱ء کو فوت ہوئے۔

مولوی حافظ محمد سجاد بمہوریؒ

مولوی حافظ محمد سجاد بن شیخ نجف علی بمہور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی مکتب میں حاصل کر کے مدرسہ صدیقیہ جامع الشرق جون پور گئے اور وہاں حافظ محمد صدیق صاحب سے قرآن شریف کا حفظ کیا، اس کے بعد کچھ دنوں بنگلہ والی مسجد نظام الدین دہلی میں عربی کی تعلیم حاصل کی، آخر میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور گئے اور مولانا محمد بیگی صاحب وغیرہ سے تکمیل کی، فراغت کے بعد پوری زندگی گھر پر بسر کی۔

۱۳۷۵ھ میں حج و زیارت سے مشرف ہوئے، راقم بھی اسی سال اس نعمت سے فیض یاب ہوا تھا، اکثر ساتھ رہتا تھا، میں نے ان کو بچپن میں پہلی بار اپنے بڑے والد حاجی میاں جی محمد حسین صاحب کے ساتھ دیکھا تھا، وہ نماز جمعہ پڑھانے کے لیے بمہور گئے اور ہم چند بچے ان کے ساتھ تھے، بمہور کے پورب والے باغ میں ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے، بڑے والد نے پوچھا حافظ صاحب کون سی کتاب ہے، انھوں نے

جواب دیا ”قوت القلوب“

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مولوی محمد سجاد صاحب تھے، حج سے واپس آ کر محلے کی مسجد میں بچوں کو دینی تعلیم کا درس دیا کرتے تھے، تقریباً پچاسی سال کی عمر میں سہ شنبہ ۹ جولائی ۱۹۶۸ء (۱۳۷۸ھ) کو بمبور میں فوت ہوئے۔

مولوی رجب علی سکٹھوی

مولوی رجب علی خاں سکٹھی کے رہنے والے تھے، کلکتہ میں رہتے تھے، اس سے زیادہ ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔

مولانا حکیم علی سجاد

مولانا حکیم علی سجاد بن میاں صاحب یار علی، محلہ شاہ محمد پور کے رہنے والے تھے، یہاں کے علمائے شیعہ میں خصوصی مقام کے مالک تھے، ان کے والد میاں صاحب یار علی فارسی کے اچھے عالموں میں تھے۔

مولانا علی سجاد کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انھوں نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی اور کس مدرسہ سے سند فراغ پائی، صاحب فہم و فراست اور بڑی سمجھ بوجھ کے آدمی تھے، ان میں اور مولانا شکر اللہ صاحب میں بڑا یارانہ تھا۔

وہ مدرسہ احیاء العلوم میں اکثر آیا کرتے تھے اور قصبہ کے امور و معاملات میں دونوں حضرات رائے مشورے کیا کرتے تھے، اس لیے بعض لوگ مولانا علی سجاد صاحب کو دیوبندی شیعہ کہتے تھے، قدابھرتا ہوا، رنگ سانولا، بڑے پائچے کا پانجامہ، کرتا اور دوپلی ٹوپی، ان کا عام لباس تھا، شیروانی بھی پہنا کرتے تھے، ۱۳۹۰ھ کے حدود میں انتقال کیا، ان کے اور علمائے شیعہ کے اکثر نام اور حالات مولانا فیاض حسین مبارک پوری کے بیان کردہ ہیں۔

مولوی عبدالرحمن

مولوی عبدالرحمن بن حاجی محمد قاسم، محلہ پرانی بستی کے رہنے والے تھے، مولانا شکر اللہ صاحب اور مولانا نعمت اللہ صاحب کے ساتھ مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا محمد محمود صاحب معروفی سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، یہ ۱۳۱۷ھ کے حدود کی بات ہے۔ نیز اسی زمانے میں مولانا حکیم الہی بخش صاحب سے تعلیم حاصل کی، نہایت ذکی و ذہین طالب علم تھے، ان کی ذاتی کتابوں پر ان کے حواشی ہیں، جن سے ان کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے، افسوس کہ تکمیل سے پہلے ہی انتقال کر گئے، بعد میں ان کی کتابیں مدرسہ احیاء العلوم کے کتب خانے میں داخل کر دی گئیں۔

مولانا غلام رسول

مولانا غلام رسول، ساکن محلہ شاہ محمد پور نے ابتدائی تعلیم مبارک پور اور دوسرے مدارس میں حاصل کی، اس کے بعد ناظمیہ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے اور وہاں کے اساتذہ سے علوم و فنون کی تکمیل کر کے سند فراغت پائی۔ بعد میں صوبہ بہار کے کسی مقام میں واعظ اور امام جماعت شیعہ مقررہ ہوئے اور وطن میں انتقال کیا، علمائے شیعہ میں مشہور عالم تھے اور ان کے خاندان میں علمی سلسلہ جاری ہوا۔

مولانا محمد تقی

مولانا محمد تقی بن مولانا غلام رسول نے علمی گہوارے میں آنکھ کھولی اور اپنے والد کے نقش قدم پر چل کر مبارک پور میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

اس کے بعد تکمیل کے لیے مدرسہ ناظمیہ کالج لکھنؤ تشریف لے گئے اور وہیں سے فراغت کی سند پائی۔

مولانا محمد داؤد

مولانا محمد داؤد بن مولانا محمد تقی بن مولانا غلام رسول اپنے علمی خانوادے کی تیسری علمی و دینی کڑی تھے، آپ نے بھی ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کر کے جامعہ سلطانیہ لکھنؤ سے صدرالافاضل کی سند حاصل کی۔

مولانا عبدالرحمن زاہد

مولانا حاجی عبدالرحمن صاحب زاہد متخلص رکھتے تھے، یہاں کے علمائے شیعہ میں نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔

مولوی احمد اللہ الملوئی

مولوی احمد اللہ بن محمد اسماعیل بن عبداللہ بن حسام الدین الملوئی، مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور میں مدرس تھے، اکثر کتابیں مولانا شاہ محمد سریانوی سے مدرسہ منبع العلوم خیر آباد میں پڑھی تھیں، بڑے نیک، متواضع اور سیدھے سادے بزرگ تھے۔
تکمیل نہ کر سکے، نہایت خوش خط تھے، کئی درسی کتابیں نقل کر کے پڑھتے پڑھاتے تھے، شعر و شاعری کا بھی نہایت سہرا ذوق تھا، اُردو اشعار کہتے تھے، فارسی کے نہایت اچھے عالم تھے، تقریباً سو سال کی عمر میں ۱۹ فروری ۱۹۶۸ء (۱۳۸۸ھ) میں الملوئی انتقال کیا۔

میاں صاحب عبداللہ شفا

شیخ عبداللہ بن شیخ محمد ہاشم محلہ کٹر مبارک پور کے باشندے تھے، شفا تخلص تھا، میاں صاحب اور میاں صاحب عبداللہ کے نام سے مشہور تھے۔

۱۲۶۶ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی، اس کے بعد فارسی کی تکمیل مولوی حکیم عبداللہ ساکن پورہ دلہن سے کی، فارسی زبان کے مشہور عالم و فاضل اور اردو ہندی کے نہایت اچھے شاعر تھے، صوفی منش بزرگ تھے، ہمارے گھر سے ان کے عزیزانہ مراسم تھے، وہ اپنے طور طریقہ اور طرز میں مبارک پور میں نرالی شان کے مالک تھے اور ان چند لوگوں میں تھے، جو یہاں کے ہونے کے باوجود کسی دوسرے ملک کے باشندے معلوم ہوتے تھے۔

درازی قد و قامت کا یہ حال تھا کہ ان کے پیر کا جوتا عام طور سے نہیں ملتا تھا اور وہ اپنے جوتے بنوایا کرتے تھے، رنگ سانولا، بدن پر ڈھیلا ڈھالا گیر و رنگ کا کرتا، سر پر کلاہ تتری ہوا کرتی تھی، تصوف کا رنگ غالب رہا، علم جفر و رمل وغیرہ سے بھی واقف تھے، اپنے کام سے کام رکھتے تھے، پوری زندگی کفاف پر بسر کی اور فقیری میں بادشاہی کا لطف پایا، انھوں نے زیادہ تر صوفی جان محمد ولید پوری کی متابعت میں ہندی زبان میں اشعار کہے ہیں، برہا، بھجن، ٹھمری، دادرا، چیتا، ہولی، بارہ ماسہ وغیرہ اصناف میں ان کے بہت سے اشعار ہیں۔

ابتدائی زمانے میں قصبہ کے ایک مدرسہ میں فارسی کی تعلیم دی، پھر چند سال عظمت گڑھ میں پڑھایا، پھر راجہ صاحب کی مسجد کے پاس اور محلہ علی نگر مسجد، پھر بوہری مسجد پورہ دیوان میں تعلیم دی، مولانا حکیم الہی بخش نے ان سے فارسی کی تعلیم پائی، طب اور روحانی علاج سے بھی واقف تھے، جفر، نجوم، رمل اور تکسیر میں بھی درک رکھتے تھے۔

(۱) ان کی کتابوں میں ”نعت محبوب“ مطبوعہ ہے، جو نعتوں، غزلوں اور ہندی دادروں پر مختصر سا مجموعہ ہے، اسے نانا مرحوم مولانا احمد حسین رسول پوری نے ترتیب دے کر اور خود کتابت کر کے اکیلل پریس بہرائچ سے شائع کیا تھا۔

(۲) مجموعہ ہندی میں ٹھمری، کجری، بھجن، دادرا، چیتا، کھمٹا، بارہ ماسہ وغیرہ ہیں، یہ بیاض تقریباً دو سو صفحات میں تھی۔

(۳) خلاصۃ الرتل دو جزو میں اسی صفحات میں ہے۔

(۴) علم الجفر ۲۰ صفحات کا رسالہ ہے۔

(۵) شفاء اللغات، تصوف کی اصطلاحات میں ہے، اسے لغات کی مختلف کتابوں کے حواشی میں لکھا ہے، ان کے علاوہ قصائد عربی، قصائد نظمہوری، سکندر نامہ، پنج رقعہ قصائد بدر چانچ، چہار مقالہ وغیرہ پر ان کے حواشی ہیں اور یہ سب غیر مطبوعہ ہیں، جو ضائع ہو چکے یا ہورہے ہیں، ۱۳۶۴ھ میں کٹرے میں انتقال کیا، نمونہ کلام یہ ہے:

کوئے جاناں میں گئے چاک گریباں کتنے جان پر کھیل گئے عاشق بے جاں کتنے
لٹ چکے قافلہ عمر گریزاں کتنے پھرتے ہیں خاک بسر بے سروساماں کتنے
لے چلا جب وہ اندھیرے میں پئے قتل مجھے چمک اٹھے ہیں ستارے سر مژگاں کتنے
میں وہ مجنوں ہوں کہ پہنچا جو بیاباں میں کبھی چومے تلووں کو مرے خار مغیلاں کتنے
کفر کے جلوہ صدرنگ کے احوال نہ پوچھ نقش حیرت بنے بیٹھے ہیں مسلمان کتنے
حسرت و خواہش و امید و یقین و تگ و دو زندگانی کے لیے ہیں مری عنوان کتنے
فیض اشرف سے شفاء نے کہے اشعار ایسے
دیکھ کر رہ گئے انگشت بدنداں کتنے

(نمودِ سحر ص ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰ و ص ۲۳)

منشی قمر الزماں زماں

منشی قمر الزماں صاحب زماں مبارک پوری محلہ پورہ رانی کے رہنے والے تھے، مبارک پور کے شعراء میں دورِ قدیم کے اساتذہ میں تھے۔

منشی حبیب اللہ صاحب حبیب ساکن کٹر مبارک پور سے شرف تلمذ رکھتے تھے اور ان کی نظر نے زماں کو زماں بنا دیا، جس کا اعتراف خود ان کو ہے اور فخر یہ انداز میں اپنے اشعار میں اس کا اظہار کیا ہے:

کچھ اگر ہے تو فقط ہے اثر فیض حبیب ورنہ اشعار زماں کے کوئی اشعار نہیں
اٹھ گیا جب سے مرے سر سے زماں ظل حبیب شعر گوئی کا مزہ کچھ نہیں ملتا مجھ کو
ایک جگہ بغیر نام لیے اپنے استاذ کو اہل ہنر بتا کر ان سے سبق لینے کی تلقین کی ہے:
زماں منظور ہے گر شعر گوئی
سبق حاصل کرو اہل ہنر سے

ہماری طالب علمی کے زمانے میں شعر و سخن کے تین معمر اساتذہ تھے: میاں صاحب عبداللہ شفا، میاں صاحب عبدالکریم عاشق اور منشی محمد زماں صاحب زماں، شفا صوفی منش آدمی تھے، اُردو ہندی کے اچھے شاعر تھے، عاشق نعت گوئی اور غزل میں خاص درجہ رکھتے تھے اور زماں گویا غزل کے بادشاہ تھے، ان تینوں کے دم قدم سے شعر و ادب کا چرچا تھا اور ہر ایک کا اپنا حلقہ تلامذہ تھا، مشاعروں میں ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔

چوں کہ منشی حبیب اللہ سرکاری ملازم تھے اور اکثر باہر رہتے تھے، اس لیے زماں نے نوح ناروی کو کلام دکھانا چاہا اور دو غزلیں ان کو روانہ کیں، مگر نوح ناروی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا اور حسب سابق منشی حبیب اللہ صاحب ہی سے مشورہ سخن لیتے رہے۔

منشی محمد زماں ان سب میں چھوٹے تھے، سیدھے سادے، دبلے پتلے آدمی تھے، ان کو دیکھ کر ان کی شاعری کا اعتبار نہیں ہوتا تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ قدیم رنگ تغزل کے نمائندے تھے، ان کی سادگی میں بڑی رنگینی تھی، زبان اور محاورے کا بر محل استعمال کرتے تھے، ان پر داغ کا رنگ غالب تھا، ”انتخاب دیوان زماں“ کے نام سے ان کا ایک مختصر سا مجموعہ کلام سلیمانی پریس بنارس سے چھپ کر شائع ہوا تھا، جس میں دو نعت اور ۳۴ یا ۳۵ غزلیں ہیں، گویا زماں مبارک پور کے صاحب دیوان شاعر تھے، ان کے تلامذہ کا حلقہ بہت وسیع تھا اور قصبہ اور باہر کے شعراء ان سے اصلاح و مشورہ لیتے تھے۔

معمولی زندگی بسر کرتے تھے، غالباً انھوں نے زندگی بھر خوشحالی نہیں دیکھی۔

۱۳۷۲ھ میں جب کہ بڑھاپا چھا چکا تھا، تلاشِ معاش میں بمبئی آئے تھے، اسی زمانے میں راقم کو اپنی تازہ غزل دی، جو شاید ان کی آخری غزل تھی، اسے میں نے اخبار ”انقلاب“ میں شائع کیا تھا، پوری غزل ان کی قنوطیت کی ترجمانی تھی، ”بسائی گئی دنیا“ ”لبھائی گئی دنیا“ قافیہ وردیف تھے۔

وہ ملازمت کرنے کے قابل نہیں رہ گئے تھے، اس لیے کچھ دنوں کے بعد وطن واپس ہو گئے اور وہیں ۱۳۷۲ھ یا ۱۳۷۳ھ میں فوت ہوئے، اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال سے زائد رہی ہوگی، نمونہ کلام یہ ہے:

رنج اچھا ہے ہمیں او ر نہ راحت اچھی آپ جس حال میں مل جائیں وہ حالت اچھی
دل گیا، چین گیا، صبر گیا، ہوش گیا آپ نے مجھ پہ یہ کی چشمِ عنایت اچھی
تاک میں ہے فلکِ پیر خدا خیر کرے نظر آتی نہیں کم بخت کی نیت اچھی
لن ترانی نے سر طور یہ عقدہ کھولا بڑی مشکل سے نظر آتی ہے صورت اچھی

تم جو آجاؤ یقین ہے کہ سنبھل جائے گا ورنہ بیمار الم کی نہیں حالت اچھی
شیخ کے سامنے قرآن ہے ہمارے نزدیک مصحفِ روئے صنم کی ہے تلاوت اچھی
کر لیا سحر بیانی سے مسخر سب کو
اے زماں تو نے دکھائی یہ کرامت اچھی

(نمودِ سحر ص ۲۳ تا ۲۸ و ص ۳۷ تا ۴۰)

میاں صاحب عبدالکریم عاشق

میاں صاحب عبدالکریم عاشق، ساکن محلہ پورہ خواجہ مبارک پور کے باشندے
تھے، یہاں کے قدیم شعراء میں خاص مقام رکھتے تھے، میاں صاحب عبداللہ شفا کے معاصر
تھے، ہم نے اپنی جوانی میں ان کو دیکھا ہے، نہایت نیک طینت، شریف الطبع اور سیدھے
سادے بزرگ تھے، یہاں کے مشاعروں میں ہمیشہ شریک ہوتے تھے، ان کی بزرگی اور فن
کے سب لوگ معترف تھے۔

غزل ان کا خاص موضوع تھا، مگر کلام میں نعتِ رسول کا رنگ نمایاں ہوتا تھا اور
نعت گوئی میں قصبہ کے شعراء میں مشہور تھے، ہمارے زمانہ طالب علمی میں ایک باریہ بسلسلہ
تجارت مراد آباد گئے اور ہم لوگوں نے ان کے اعزاز میں ایک مختصر سی مجلس مشاعرہ منعقد کی،
جس میں کئی نعتیں سنائیں اور خوب خوب داد پائی، ان کو دیکھ کر ان کے شاعر ہونے کا یقین نہ
ہوتا تھا، مگر جب کلام سناتے تو مشاعرے پر چھا جاتے تھے، نمونہ کلام یہ ہے:

مست ہوں بادۂ توحید کے پیمانے کا فیض ہے ساقی کونین کے میخانے کا
کھول دے گا درِ فردوس یہ کہہ کر رضواں مست آیا مئے توحید کے پیمانے کا

آج للہ تو اے بادِ صبا وعدہ کر خوشبوئے گیسوئے محبوب اڑالانے کا
 اے جنوں وادیِ طیبہ میں خدارا لے چل دل بہلتا ہے وہیں آپ کے دیوانے کا
 باغ عالم تو ہے شاداب مگر اے عاشق!
 آج جو گل ہے کھلا کل نہیں رہ جانے کا

مولانا محمد اسماعیل اصلاحی

مولانا محمد اسماعیل بن شیخ محمد حسین اصلاحی، محلہ کٹڑہ کے رہنے والے تھے، ان کا
 آبائی مکان محلہ علی نگر میں تھا۔

ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے مدرسہ احیاء العلوم میں داخل ہوئے، اس کے بعد
 مدرسۃ الاصلاح سرائے میر گئے، مولانا حمید الدین فراہی اور دوسرے اساتذہ سے پڑھ کر
 سند فراغت پائی، اس کے بعد رنگون تشریف لے گئے، جہاں ایک مدت تک دینی و علمی
 خدمت انجام دیتے رہے، چند سال تک قصبہ لار ضلع دیوریا کے ایک مدرسہ میں پڑھایا اور
 آخر میں سوراشر کے مشہور ضلع دھوراجی کے مقام بگیسرا بھائیاں کے ایک اسکول میں اُردو اور
 دینیات کے مدرس ہوئے اور ایک زمانے تک یہاں رہ کر اصلاحی، تعلیمی اور تبلیغی خدمات
 انجام دیں اور وہاں کے خواص و عوام میں بڑا اثر و رسوخ پیدا کیا، آخر میں علاقہ سوراشر میں
 ایک عظیم الشان دینی درس گاہ قائم کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے فضا بھی ہموار کر لی، مگر اس
 سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔

آخری دور میں ہم لوگوں سے بہت بے تکلف ہو گئے تھے، قدمیانہ، جسم فریبہ، رنگ
 سیاہ اور آواز بھاری بھر کم تھی، نہایت خوش اخلاق اور کریم النفس عالم تھے، ۱۳۷۲ھ/
 ۱۹۵۲ء میں کٹڑے میں انتقال کیا، ان کی اولاد کراچی میں موجود ہے۔

مولوی حکیم محمد یسین نوادوی

مولوی حکیم محمد یسین بن حاجی محمد صدیق بن حاجی محمد اکبر، ساکن نوادہ نے ابتدائی تعلیم اپنے محلے میں حاصل کر کے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں مولانا نعمت اللہ اور مولانا شکر اللہ وغیرہ سے پڑھا، اس کے بعد مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں تعلیم حاصل کی۔ آخر میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں طب و حکمت کی مکمل تعلیم حاصل کی اور فراغت کے بعد نوادہ میں مطب جاری کیا اور تاحیات اسی مشغلے سے متعلق رہے، نہایت خوش اخلاق، ملنسار اور بامروت حکیم تھے، ۱۳۶۴ھ کے حدود میں نوادہ میں فوت ہوئے۔

استاذ الشعراء مولوی علیم اللہ خیالی مبارک پوری برہان پوری

مولوی منشی علیم اللہ صاحب خیالی مبارک پوری برہان پوری کا آبائی مکان ارچٹی کے پورب لال چوک کے پاس تھا، ان کے والد نے ۱۲۸۵ھ میں یہاں سے ترک وطن کر کے الہ آباد میں اقامت اختیار کی، پھر وہاں سے برہان پور چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ خیالی کا تذکرہ دو کتابوں میں ہے، ”خم خانہ جاوید“ مصنفہ لالہ سری رام دہلوی میں، جو بہت مختصر ہے اور ”سلک گہر“ مصنفہ جاوید انصاری برہان پوری میں جو مفصل ہے۔

”خم خانہ جاوید“ میں ہے کہ منشی علیم اللہ صاحب خیالی مبارک پوری شاگرد ہتر غازی پوری ۱۹۰۲ء کے ”نسیم دکن“ سے کلام منتخب ہوا، معمولی کہنے والوں میں سے ہیں، چند اشعار ان کے نتائج افکار سے درج کیے جاتے ہیں، اس کے بعد سات اشعار درج ہیں، جن میں تین اشعار ایک غزل کے ہیں، دو اشعار دوسری غزل کے ہیں اور ایک شعر کسی اور غزل کا ہے۔

(خم خانہ جاوید ج ۳ ص ۹۹)

یہ تذکرہ اس زمانے میں لکھا گیا ہے، جب خیالی کے کلام میں پختگی نہیں پیدا ہوئی تھی اور نہ ان کی شاعری کی شہرت عام ہوئی تھی، البتہ سلک گہر میں ان کا تذکرہ ان کے انتقال کے بعد لکھا گیا ہے اور ان کے وطن میں ان کے حلقہ شعر و ادب کی طرف سے لکھا گیا ہے، جسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

محمد علیم اللہ صاحب خیالی مرحوم برہان پور کے مایہ ناز شعراء میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، آپ کا آبائی وطن مبارک پور ضلع اعظم گڑھ ہے، مگر موصوف کی ولادت الہ آباد میں ہوئی، آپ کی پیدائش کا سال ۱۸۶۸ء (۱۲۸۵ھ) ہے، الہ آباد میں والدین کے زیر سایہ آٹھ سال تک پرورش پائی، نو سال کی عمر میں ان کے ہمراہ برہان پور تشریف لائے اور اس شہر کو مستقل وطن بنالیا۔

کتب صرف و نحو، فارسی و عربی کی تعلیم مولوی حافظ محمد فیض اللہ صاحب برہان پوری سے حاصل کی، اس کے علاوہ اخلاق و آداب، نظم و نثر اور انشاء کی کتابیں بھی مولانا نے موصوف سے پڑھیں، علم منطق اور فلسفہ بھی حاصل کیا، زمانہ طالب علمی میں شعر و سخن کی طرف رجوع ہوئے، اپنے فاضل استاذ مولانا فیض اللہ صاحب کے مشورے سے اپنا کلام ابوالکلام سید ذاکر حسین صاحب ہنر غازی پوری کو اصلاح کے لیے بھیجا، ہنر صاحب آفتاب الدولہ نواب ارشد علی خاں بہادر قلع لکھنوی کے مایہ ناز شاگرد تھے۔

ہنر صاحب کے فیض تربیت اور اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کی بنا پر بہت کم عرصے میں فن شعر و ادب پر کامل عبور حاصل کر لیا، ۱۹۱۳ء (۱۳۳۲ھ) میں جب حضرت ہنر غازی پوری برہان پور تشریف لائے تو ایک عظیم الشان مشاعرے میں حضرت خیالی کو شرف جانشینی سے سرفراز فرمایا، ۱۹۱۶ء (۱۳۳۵ھ) تک قدیم رنگ تغزل کی تقلید کرتے رہے، ۱۹۱۷ء میں طبیعت کا رجحان بدلا، مجموعہ غزلیات تلف کر دیا، جو حصہ موصوف کی غزلیات کا محفوظ رہ سکا، اس کے مطالعہ سے موصوف کے رنگ تغزل کا اندازہ ہوتا ہے۔

نہایت سلیس اور سادہ بیان میں نازک تشبیہات اور لطیف استعارات کے ساتھ مؤثر پیرائے میں خیالات کو نظم کرتے تھے، اپنی شاعری کے دوسرے دور میں واقعہ نگاری، اصلاحی، اخلاقی، قومی اور فلسفیانہ مضامین دلکش اور مؤثر انداز میں با محاورہ زبان میں نظم کرتے تھے۔

خیالی مرحوم نے ۱۹۳۷ء (۱۳۵۶ھ) میں خواجہ احمد حسین شاہ صاحب امر وہوی سے سلسلہ نقشبندیہ میں شرف بیعت حاصل کیا، جس کی وجہ سے آپ کے کلام پر رنگ تصوف غالب ہو گیا، ۱۹۳۹ء (۱۳۵۸ھ) میں خواجہ احمد حسین شاہ صاحب نے حضرت خیالی کے اکتاء اور زہد سے متاثر ہو کر اپنے سلسلے کے حق خلافت سے مشرف فرمایا، آپ صوفی مسلک اور ہر دلعزیز تھے۔

موصوف کی اُردو خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، صوبہ متوسط کے قابل فخر اساتذہ میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، وسط ہند اور دکن کے بڑے بڑے مشاعروں، ادبی اور سیاسی جلسوں میں مدعو کیے گئے، جہاں مشاہیر اہل فن سے تبادلہ خیالات کے مواقع ملتے رہے، تحت اللفظ نہایت مؤثر اور دلکش انداز میں پڑھتے تھے، برہان پور، خاندیس، بمبئی، برار اور دکن میں موصوف کے صد ہا تلامذہ ہیں۔

خیالی مرحوم ایک کام یاب مقرر بھی تھے، اکثر سیاسی جلسوں میں آپ کی مدد اور جامع تقریروں سے سکوت طاری ہو جاتا تھا، تحریک خلافت کے دور میں موصوف کی سیاسی خدمات یادگار ہیں، آپ کی سیاسی نظموں کا مختصر مجموعہ ”دورِ جدید“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے، موصوف کو نام و نمود اور شہرت پسندی سے گریز تھا، اسی وجہ سے کلام تشنہ اشاعت رہا اور ہندوستان کا ادبی طبقہ آپ کی علمی و ادبی خدمات کا صلہ نہ دے سکا۔

خیالی صاحب نے جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، موصوف کے مقامی

شاگردوں میں ہلالی، رضی، مہبی، شرر، حیرت، فاضل، فلسفی، ذکی، ناظر، مضطر اور شوکت وغیرہ اصحاب خصوصاً قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ آپ کے برادر خورد اور جانشین حشمت اللہ صاحب ریاضی بھی برہان پور میں ممتاز ہیں۔

۳۰ دسمبر ۱۹۴۴ء مطابق ۱۳ محرم ۱۳۶۴ھ کو ۴ بجے بزم شعرائے قدیم کی آخری شمع صرصر اجل سے خاموش ہو گئی، مرحوم کے دو فرزند کلیم اللہ اور حکیم اللہ تھے، خیالی صاحب کلیات نظم شائع نہ ہو سکا، ورنہ موصوف کا مجموعہ کلام اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہوتا۔ (سلک گہر ج ۱، ص ۱۸۷ تا ۱۹۰)

اس کے بعد خیالی مرحوم کا نمونہ کلام جو ہر صنف سخن میں شامل ہے، ص ۱۹۰ سے ۲۰۳ تک درج ہے۔

مولوی منشی غلام حسین عاشق مبارک پوری

مولوی منشی غلام حسین بن مولوی غلام عباس مبارک پوری اپنے والد کے ساتھ سمبھی ضلع اعظم گڑھ میں رہتے تھے، شاعری میں انھیں کے شاگرد تھے، ”خم خانہ جاوید“ لالہ سری رام دہلوی میں ان کا تذکرہ یوں درج ہے، عاشق منشی غلام حسین صاحب خلف اکبر و شاگرد مولوی غلام عباس صاحب متوطن سمبھی ضلع اعظم گڑھ۔

انھوں نے اپنے والد سے فارسی کی تحصیل کی، فن سخن میں بھی ان ہی سے استفادہ کیا ہے، شاعری کا اوائل عمر سے شوق ہے، متعدد رسالوں اور گلدستوں میں کلام شائع ہو چکا ہے، ۱۸۸۴ء (۱۳۰۲ھ) میں پیدا ہوئے، شعر کو سمجھ کے کہتے ہیں اور اچھا کہتے ہیں، اب کچھ معلوم نہیں، کلام یہ ہے:

نہیں گردوں پہ یہ مہ تاباں عکس ہے اس کے روئے انور کا

چشمِ بینا کے واسطے عاشق ایک رتبہ ہے سنگ و گوہر کا
 کل تو آنکھیں نہ لگیں شام سے تا صبح مری آج کیا حال کرے گی شب ہجراں میرا
 عجب انداز سے اس سنگدل نے اسکو توڑا تھا کہ نکلی شیشہ دل سے صدائے آفریں برسوں
 تیرے دامِ بلا دونوں رہے گیسو کی الفت میں مری جانِ حزیں برسوں دلِ اندوہ گیس برسوں
 رحمت حق سے تو محروم رہے گا واعظ بخشے جاتے ہیں وہی جو کہ خطا کرتے ہیں
 ابھی سے حشر کا عالم نظر آتا ہے آنکھوں میں

ہماری شامِ غم صبحِ قیامت ہونے والی ہے

(خیم خانہ جاوید ج ۵ ص ۵۲۵ و ۵۲۶)

حضرت مولانا محمد شعیب رسول پوریؒ

حضرت مولانا حکیم مفتی محمد شعیب بن عبدالعلیم بن شیخ باب اللہ رسول پوریؒ
 ۱۳۰۹ھ میں رسول پور میں پیدا ہوئے، اپنے والد کی سب سے بڑی اولاد تھے، علم و فضل
 کے گہوارے میں آنکھ کھولی۔

ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، نحو و صرف کی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد مدرسہ چشمہ
 رحمت غازی پور گئے، جہاں آپ کے والد ماجد مولانا عبدالعلیم رسول پوری، مولانا محمد فاروق
 صاحب چریا کوٹی، مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی اور مولانا محمد اسماعیل صاحب سے اکثر کتب
 درسیہ پڑھیں، اس کے بعد مدرسہ عالیہ رام پور میں مولانا عبدالحق خیر آبادی سے معقولات، فلسفہ،
 منطق، ریاضی، فقہ اور اصول فقہ، مولانا محمد طیب عرب کی سے تفسیر عربی، ادب و معانی و بیان،
 مولانا منور علی محدث رام پوری سے فقہ و اصول فقہ، بقیہ کتب احادیث اور مولانا حافظ وزیر احمد
 رام پوری سے بقیہ کتب ادب و معانی و بیان اور مولانا محمد امین کابلی سے تعلیم حاصل کی، مولانا

نے ان ہی دونوں درس گاہوں میں پوری تعلیم پاکر مدرسہ عالیہ سے سند فراغت پائی۔ اس وقت ان کے والد مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور کے مدرس اعلیٰ اور شہر مفتی اعظم تھے، مولانا بھی اسی درس گاہ سے منسلک ہو کر تعلیمی و تدریسی خدمات انجام دینے لگے، یہاں تک کہ ۱۳۴۰ھ میں ان کے والد غازی پور اور بنارس کے درمیان ریل کے حادثے میں شہید ہو گئے تو بیٹے نے باپ کی جگہ سنبھالی، اس کے بعد ۱۳۵۸ھ تک مدرسہ کے پرنسپل اور صدر مدرس اور شہر مفتی اعظم رہے، مشرقی دیار کی جس مشہور درس گاہ میں مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی، مولانا عبداللہ منوی غازی پوری، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا عبدالاحد شمشاد لکھنوی اور مولانا عبدالعلیم رسول پوری جیسے اساطین علم و فن اور سرآمدگان روزگار نے اپنے اپنے وقت میں علمی و دینی غلغلہ پیدا کیا تھا، اسی میں مولانا محمد شعیب صاحب نے بھی پینتالیس سال تک مدرسہ، صدر مدرس اور مفتی شہر کے مناصب پر رہ کر زیادہ سے زیادہ خدمت کی۔

اس مدت میں ہزاروں طلبہ نے ان سے فیض پایا اور سینکڑوں علماء ان کی محفل درس سے پیدا ہوئے، جن میں مولانا مفتی عبدالقادر فرنگی محلی، مولانا عبید اللہ بلیاوی (تبلیغی جماعت) مولانا محمد حسن صدیقی رحمتی غازی پوری، مولانا ابوالوفاء نسیمی غازی پوری، مولانا جمیل احمد رحمتی، مولانا حافظ شمس الہدیٰ رحمتی، مولانا شیخ محمد رحمتی غازی پوری، کلیم غازی پوری، خاموش غازی پوری، مولانا ہارون رشید رہبر صدیقی در بھنگوی جیسے مشاہیر علم و فن شامل ہیں۔

ان کے علاوہ یوپی، بہار اور بنگال وغیرہ کے صد ہا طلبہ نے آپ سے کسب فیض کیا ہے، فقہ حنفی اور افتاء میں تبحر اپنے والد سے وراثت میں پایا تھا، فقہی جزئیات پر نظر بڑی وسیع تھی، ہر علم و فن کی کتابیں پڑھاتے تھے، مدرسہ کے علاوہ اپنی قیام گاہ پر صبح و شام طلبہ کو حدیث اور تفسیر کا درس دیتے تھے، رات کو عموماً ایک بجے تک مطالعہ اور فتویٰ نویسی میں مصروف رہتے تھے، دنیاوی معاملات سے یکسو تھے، سیاسیات سے دور کا واسطہ نہیں رکھتے

تھے، بل کہ وہ ہمہ تن علم و عمل اور زہد و تقویٰ تھے۔

ہر مکتب اور ہر خیال کے علماء اور عوام ان سے عقیدت و محبت رکھتے تھے اور وہ سب کے ساتھ اخلاق کریمانہ سے پیش آتے تھے، مہمان نوازی اور دروازے پر آنے والوں کی خاطر و مدارات خاندانی روایات کے مطابق غازی پور میں بھی کرتے تھے، اکثر ان کے یہاں کوئی نہ کوئی مہمان رہتا تھا، پچاس سال تک غازی پور میں مخدوم کی حیثیت سے رہے، مگر اپنے کو خادم بنا کر رکھا، مولانا کو اپنے علم پر بڑا اعتماد تھا، مگر کسی کے سامنے اپنی بڑائی نہیں ظاہر کرتے تھے، مجھ جیسے اپنے چھوٹے عزیز کو خط لکھتے تو آپ سے خطاب کرتے اور پورے خط سے معلوم ہوتا تھا کہ اپنے کسی بڑے اور محترم کو خط لکھ رہے ہیں۔

ان کا وعظ بہت ہی دل نشین اور سلف صالحین کے انداز کا ہوتا تھا، ادبیت و لفاظی کے تکلفات سے دور رہ کر سیدھا سادا وعظ فرماتے تھے، میں نے بچپن میں ان کا وعظ جامع مسجد راجہ صاحب میں سنا ہے، جس میں سورہ ”الہکمہ التکاثر“ کی تفسیر بیان کی تھی اور دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی تیاری پر تقریباً دو گھنٹے تک وعظ بیان کیا تھا۔

طب و حکمت ان کے گھر کا فن تھا، طبابت بھی کرتے تھے، عموماً صبح کو مریضوں کو دیکھا کرتے تھے، وضعداری، سادگی اور تواضع و انکساری میں اپنے خاندان میں سب سے جدا تھے، اس وقت ان کو دیکھ کر کوئی شخص ان کو عالم نہیں سمجھ سکتا تھا۔

ان کی کسی مستقل تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، البتہ فتاویٰ کئی ہزار کی تعداد میں لکھے ہیں، اگر ان کو مرتب کر کے شائع کیا جائے تو کئی جلدوں میں دینی اور فقہی معلومات کا بیش بہا اور مستند ذخیرہ بن سکتا ہے، آخر زمانہ میں غازی پور میں زیادہ رہنے لگے تھے، گھر پر تشریف لاتے تو مدرسہ کی ضروریات کی وجہ سے جلد ہی واپس چلے جاتے تھے۔

ضعف و کمزوری کا دور تھا، مگر مدرسہ کی فکر میں گھر پر چین سے نہیں بیٹھتے تھے،

آخری بار شروع شعبان ۱۳۸۵ھ میں گھر آئے تھے اور چند دن بال بچوں میں رہ کر واپس ہونے کا ارادہ کر رہے تھے، جس دن صبح کو غازی پور جانے والے تھے، دو چار دست آئے اور دس بجے دن میں انتقال فرما گئے، چند گھنٹہ بیمار رہے اور یک شنبہ ۱۸ شعبان ۱۳۸۵ھ/ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۵ء کو فوت ہو گئے اور اسی دن آبائی قبرستان میں اپنے چچا مولانا احمد حسین صاحب کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

حضرت مولانا عبدالباقی رسول پوریؒ

حضرت مولانا عبدالباقی بن مولانا عبدالعظیم بن شیخ باب اللہ رسول پوری مبارک پوری، ۱۳۰۰ھ کے حدود میں رسول پور میں پیدا ہوئے، غالباً اپنے والد کی آخری اولاد تھے، گھر کا ماحول دینی و علمی تھا، ابتدائی تعلیم گھر اور محلہ میں حاصل کر کے مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں داخل ہوئے، جہاں آپ کے والد ماجد مدرس و مفتی تھے، اپنے والد کے علاوہ مدرسہ کے دوسرے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، مشکوٰۃ شریف کے چند اسباق مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے بھی پڑھے، جو ان دنوں مدرسہ چشمہ رحمت کے مشہور اساتذہ میں تھے۔

اس کے بعد عربی کی تعلیم بند کر کے انگریزی تعلیم حاصل کی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے عربی میں ایم۔ اے۔ کر کے وہیں عربی کے پروفیسر ہوئے، کچھ دنوں کے بعد ایل۔ ایل۔ بی۔ کی ڈگری حاصل کی اور اعظم گڑھ ججی میں وکالت شروع کی، جو آخری دم تک جاری رہی۔

عربی ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے، فقہ و فتویٰ اور تفسیر میں خصوصی شہرت رکھتے تھے، وکالت کے پیشہ کے ساتھ مولویت اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ باقی رکھی، تفسیر و فقہ کا مطالعہ ہمیشہ جاری رکھتے تھے، فتویٰ نویسی بھی کرتے تھے، سادگی حد سے زیادہ ہی تھی،

خوردونوش، لباس اور رہنے سہنے میں انتہائی بے تکلفی اور سادگی تھی، اسی کے ساتھ رفاہی اور دینی کاموں میں پیش پیش رہا کرتے تھے، ان کا احترام سرکاری حکام اور وکلاء تک کرتے تھے، کچہری کی مسجد کے امام تھے۔

شہر اعظم گڑھ میں متعدد مساجد کی مرمت و توسیع کرائی، مسلم مسافر خانہ کی تعمیر میں مزید بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مبارک پور انٹر کالج ان ہی کی توجہ سے جاری ہوا اور آخر تک اس کی ترقی کے لیے کوشاں رہے، مدرسۃ الرشاد اعظم گڑھ کے طلبہ کو اپنے گھر بلا کر ہدایہ کی تعلیم دیتے تھے، اعظم گڑھ ہوں یا رسول پور ہر وقت کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف رہا کرتے تھے، ان کی مجلس خالص علمی اور دینی ہوتی تھی۔

تذکرہ علمائے مبارک پور کے لیے بیش بہا معلومات فراہم کیں، راقم الحروف کے ماموں ہوتے تھے اور بہت زیادہ لحاظ کرتے تھے، وکالت کے پیشہ کے بعد زندگی بھر فقیرانہ زندگی بسر کی اور جو کچھ ملا خود رکھی پھینکی زندگی بسر کر کے خاندان کے طلبہ پر خرچ کیا، علمی و دینی معاملات میں ہمیشہ تحقیق و تدقیق میں لگے رہتے تھے۔

”ریا الرضب شرح لامیۃ العرب“ کے نام سے عربی زبان میں مشہور جاہلی شاعر شنفری کے قصیدہ لامیۃ کی شرح لکھی، جو ان کے ادب عربی کے اعلیٰ ذوق کا نمونہ ہے، یہ شرح ۱۳۲۸ھ میں لکھی اور ۱۳۳۱ء میں اکیلی پریس رسترا میں ۲۶ صفحات پر چھپی ہے، تقریباً ۷۰ اشعار کی شرح ہے، پہلے عل لغات ہے پھر عربی میں ترجمہ ہے، اس کی ابتداء یوں ہے:

”الحمد لله المنعم الناهر، الهادی الفاجر، القادر القاهر،

العالم نعمائہ کل بَرّ وفاجر، الشامل رحمته کل شاکر وکافر،

والصلوة علی الصفی الطاهر، المسک الذاکر، نبیہ المنذر

.....

الخابر عن خطيرة القدس والهنابر، محمد کابر عن کابر،
وعلى اله أصحابه، المقيى راس الحائر البائر، النجوم للنظر،
اما بعد فيقول العائد بالله تعالى عبد الباقي الاعظمي المبارك
فوري ابن العلامة الجموم الذي لا تكدر العلاء، والخضم
الذي لا يشينه جزر الماء والحر البارع والزكى القارع مولانا
ابى الامجد محمد عبد العليم أبقاه الله وأجزل عليه نعمائه
هذا شرح موجز على لامية شمس بن مالك الملقب
بالشنفرى، حثنى عليه متواردها فلم أُل في تسهيلها وضربت
صفحاً عما لا يجدى وسيتته رياً الرضب شرح لامية العرب“.
آخر میں یہ عبارت ہے:

”قال مؤلفه فرغت من هذا الشرح في سنة ألف وثلث
مأته وثمانين وعشرين من الهجرة“۔
اس قصیدہ کی ابتدا اس شعر سے ہے:

أقيموا بنى امى صدور مطيكم
فانى الى قوم سواكم لاميل

۴/رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ مطابق ۳۱/اگست ۱۹۷۶ء کو ساڑھے آٹھ بجے دن
میں اعظم گڑھ اپنے مکان میں انتقال کیا اور ۴/بجے دن میں اپنے وطن رسول پور کے آبائی
قبرستان میں دفن کیے گئے، اس دن راقم اعظم گڑھ گیا تھا، پہنچنے پر انتقال کی خبر ملی اور مکان پر
گیا، پھر رسول پور میں جنازہ اور تدفین میں شریک رہا۔

حضرت مولانا عبدالصمد حسین آبادی

حضرت مولانا عبدالصمد بن شیخ محمد اکبر بن شیخ محمد علی بن شیخ مومن بن شیخ فقیر اللہ،
رمضان ۱۳۲۲ھ میں حسین آباد میں پیدا ہوئے، جو مبارک پور کے شمال میں ایک میل پر
مسلمانوں کی مشہور بستی ہے۔

ایام طفولیت میں قرآن مجید اپنے دادا شیخ محمد علی سے پڑھنا شروع کیا، دو تین
پارے پڑھے ہوں گے کہ شیخ محمد علی کو کسی معاملہ میں جیل بھیج دیا گیا، اس کے بعد مولوی احمد
علی برادر خور مولانا عبدالسلام مبارک پوری سے پڑھ کر قرآن ختم کیا، نیز اردو اور فارسی کی
تعلیم ان سے حاصل کر کے مدرسہ دارالتعلیم میں داخل ہوئے اور مولانا حکیم محمد اصغر صاحب
سے فارسی کی تکمیل کی اور ان ہی سے فصول اکبری، شرح تہذیب اور شرح جامی وغیرہ پڑھیں
اور مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری سے شرح وقایہ جلد اول، بلوغ المرام، مشکوٰۃ،
جلالین، پارہ اول، سراجی اور قطبی کی تعلیم حاصل کر کے مدرسہ عالیہ منو میں مولانا عبدالسلام
مبارک پوری سے جلالین، شرح وقایہ جلد ثانی، نفحۃ الیمن، شرح نخبۃ الفکر، میر قطبی پڑھی اور
۱۳۳۸ھ میں مدرسہ حضرت میاں صاحب پھانک حبش خاں دہلی میں مولانا شرف الدین
دہلوی سے مختصر المعانی، دیوان متنبی، میرزاہد، ملا جلال، ملا حسن، ترمذی شریف، نسائی شریف
وغیرہ پڑھی، اس درمیان میں سیالکوٹ میں مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی اور دیگر اساتذہ سے
ملاحسن، مختصر المعانی، میبذی اور مقامات حریری وغیرہ پڑھا، مگر سیالکوٹ میں صرف دو تین ماہ
قیام رہا اور وہاں سے دہلی آ کر مولانا شرف الدین صاحب سے ان کتابوں کی تکمیل کی۔

تحصیل و تکمیل کے بعد تعلیم و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور مدرسہ اسلامیہ بڑا

(بہار)، مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور، مدرسہ احمدیہ سلفیہ درجہ نگاہ اور مدرسہ محمدیہ دیوریہ میں مدتوں تعلیمی و تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد تصنیف و تالیف میں لگ گئے۔

مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری نزول الماء کی بیماری کی وجہ سے ”تحفۃ الاحوذی“ کی آخری دونوں جلدوں کی تہیض نہیں فرما سکے تھے، اس لیے اہل علم کی ایک جماعت کو اس کام میں شریک کیا، جس میں مولانا عبدالصمد صاحب اپنے ذوق و شوق اور علم و استعداد کے اعتبار سے نمایاں تھے، چنانچہ مسلسل تین سال تک مولانا موصوف کی خدمت میں رہ کر ان کی نگرانی میں یہ خدمت انجام دی، جس کی وجہ سے ان کو احادیث و رجال میں اچھی خاصی نظر پیدا ہوگئی اور علمی اور تحقیقی میدان میں کام کا سلیقہ آگیا۔

مولانا نہایت ذی استعداد عالم و مدرس تھے، نیکی و شرافت کا نمونہ اور حلم و صبر کا مجسمہ تھے، ان کی زندگی سلف صالحین کا پرتو معلوم ہوتی تھی، کثرت مطالعہ کی وجہ سے بینائی کمزور ہوگئی تھی، مگر مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں لگے رہتے تھے، وہ کامیاب مصنف و مؤلف، نہایت اچھے مضمون نگار اور انشاء پرداز تھے، مختلف جرائد و مجلات میں ان کے علمی و تحقیقی مضامین و مقالات شائع ہوتے تھے، جن کو جمع کیا جائے تو اچھی خاصی کتاب بن سکتی ہے، مولانا مبارک پور کے علمائے مصنفین میں سے تھے اور تصنیف و تالیف کا نہایت اچھا ذوق رکھتے تھے، ان کے ذوق تصنیف اور حدیث و رجال میں وقت نظر کی شہادت کے لیے یہی کافی ہے کہ مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری کے وصال کے بعد مقدمہ تحفۃ الاحوذی کی منتشر یادداشتوں اور نامکمل مباحث کے ابواب و فصول کو مولانا نے مکمل کیا اور اس اہم کتاب کو نہایت سلیقہ مندی اور علمی تحقیق و کاوش سے یوں مرتب و مدون کیا کہ وہ ہر اعتبار سے مکمل ہوگئی۔

مولانا نے کئی کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے اکثر افسوس کہ شائع نہ ہو سکیں، ان

کے نام یہ ہیں:

- (۱) ”تائیدِ حدیث بجوابِ تنقیدِ حدیث“: یہ کتاب مولوی اسلم جیراج پوری منکرِ حدیث کی تلبیسات و فتن کے رد میں ہے۔
- (۲) ”شرفِ حدیث“: اس کتاب میں بھی مولوی اسلم جیراج پوری منکرِ حدیث کے ان مضامین کا رد ہے، جو ”طلوعِ اسلام“ نامی پرچے میں چھپے تھے۔
- (۳) ”شانِ حدیث“: مولانا کی تصانیف میں منکرِ حدیث کے رد میں سب سے اہم کتاب ہے، ان تینوں کتابوں کے مضامین اخبار ”اہلِ حدیث“، امرتسر میں پچاس پچپن قسطوں میں شائع ہوئے، باقی قسطیں شائع نہ ہو سکیں۔
- (۴) ”الفتوحات الربانیہ“: تاریخِ وہابیہ کے رد میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اور چھپ چکی ہے۔
- (۵) ”تذکرۃ الاخوان بمنع شرب الدخان“: اس میں حقہ وغیرہ کی ممانعت ہے۔
- (۶) ”ذم غناور در قص و سرود“: ناچ اور گانے بجانے کی حرمت میں۔
- (۷) ”خطبات السنۃ“
- (۸) ”احوال الصحابہ“
- (۹) ”شرح سنن ابن ماجہ“: اس میں سنن ابن ماجہ کے ابتدائی اجزاء کی شرح تحفۃ الاحوذی کے انداز میں ہے۔
- (۱۰) ”رسالہ مختصر بابت رفع یدین“
- (۱۱) ”التبیان لما یجب معرفۃ علی اهل الایمان“: یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔

(۱۲) ”حق پرستی، بجوابِ شخصیت پرستی“: یہ بھی منکرینِ حدیث کے رد میں ہے۔

(۱۳) ”ترجمہ رسالہ عبودیت امام ابن تیمیہ“

(۱۴) ”ترجمہ رسالہ ابن تیمیہ“: اس کا کوئی نام نہیں ہے۔

(۱۵) ”چہل حدیث“: مع ترجمہ

(۱۶) ”ترجمہ حصن حصین“: (ناقص)

(۱۷) ”رسالہ مختصر بابت تحقیقِ مسننہ“

(۱۸) ”فقہ حنفی پر ایک نظر“

افسوس کہ مولانا کی عمر نے وفانہ کی ورنہ وہ ہندوستان کے مشاہیر علماء کی صف میں ہوتے اور ان کے علمی و دینی کارناموں سے بڑا فائدہ پہنچتا۔

ان کی وفات ۱۴ ربیع الاول ۱۳۶۷ھ / ۲۶ جنوری ۱۹۴۸ء یومِ دو شنبہ دس بجے رات میں ہوئی اور دوسرے دن حسین آباد کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے، رحمۃ اللہ علیہ، مولانا نے وصال سے پہلے اپنے ہاتھ سے چند باتیں تحریر فرمائی تھیں، جن سے ان کے تقویٰ و طہارت، شرافتِ نفس اور تعلق باللہ کا پتہ چلتا ہے۔

”شکریہ“ کے عنوان سے یہ مضمون لکھا:

”میں جناب محی مولوی حکیم محمد بشیر صاحب اور جناب حکیم عبدالسمیع صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میرے علاج میں کافی توجہ کی اور مفید نسخے تجویز کیے، کسی نسخہ سے کوئی ضرر نہیں ہوا، لیکن دوا تو مرض کے لیے ہے، موت کی دوا کسی کے پاس نہیں اور کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کا کلام صادق ہے، اللہ تعالیٰ ان دونوں کو دنیا و آخرت میں ترقی عطا فرمائے۔ عبد الصمد غفرلہ ۲۴ صفر ۱۳۷۷ھ۔“

اور یہ وصیتیں تحریر کیں:

وصیت اول: ”اگر حالات سازگار ہوں اور تعمیر مسجد کا کام جاری ہو تو ہمارے کتب خانے کی کتاب فتح الباری کامل فروخت کر کے اس کا کل روپیہ تعمیر مسجد پر صرف کیا جائے، اس میں کوئی رد و بدل نہ کیا جائے۔“

وصیت دوم: ”بقیہ کتب عربیہ کی اگر پوری حفاظت ہو سکے تو رکھی جائیں اور خدا کرے گھر میں کوئی صالح اور سعید ذی علم پیدا ہو تو اس سے منتفع ہو، اگر اس کی امید نظر نہ آئے تو حسب مشورہ شیخ حدیث عمل درآمد کیا جائے اور کتابوں کی حفاظت کی جو شکل ہو، اختیار کی جائے۔“

وصیت سوم: ”وفات کے بعد تجہیز و تکفین میں جلدی کی جائے اور نماز جنازہ شیخ حدیث صاحب پڑھائیں اور بعد دفن قبر پر دیر تک دعاء کریں اور حتی الامکان کوئی بے نمازی جنازہ نہ اٹھائے، نہ لے چلے۔“

وصیت چہارم: ”میری قبر حتی الوسع جدا مجر نور اللہ مرقدہ کی قبر کے قریب کھدائی جائے، قبر کی جگہ لوگوں کو غالباً یاد ہوگی، اس کی بابت جہاں تک ممکن ہو، تحقیق و تفتیش میں سعی کی جائے۔“ المرقوم ۱۳/صفر

ان وصایا کے حرف حرف سے خدا ترسی و خوفِ آخرت کا ظہور ہوتا ہے اور یہ کہ مولانا مرحوم واقعی با خدا بزرگ تھے۔

حضرت مولانا محمد یحییٰ رسول پوریؒ

حضرت مولانا حکیم ابوالاؤفی محمد یحییٰ بن مولانا احمد حسین بن شیخ باب اللہ، راقم کے

ماموں ہیں، ۱۳۲۸ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل کی، پھر مدرسہ احياء العلوم مبارک پور میں داخل کیے گئے اور مولانا شکر اللہ صاحب، مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری وغیرہ سے عربی کی کتابیں قدوری تک پڑھیں، اس وقت ان کے والد ماجد ڈھاکہ میں مدرسے تھے۔

ان کے ساتھ ڈھاکہ گئے اور متوسطات تک کی تعلیم ان سے اور دوسرے اساتذہ سے حاصل کی، پھر مدرسۃ الشریعہ سنبھل، اس کے بعد مدرسہ اسلامیہ امر وہہ میں داخل ہوئے اور وہیں مولانا انوار الحق صاحب امر وہہ اور دیگر اساتذہ سے پڑھ کر سند فراغت پائی، امر وہہ میں طب و حکمت کی تعلیم مولانا حکیم محمد اسماعیل عباسی سے حاصل کی، اس کے بعد دارالمبلغین لکھنؤ میں مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنؤی سے پڑھا۔

اسی درمیان میں انگریزی معمولی طریقے پر سیکھی، نہایت ذہین، طباع اور صاحب استعداد عالم تھے، علوم عقلیہ و نقلیہ میں مہارت رکھتے تھے، معقولات میں منطق، فلسفہ، ہیئت، ریاضی، مناظر، مرایا، اکر، اسطرلاب کے جامع تھے، علم ہیئت اور فلکیات میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، اس دیار میں یہ فن ان پر ختم ہو گیا۔

استعداد اور جود طبع کا یہ حال تھا کہ مشکل سے مشکل عبارت پڑھتے ہی اس کے معانی و مطالب کی تہ تک پہنچ جاتے تھے، فقہ، تفسیر، حدیث و معانی، بلاغت اور عربی ادب میں پوری مہارت رکھتے تھے، عربی کے اچھے شاعر تھے، وہ حقیقی معنی میں جامع المعقول و المنقول تھے اور جملہ علوم مروجہ میں متخصص معلوم ہوتے تھے۔

مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور، عربی کالج رائیدرگ آندھرا اور مدرسہ احياء العلوم مبارک پور میں مدتوں تدریسی خدمات انجام دیں اور ہر مدرسہ میں ہر فن کی اونچی کتابیں

پڑھاتے رہے، قیامِ غازی پور کے زمانے میں حج محمد علی صاحب کوالاتقان فی علوم القرآن پڑھائی، حج صاحب محمد آباد کے رہنے والے تھے اور تاحیات استاد کی نسبت کا احترام کرتے رہے، طلبہ پر زور دے کر حتی الامکان ان ہی سے مطلب حل کراتے تھے۔

طالب علموں پر بہت ہی شفیق تھے اور اس بارے میں خاندانی روایات کو پوری طرح باقی رکھا، سادگی اور بے تکلفی ان کے لباس اور وضع قطع سے ظاہر ہوتی تھی، بچوں میں بچے اور بڑوں میں بڑے تھے، بہت جلد خفا ہو جاتے اور اس سے جلد راضی ہو جاتے، ہر مجلس میں خود کوئی علمی اور معلوماتی بات نکال دیتے اور ایک ایک موضوع پر گھنٹوں معلومات بہم پہنچاتے، طلبہ ان سے راضی اور وہ طلبہ سے راضی تھے اور جن لوگوں سے ان کی دوستی تھی، ان سے انتہائی تعلق تھا اور دوستی سے گزر کر عزیزانہ مراسم جاری تھے۔

جو بات سامنے آ جاتی، اس کی تہ تک پہنچنا ان کے لیے ضروری تھا، علمی وقار کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اس بارے میں علمائے رسول پور کی پوری نمائندگی کرتے تھے، ان کو اپنے علم پر بڑا اعتماد تھا، سادگی انتہائی درجہ کو پہنچی تھی اور اس بارے میں وہ خاص شہرت رکھتے تھے، جو بات چھڑ جاتی، اسے پایہ تکمیل تک پہنچانا ضروری تھا۔

ان کے کئی ایسے واقعات ہیں کہ عشاء کے بعد کوئی بات شروع کی تو صبح ہو گئی، مگر بات ادھوری رہی، ان کے دوست، احباب کبھی کبھی ان کو خاص طور سے دعوت دے کر اپنے یہاں بلاتے تھے اور ان سے معلومات حاصل کرتے تھے، ہر کام اپنے معیار و مزاج کے مطابق کرتے تھے، اس بارے میں دوسرے کا لحاظ نہیں کرتے تھے، جلد بازی ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں تھی، اپنی ہر چیز اپنے ذوق کے مطابق نہایت سلیقہ سے بناتے اور رکھتے تھے اور اس میں ذرا بھی فرق نہیں آنے دیتے تھے۔

جس مجلس میں مولانا محمد یحییٰ صاحب کا نام آجاتا، ان کے واقعات موضوع سخن بن جاتے تھے اور لوگ ان سے متعلق اپنے اپنے واقعات و تجربات بیان کرنے لگتے، آج بھی جب ان کا نام آجاتا ہے تو ان کے کئی واقعات سنے سنائے جاتے ہیں، وہ واقعی یادگار زمانہ تھے، انھوں نے تدریس و تعلیم کے ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا، ان کے کئی علمی و تحقیقی مقالات و مضامین جرائد و مجلات میں چھپ چکے ہیں، ان کی چند تصانیف یہ ہیں:

(۱) ”عمدہ شرح زبدہ“: صرف کے مشہور فارسی متن زبدہ کی اردو میں شرح ہے، جسے مولانا نے طالب علمی کے زمانے میں ڈھاکہ میں لکھا تھا، رفہ عام پریس گورکھپور میں چھپی ہے۔

(۲) ”تحقیق رویت ہلال و اختلاف مطالع“: اس رسالہ میں رویت ہلال، قبل زوال و بعد زوال، مشکلات قمریہ، کسوف، خسوف، اختلاف رویت اور اختلاف مطالع وغیرہ کا ذکر ہے، اس کا انداز بیان نہایت سلیجھا ہوا ہے، اعظم گڑھ کو مرکز قرار دے کر مشرق و مغرب کی رویت ہلال اور اختلاف مطالع پر جامع بحث کی ہے اور اس اہم اور اداق بحث کو نہایت سہل انداز میں سمجھایا ہے، یہ پورا رسالہ فتاویٰ ثنائیہ جلد اول میں چھپا ہوا ہے، نیز رسالہ ”البلاغ“ بمبئی اور اخبار ”اہل حدیث“ دہلی میں چھپا ہے۔

(۳) ”شرح سبعہ معلقہ“: عربی نامکمل غیر مطبوعہ۔

(۴) ”دائمی جنتری“: ایک نقشہ ہے، جس سے قمری اور شمسی سالوں اور مہینوں کی تاریخیں معلوم ہوتی ہیں۔

(۵) ”دائمی نقشہ اوقات نماز“: اسے بڑی کاوش سے کئی سال کی محنت

شاقہ کے بعد مرتب کیا ہے اور اس سے علم ہیئت و فلکیات میں ان کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔
ان کے علاوہ ان کے کئی علمی اور تاریخی مضامین رسالہ ”البلاغ“ وغیرہ میں شائع

ہوئے ہیں۔

نیز ان کے عربی کے کئی قصائد ہیں، جن میں سے بعض مطبوعہ ہیں، کوکن کی ایک جامع مسجد کے لیے عربی میں کئی اشعار کا نہایت شان دار قصیدہ لکھا ہے، جو چھپ چکا ہے، منظوم تاریخ گوئی میں ملکہ حاصل تھا:

”منظومة تاريخية في جامع مهسلة“

جزى الله رب الناس خير جزائه أنا سَابَنُوا فضلاً من الله مسجدا
لهم مثله بيت من الله في الجنان قال رسول الله ذلك وارشدا
وذاك بياهم أنفقوا خالصاً له فله در المخلصين مؤيدا
فطوبى لأرباب مهسلة كلهم فانهم خروا الى الله سُجّداً
من الاطهر القاضى الفقير افتتاحه ويرجو اله الخلق غفراً مجددا
وأرخ يحيى الأعظمي اختتامه
برحمتك اللهم ابدعت معبداً

۱۳۷۰ھ

دسمبر ۱۹۵۵ء میں جلالتہ الملک سعود الاول ہندوستان تشریف لائے تھے اور ان کی بمبئی میں تشریف آوری کے موقع پر رسالہ ”البلاغ“ کا خاص ”ملک سعود“ نمبر نکالا گیا تھا، جس میں ملک کے علماء و فضلاء نے جلالتہ الملک مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا تھا، مولانا نے ”البلاغ“ میں یہ قصیدہ لکھا تھا:

ألا يا أيها القوم الكرام اتأنا الا وحد الملك الهام
تفضل بالقدوم بلاد هند فضاء الجو وانصرف الظلام

فليس الابتهاج لنا وحيداً بل ابتهاج الليالي والايام
 هوا السلطان ظل الله في الارض من يرضاه يرضيه السلام
 هو الملك المعظم ذو جلالٍ واقدارٍ يُرَجِّبُهُ الارام
 محامده كثير ليس يحصى مكارمه رفيع الايرام
 له جود و افضال ويبقى تاثره مفاخره العظام
 له سيف فلول لليتامى وللاعدا والحساد حسام
 وقد سعد النجوم بسعد خطه سعد سعده وله الدوام
 وكيف هو المسى بالسعود تسعدنا به وهو المرام
 فيا ضيف بجليل فاقد الند على لك صلوة ربى والسلام
 وندعوه لكم بدوام ملك

وسلطان وخير ما الغمام

طبابت و حکمت خاندانی فن تھا اور اسے مستقل طور سے حاصل کیا تھا، ان کے والد مرحوم کی بیاضیں اور نسخہ جات تھے، ان سے بھی کام لیتے تھے، ایک زمانے میں مطب جاری کیا تھا اور مبارک پور بازار میں ”احمدی دواخانہ“ کے نام سے دواؤں کی دکان بھی رکھی تھی، ہومیو پیتھک علاج بھی کرتے تھے، علم الادویہ سے اچھی طرح واقف تھے۔

فن تجلید کے بھی ماہر تھے اور نہایت عمدہ، پائیدار اور دیدہ زیب جلدیں بناتے تھے، اپنے کتب خانے کی کئی سو کتابوں کی جلد بندی خود ہی اپنے ذوق کے مطابق کی تھی، جس میں تمام فنی خوبیاں اور نزاکتیں پائی جاتی تھیں۔

سل اور دق کے مریض تھے، علاج اور پرہیز دونوں میں شدید پابندی کرتے تھے،

مدرسہ احیاء العلوم کے مدرس تھے، آخری ایام میں دن میں ہمارے یہاں رہ جاتے اور شام کو گھر چلے جاتے تھے، ایک دن شام کو گھر جاتے ہوئے طبیعت کچھ نڈھال معلوم ہوئی تو اپنے معالج خاص مولانا حکیم محمد صابر خاں صاحب ندوی کے مشورہ سے اس دن مدرسہ ہی میں رہ گئے، دوسرے دن بھی نہ جاسکے اور تیسرے دن دوشنبہ ۱۱/ صفر ۱۳۸۷ھ / ۲۲/ مئی ۱۹۶۷ء کو صبح چار بجے بمرض سہل مدرسہ احیاء العلوم میں انتقال فرما گئے اور سورج نکلنے سے طلبہ و مدرسین کے کاندھوں پر رسول پور پہنچائے گئے اور اسی دن اپنے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

آپ کے والد ماجد کا انتقال بھی اسی طرح گھر سے دور عظمت گڑھ میں ہوا اور وہاں سے لا کر رسول پور میں دفن کیے گئے، باپ اور بیٹے دونوں کے دنیا سے جانے کی ادا ایک ہی قسم کی ہے۔ رحمۃ اللہ علیہما

مولوی ممتاز علی سریانویؒ

مولوی ممتاز علی بن حافظ نظام الدین بن شیخ عبدالوہاب سریانوی نے نحو و صرف کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھ کر مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں مولانا عبدالعلیم رسول پوری وغیرہ سے تعلیم حاصل کی۔

اس کے بعد لاہور کے کسی مدرسہ میں داخل ہو کر مروجہ علوم و فنون کی تکمیل کی، اسی جگہ کسی بنگالی یا بہاری طالب علم سے دوستی ہو گئی اور دونوں نے آپس میں مشورہ کر لیا کہ ہم لوگ فراغت کے بعد ایک ہی ساتھ رہیں گے، چنانچہ مولوی ممتاز علی فراغت کے بعد ادھر ہی سے پورنہ چلے گئے اور گھر کے لوگوں کو اپنی خبر نہیں دی۔

پھر بنگال میں چائے کے ایک باغ میں ملازمت کر لی، اس کے بعد اسی علاقے

میں مختلف مدرسوں اور اسکولوں میں مدرسہ کرتے رہے، مفقود الخبری کے چند سال بعد خود بخود گھر آئے اور کچھ دن یہاں رہے، پھر بیوی کو ساتھ لے گئے اور پورنیہ میں مستقل بود و باش اختیار کر لی اور وہیں پہلی بیوی کے انتقال پر دو شادیاں کر لیں، بعد میں جب سریاں آتے جاتے تھے تو دونوں بیویاں ساتھ ہوتی تھیں، وہ بھی اپنے والد ماجد کی طرح سیدھے سادے اور بے تکلف آدمی تھے، علم الفرائض پر آخر تک پورا عبور حاصل تھا اور فقہی جزئیات بھی مستحضر تھیں، ایک مرتبہ مجھ سے مسیح رقبہ کے بارے میں امتحان لیتے ہوئے کہنے لگے کہ سنن ابوداؤد میں اس سلسلہ میں ایک حدیث ہے، عمر کے آخری سالوں میں سریاں آتے جاتے تھے، میری والدہ مرحومہ کے حقیقی ماموں تھے، اس لیے ہمارے گھر ان کا آنا جانا بہت تھا اور نانی مرحومہ تو ان کی بڑی بہن ہی تھیں، بعد میں دیناج پور مغربی بنگال میں زمین و جائیداد خرید کر وہیں آباد ہو گئے، ان کی اولاد وہاں آج بھی موجود ہے۔

ایک مرتبہ دیناج پور سے دارجلنگ جاتے ہوئے اپنی بڑی بیوی سے کہا کہ ہمارے خاندان میں مرنے والوں کو اکثر باہر ہی موت آئی ہے، میں بوڑھا ہو چکا ہوں، ممکن ہے میرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہو۔

خدا کی شان کہ دارجلنگ جا کر بیمار پڑے اور وہیں جمعرات ۶ جنوری ۱۹۴۳ء / ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ کو ان کا انتقال ہوا، اس وقت ان کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ رہی ہوگی، ان کے والد حافظ نظام الدین صاحب بھی آخری سفر میں سب لوگوں سے مل کر کلکتہ گئے اور وہیں فوت ہوئے۔

مولوی فقیر اللہ

مولوی حاجی فقیر اللہ بن حاجی حبیب اللہ بن حاجی خدا بخش بن شیخ جمعیت، محلہ

پورہ دیوان کے رئیس اور تاجر تھے، ان کا خاندان بہت پہلے سے خوش حال اور مال دار تھا، ان کے جد اعلیٰ شیخ جمعیت نے ایک مسجد تعمیر کی تھی، جو ان کے نام سے مشہور ہے، بعد میں بوہرہ لوگوں کی خواہش پر ان کو نماز پڑھنے کے لیے دے دی۔

مولوی فقیر اللہ نے ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا محمد محمود معروفی اور مولانا الہی بخش صاحب سے حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں مولانا عبدالعلیم رسول پوری وغیرہ سے پڑھا، پھر مدرسہ حنفیہ جون پور میں مولانا ہدایت اللہ خان صاحب رام پوری سے معقولات کی تعلیم حاصل کی۔

اسی درمیان میں مولانا عبدالوہاب بہاری سے استفادہ کیا، مگر سند فراغت حاصل نہ کر سکے، ویسے ”ملا فاضل“ تھے، کام یاب تاجر کی حیثیت سے زندگی بسر کی اور مدرسہ احیاء العلوم اور دیگر دینی کاموں میں پیش پیش رہے، وہ مولانا شکر اللہ صاحب کے مخصوص دوستوں میں سے تھے اور اپنی اصابت رائے اور دولت دونوں سے جماعتی اور دینی کاموں میں مدد کرتے تھے۔

نہایت شریف النفس، ملنسار، بامروت اور خلیق آدمی تھے، باوجودے کہ تجارت کرتے تھے، وضع قطع اور عمل میں بالکل عالم باعمل بن کر رہے، مدرسہ کے طلبہ پر بے حد شفیق تھے، بچپن کے نحوی و صرفی مسائل بڑھاپے تک مستحضر تھے، ذہین و طباع اور بذلہ نسخ بھی تھے، ۱۳۷۱ھ میں حج و زیارت سے مشرف ہوئے، یوم جمعہ ۱۱/ رجب ۱۳۷۶ھ میں انتقال کیا۔

مولوی حکیم محمد سعید

مولوی حکیم حاجی محمد سعید بن شیخ عبدالکریم بن شیخ محمد عالم بن شیخ بڈل، محلہ پورہ صوفی کے رہنے والے تھے، یہاں کے مشہور اطباء میں سے تھے، مطب کے ساتھ بازار میں

دواخانہ بھی رکھتے تھے۔

ان کے آباء واجداد موضع اُکروڑا سے ترک وطن کر کے مبارک پور میں آباد ہوئے، خاندانی روایات کے مطابق جھٹا اور پٹا دو بھائی سب سے پہلے اُکروڑا سے (جو کہ اعظم گڑھ سے جین پور کی طرف جانے والی قدیم سڑک کے دونوں جانب مشہور گاؤں ہے) مبارک پور آئے، سڑک کے مغرب میں جہاں ان کا گھر تھا، پٹا شہر کے نام سے اب تک چند گھرانے ہیں، انگریزی حکومت میں جب زمین کا نیا بندوبست ہوا تو ان دونوں بھائیوں کی اولاد کو مبارک پور میں اطلاع دی گئی کہ زمینداروں سے اپنے حصہ لے لیں، مگر ان لوگوں نے انکار کر دیا، اس خاندان کی آمد یہاں غالباً سلطان عالم گیر کے آخری دور میں ہوئی۔

مولوی حکیم محمد سعید نے اپنے گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کر کے مولانا محمد محمود معرونی اور مولانا عبدالرحمن محدث مبارک پوری سے کتب درسیہ پڑھیں اور فن طب و حکمت کی تعلیم مولانا حکیم الہی بخش سے حاصل کر کے ان ہی کے یہاں مطب کیا، پرانی وضع قطع کے آدمی تھے۔
۱۶ شعبان ۱۳۷۸ھ (۲۸ فروری ۱۹۵۹ء) میں مبارک پور میں فوت ہوئے۔

مولوی حکیم عبدالمجید رسول پوریؒ

مولوی حکیم عبدالمجید بن مولانا عبدالعلیم بن باب اللہ رسول پوری نے گھر پر اُردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

اس کے بعد جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور فراغت کے بعد اسمتہ ہائی اسکول عظمت گڑھ میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے اور پوری زندگی وہیں گزار دی، عظمت گڑھ، رسول پور سے چند میل کے فاصلے پر اتر کی جانب ہے، اس لیے گھر سے برابر تعلق قائم رہا۔

طبابت خاندانی مشغلہ تھا، آخری دور میں اس کی طرف خصوصی توجہ ہو گئی تھی، خاندانی روایات کا نمونہ تھے، آخری ایام میں تعلق مع اللہ کا یہ حال تھا کہ رات دن میں سینکڑوں رکعات نفل پڑھا کرتے تھے، ۱۳۸۳ھ (۱۳ ستمبر ۱۹۶۳ء) کو وطن میں فوت ہوئے، اُن کی اولاد میں تعلیم کا چرچا ہے۔

مولوی حکیم عبدالحمید

مولوی حکیم عبدالحمید بن حاجی رحمت اللہ بن حافظ عبدالسبحان بن شیخ پکھن، مولانا نعمت اللہ صاحب کے خاندان سے تھے۔

نحو و صرف کی تعلیم مولانا محمد محمود معروفی سے حاصل کر کے، طب کی تعلیم مولانا حکیم الہی بخش سے حاصل کی، مروجہ علوم و فنون کی تکمیل نہ کر سکے اور مطب جاری کر کے دواخانہ چلایا، بعد میں مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد جہانانگج میں صدر مدرس ہوئے، جہاں کئی سال تک نہایت اخلاص اور جان فشانی کے ساتھ اُردو، فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھائیں۔

ان کے دورِ مدرسہ میں جہانانگج اربابِ علم و فضل کا مرجع بن گیا تھا اور اُن کے متعدد شاگرد فارغ التحصیل عالم ہوئے، بڑے متواضع، منکسر المزاج اور سیدھے سادے آدمی تھے، ان کا ذاتی کتب خانہ بھی تھا، جس میں عربی کی مختلف کتابیں تھیں، ان ہی میں ”تقریب التہذیب“ بھی تھی، جواب بھی میرے کتب خانے کی زینت ہے، علمی و دینی اور اصلاحی و اجتماعی کاموں میں خادم کی حیثیت سے کام کرتے تھے، حدود ۱۳۵۴ھ میں مبارک پور میں انتقال کیا۔

مولوی حکیم شاہ محمد صاحب

مولوی حکیم شاہ محمد، محلہ پورہ خضر کے رہنے والے تھے، ان کے بارے میں ایک قلمی یادداشت سے اتنا معلوم ہوا ہے کہ بہت کام یاب جراح تھے، مگر فیس بہت زیادہ لیتے تھے اور وہ مولانا شاہ علی حسین کے مرید تھے، ان کا انتقال ۱۳۳۲ھ (۱۰ اپریل ۱۹۱۵ء) میں ہوا اور ان کی قبر میں شاہ صاحب کا شجرہ رکھا گیا تھا۔ (یادداشت قلمی شیخ عبدالجبار پورہ صوفی)

مولوی محمد ہارون صاحب

مولانا محمد ہارون بن حافظ عبداللطیف بن میاں جی فتح محمد، محلہ پورہ صوفی کے رہنے والے تھے، ان کے مورث اعلیٰ جن کا نام پہلے ہریہر سنگھ تھا، غازی پور کے راجپوت تھے، جو اسلام لائے اور گھر بار چھوڑ کر قصبہ سے متصل مقام املو میں مستقل طور سے سکونت پذیر ہو گئے اور وہیں شادی کر کے متاہل زندگی بسر کی۔

مولانا کے دادا میاں جی فتح محمد نے املو ہی میں انتقال کیا، بعد میں ان کے والد نے محلہ پورہ صوفی میں مکان لیا اور یہیں بود و باش اختیار کی، حافظ عبداللطیف صاحب نہایت نیک اور ذی علم بزرگ تھے، مولانا محمد ہارون نے عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا شاہ محمد صاحب سریانوی سے پڑھیں، اس زمانہ میں مدرسہ چشمہ رحمت کے بعد مدرسہ حنفیہ جون پور دیارِ مشرق کی مشہور درس گاہ تھا، جہاں مولانا شاہ اصغر حسین صاحب دیوبندی درس دے رہے تھے، چنانچہ آپ نے مولانا موصوف سے پوری تعلیم حاصل کی اور وہیں سے سند فراغت پائی، اس کے بعد مدتوں بنارس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، بعد

میں مبارک پور کے بعض مدارس و مکاتب میں مدرّس ہوئے، نہایت نیک اور صالح انسان تھے، سادگی اور قناعت پسندی شیوہ زندگی تھی، اپنے کام سے کام رکھتے تھے، پارٹی بازی اور بحث و تکرار سے دُور رہتے تھے، اس طرح پوری زندگی سلف صالحین کے طریقے پر بسر کی اور وضع داری میں فرق نہیں آنے دیا، اچھی خاصی عمر پائی تھی۔

۸/رجب ۱۳۸۷ھ بروز جمعہ ۱۳/اکتوبر ۱۹۶۷ء فجر کے وقت انتقال کیا اور قصبہ کے پچھم روضہ کے قبرستان میں دفن کیے گئے، ان کی اولاد میں علم دین کا سلسلہ چلا، بلکہ اب بھی جاری ہے، ان سے تقریباً بیس سال پہلے ان کے جوان صاحب زادے مولوی عبدالجی صاحب کا انتقال ہوا۔

مولوی محمد طفیل الملوئی

مولوی حاجی محمد طفیل الملوئی پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی طور سے حاصل کی، اس کے بعد مولانا عبدالعلیم رسول پوری کی خدمت میں آکر پڑھنے لگے، ان کے ساتھ مولوی شاہ فیاض عالم الملوئی بھی مولانا سے پڑھتے تھے، یہاں سے مدرسہ حنفیہ جون پور جا کر مولانا ہدایت اللہ خان صاحب رام پوری سے کتب درسیہ کی تعلیم پائی، پھر مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں جا کر مولانا عبدالعلیم رسول پوری اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی وغیرہ سے پڑھا اور یہاں سے نکل کر مدرسہ عالیہ رام پور میں داخل ہوئے، جہاں مولانا عبدالحق خیر آبادی، مولانا منور علی رام پوری، مولانا محمد طیب عرب مکی، مولانا حافظ وزیر احمد رام پوری اور دیگر اساتذہ سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تکمیل کی۔

فراغت کے بعد خیر آباد ضلع سیتا پور کے کسی مدرسہ میں مدرّس ہوئے، اس کے بعد

گورنمنٹ ہائی اسکول چھپرا (بہار) میں ہیڈ مولوی ہوئے، مگر دو سال کے بعد وہاں سے بھی بمبئی چلے آئے اور مدرسہ مکتو جعفر میں تعلیم دینے لگے، پھر مدرسہ ہاشمیہ میں مدرس ہوئے، اسی دوران میں حج و زیارت سے مشرف ہوئے، واپسی پر پانچ برس وطن میں رہے، پھر بمبئی آکر مدرسہ رحیمیہ میں پڑھانے لگے، یہاں تک کہ بمبئی ہی میں ۴ اگست ۱۹۵۸ء (۱۳۷۸ھ) میں انتقال کیا اور یہیں دفن کیے گئے۔

۱۳۱۷ھ میں جب مدرسہ احیاء العلوم کنہی کے کنویں کے پاس والی مسجد میں تھا اور طالب علموں کے لیے کمرہ بنانے کی ضرورت ہوئی تو مولوی محمد طفیل نے بہت زیادہ بانس اور سرپت سے امداد کی تھی، طبیعت میں لا اُبالی پن تھا۔

مزاج پر معقولات کا غلبہ تھا اور ”خیر آبادیت“ کی حرارت بڑھاپے تک باقی تھی، سادگی اور بے تکلفی میں بہت آگے تھے، قیام بمبئی کے زمانے میں مجھ سے بڑی محبت اور شفقت سے ملتے تھے اور اپنے استاذ کے خاندان سے ہونے کی وجہ سے احترام کرتے تھے، حالاں کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، ماضی قریب تک استاذی و شاگردی کی نسبت کیسی محترم سمجھی جاتی تھی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

مولوی ولی الحسن فاروقی

مولانا ولی الحسن بن شیخ نجیب اللہ بن شیخ احمد علی بن شیخ مکرم بن شیخ محمد اعظم فاروقی مولانا ظفر حسن صاحب عینی فاروقی کے حقیقی بھائی تھے، عمر میں ان سے چھوٹے تھے۔

غالباً انھوں نے کلکتہ اور ڈھاکہ وغیرہ میں تعلیم حاصل کی، جہاں حکیم غلام رسول فاروقی اور مولانا ظفر حسن عینی رہتے تھے، گھر ہی رہتے تھے اور زمینداری کی دیکھ بھال

کرتے تھے۔

نہایت متواضع اور منکسر المزاج آدمی تھے، شرافت و مروت کا مجسمہ تھے، ہم لوگ اکثر ان کے گھر جایا کرتے تھے اور وہ بڑے انشراح سے خاطر تواضع کرتے تھے، آخر میں ضیق النفس کا شکار ہو کر اکثر بیمار رہا کرتے تھے، مولانا ظفر حسن صاحب کے انتقال کے بعد پورا کتب خانہ اٹھا کر مدرسہ احیاء العلوم کو دے دیا، جس میں مختلف علوم و فنون کی صد ہانادر و نایاب اور قیمتی کتابیں تھیں۔

ان کے صاحب زادے مولوی غلام ربانی کلکتہ میں کتابوں کے کامیاب تاجر تھے، وہ مشرقی پاکستان گئے تو کچھ دنوں کے بعد مولانا ولی الحسن صاحب کو بھی وہیں بلا لیا، چنانچہ زندگی کے بقیہ دن گزار کر بھوانی پور ضلع میمن سنگھ میں انتقال کر گئے، ان کا انتقال ۱۳۸۰ء کے حدود میں ہوا۔

مولوی منشی عبدالوحید لاہر پوری

مولوی منشی عبدالوحید صاحب لاہر پوری سینا پور کے رہنے والے تھے، جہاں مولانا شکر اللہ صاحب ایک زمانہ میں بسلسلہ تعلیم رہ چکے تھے، ہمارے بچپن میں مبارک پور آئے اور مولانا مرحوم سے بقیہ کتابیں پڑھیں اور مدرسہ احیاء العلوم میں ریاضی وغیرہ کی مدرسے کر کے یہیں مستقل طور سے آباد ہو گئے۔

مرحوم ہمارے اردو اور ریاضی کے استاذ ہیں، یہاں ان کے تلامذہ کی کثیر تعداد ہے، جن میں علماء و فضلاء ہیں، بہت نیک اور بڑے رعب و داب کے آدمی تھے، بچوں کی تعلیم کا خاص سلیقہ رکھتے تھے، صفر ۱۳۵۰ھ میں مبارک پور میں فوت ہوئے، ان کی اولاد یہاں آباد ہے۔

حضرت مولانا نذیر احمد رحمانی الملوئیؒ

مولانا نذیر احمد بن شیخ عبدالشکور بن شیخ جعفر رحمانی الملوئی ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ (فروری ۱۹۰۶ء) میں الملو میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے محلہ میں حاصل کر کے مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور اور مدرسۃ الاصلاح سرانے میں متوسطات تک تعلیم پائی۔

پھر مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی گئے اور وہاں کے اساتذہ سے انتہی کتابیں پڑھ کر شعبان ۱۳۴۶ھ میں سند فراغت حاصل کی، اس دور میں ہر امتحان میں اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوتے تھے، آخری سال میں پورے مدرسہ میں اول آئے اور خصوصی انعام میں صحیح بخاری اور چالیس روپیہ نقد پایا، چوں کہ نہایت ذہین اور ذی استعداد عالم تھے، اس لیے فراغت کے بعد دارالحدیث رحمانیہ ہی میں مدرس ہو گئے اور پہلے ہی سال نورالانوار اور رشیدیہ وغیرہ پڑھائی، اسی دوران میں مدرسہ کی طرف سے مشہور معقولی عالم مولانا صاحب کے پاس رام پور گئے، مگر وہاں نہ رہ سکے اور بدایوں جا کر مولانا عبدالسلام صاحب سے منطق و فلسفہ اور ریاضی کی تعلیم حاصل کی، یہ علوم مدرسہ رحمانیہ کے نصاب میں داخل نہ تھے، بعد میں پھر مدرسہ رحمانیہ میں اپنی جگہ واپس آ گئے، اس درمیان میں مدرسہ کی طرف سے آپ کی تنخواہ جاری رہی۔ (تراجم اہل حدیث ج ۱، ص ۱۱ و ۱۲)

مدرسہ دارالحدیث سے ترک ملازمت کے بعد کچھ دنوں وطن میں رہے، ان دنوں بازار میں ہمدرد دواخانہ کی ایجنسی لی تھی اور دوکان پر کبھی کبھی بیٹھا کرتے تھے، یہیں آپ سے ملاقات ہوئی اور کچھ دنوں ملنا جلنا رہا، خوش خلق، ملسار اور متواضع عالم تھے۔

اس کے بعد بنارس میں مدرس ہو کر گئے، تو یوں جم کر رہے کہ یہیں کی ملازمت کے

دوران میں انتقال کیا، وہ مبارک پور کے علمائے مصنفین میں تھے۔

تعلیم و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ رکھتے تھے، ان کے مضامین و مقالات قیمتی اور معلوماتی ہوتے تھے، جرائد و مجلات میں اکثر شائع ہوتے تھے، ان کی مستقل تصانیف میں ”مصائب بجواب رکعات تراویح“ چھپ چکی ہے، جس سے حدیث میں آپ کی دقت نظر اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

انتقال کے بعد ان کی دوسری کتاب ”اہل حدیث اور سیاست“ شائع ہوئی، جس سے مولانا کا سیاسی مزاج اور معلومات کا پتہ چلتا ہے، کئی سو صفحات میں آب و تاب کے ساتھ بنارس سے شائع ہوئی ہے، آنتوں کے کینسر کے موذی مرض میں مدتوں مبتلا رہے، مگر تعلیمی خدمات میں مصروف رہے، آخر میں بنارس سے المولائے گئے اور یہیں ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء ۱۳۸۴ھ یکشنبہ کو ۳ بجے دن میں فوت ہوئے اور رات میں ۱۱ بجے دفن کیے گئے۔

مولانا عبید الرحمن مظاہری رحمانیؒ

مولانا عبید الرحمن بن مولانا عبدالسلام بن شیخ خان محمد بن شیخ امان اللہ بن شیخ حسام الدین، مولانا عبدالسلام صاحب مصنف ”سیرت البخاری“ کے صاحب زادے تھے، اُردو و فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور مقامی مدرسہ میں حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ فیض عام منو میں تین سال تک پڑھا، آخر میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں جملہ علوم و فنون کی تکمیل کر کے ۱۳۵۶ھ میں سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں مزید دو سال تعلیم حاصل پائی، فنون کی کتابیں مولانا سکندر علی اور مولانا شریف اللہ سے پڑھیں اور حدیث و تفسیر مولانا احمد اللہ صاحب پر تاپ گڑھی سے حاصل کی۔

فراغت کے بعد مدرسہ رحمانیہ ہی میں مدرس ہو گئے، نہایت خوش خلق، شریف النفس اور سلیم الطبع عالم تھے، ساتھ ہی اردو کے اچھے شاعر اور مضمون نگار تھے، دوست احباب کی مجلس کو گلستاں بنائے رکھتے تھے، ان سے علمی کاموں کے سلسلے میں بڑی توقعات تھیں۔

مگر افسوس کی عین جوانی میں سل اور دق میں مبتلا ہو کر بزمانہ ملازمت مدرسہ رحمانیہ اپنے وطن مبارک پور میں ۱۰/ ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ کو انتقال کر گئے، آپ کا تذکرہ ”تراجم علمائے اہل حدیث“ اور ”سیرت البخاری“ طبع ثانی کے مقدمہ میں موجود ہے۔

(تراجم اہل حدیث ج ۱، ص ۸۰۸ و ۸۰۹)

مولانا حکیم محمد بشیر رحمانی

مولانا حکیم محمد بشیر بن عبد المجید بن حافظ عبد الرحمن بن عبد الوہاب مبارک پوری، خود نوشتہ حالات تراجم علمائے اہل حدیث میں یہ ہیں:

”۱۹/ اکتوبر ۱۹۰۴ء بروز چہار شنبہ مطابق ۹ شعبان ۱۳۲۲ھ کو مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوا، کلام مجید، اردو، فارسی، حساب وغیرہ مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور میں پڑھا، کتب علوم آلیہ عربیہ اور بعض کتب حضرت مولانا ابوالعلیٰ عبد الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث مبارک پوری سے پڑھیں، بعد ازاں بایماء حضرت مولانا مرحوم ۱۳۴۱ھ میں بغرض تکمیل درس نظامیہ مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں داخل ہوا اور اکثر حدیث حضرت مولانا الحاج احمد اللہ صاحب شیخ الحدیث رحمانیہ سے اور کتب اصول حدیث، اصول فقہ، فقہ حضرت مولانا عبد السلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ مبارک پوری سے اور بعض کتب اصول فقہ، تفسیر حضرت مولانا عبد الغفور صاحب بندولی اعظمی سے اور

کتب ادب و عروض اور ترجمتین حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب مرحوم مگر نہسوی سے اور کتب منطق، فلسفہ، ریاضی، ہیئت وغیرہ حضرت مولانا غلام یحییٰ صاحب مدرس الحال مدرسہ الہیات کان پور سے اور بعض کتب بلاغت، مناظرہ، اقلیدس حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب آروی سے اور بعض متفرقات دوسرے اساتذہ جیسے مولانا احمد صاحب منوی، مولانا ابوطاہر صاحب بہاری مرحوم، مولانا عبدالوہاب صاحب آروی وغیرہ سے پڑھیں اور الحمد للہ مدرسہ کے تمام امتحانوں میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا۔

۷ شعبان ۱۳۴۵ھ کو مدرسہ سے علاوہ جبہ و دستار اور نقدی انعام کے سند تکمیل عنایت فرمائی گئی اور شیخ الحدیث نے اپنا اجازہ مرحمت فرمایا، بانی مدرسہ رحمانیہ جناب شیخ حاجی عطاء الرحمن صاحب رئیس اعظم دہلی نے اپنے مدرسہ میں میری ملازمت کے لیے متعدد مرتبہ اپنا خیال ظاہر فرمایا، مگر تحصیل طب کے ارادے نے مجھے انکار کرنے پر مجبور کر دیا، بعد ازاں اس سال تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں طب پڑھنے کے لیے داخل ہوا، علاوہ طب و سرجری کے سائنس بھی متعدد بہ حاصل کیا، میرے اساتذہ میں جناب حکیم عبدالحفیظ صاحب وائس پرنسپل طبیبہ کالج علی گڑھ اور جناب شفاء الملک حکیم وڈاکٹر عبدالحمید خان صاحب اور جناب حکیم عبدالحکیم صاحب خلف الرشید جناب حکیم عبدالعزیز صاحب و جناب تربیتی پرشاد صاحب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں اور ۱۳۴۸ھ میں کالج مذکور سے سرٹیفکیٹ حاصل کیا اور اپنے وطن میں کام یاب مطب کرتا رہا، اہل منو کے اصرار سے کچھ دنوں تک مدرسہ عالیہ منو میں بھی پڑھایا، باہماء حضرت مولانا مبارک پوری مرحوم ۱۳۵۳ھ میں حضرت سیدنا و مولانا سید نذیر حسین میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی کے مدرسہ واقع پچانک جیش خاں دہلی میں

پڑھاتا رہا ہوں، اس کے بعد شوال ۱۳۵۶ھ سے دارالحدیث رحمانیہ میں آئے۔

(تراجم اہل حدیث ج ۱ ص ۴۱۰ و ۴۱۱)

اس کے بعد مرحوم ۱۳۷۱ھ میں وطن چلے آئے اور یہیں مطب جاری کر کے کئی سال تک خدمتِ خلق کی۔

آخر میں سیونی (مدھیہ پردیش) میں مدرس ہوئے اور کئی سال تک تعلیمی و دینی خدمات انجام دیں اور ۳۰ مئی ۱۹۶۸ء / یکم صفر ۱۳۸۸ھ بروز سہ شنبہ نوبے شب میں انتقال کیا اور مبارک پور کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مولانا محمد حنیف رہبر شکاری

مولانا محمد حنیف بن حافظ عبدالرحیم شکاری، مولانا شکر اللہ صاحب کے خواہر زادے تھے، چوں کہ مولانا کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہ گئی تھی، اس لیے ان کو اپنے یہاں رکھ کر ان کی تعلیم و تربیت کی اور بڑی محنت و مشقت سے پالا پوسا، اس لیے مرحوم اپنی نسبت شکاری کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا شکر اللہ صاحب وغیرہ سے حاصل کی، اس کے بعد شوال ۱۳۵۰ھ میں مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور، پھر مدرسہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، مگر بیماری کی وجہ سے وہاں تکمیل نہ کر سکے اور مدرسہ مفتاح العلوم منو میں دورہ حدیث پڑھا اور یہیں سے فارغ ہوئے، بڑے ذہین و طباع اور لطیف المزاج تھے، اردو کے نہایت اچھے شاعر تھے، غزلیں خوب کہتے تھے۔

ابتدا میں حسرت موہانی سے خط و کتابت کے ذریعے کچھ مشورہ سخن لیا تھا، مضمون نگار بھی بہت اچھے تھے، ان کے اشعار و مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں چھپتے تھے، اگر

عمر نے وفا کی ہوتی تو وہ مبارک پور کے علمائے مصنفین میں نمایاں مقام کے مالک ہوتے۔
 بڑے عزم و حوصلے کے مالک تھے، دوست احباب کی مجلس میں چراغ محفل تھے،
 بڑی سمجھ بوجھ کے عالم تھے، مولانا شکر اللہ صاحب کو ان سے بڑی توقعات تھیں، مگر افسوس کہ
 عین جوانی میں دق کے مرض میں مبتلا ہو کر ۱۳۵۷ھ (۱۹۳۸ء) میں انتقال کر گئے، مرحوم کی
 وفات پر کئی شعراء نے مرثی اور توارخ کہیں، مولوی محمد شبلی شیدا خیر آبادی نے کہا ہے:

دل شیدا سن فوٹش بکفت: ہائے زچشم شد نہاں رہبر عزیزم

۱۳۵۷ھ

رہبر اعظمی جواں صالح در حجاب عدم چوں شد مستور
 بس کہ غفران حق بدو پیوست بدر تارخ گفت: المغفور

۱۳۵۷ھ

”مقام الحدید بجواب مصباح الحدید“ ان کی مشہور تصنیف ہے، بڑے دلچسپ
 انداز میں لکھا ہے، یہ کتاب دومرتبہ چھپ چکی ہے، ان کے اشعار کو جمع کیا جائے تو مبارک پور
 کے ادبی و شعری سرمایہ میں گراں قدر اضافہ ہو سکتا ہے۔

مولانا عبدالحی غفران

مولانا عبدالحی بن مولانا محمد ہارون بن حافظ عبداللطیف بن میاں جی فتح محمد،
 ۱۳۳۱ھ میں پیدا ہوئے، تاربخ نام غفران ہے، بعد میں اس کو شاعری کا تخلص قرار دیا۔

ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے قصبہ کے بعض مدرسوں میں پڑھا، اس کے بعد
 جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (سورت) گئے، اس زمانے میں یہ مدرسہ ارباب علم و فضل کا مرکز تھا اور

ہندو بیرون ہند کے طلبہ یہاں سے اکتساب فیض کر رہے تھے، مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حافظ عبدالرحمن امر وہوی جیسے فضلاء روزگار سے مولانا نے تعلیم حاصل کر کے سند فراغت پائی اور اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر چل کر درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا، کوٹواری ضلع بلیا کے ایک مدرسہ میں کئی سال تک مدرس رہے اور یہاں کے مسلمانوں کی علمی و دینی خدمت کی، اردو شاعری کا نہایت سہرا ذوق رکھتے تھے، نظمیں خوب کہتے تھے، بڑے صالح اور نیک عالم تھے، ان کی صورت سے نیکی اور شرافت ظاہر ہوتی تھی، اخلاق و مروت میں بہت آگے تھے۔

افسوس کہ اپنے والد کی حیات ہی میں جوانی کے ایام میں ۲۵/ ذی الحجہ ۱۳۶۵ھ/ ۲۰ نومبر ۱۹۴۶ء مغرب اور عشاء کے درمیان مبارک پور میں فوت ہوئے اور روضہ کے قبرستان میں دفن کیے گئے، تاریخ وفات یہ ہے:

پاک طینت، نیک سیرت مولوی عبدالحی
کرد رحلت آہ در عہد شباب
بہر تاریخ وفاتش اے شفا
وہ عدد کم کردہ گو ”غفراں مآب“

مولوی احمد علی

مولوی احمد علی بن شیخ محمد بن شیخ امان اللہ بن شیخ حسام الدین، مولانا عبدالسلام مبارک پوری کے چھوٹے بھائی ہیں، ابتدائی دور میں تعلیم و تدریس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں معلومات نہ ہو سکیں، وہ اہل میت کی تسلی اور صبر کی تلقین میں

خاص شہرت رکھتے تھے، وہ اس موضوع پر مستقل وعظ شروع کر دیتے تھے اور قرآن و حدیث سے استدلال کرتے تھے، اس سلسلہ میں یوں کتب حدیث اور محدثین کا حوالہ دیتے جیسے حدیث کی کسی کتاب کا درس دے رہے ہیں، بھاری بھر کم بدن تھا، اسی کے مطابق کپڑے پہنا کرتے تھے، نہایت سیدھے سادے اور نیک آدمی تھے، مولانا عبدالصمد حسین آبادی نے ان سے اُردو، فارسی کی تعلیم پائی تھی، بڑھاپے میں انتقال کیا۔

مولانا محمد شبلی متکلم ندوی بمہوری

مولانا محمد شبلی بن شیخ عنایت علی بن شیخ شیر علی بن شیخ ڈمر ندوی بمہوری، تیرہویں صدی کے آخر یا چودھویں صدی کے شروع میں بمہور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کر کے مدرسہ حنفیہ جون پور میں گئے اور وہاں کے اساتذہ سے اخذ علم و فن کرنے کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی، علامہ شبلی نعمانی کے خاص تلامذہ اور معتمدوں میں سے تھے، ”حیات شبلی“ میں جگہ جگہ ان کے نام اور حالات درج ہیں، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں ایک مدت تک تدریسی و تعلیمی خدمات انجام دیں۔

ان کے دور میں ضلع کے تین شبلی تھے، اس لیے ان کو متکلم کے نام سے یاد کیا گیا، بڑے بے تکلف، ملنسار اور بااخلاق انسان تھے، سیر و صید کا شوق بڑھاپے تک رہا، روشن خیالی اور وسعتِ ظرفی میں مشہور تھے۔

۵/ ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ مطابق ۳۰/ دسمبر ۱۹۷۳ء کو لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں دفن کیے گئے، اس وقت ان کی عمر سو کے قریب تھی، فی الحال اس سے زیادہ حالات نہ مل سکے، راقم

سے بڑی شفقت و محبت سے ملتے تھے۔

قاری عبدالحی صاحب

مولوی قاری عبدالحی بن شیخ رحمت اللہ، محلہ پورہ دولہن کے رہنے والے تھے۔ مدرسہ احیاء العلوم میں مولوی قاری ظہیر الدین صاحب معرونی سے فن تجوید و قرأت کی پوری تعلیم حاصل کی اور ان ہی سے سند پائی، قصبہ کے مشہور قراء میں سے تھے، ملکوتہ میں تجوید و قرأت کے مدرس تھے، اسی دوران فن تجوید پر ایک کتاب لکھی، جو طبع ہو کر مقبول ہوئی، بڑے بااخلاق، مخلص اور محنتی آدمی تھے۔

افسوس کہ جوانی کے عالم میں وطن میں ۱۳۸۲ھ کے حدود میں انتقال کیا۔

مولانا شمس الحق گجھڑا

مولانا شمس الحق بن شیخ گدا حسین، ساکن گجھڑا نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد فارسی اور عربی کی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ ناصر العلوم گھوسی میں متوسطات پڑھیں اور دارالعلوم دیوبند میں کئی سال پڑھ کر وہیں سے سند فراغت پائی، وہاں سے آکر مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور میں مدرس ہوئے اور آخر دم تک اسی میں رہے۔

۹ شعبان ۱۳۹۳ھ / ۷ ستمبر ۱۹۷۳ء بروز جمعہ قلب کی حرکت بند ہو جانے سے وطن میں فوت ہوئے، اس وقت ان کی عمر ستر سال کے حدود میں تھی، اس کتاب میں گجھڑا کی شاہی مسجد اور وہاں کے مشائخ کے حالات مولانا مرحوم نے مجھے عنایت فرمائے ہیں۔

مولوی حکیم حماد علی

مولوی حکیم حماد علی بن مولوی سجاد علی بن شیخ یار علی، ساکن محلہ شاہ محمد پور کا خاندان شیعانِ مبارک پور میں علمی اور دینی تھا اور ان کے دادامیاں صاحب یار علی جماعت کے سردار اور مبارک پور ٹاؤن ایریا پنچ کے مجسٹریٹ تھے اور والد زبردست عالم تھے، مولوی حماد علی صاحب نے اپنے والد اور دوسرے اساتذہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور کتبِ درسیہ کی تکمیل کے بعد الہ آباد بورڈ سے ”فاضل“ کا امتحان دے کر سند لی، طبابت خاندانی ورثہ تھا، مبارک پور کے مشہور اطباء میں تھے، بڑے خلیق اور ملنسار تھے، ۱۳۶۰ھ اور ۱۳۷۰ھ کے درمیان انتقال ہوا۔

مولوی حکیم محمد عمر

مولوی حکیم محمد عمر بن حافظ عبدالغفور، ساکن محلہ پورہ صوفی نے ابتدائی تعلیم مدرسہ مصباح العلوم مبارک پور میں حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ مظہر العلوم بنارس میں بقیہ کتبِ درسیہ سے فراغت پائی اور بنارس ہی میں طب و حکمت کی تعلیم بھی حاصل کی۔ ملنسار اور خلیق آدمی تھے، طبابت بطور پیشہ کے کرتے تھے، گھر ہی پر دوا خانہ بھی رکھتے تھے، چالیس پینتالیس سال کی عمر میں ۱۳۶۰ھ میں انتقال ہوا۔

مولوی محمد یوسف انصاری

مولوی محمد یوسف انصاری بن حاجی کریم بخش، ساکن محلہ حیدر آباد نے ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا شکر اللہ صاحب سے حاصل کی، اس

کے بعد مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد میں جا کر کتبِ درسیہ کی تکمیل کی، اس کے بعد بمبئی چلے گئے تو زندگی کا بیشتر حصہ وہیں گزارا، مدتوں سب سے الگ تھلگ رہے اور مختلف اخبارات میں مترجم اور کالم نویس رہے۔

”خاتون“ کے نام سے ایک ہفتہ وار بمبئی سے جاری کیا تھا، ”آوارہ بمبئی“ کے نام سے فکاہی کالم لکھتے تھے۔

گھر، خاندان اور بیوی سے بالکل بے تعلق رہے، آخر دور میں مبارک پور آنے جانے لگے تھے، آخر میں مدرسہ صمدیہ بھینڈی کے نگراں و مدرّس ہو گئے تھے اور شرح و قایہ، نور الانوار وغیرہ کی تعلیم بھی دیتے تھے اور بھینڈی ہی میں جمعرات ۲۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۶ھ کو فالج میں فوت ہوئے۔

مولوی محمد حسن صاحب

مولوی محمد حسن بن شیخ محمد منیر، ساکن محلہ پورہ صوفی نے متوسطات تک مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا نعمت اللہ صاحب، مولانا شکر اللہ صاحب اور مولانا وصی اللہ صاحب سے تعلیم حاصل کی، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گئے، جہاں مولانا محمد انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا حافظ عبدالرحمن امر و ہوی وغیرہ سے تکمیل کر کے سند حاصل کی۔ وطن واپس آ کر کچھ دنوں مدرسہ احیاء العلوم میں اعزازی طور سے دو تین اسباق پڑھاتے رہے، طبیعت میں معمولی سی تیزی تھی، اس لیے یہ سلسلہ بند کر دیا، افسوس کہ جوانی ہی میں ۱۳۵۵ھ کے حدود میں انتقال کیا۔

مولوی حکیم عبدالباری

مولوی حکیم عبدالباری بن حکیم محمد سعید بن عبدالکریم بن محمد عالم بن بدل، ساکن پورہ صوفی نے ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور گئے، مگر بیماری کی وجہ سے پھر نہ جاسکے اور مدرسہ احیاء العلوم میں مشکوٰۃ تک پڑھ کر تکمیل الطب کالج لکھنؤ چلے گئے اور وہاں سے فن طب میں تکمیل کی سند پائی اور طبابت کے خاندانی پیشہ کو اختیار کیا، اپنے حلقہ احباب میں باغ و بہار آدمی تھے، ان کی طبی شہرت دُور دُور تک تھی۔

۱۶/ محرم ۱۳/ ۱۱/ اپریل ۱۹۶۷ء کو صبح چار بجے انتقال کیا اور اُسی دن روضہ کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مولوی محمد اصغر

مولوی حکیم محمد اصغر بن شیخ قاری محمد علی بن حافظ عبدالرحیم بن حاجی بہادر، ساکن محلہ پورہ صوفی، مولانا عبدالرحمن محدث کے برادرزاد اور اُن کے تلمیذ رشید تھے۔

ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کر کے مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا محمد محمود معرونی سے پڑھا، جو مولانا عبدالرحمن محدث کے تلمیذ تھے، اس کے بعد اپنے چچا مولانا عبدالرحمن محدث کے ساتھ ساتھ رہے اور مختلف مقامات و مدارس میں ان سے پڑھتے رہے، چنانچہ ان کے ہمراہ آرہ، پٹنہ، کلکتہ، گونڈہ وغیرہ میں رہے۔

فراغت کے بعد مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور میں اُردو، فارسی اور عربی کے مدرس ہوئے اور پوری زندگی اس سے وابستہ رہے، قد دراز، جسم دبلا پتلا اور نہایت کم سخن، سیدھے

سادے بزرگ تھے، پوری زندگی معمولی تنخواہ پر صبر و قناعت کے ساتھ بسر کی، طب و حکمت سے بھی واقف تھے اور ان کے علاج سے بہت سے مریضوں کو فائدہ ہوا، ان کے والد قاری محمد علی نے قرأت و تجوید کی تعلیم اپنے والد حافظ عبدالرحیم اور قاری عبدالرحمن سے حاصل کی تھی، مولوی محمد اصغر صاحب بہترین جلد ساز تھے، یہ فن انھوں نے قیام کلکتہ کے دوران سیکھا تھا، ۱۳۴۶ھ میں انتقال کیا اور آبائی قبرستان میں دفن ہوئے۔

مولوی عبدالحفیظ سریانویؒ

مولوی عبدالحفیظ بن مولوی شاہ محمد بن حاجی اسماعیل بن شیخ کتوارو سریانوی اپنے والد ماجد کے بڑے صاحب زادے تھے، ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل گئے اور مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حافظ عبدالرحمن امر و ہوی وغیرہ سے کتب درسیہ کی تحصیل و تکمیل کی۔

اس کے بعد وطن اور کلکتہ کے اطراف میں چند سال تک درس و تدریس کی خدمت انجام دی، علمی استعداد ٹھوس تھی، جری اور صاف گو آدمی تھے، غالباً ۱۳۷۰ھ اور ۱۳۷۵ھ کے درمیان سریاں میں انتقال ہوا۔

مولوی نظام الدین سریانوی

مولوی نظام الدین صاحب سریانوی نے ابتدائی تعلیم سریاں میں پائی، اس کے بعد مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا شکر اللہ صاحب سے فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھیں اور ۱۳۵۰ھ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور سے جملہ علوم

وفنونِ مروّجہ سے فارغ ہوئے، نیک اور صالح نوجوان تھے، فقہی جزئیات پر اچھی نظر تھی، افسوس کہ جوانی ہی میں بعارضہ دق ۱۶ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ کو انتقال کر گئے۔

مولوی حفیظ اللہ ضوی

مولوی حفیظ اللہ بن شیخ دین محمد، ساکن محلہ پورہ دیوان نے ابتدائی تعلیم مدرسہ مصباح العلوم (پرانے گولہ) میں حاصل کر کے، مدرسہ منظر حق ٹانڈہ میں داخلہ لیا، اس کے بعد مدرسہ منظر اسلام بریلی میں متوسطات کی تعلیم حاصل کی اور آخر میں دارالعلوم معینیہ اجمیر میں مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی سے پڑھ کر تکمیل کی، اس کے بعد طب و حکمت اور کچھ تفسیر کی کتابیں مدرسہ نعیمیہ مراد آباد میں پڑھیں اور وطن واپس آ کر کچھ دنوں رہے، پھر ریاست حیدر آباد میں سرکاری ملازمت کر کے وہیں مستقل طور سے مقیم ہو کر متاثر ہو گئے اور وطن واپس نہیں آئے، وہیں ۲۴ نومبر ۱۹۶۴ء (۱۳۸۴ھ) میں انتقال کیا، خوش گوشاعر تھے اور تاجی تخلص رکھتے تھے۔

افسوس کہ ان کے حالات اس سے زیادہ معلوم نہ ہو سکے، ان کی اولاد حیدر آباد

میں ہے۔

مولوی نثار احمد مظاہری

مولوی نثار احمد ولد محمد شفیع ولد حکیم الہی بخش صاحب، ساکن پورہ دلہن نے ابتدائی تعلیم اپنے محلہ میں حاصل کی، پھر مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا نعمت اللہ صاحب اور مولانا شکر اللہ صاحب سے کتب درسیہ پڑھیں، شوال ۱۳۵۰ھ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخل ہو کر بقیہ کتابیں پڑھ کر سند فراغت پائی، بڑے خوش مذاق اور باغ و بہار آدمی

تھے، افسوس کہ عمر نے وفاتہ کی اور بعارضۂ دق ۱۳۵۵ھ کے حدود میں انتقال کر گئے۔

مولوی عبدالجبار سکٹھوی

مولوی عبدالجبار بن محمد یعقوب بن محمد شفیع نمبر دار خان، ساکن سکٹھی نے اپنے محلہ کے مکتب میں پڑھ کر مدرسہ احیاء العلوم میں داخلہ لیا اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اُن دنوں میں بھی مدرس تھا اور انھوں نے مجھ سے کچھ کتابیں پڑھیں، اس کے بعد گھر اور محلہ والوں نے اُن کو مدرسہ اشرفیہ میں داخل کرایا، جہاں وہ فارغ ہو گئے، مگر اس کے دو چار برس ہی کے بعد بعارضۂ دق غالباً ۱۳۶۵ھ میں عین جوانی میں فوت ہو گئے۔

مولوی محمد سلیمان

مولوی محمد سلیمان بن محمد یسین بن حاجی احمد اللہ، ساکن محلہ پورہ صوفی، متوسطات تک مدرسہ احیاء العلوم میں پڑھ کر غالباً دارالعلوم دیوبند میں بقیہ کتب کی تکمیل کی، اس کے بعد متاہل زندگی بسر کرتے رہے۔ افسوس کہ جوانی ہی میں ہیضہ کی بہت ہی مختصر علالت میں غالباً ۱۳۸۴ھ میں انتقال کر گئے۔

مولوی عبدالشکور

مولوی عبدالشکور بن شیخ عبدالغفور بن حافظ امین الدین بن محمد عالم بن شیخ بدّل، ساکن محلہ پورہ صوفی، مولوی حکیم محمد سعید کے برادر زاد تھے۔

بڑی عمر میں پڑھنا شروع کیا اور متوسطات تک مدرسہ احیاء العلوم میں پڑھا اور جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں مولانا سید فخر الدین احمد اور مولانا عبدالحق مدنی وغیرہ سے پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

پڑھنے کے بعد تجارت شروع کی اور بازار میں ایک دوکان کر لی، سیدھے سادے اور نیک آدمی تھے، چنانچہ کتابوں میں راقم کے ہم سبق تھے، تقریباً ۱۵ سال ہوئے، انتقال کر گئے۔

مولوی عبدالمجید سریانوی

مولوی عبدالمجید بن مولوی شاہ محمد بن اسماعیل بن شیخ کتوارو سریانوی، مولوی عبدالحفیظ سریانوی کے چھوٹے بھائی تھے۔

ابتدائی تعلیم مقامی مکتب میں حاصل کر کے اپنے والد مولوی شاہ محمد صاحب وغیرہ سے مدرسہ منبع العلوم خیر آباد میں عربی کی تعلیم حاصل کی، جہاں ان کے والد مدرس تھے، اس کے بعد امر وہہ میں تکمیل کی، علمی استعداد اچھی تھی، بعض مدرسوں میں کچھ دنوں مدرس رہے، پھر ذاتی کاروبار میں یوں مشغول ہوئے کہ اسی کے ہو کر رہ گئے، راقم سے عمر میں بڑے تھے، طبیعت کی تیزی اور صاف گوئی میں مشہور تھے۔

غربت اور گھریلو معاملات کی وجہ سے پریشان رہا کرتے تھے، تقریباً ایک ماہ بیمار رہ کر ۷ شوال ۱۳۹۸ھ / ۱۱ ستمبر ۱۹۷۸ء بروز دوشنبہ عصر سے پہلے انتقال کیا اور عشاء کے بعد سریاں میں دفن کیے گئے، مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی نے نماز جنازہ پڑھائی، راقم جنازہ اور تدفین میں شریک تھا۔ رحمۃ اللہ علیہ

مولوی عبداللہ ملوی

مولوی عبداللہ بن شیخ عبدالشکور، المومبارک پور میں پیدا ہوئے، ان کے نانا حاجی احمد صاحب ساکن کٹرا نہایت بزرگ اور باخدا انسان تھے اور اپنے اس نواسے سے بے حد محبت کرتے تھے، مولوی عبداللہ نے ابتدائی تعلیم الملو میں حاصل کر کے مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور میں نحو و صرف پڑھا، پھر مدرسہ فیض عام مئو میں داخل ہوئے اور آخر میں مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں جملہ علوم و فنون کی تکمیل کی اور رجب ۱۳۶۱ھ میں سند فراغت لی۔ اس موقع پر ان کے دوست مولوی سعید احمد اعظمی مقیم نواب گنج دہلی نے یہ قطعہ تاریخ کہا:

نیک دل پاکباز عبداللہ عالم دیں ز فضل دا ورشد
بہر تاریخ سال گفت سعید وارث نامہ پیمبر شد

فراغت کے بعد مدرسہ در بھنگہ میں عربی کے مدرس ہوئے، مگر چھ ماہ گزرتے گزرتے بیمار پڑ گئے اور مجبوراً وطن چلے آئے اور سل کے مرض میں ۱۳۶۲ھ میں انتقال کر گئے، مرحوم ذہین، سنجیدہ اور جوان صالح تھے، نیک نفسی اور شرافت طبع اپنے نانا سے ورثہ میں پائی تھی۔

مولوی نذیر احمد نواذوی

مولوی نذیر احمد بن حافظ قادر بخش، ساکن نواذہ پیدائشی طور سے معذور اور اپاہج تھے، ابتدائی تعلیم مقامی مدرسہ میں حاصل کر کے مدرسہ احیاء العلوم میں داخل ہوئے، اس زمانے میں راقم فراغت کے بعد مدرسہ میں عربی کا مدرس تھا، انھوں نے مجھ سے مقامات

حریری، دیوانِ حماسہ، سبجہ معلقہ، مقدمہ ابن خلدون اور ہدیہ سعیدیہ وغیرہ پڑھا۔
اس کے بعد جامعہ قاسمیہ شاہی مراد آباد میں جا کر تکمیل کی، فراغت کے بعد کچھ دنوں
نوادہ کے مدرسہ میں مدرس رہے، پھر اپنا ذاتی کاروبار جاری کیا اور اچھی خاصی کام یابی حاصل
کی اور متابل زندگی بسر کی، بال بچے ہوئے، معذوری کی وجہ سے ادھر ادھر آجائیں سکتے تھے،
استعداد اچھی تھی، نیک اور صالح عالم تھے، جمعرات ۲۹ محرم ۱۳۸۹ھ / ۱۷ اپریل ۱۹۶۹ء کو
نوادہ ہی میں انتقال کیا، اس وقت ان کی عمر چالیس سال کے حدود میں رہی ہوگی۔

مولوی محمد یوسف رحمانی

مولوی محمد یوسف بن حاجی محمد صدیق، ساکن لوہیا ملو نے ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالتعلیم
مبارک پور میں حاصل کی، اس کے بعد منو کے مدرسوں میں پڑھا اور مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ
دہلی سے فراغت پائی، چند سال پہلے جنوری میں فوت ہوئے۔ (یہ عبارت ۱۹۷۴ء کی ہے)

مولانا حافظ عبدالرؤف بلیاوی

مولانا حافظ عبدالرؤف بن شیخ محمد اسلام، بھوجپور ضلع بلیا کے رہنے والے تھے۔
ابتدائی تعلیم اپنے یہاں حاصل کر کے، مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور میں
عربی کی پوری تعلیم حاصل کی، درمیان میں کچھ دنوں کے لیے ناگ پور گئے، مگر تکمیل مبارک
پور میں کی اور کٹیہار ضلع پورنیہ کے مدرسہ میں چھ ماہ قیام کر کے ہیئت کی تعلیم حاصل کی اور
مدرسہ اشرفیہ میں نائب شیخ الحدیث کے عہدے پر رہے اور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۷۲ء تک مسلسل
تیس سال تک درس و تدریس کی خدمت انجام دی۔

اسی درمیان میں فتاویٰ رضویہ کی دو جلدوں کو مرتب کر کے سنی دارالاشاعت مبارک پور سے شائع کیا، وہ اپنی ذات سے نیک، بے نفس اور صاحب علم و فضل تھے، ہم لوگوں سے کھل کر ملتے تھے، بیعت و ارادت مولانا امجد علی گھوسوی سے رکھتے تھے، ان کا مختصر حال ”تذکرہ علمائے اہل سنت“ میں صفحہ ۱۸۰ و ۱۸۱ پر ہے، ۱۲ شوال ۱۳۹۱ھ میں شکم کی بیماری میں فوت ہوئے، ان کی قبر مبارک پور میں سمودی تالاب کے شمال مشرقی حصے میں ہے۔

استاذ الشعراء محمد یسین فغان مبارک پوری سورتی

فغان کا نام محمد یسین ہے، وہ ۱۳۲۹ھ (۱۹۱۱ء) میں بمقام مبارک پور ضلع اعظم گڑھ پیدا ہوئے، موصوف ایک سال کے بھی نہ تھے کہ والد نے انتقال کیا اور دادا حکیم مولوی امیر علی کے ذمے آ گئے، چھٹے سال والدہ کا بھی انتقال ہو گیا، حکیم امیر علی اپنے بیٹے بہو کا صدمہ برداشت نہ کر سکے اور فغان کو لے کر ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء) میں سورت آ گئے اور فغان سورت ہی کے ہو کر رہ گئے، سورت آتے ہی حکیم مولوی امیر علی نے دینیات کی تعلیم دلوائی، ابھی تعلیم بھی پوری نہ ہوئی تھی، حکیم مولوی امیر علی کا ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ء) میں انتقال ہو گیا اور ۱۲/۱۱ سالہ نوجوان نے فکر معاش کے لیے اپنا تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے پارچہ بانی کی صنعت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا، جدوجہد نے ان کو کافی نواز اور ماحول سازگار ہونے لگا، پندرہ سولہ سال کی عمر میں فغان کو شعر سننے کا ذوق ہوا، آخر یہی ذوق شعر گوئی میں ڈھل گیا، اپنا ابتدائی کلام میرزین الدین شیدا کو دکھاتے تھے، شفیق استاد نے خلوص و محبت سے ان کی تربیت کی، دل کی تڑپ اور استاد کی نظر سے فغان مشاعرہ میں کام یاب ہوتے رہے، انھوں نے سورت میں اردو کی اشاعت اور شعر و سخن کی خدمت کے لیے ۱۳۷۲ھ (۱۹۵۳ء) میں ”بزم انجمن ترقی ادب“ کی

بنیاد رکھی، اس کے ماتحت بڑے بڑے کامیاب مشاعرے کر کے عوام کو شعر و سخن کا ذوق دیا۔
شیدا کے انتقال پر فغان نے ۱۳۷۷ھ (۱۹۵۷ء) میں پنڈت بھولانا تھ جوش
ملیسانی کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا، جوش ملیسانی کی صحیح رہنمائی کا نتیجہ ہے کہ فغان ریاست
گجرات کے ایک باعزت استاد مانے جاتے ہیں۔

آپ کے کئی شاگرد ہیں، جو اپنے استاد کے ساتھ اردو کی ترقی میں سرگرم ہیں، فغان کی
غزلیت کا ایک مجموعہ مرتب ہو چکا ہے، کلام میں عزم و ہمت، حوصلوں کی بلندی، جذبات کی روانی
اور خیالات کی بلندی قوس و قزح کے رنگوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔

مرے عزمِ مصمم نے مجھے ساحل پہ پہنچایا
رہے گرداب میں دامانِ ساحل دیکھنے والے
آندھی چلے، چلا کرے، برق گرے، گرا کرے
اپنا جہاں مقام تھا، اب بھی وہیں مقام ہے

(روزنامہ اردو ٹائمز بمبئی ۹ ستمبر ۱۹۶۹ء)

سن وفات معلوم نہ ہو سکا۔

مولوی حکیم عبدالباری

مولوی حکیم عبدالباری بن مولانا حکیم الہی بخش بن حکیم عبداللہ بن شیخ بھولن بن شیخ
لعل محمد عرف لال بن شیخ عبداللطیف بن شیخ غلام محمد مبارک پور، مشہور عالم و طبیب مولانا حکیم
الہی بخش ساکن پورہ دلہن کے لڑکے تھے۔

۱۳۱۷ھ میں پیدا ہوئے، ان کا نام نذیر احمد بھی تھا، مگر عبدالباری کے نام سے

مشہور تھے، ابتدائی تعلیم مدرسہ احیاء العلوم میں مولانا محمد محمود صاحب معرونی اور اپنے والد وغیرہ سے حاصل کی، اس کے بعد کان پور حصولِ تعلیم کے لیے گئے اور باقاعدہ تکمیل نہ کر سکے، فن طب ان کا خاندانی ورثہ تھا اور وہ قصبہ کے چند مشہور اطباء میں سے تھے، سہل، دق، تپ محرقہ اور دیگر مخصوص امراض کے علاج میں خاص شہرت رکھتے تھے، ان کے ہاتھ سے بہت سے مریضوں کو شفا ہوئی۔

طبیعت میں نفاست و نزاکت تھی، لباس، وضع قطع اور خورد و نوش کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، کہنا چاہیے کہ بڑے نوک پلک کے آدمی تھے، ساتھ ہی طبیعت میں لا اُبابی پن تھا اور طبابت کی طرف کوئی خاص رجحان نہیں تھا، مگر آخر میں اس پر خصوصی توجہ دی اور خوب شہرت پائی، ادھر دو تین سال پہلے اختلاجِ قلب کی شکایت ہو گئی تھی، جس کے بعد رجوع الی اللہ کا ذوق بڑھ گیا تھا، وضع داری آخر تک باقی رہی اور طبعی ذوق کے مطابق زندگی بسر کی۔

شنبہ ۱۵ / ذیقعدہ ۱۳۹۴ھ / ۳۰ نومبر ۱۹۷۴ء کو حسبِ عادت دوپہر کو بازار آئے، یہیں قلبی دورہ پڑا اور درد ہوا، ساڑھے چھ بجے شام کو انتقال کر گئے۔

مولوی محمد یونس سریانویؒ

مولوی محمد یونس بن شیخ محمد شکر اللہ سریاں کے رہنے والے تھے، ان کے والد کے انتقال کے بعد بچپن ہی میں سریاں کے مشہور بزرگ اور حافظ نظام الدین صاحب کے شاگرد جناب نور محمد صاحب کی زیر تربیت آ گئے، ان کی والدہ نے نور محمد صاحب سے نکاح کر لیا تھا، انھوں نے مولوی محمد یونس کی تعلیم کی ذمہ داری لی، مرحوم نے ابتدائی تعلیم سریاں میں حاصل کر کے مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخلہ لیا اور فارسی، عربی کی جملہ تعلیم یہیں حاصل کی

اور ۱۳۵۹ھ میں مدرسہ امدادیہ مراد آباد میں دورہ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔
 کچھ دنوں اپنے وطن میں رہ کر مقامی مکتب میں تعلیم دی، پھر نور الدین پور، رسول پور
 اور نوادہ کے مدرسوں میں تعلیمی خدمت کرتے رہے، آخر میں بیمار پڑے اور معمولی طور سے فالج
 کا اثر رہا، وہی جان لیوا ثابت ہوا اور ۲/رجب ۱۳۹۵ھ/۱۲/جنوری ۱۹۷۵ء بروز شنبہ سریاں
 میں انتقال کیا، مرحوم اور راقم دونوں کی طالب علمی کا زمانہ ساتھ گزرا ہے، بے تکلف دوستوں میں
 تھے، سادگی بہت زیادہ تھی، انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۰ برس کے قریب رہی ہوگی۔

مولانا خواجہ عبدالعزیز نعمانی مبارک پوریؒ

مولانا خواجہ عبدالعزیز بن شیخ عبدالغنی نعمانی مبارک پوری محلہ پورہ صوفی میں پیدا
 ہوئے، ابتداء سے متوسطات تک مدرسہ احیاء العلوم میں وہاں کے اساتذہ سے تعلیم حاصل
 کی، فارسی کے زمانہ ہی سے میرے شریک درس تھے، آخر میں جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی
 مراد آباد سے فراغت حاصل کی، بڑے نفاست پسند، ذکی الحس اور پُر وقار آدمی تھے، زمانہ
 طالب علمی میں ان کا مکان، ہم طلبہ کا مامن و مرکز تھا، جہاں نہایت بے فکری اور بے تکلفی سے
 ہم لوگ اٹھتے بیٹھتے تھے، ان کے گھر والے بھی طلبہ کی عزت کرتے تھے اور ان کے کھلانے
 پلانے میں لذت پاتے تھے، آبائی پیشہ حلاقت تھا، خواجہ کالقب اسی زمانہ طالب علمی سے ان
 کے لیے تجویز کیا گیا تھا، اسی طرح نعمانی کی نسبت بھی اسی دور کی یادگار تھی۔

فراغت کے بعد کچھ دنوں مراد آباد اور مبارک پور رہے، پھر پینتے پور ضلع سیتا پور
 کے مدرسہ شمس العلوم میں مدرس ہوئے تو وہیں کے ہو کر رہ گئے، وہاں سے علیحدگی کے بعد
 مدرسہ احیاء العلوم کے نام سے پینتے پور میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جو آگے نہ چل سکا۔

دعا تعویذ میں بہت آگے تھے اور اس پر معاوضہ طلب نہیں کرتے تھے، کسی نے کچھ دے دیا تو لے لیا، ورنہ کوئی بات نہیں تھی، اس بے نیازی کی وجہ سے نقصان میں رہے، ویسے بھی میاں بیوی تھے، اخراجات بھی معمولی تھے، صاحب اولاد نہ ہو سکے، کئی کئی سال پر مبارک پور آیا کرتے تھے، تقریباً ۳۵ سال پینتے پور میں بسر کیے۔

آخر عمر میں فالج کا حملہ ہوا تو کچھ دنوں کے بعد میاں بیوی مبارک پور چلے آئے، علاج سے کافی افاقہ تھا، مگر اچانک فالج کا دوسرا حملہ ہوا، جس سے جاں بر نہ ہو سکے اور ۳۰ جمادی الثانیہ ۱۴۰۰ھ سنچر کا دن گزار کر رات میں انتقال کیا اور دوسرے دن یکشنبہ کو دوپہر میں دفن کیے گئے، ۱۴ جولائی ۱۹۸۰ء کو انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۶۵ سال کے حدود میں تھی۔

میری ان کی آخری ملاقات مبارک پور میں ان کے انتقال سے ایک ماہ پہلے ہوئی تھی، جب کہ وہ پینتے پور سے بیمار ہو کر آئے تھے اور اپنی سسرال سکٹھی میں قیام کرتے تھے، ان کے انتقال کے وقت میں بمبئی میں تھا، برادر م حیات النبی اور عزیزم ظفر مسعود کے خطوط سے ان کے انتقال کی خبر ملی۔

مولوی محمد بشیر خان سکٹھویؒ

مولوی محمد بشیر خان ولد ولی محمد خان، ساکن سکٹھی نے بڑی عمر میں تعلیم حاصل کی، مدرسہ احیاء العلوم میں اُردو، فارسی اور عربی کی تعلیم پا کر، آخری سال جامعہ قاسمیہ مراد آباد گئے اور وہاں کے شیوخ و اساتذہ سے دورہ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

میری اور ان کی طالب علمی کا زمانہ ایک تھا اور ہم لوگوں میں بڑا یارانہ تھا، جو آخر تک قائم رہا، بلکہ وہ میرے ہم سبق تھے، ان کے والد قدیم وضع قطع کے بے پڑھے لکھے آدمی تھے،

مگر انھوں نے اپنے اکلوتے لڑکے محمد بشیر کو مولویت کی تعلیم دلائی، مولوی محمد بشیر خان بڑے باغ و بہار اور بے تکلف آدمی تھے، ان میں سادگی انتہاء کو تھی، پوری زندگی لا اُبابی پن اور تکلیف میں بسر ہوئی، حالاں کہ بیوی بچوں کی زندگی رکھتے تھے، مگر آخر میں سب نے آنکھیں پھیر لی تھیں اور بڑی کسمپرسی کے عالم میں دنیا سے گئے، میں ان کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش میں رہا، اسی سلسلہ میں دوبارہ بمبئی بھی بلایا تھا، یک شنبہ صبح کو ۷/رجب ۱۳۹۷ھ/ ۲۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو فوت ہوئے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

(از خط ظفر مسعود ۲۷ جولائی ۱۹۷۷ء)

مولوی عبدالغفورؒ

مولوی عبدالغفور بن شیخ عبدالجید بن حافظ محمد علی، محلہ پورہ صوفی ٹن کے پاس کے رہنے والے تھے، ان کا خاندان موضع اکروڑا سے آیا تھا، اوپر جا کر ان کا سلسلہ نسب مولوی حکیم محمد سعید سے مل جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم اپنے گھر اور محلہ کے مدرسہ میں حاصل کر کے، مدرسہ احیاء العلوم میں داخل ہوئے اور فارسی و عربی کی مکمل تعلیم حاصل کر کے دو تین سال جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں تکمیل کی۔

فراغت کے بعد پوری زندگی درس و تدریس اور تعلیم و تعلم سے بے تعلق رہے، مزاج کے اعتبار سے کم آمیز تھے، کاروبار میں ترقی کی اور اولاد پھولی پھلی، نہایت سیدھی سادی اور خاموش زندگی بسر کی، آخری دور میں مشغلہ کے طور پر اپنے آبائی مکان کے پاس والی سنی مسجد کی دوکان میں معمولی طور سے دکان داری کرتے تھے اور عموماً مسجد کی چھت پر سوتے تھے۔

۴ ر شوال ۱۳۹۴ھ کی رات میں بارہ بجے مسجد کی چھت پر فالج کا حملہ ہوا اور بے ہوش ہو گئے، صبح دوشنبہ کو بغرض علاج اعظم گڑھ لے جائے گئے، دوسرے دن ۵ ر شوال منگل کی رات میں ۴ بجے وہیں انتقال کر گئے اور روضہ کی عید گاہ کے پیچھے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے، اس وقت ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی، راقم سے دو ایک سال پہلے فارغ ہوئے تھے، کہنا چاہیے کہ میرے معاصرین میں سے تھے۔

مولوی فیاض حسین واعظ

مولوی فیاض حسین بن شیخ محمد ابراہیم، ساکن محلہ پورہ صوفی نے ابتدائی تعلیم اپنے محلہ کے مدرسہ دارالتعلیم میں حاصل کی، اس کے بعد مولوی علی سجاد مبارک پوری سے پڑھ کر وثیقہ اسکول فیض آباد میں پڑھا، پھر سلطان المدارس لکھنؤ اور مدرسہ جواد یہ بنارس میں پڑھ کر فخر الافاضل کی سند لی۔

اس کے بعد مدرسۃ الواعظین لکھنؤ سے مروجہ علوم و فنون میں سند فراغت حاصل کی، ان کے اساتذہ میں مولانا سید ابن حسن نونہروی، مولانا سید محمد رضی زنگی پوری، مولانا سید سبط حسن، مولانا سید ابوالحسن عرف منن، مولانا سید احمد علی وغیرہ مشاہیر علمائے شیعہ ہیں۔

فراغت کے بعد کچھ دنوں مدرسۃ الواعظین سے تعلق رہا، اس کے بعد مسقط میں واعظ بن کر گئے، جمال دیوبند مسافر خانہ بمبئی میں واعظ اور پیش امام رہے، ان کا مزاج علمی اور تعلیمی و تصنیفی تھا اور وسعت نظری بھی تھی، بمبئی میں راقم سے ملاقاتیں رہا کرتی تھیں اور مبارک پور میں ان سے علمی ربط بھی رہا، ”تذکرہ علمائے مبارک پور“ کے لیے علمائے شیعہ کے حالات کا بیشتر حصہ ان ہی کا فراہم کردہ ہے، وہ ملنسار، باوقار اور خوددار عالم تھے، واعظ اور مبلغ ہونے کے ساتھ اپنے

مذہب کے اچھے مصنف میں تھے، ان کی دو کتابیں مطبوعہ ہیں، ایک ”تاریخ وعقائد شیعہ امامیہ“ جو اچھی خاصی ضخیم ہے اور دوسری کتاب ”صاحب امر امام عصر“ ہے، جو ہمارے پاس ہے اور موصوف کی عطا کردہ ہے، اس میں شیعہ امامیہ عقیدہ کے مطابق امام مہدی کا بیان ہے۔

اہل سنت کی کتابوں سے استدلال کیا گیا ہے، مگر اسلوب مناظرانہ نہیں ہے، بلکہ محققانہ ہے، یہی حال پہلی کتاب کا ہے، پچھلے چند سال سے اہل زمانہ کی ناقدری کے باعث گھر ہی پر تھے، اسی دوران میں فالج میں مبتلا ہو کر سالوں کے بعد شعبان ۱۳۹۴ھ میں وطن ہی میں فوت ہوئے، عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی۔

مولانا حکیم محمد صابر خان سبکٹھی

قصبہ کے مشہور طبیب مولانا حکیم محمد صابر صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے دوشنبہ ۸ / رجب ۱۳۹۹ھ / مئی ۱۹۷۹ء / ۳ بجے شب میں انتقال کیا اور دوشنبہ ہی کو اپنے آبائی قبرستان شاہ کے پنجہ میں ۸ بجے رات میں دفن کیے گئے، انتقال کے وقت آپ کی عمر لگ بھگ ۸۲ سال تھی۔

مولانا مرحوم نہایت متواضع وقانع اور بزرگ انسان تھے، پوری زندگی طبابت کے ذریعہ خدمتِ خلق میں صلہ و شہرت سے بے نیاز ہو کر بسر کی، فنِ طب میں مجتہدانہ حیثیت رکھتے تھے، ان کے شاگردوں میں کئی مشہور طبیب ہوئے، راقم کے نانہال اور مولانا مرحوم کے خاندان سے قدیم دینی و علمی تعلقات تھے، راقم بھی عربی کی ابتدائی تعلیم ہی کے زمانہ سے ان کے یہاں جا کر استفادہ کرتا تھا اور بڑی شفقت و محبت سے ملتے تھے، یہ تعلق آخری وقت تک وضع داری کے طور پر جانبین سے قائم رہا اور اس میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا، ان کے ساتھ مبارک پور سے

فنِ طب بھی ختم ہو گیا اور اب یہاں کوئی قابلِ ذکر حکیم و طبیب نہیں رہا، اللہ رحم فرمائے۔

مولوی فخر الدین مبارک پوری

مولوی شمس الدین صاحب حسینی مبارک پوری کے سب سے بڑے صاحب زادے مولوی فخر الدین مبارک پوری کا مکہ مکرمہ میں بروز دوشنبہ ۱۲/ فروری ۱۹۸۳ء کو جدہ آتے ہوئے حدودِ حرم ہی کے اندر ٹیکسی کا ایکسیڈنٹ ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا، رَحِمَهُ اللہُ وَغْفَرَ لَہُ۔

زاہد اسپتال میں بھرتی کیے گئے، مگر ڈھائی گھنٹہ کے بعد انتقال ہوا، نمازِ جنازہ بعد نمازِ عصر حرم میں ادا کی گئی اور جنتِ المعلیٰ میں دفن کیے گئے، دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی تھی، مرحوم جوان، نیک اور صالح تھے، آپ جدہ میں ہندوستانی قونصل خانہ میں عربی انگریزی کے ٹائپسٹ تھے، انتقال کے وقت مرحوم کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال تھی۔

مولوی حافظ مبارز الدین مبارک پوری

مولانا شمس الدین صاحب حسینی مبارک پوری کے صاحب زادے مولوی حافظ مبارز الدین ۲۰/ شعبان ۱۴۰۰ھ / ۴/ جولائی ۱۹۸۰ء جمعہ کو بمبئی جاتے ہوئے ناسک ریلوے اسٹیشن پر ریل پر سوار ہوتے ہوئے شہید ہو گئے تھے، رحمۃ اللہ وغفرلہ۔

مرحوم جوان صالح عالم تھے، دارالعلوم سے فراغت کے بعد جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخل ہو کر گزشتہ سال فارغ ہوئے تھے اور دارالافتاء ریاض کی طرف سے ان کا تعاقب ہندوستان میں ہوا تھا، مگر اپنی ذمہ داری کے سلسلے میں بمبئی کا یہ سفر کر رہے تھے، ناسک

کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مولانا خالد کمال مبارک پوریؒ

خلف اکبر مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ

از: قاضی ظفر مسعود مبارک پوری

ہمارے بھائی مولانا خالد کمال مبارک پوری، جنہیں ہم سب بھائی بہن ”بڑے بھائی“ کہہ کر پکارتے تھے، جب کہ خاندان اور گھر کے دیگر بڑے افراد خالد کمال کہتے تھے، ان کی تاریخ پیدائش مدرسے کے سرٹیفکیٹ کے حساب سے یکم دسمبر ۱۹۳۸ء ہے۔

بھائی صاحب بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے میں بہت تیز اور ذہین و فطین تھے، مگر پڑھتے کم تھے، جو پڑھتے تھے وہ یاد ہو جاتا تھا، والد صاحب کی طرح پڑھنے کے زمانے ہی سے شاعری اور مضمون نگاری کرنے لگے تھے، انھوں نے بھی والد صاحب کی طرح پوری تعلیم احیاء العلوم ہی میں حاصل کی، دو سال کے لیے دیوبند گئے اور وہیں سے ۱۹۵۸ء میں سند فراغت حاصل کی، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں تھوڑے عرصہ کے لیے تدریسی خدمات انجام دی اور اس کے بعد چند سال مدرسہ مفتاح العلوم بھیونڈی میں جسے والد محترم نے ۱۹۵۱ء میں جاری کیا تھا، درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔

اس دوران عبدالمنعم انجارتو نصل جنرل حکومت مصر نے باصرار آپ کو جامع ازہر میں سرکاری وظیفے پر داخلہ کے لیے والد صاحب سے بہت زور دیا، مگر آپ نے انکار کر دیا، کیوں کہ اس زمانے میں جامع ازہر سے پڑھ کر واپس آنے والے طلبہ عام طور پر کوٹ پینٹ پہن

لیتے تھے اور داڑھی بھی صاف کرا دیا کرتے تھے، اس لیے والد صاحب کو انقباض تھا، مگر جب جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا آغاز ہوا تو والد صاحب نے انشراح کے ساتھ ۱۹۶۲ء میں داخلہ کرا دیا، جس کا تذکرہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نہایت دلچسپ انداز میں کرتے ہیں:

”یہ ۱۹۶۲ء کی بات ہے، مدینہ یونیورسٹی کے ہوسٹل میں ایک ہنس مکھ نوجوان ہمارے روم پارٹنر بن کر آئے، ان کا نام خالد کمال تھا، خالد کمال ہوسٹل میں بادبہار بن کر آئے، کمرے کی سنجیدگی قہقہوں میں بدل گئی، معلوم ہوا کہ ہمارے یہ نئے روم پارٹنر مشہور و معروف عالم دین قاضی اطہر مبارک پوری کے صاحب زادے ہیں، قاضی صاحب کے نام سے ہر شخص واقف تھا، جسے کچھ اسلامی کتابوں اور رسائل و جرائد کے مطالعے کا موقع ملا تھا“۔ (ماہ نامہ دارالسلام اگست ۱۹۹۶ء)

مدینہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۷ء میں سند فراغت حاصل کرنے کے بعد ہی حکومت سعودیہ کی طرف سے دین حنیف کی اشاعت کے لیے مبعوث ہو کر گھانا مغربی افریقہ بھیجے گئے، جہاں چودہ سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے رہے۔

ربوہ (پاکستان) کے بعد دنیا میں قادیانیوں کے سب سے بڑے مرکز گھانا میں اسلام کا بہتر تعارف کرایا اور صحیح دینی شعور بیدار کیا، پورے گھانا میں گاؤں گاؤں، شہر، شہر، قبیلہ قبیلہ گھوم گھوم کر جلسہ کیا اور قادیانیوں کو چیلنج دیا، چوں کہ گھانا بھی برٹش کالونی تھا، اس لیے اپنے پروردہ مرزا غلام احمد قادیانی کی گھانا کو پوری دنیا میں اسلام کے مقابلے میں قادیانیت کا مرکز بنانے کی کھلی ہمت افزائی کی اور اس کے لیے تمام ہتھکنڈے استعمال کیے، جس میں سب سے مؤثر حربہ اپنی تبلیغ کا یہ استعمال کیا کہ تم لوگ حج کے لیے جاتے ہو، وہاں جتنے کرتا پانجامہ اور شیروانی میں لوگ نظر آتے ہیں، سوائے قادیانی کے کوئی اور نہیں، وہ بیچارے

سیدھے سادے ان کے چنگل میں پھنستے رہے اور یہ لوگ اسپتال، اسکول کالج اور مسجدیں بنوا کر لوگوں کو متوجہ کرتے رہتے اور حالات یہ تھے کہ کوئی ان کی صحیح رہنمائی کرنے والا نہیں تھا، چوں کہ بھائی صاحب بھی کرتا پاجامہ اور شیروانی پہنتے تھے، اس لیے ان کے بارے میں بھی یہ مشہور کیا کہ دیکھو حکومت سعودی نے بھی اپنا نمائندہ ایک قادیانی ہی کو بھیجا ہے، اس زمانے میں پاکستان کا وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں ایک نہایت بد بودار قادیانی تھا، اس لیے غیر ممالک میں تقریباً پچتر فیصد قادیانی بھیجے جاتے تھے اور وہ لوگ بھی اس سلسلے میں مقامی لوگوں کو ورغلا تے تھے اور بیچارے دوسرے لوگ اگر کبھی منہ کھولتے یا احتجاج کرتے تو فوراً حکومت پاکستان کا عتاب نازل ہوتا، یا تبادلہ کر دیا جاتا، یا پاکستان بلا لیا جاتا۔

اتفاق سے بھائی صاحب کے ساتھ ایک اور ہندوستانی عالم جو جامع ازہر کے فارغ تھے، مولانا فضل الرحمن بہاری وہ بھی مبعوث ہوئے، وہ بھی دارالعلوم دیوبند سے فارغ تھے، ان دونوں حضرات نے وہاں کے لوگوں کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ قادیانی ہندوستان و پاکستان میں غیر مسلم مانے جاتے ہیں، ان کا عقیدہ عمل سراسر اسلام کے منافی ہے، انگریزوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے اندر اختلاف پیدا کرنے کے لیے، ان کو خوب بڑھا دیا اور وہی کام یہ لوگ گھانا میں بھی کر رہے ہیں، ہم ان کو کھلا ہوا چیلنج دیتے ہیں کہ یہ پوری دنیا حتیٰ کہ اپنے آقا ظفر اللہ خاں کو بھی بلا لیں، ہم ان سے بحث کرنے کے لیے تیار ہیں، بس کیا تھا، پورے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، پاکستانی سفارت خانے والوں نے بھی کھل کر قادیانیوں کا ساتھ دیا، یہ دو ہندوستانی مولوی کیا کر پائیں گے، انھیں یہ خبر نہیں تھی کہ یہ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہیں، جس کا مقصد ہی باطل عقائد سے ٹکر لینا ہے۔

چنانچہ معرکہ آرائی تو ہوئی نہیں، مگر دکھاوے کے لیے محاذ آرائی کرتے رہے،

ان دونوں مولویوں کی کوشش رنگ لائی اور گاؤں کا گاؤں اور قبیلے کا قبیلہ توبہ واستغفار کر کے از سر نو کلمہ توحید پڑھ کر اسلام میں داخل ہو گیا۔

اس سلسلے میں سر ظفر اللہ خاں اور شاہ فیصل مرحوم میں خط و کتابت بھی ہوئی، سر ظفر اللہ خاں چوں کہ بین الاقوامی عدالت ہیگ (جنیوا) کا صدر رہ چکا تھا، اس لیے بڑے کڑوہ سے شاہ فیصل مرحوم کو لکھا کہ ہم تو دنیا میں اتحاد بین المسلمین کے لیے رات دن کام کرتے ہیں اور اسلام کی اشاعت و ترویج کے لیے کوشاں رہتے ہیں، مگر آپ کے آدمیوں نے گھانا میں طوفان کھڑا کر رکھا ہے، تو یہ کام کیسے شرمندہ تعبیر ہوگا، جب کہ آپ بھی اس کے پرزور حامی ہیں، چوں کہ اس درمیان میں پورے گھانا سے شاہ فیصل مرحوم کے نام لعنت و ملامت کے خطوط کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور جتنا خط جاتا تھا شاہ فیصل مرحوم سب کو بہ نفس نفیس پڑھتے تھے اور جہاں ضرورت سمجھتے تھے، سرخ نشان لگا کر گھانا اپنے سفیر کو واپس بھیج دیتے تھے۔

بھائی صاحب کہتے تھے کہ سفیر ہم لوگوں کو ڈاک دکھلاتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ سب شاہ کے قلم کا نشان ہے، جسے میں پہچانتا ہوں، شاہ فیصل مرحوم ان علاقوں میں دوبارہ جا کر قبیلوں کے سردار سے ملنے کے لیے حکم دیتے تھے، شاہ فیصل مرحوم نے بڑی خندہ پیشانی سے سر ظفر اللہ خاں کے خط کا جواب دارالافتاء سے منگوایا، جس میں صاف لکھا تھا کہ ان کا مسلمانوں کے عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ غیر مسلمین کے زمرے میں آتے ہیں، اسی کے ساتھ شاہ مرحوم کو دارالافتاء نے یہ مشورہ بھی دیا کہ آئندہ حج کے نام پر کوئی قادیانی مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں داخل نہ ہونے پائے۔

چنانچہ سر ظفر اللہ خاں کو جواب ارسال کر دیا گیا اور اسی کے ساتھ ساتھ سرکاری سرکلر بھی جاری ہو گیا اور سعودی سفراء کو ہدایت کر دی گئی کہ آئندہ حج کے ویزے پر کوئی قادیانی

اگر مملکت میں داخل ہوا تو وہاں کی حکومت اس کی ذمہ دار ہوگی اور ہمارے اور اس حکومت کے تعلقات بگڑ جائیں گے، چنانچہ اس سال ہندوستان میں بھی بڑی سختی تھی کہ کوئی قادیانی ویزا حاصل نہ کر سکے اور پاکستان میں تو طوفان کھڑا ہو گیا، اس لیے کہ سرکاری مشنریوں اور حکومت کے اہم عہدوں پر قادیانی فائز تھے، اسی ہنگامہ میں مجلس ختم نبوت بنی، جس کی بے مثال قربانیوں کے سامنے آخر حکومت نے تھک ہار کر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا۔

اس طرح پوری دنیا میں قادیانیت کا زور ٹوٹ گیا اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے ان سے چھٹکارا ملا، الحمد للہ علی ذالک۔

یہ میں نے اس لیے لکھ دیا کہ یہ ایک حقیقت ہے، جو ریکارڈ میں آجائے، اس زمانے کے سارے خطوط بھائی صاحب کے جو والد صاحب کے نام ہیں، اس سے بھرے پڑے ہیں اور ضائع ہو رہے ہیں۔

بھائی صاحب کی کارگزاریوں سے خوش ہو کر حکومت سعودی نے ۱۹۸۱ء میں انھیں نیوزی لینڈ بھیجا، جہاں وہ اپنی وفات (۶ دسمبر ۱۹۹۹ء) تک مقیم رہے۔

اس کی بھی تھوڑی تفصیل سن لیجئے، جتنے بھی سرکاری یا غیر سرکاری اور تجارتی وفود آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ جاتے رہے، سب یہ رپورٹ دار الافتاء ریاض کو بھیجتے تھے کہ نیوزی لینڈ ایک پُر فضا اور پُر سکون ملک ہے، جہاں دنیا کے بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ رہتے ہیں، وہ لوگ اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں، چنانچہ کسی ایسے شخص کو بھیجا جائے، جو اسلام کو ان کے سامنے مکمل طور پر ان کی زبان یعنی انگریزی میں پیش کر سکے اور ان کی صحیح رہنمائی کر سکے، چوں کہ بھائی صاحب کو چودہ سالہ تجربہ، انگریزی، عربی پر عبور اور ان سب سے بڑھ کر دینی معلومات اور مسائل کی پورے طور پر جانکاری تھی، اس لیے انھیں کا انتخاب کیا اور بھیجا گیا۔

جہاں انھوں نے لگ بھگ اٹھارہ سال تک اسلام اور مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کی اور اسلام کے نام پر جاری رسومات و خرافات کو ختم کرایا اور پورے وقار کے ساتھ اسلام کے نمائندے بن کر رہے اور اپنی جدوجہد سے وہاں کے دارالسلطنت و پبلنگٹن میں پہلی مسجد کی بنیاد رکھی اور یورپین افسران اور باشندوں کے سامنے دور کھت نماز پڑھ کر مسجد کا افتتاح کیا، یہ آپ کا کمالِ خلوص تھا کہ افتتاح رسمی نہیں رہنے دیا، بل کہ پورے ملک میں مسلمانوں کو آزادی اور برابری کے ساتھ رہنے کا حق دلوا یا اور سینکڑوں انگریزوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا، آج پورے نیوزی لینڈ میں مسلمان اپنے تمام تہذیبی تخصّص اور پوری شان و شوکت کے ساتھ رہتے ہیں اور بھائی صاحب نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور ناتھ پیفک کے جزیروں میں تاریخ کا ایک حصہ بن گئے۔

عربی زبان اور دینی معلومات کے سلسلے میں بمبئی کے مشہور مہمن خاندان کے فرد احمد غریب صاحب ماہنامہ ”البلاغ“ فروری ۱۹۶۷ء میں لکھتے ہیں:

”بہت دنوں سے قاضی اطہر صاحب کی کچھ خبر نہیں، دو ہفتہ قبل مدینہ منورہ میں ان کے صاحب زادے مولوی خالد کمال سے ملاقات ہوئی تھی، ماشاء اللہ دینی معلومات میں کافی ترقی کر لی ہے اور ہمارے یہاں کے علمائے کرام و فضلاء عظام میں جو کمی محسوس کر رہا تھا عربی بول چال کی، انھوں نے وہ کمی بہت اچھی طرح پوری کر لی ہے، عربی میں گفتگو بہت اچھی طرح کر لیتے ہیں اور اس چیز کی مجھ جیسے خادم علماء کو کھٹک رہتی تھی، ایک مرتبہ ہم بھائیوں نے یہاں ایک دعوت کی، جس میں چار پانچ ہندوستان و پاکستان کے علماء کو مدعو کیا، اسی موقع پر یہاں کے علماء کو بھی دعوت دی، عربی و عجمی دونوں پارٹیاں علیحدہ علیحدہ معلوم ہوتی تھیں، کیوں کہ اپنے علماء عربی میں گفتگو پر قادر نہیں ہوتے ہیں، ہندوستان کے مولانا علی میاں اس سے مستثنیٰ ہیں کہ وہ

عربی زبان پر قدرت رکھتے ہیں، اسی طرح پاکستان کے مولانا محمد یوسف صاحب بنوری بھی عربی زبان میں گفتگو پر قدرت رکھتے ہیں۔

والد صاحب اپنے مضمون ”اہلِ حرمین سے ملاقاتیں“ کے تحت لکھتے ہیں:
 ”بارہا ایسا ہوا کہ مدینہ منورہ کی ان علمی مجلسوں میں عزیزم خالد کمال ساتھ رہے اور اساتذہ و شیوخ سے گفتگو کے درمیان کوئی لفظ بروقت یاد نہیں آیا اور مطلب کی ادائیگی میں دقت محسوس ہوئی تو وہیں باپ نے بیٹے کی طرف مراجعت کر لیا اور یہ بات بھی ان اساتذہ اور شیوخ کے نزدیک علمی شان کی ایک ادا بن گئی۔“

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری والد صاحب کے نام ۲۰ صفر ۱۳۸۴ھ کے خط میں لکھتے ہیں:

”آپ کے صاحب زادے سے مل کر بہت خوشی ہوئی، ماشاء اللہ ذکی اور باوقار ہیں، اللہ تعالیٰ جید عالم بنائے۔“

مولانا لقمان سلفی سکرپٹری شیخ ابن باز والد صاحب کے نام ۵ جون ۱۹۶۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

”کل بھائی خالد کمال کا خط آیا، خیریت سے ہیں اور مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے تعاقد کے بعد فوراً ہی خط کیوں نہ لکھا، میں نے انھیں خط لکھ دیا ہے اور معذرت کر لی ہے، ان کی چھٹی ۸ ربیع الثانی سے شروع ہوگی، ان کے کام سے نائب مفتی خوش ہیں، خدا مزید کی توفیق دے۔“

مولانا ڈاکٹر خالد محمود اور مولانا منظور احمد چنیٹوی فاتح ربوہ اپنے ”دورہ افریقہ“ ۱۹۷۶ء ناشر مکتبہ ختم نبوت لاہور میں لکھتے ہیں:

.....

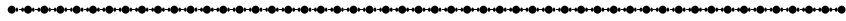
”وفد سیدھے سعودی عرب کے سفارت خانے میں پہنچا اور محترم سفیر سے ملاقات کی اور ساتھ ہی گھانا کے دینی حالات اور مرزائیوں کے سماجی تسلط پر کچھ بات چیت کی، سفیر صاحب وفد کی آمد اور پروگرام سن کر بہت خوش ہوئے اور ہر قسم کے تعاون کی پیش کش فرمائی، ایک بجے کے قریب اراکین وفد ناظم استقبال کی کار میں شیخ خالد کمال مبعوث دارالافتاء کے مکان پر پہنچے اور طے پایا کہ آج شام پاکستانی سفیر سے بھی ملاقات ہو جائے، چنانچہ ۵ بجے وفد نے پاکستانی سفیر سے ملاقات کی اور ان سے گزارش کی کہ یہاں گھانا میں اس قرارداد کی اشاعت نہیں ہوئی ہے، جو پاکستان نیشنل اسمبلی نے ختم نبوت کے سلسلے میں پاس کی تھی اور یہاں کے عوامی حلقوں میں اب تک پاکستانی سے مراد قادیانی ہی لیے جاتے ہیں، سفیر صاحب نے وعدہ فرمایا کہ وہ ہمیں اس قرارداد کی نقول مہیا کریں گے۔

ہمیں اس بات سے بھی دکھ ہوا کہ گھانا جیسے اہم مقام میں جسے مرزائی دوسرا ربوہ سمجھتے ہیں، پاکستان نیشنل اسمبلی کی ختم نبوت کی قرارداد کی مناسب تشہیر نہیں ہوئی، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ پاکستانی اور مرزائی کے مترادف ہونے کا تصور یہاں سے یکسر مٹ نہ جاتا۔۔۔۔۔۔ ہاں شیخ خالد کمال کو ہم نے اس سلسلے میں بہت فکر مند پایا، انھوں نے یہاں کے مقامی دینی ماہنامہ ”اطہر“ میں جو انگریزی زبان میں چھپتا ہے، مرزائیت کے بارے میں چھیڑ چھاڑ کر رکھی ہے۔

والد صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر خالد کمال لکھنے پڑھنے میں آتے تو مجھ سے آگے جاتے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان سے دوسرے طریقے سے دین کا بڑا بڑا کام لیا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے۔ آمین ثم آمین

آپ نے کم از کم چودہ پندرہ حج ادا فرمایا، ۱۹۹۶ء میں والد محترم کے انتقال کے بعد وطن آئے تو والدہ مرحومہ کو لوا کر حج کے لیے تشریف لے گئے، اسی سال منیٰ میں زبردست آگ لگی تھی، پھر ۱۹۹۸ء میں نیوزی لینڈ سے سیدھے جدہ تشریف لے گئے اور وہاں پندرہ دن رہ کر فریضہ حج ادا کیا اور ہندوستان تشریف لائے اور ایک ماہ گھر رہ کر واپس تشریف لے گئے، چند ماہ کے بعد برین ہیمرج کا حملہ ہوا، جس میں سات آٹھ ماہ مبتلا رہے، حالاں کہ آپریشن بھی ہوا، مگر جس کا وقت آجائے، اسے کون ٹال سکتا ہے، بالآخر وقت موعود آ ہی گیا اور اسی مرض میں ۶ دسمبر ۱۹۹۹ء اور ہندوستانی تاریخ کے مطابق ۵ دسمبر ۶ بجے شام کو انتقال فرمایا۔

مرتبہ بخشنے شہادت کا
موت پردیش ہی میں آدھمکی



مراجع و مصادر

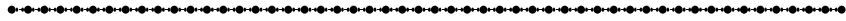
نمبر	نام کتاب	مصنف	مطبع
۱	اخبار لبرل اعظم گڑھ		اعظم گڑھ
۲	اعظم گڑھ گزیٹیر	مسٹر ڈی۔ ایل۔ ڈرک۔ بروکمان	الہ آباد
۳	آئینہ اودھ	مولانا شاہ ابوالحسن قطبی مانک پوری	نظامی پریس کانپور
۴	اذکار برابر ترجمہ گلزار ابرار	مولانا فضل احمد	منفید عام آگرہ
۵	اخبار اردو ٹائمز		بمبئی
۶	بحر ذخار	مولوی وجیہ الدین اشرف	قلمی
۷	تاریخ المتوال و اہلہ	مولانا عبدالسلام مبارک پوری	احمدی پریس پٹنہ
۸	تذکرۃ الحفاظ	امام ذہبی	حیدر آباد
۹	تذکرہ علماء ہند	مولوی رحمان علی	نول کشور لکھنؤ
۱۰	ترجم علماء اہل حدیث	مولانا بیچئی نوشہروی	دلی
۱۱	تذکرہ علماء حال		
۱۲	ترجمان اہل حدیث	مولانا ثناء اللہ امرتسری	دلی
۱۳	الثقافة الاسلامیة فی الہند	مولانا عبدالحی	حیدر آباد
۱۴	حیات شلی	علامہ سلیمان ندوی	معارف پریس اعظم گڑھ
۱۵	خلاصہ حال اقوام ہند	مسٹر ٹی ڈبلو ٹالبرٹ	جیل پریس ڈیرہ اسماعیل خاں
۱۶	خلاصہ تاریخ مسعودی	مولوی صادق	غالب الاخبار پریس
۱۷	خم خانہ جاوید (جلد پنجم)	لالہ سری رام ایم۔ اے دہلوی	دلی
۱۸	خانوادہ ظہیریہ	مولانا خالد کمال مبارک پوری	البلاغ بمبئی

۱۹	رحلۃ ابن بطوطہ	ابن بطوطہ	مصر
۲۰	سیرۃ البخاری	مولانا عبدالسلام مبارک پوری	دلی
۲۱	سلک گہر	جاوید انصاری برہان پوری	برہان پور
۲۲	صدرنگ	مولانا قمر الزماں قمر مبارک پوری وفیاض گوالیاری	اسرار کریم پریس الہ آباد
۲۳	صدق جدید	مولانا عبدالماجد دریابادی	لکھنؤ
۲۴	عمل صالح	محمد صالح کمنبوہ	رام پور
۲۵	غزائنامہ	مولوی عنایت اللہ	نظامی پریس کان پور
۲۶	گل رعنا	مولانا عبدالحی	لکھنؤ
۲۷	گنج ارشدی	مولانا شاہ غلام رشید جون پوری	قلمی
۲۸	مقدمہ آثار الکرام	صمصام الدولہ شاہنواز خان	لاہور
۲۹	مظہر الاحدیۃ	مولوی عبدالاحد ظفر آبادی	کاظمی پریس کان پور
۳۰	مرآۃ الاسرار	مولانا عبدالرحمن چشتی	قلمی
۳۱	مناقب غوثی باب ہشتم	شیخ شمس الدین حیدری	قلمی
۳۲	آثار و معارف	مولانا قاضی اطہر مبارک پوری	ندوۃ المصنفین دلی
۳۳	مقدمہ عون المعبود	مولانا ابوالطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی	دلی
۳۴	ماہ نامہ البلاغ	اڈیٹر مولانا قاضی اطہر مبارک پوری	بہمنی
۳۵	ماہ نامہ فاران	اڈیٹر ماہر القادری	کراچی
۳۶	نزہۃ الخواطر	علامہ عبدالحی لکھنوی	حیدرآباد
۳۷	نمود سحر	مولانا شرمصباحی مبارک پوری	نامی پریس لکھنؤ
۳۸	واقعات و حادثات مبارک پور	مولوی علی حسن فاروقی مبارک پوری	قلمی

تکبیلہ

تذکرہ علمائے مبارک پور

مفتی محمد صادق مبارک پوری



بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

تذکرہ علمائے مبارک پور کا جون ۱۹۷۴ء میں پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا، اس کے مصنف و مؤلف مورخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری اس کے بعد ۲۲ سال تک بقید حیات رہے، اس عرصہ میں مرحوم و مغفور ہونے والی شخصیات کا تذکرہ رقم کرنے کے خواہش مند تھے، اس لیے ۲۰ علمائے عظام کی تاریخ وفات لکھ لی تھی، مگر زندگی کے لمحات نے انھیں فرصت نہ دی، ان کے وصال کے بعد دوسرے ایڈیشن ۲۰۰۷ء میں ان علمائے کرام کا تذکرہ شامل کرنے کا عزم واردہ تھا، مگر اس کی تکمیل ابھی مقدر نہ تھی۔

اب ان علمائے کرام کا تذکرہ رقم کرنے کے لیے قلم نے اپنا سفر شروع کیا تو ۸۰ ر سے زائد علمائے کرام کے حالات زندگی معرض تحریر میں آ گئے۔

یہ مؤرخ مبارک پوری کے کام کی تکمیل ہے، مستقل تصنیف نہیں ہے، اس لیے اس کا نام مکملہ تجویز کیا گیا ہے، اس میں کوئی خوبی نظر آئے، مؤرخ مبارک پوری کی برکت و فیض ہے، اپنا کوئی کمال نہیں، اور کوئی خامی و نقص نظر آئے تو منی اور من الشیطان ہے۔

مولانا قاضی سلمان مبشر صاحب مبارک پوری، مولانا مفتی فرحت افتخار صاحب نوادوی، مولوی مفتی عین الہدی صاحب قاسمی، قاری محمد اختر صاحب الحسینی، جناب جمیل احمد بھائی علیگ، جناب رضوان اللہ صاحب سیٹھ کا بے ممنون و مشکور ہوں کہ اول الذکر کی رہنمائی و تعاون رسالہ کی ترتیب میں رہی، اور بقیہ حضرات نے مختلف شخصیات کے سلسلے میں معلومات بہم پہنچائی۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور ان حضرات کے تعاون سے یہ رسالہ ایک سال

کی کدو کاوش کے نتیجہ میں اب قارئین کرام کی نگاہوں کے سامنے ہے، میں اپنی اس کاوش قلم میں کہاں تک کامیاب رہا، اس کا فیصلہ خود قارئین کرام کریں گے۔

تاہم چند باتوں کی وضاحت ضروری خیال کی جاتی ہے:

(۱) اکثر شخصیات کے اہل خانہ کے معلومات بہم پہنچانے میں سستی و کوتاہی رہی، ہاں رسالہ شائع ہو جانے کے بعد معلومات کا دعویٰ خوب ہوتا ہے۔

(۲) بعض حضرات نے معلومات پہنچانے میں تنگ نظری اور تعصب کا ثبوت دیا۔

(۳) بعض شخصیات کے حالات زندگی مختصر ہونے کی وجہ ادھوری معلومات کا حصول ہے۔

(۴) جن شخصیات کے بارے میں جو بھی معلومات حاصل ہوئیں، ان میں تعصب اور تنگ نظری کی دیوار حائل نہیں ہونے دیا گیا۔

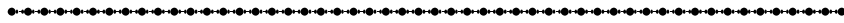
(۵) کسی شخصیت کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا گیا، اور نہ ہی کشف و کرامت کے واقعات سے ان کے قد کو اونچا کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ اس کاوش قلم کو قبول فرمائے اور مصنف کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے۔

محمد صادق مبارک پوری

جنرل سکریٹری مولانا شکر اللہ اکیڈمی

مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی



حضرت مولانا امین احسن صاحب اصلاحی بمہوری

مولانا امین احسن ولد حافظ محمد مرتضیٰ صاحب اصلاحی مدرسۃ الاصلاح کے گل سرسبد اور فکرِ حمید کے سب سے نام ور عالم تھے، ان کی متحرک زندگی درس و تدریس، تقریر و خطابت، تصنیف و تالیف اور اشاعتِ علم دین کے لیے وقف تھی۔

ضلع اعظم گڑھ کے مشہور مردم خیز موضع بمہور میں ۱۹۰۳ء/ ۱۳۲۱ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی نوشت و خواند کے بعد ۱۹۱۴ء میں مدرسۃ الاصلاح سرانے میر میں داخل کیے گئے، اس دور میں یہ چشمہ علم و معرفت پوری آب و تاب سے جاری تھا، مولانا شبلی ندوی متکلم، مولانا عبدالرحمن نگرانی، مولانا عبدالصمد صاحب ندوی، مولانا حکیم محمد احمد لہراوی جیسے فضلاء عصر طالین علوم و فنون کے سینوں کو علم و فضل کی امانت سونپ رہے تھے۔

نصابی علوم و فنون کی تکمیل کے بعد خصوصی طور پر مولانا حمید الدین فراہی کے درس ہائے قرآن سے بھرپور استفادہ کیا، ان کا ذوق و شوق دیکھ کر مولانا فراہی نے بھی اپنی توجہ کا مورد بنایا۔ مشہور غیر مقلد عالم و محدث شارح ترمذی مولانا عبدالرحمن صاحب مبارک پوری سے خصوصی طور پر حدیث پڑھی۔

فراغتِ تعلیم کے بعد اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا، سب سے پہلے ”مدینہ“ بجنور سے بحیثیت ایڈیٹر وابستہ ہوئے، وہاں سے منتقل ہو کر لکھنؤ آ گئے، اور اخبار ”سچ“ سے منسلک ہو گئے، دو ڈھائی سال منسلک رہے، پھر بحیثیت مدرس اپنے مادر علمی مدرسۃ الاصلاح سرانے میر آ گئے۔

جب مودودی صاحب کے ماہ نامہ ”ترجمان القرآن“ کا غلغلہ ہوا تو جدید طبقہ کے ساتھ علمائے دین بھی اس سے متاثر ہو گئے، مگر آپ اس سے متاثر نہیں ہوئے، لیکن جب

مودودی صاحب نے اپنے حلقہ اثر کو بڑھانے کے لیے ملک کا دورہ کیا تو وہ سرائے میر بھی آئے، اس موقع پر دیگر علمائے مدرسۃ الاصلاح کی طرح فکر حمید کا یہ سب سے بڑا داعی و شارح بھی اس سے اپنے دامن کو نہ بچا سکا، پھر وہ وقت آیا کہ اپنے حضرت الاستاذ و مربی کے آستانے کو چھوڑ کر ۱۹۴۵ء میں مودودی صاحب کی تحریک کے مرکز پٹھان کوٹ پہنچ گئے۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ دیگر بہت سے علمائے کرام کی طرح آپ بھی جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو گئے، اس علیحدگی کے بعد اصل کام کی طرف پلٹے، اور حلقہ تدبر قرآن قائم کیا، اس کے ذریعہ ذی استعداد طلبہ اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو کتاب الہی اور حدیث نبوی کا درس دینا شروع کیا، اور اپنے علوم و مقاصد کے اظہار کے لیے رسالہ ”میشاق“ جاری کیا، اسی کے ساتھ تدبر قرآن کے نام سے تفسیر تصنیف کرنی شروع کیا، جب اپنی تفسیر تدبر قرآن کی ۹ جلدوں میں تکمیل کر چکے، تو تدبر حدیث پر کام شروع کیا، مؤطا امام مالک اور صحیح بخاری کی حدیثوں کی شرح و ترجمانی سے متعلق حصے ماہ نامہ ”تدبر“ میں شائع ہوتے رہے، آپ کی چند تصانیف درج ذیل ہیں:

حقیقت شرک، حقیقت توحید، حقیقت نماز، حقیقت تقویٰ، اسلامی ریاست میں فقہی اختلاف کا حل، تدوین قانون اسلامی، تزکیہ نفس، دعوت دین، اور اس کا طریقہ کار، قرآن میں پردے کے احکام، مبادی تدبر قرآن، مبادی تدبر حدیث، مولانا حمید الدین فراہی، اسلامی معاشرت میں عورت کا مقام وغیرہ وغیرہ۔

مستقل تصانیف کے علاوہ مولانا فراہی کی متعدد تصنیفات اور رسائل کا اردو ترجمہ کیا، ۱۶ دسمبر ۱۹۹۷ء / ۱۴۱۸ھ کو انھوں نے جان جان آفریں کے حوالہ کر دی۔

(تذکرہ علمائے اعظم گڑھ بحوالہ معارف اعظم گڑھ جنوری ۱۹۹۸ء)

مولانا الیاس احمد صاحب اصلاحی بمہوری

مولانا الیاس احمد بن شیخ سلیمان بن شیخ امیر علی بن شیخ دبیر علی صاحب اصلاحی بمہوری نہایت حیا دار، خوش اخلاق، سادہ مزاج، مدبر اور معاملہ فہم تھے، قناعت و استغناء، تواضع و انکساری وغیرہ صفات سے متصف تھے، دراز قد، گورا جسم، بڑی بڑی آنکھیں، غرض نہایت ہی خوب صورت انسان تھے۔

۱۹۰۷ء میں بمہور کے ایک خوش حال، اور علمی گھرانے میں آنکھ کھولی، مقامی طور پر کچھ دنوں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۹ سال کی عمر میں ۱۹۱۶ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخلہ لیا، اور وہیں سے سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد مدرسۃ الاصلاح میں کچھ دنوں تک درس و تدریس سے وابستہ رہے، مگر یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چل سکا اور موروثی زمین داری میں ایسا الجھے کہ پھر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا موقع نہ پاسکے۔

آس پاس کے موضوعات پر آپ کا کافی گہرا اثر تھا، پنجایت وغیرہ میں آپ کا فیصلہ حتمی اور آخری ہوتا تھا۔

آپ کا نظریہ تھا کہ جو کچھ بھی سیکھا جائے، چاہے علم ہو، کوئی اور چیز، اس میں کمال پیدا کیا جائے، یہی وجہ تھی کہ علم کے ساتھ اس وقت کے مشہور کھیل فٹ بال، کبڈی، اور لائٹھی کے مشہور کھلاڑی تھے اور ان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

۱۹۷۰ء میں فریضہ حج ادا کیا، آخری ایام میں جب زیادہ کمزوری ہو گئی، ہر وقت رقت طاری رہتی، اکثر احادیث اور بزرگوں کے واقعات سنتے اور روتے تھے، علماء و حفاظ کی بڑی قدر کرتے

تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ کی نسل سے تقریباً ۲۲ علماء و حفاظ پیدا ہوئے، یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔
 بہر حال علم و عمل، حسن و سادگی، اور ہمت و بہادری کا یہ پیکر جس نے کسی میدان میں
 شکست نہیں کھائی، بالآخر ۲۸ نومبر ۱۹۷۵ء / ذی قعدہ ۱۳۹۵ھ جمعہ کی رات میں موت کے
 ہاتھوں ہار گیا اور اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ (تلخیص از مقالہ مولانا محمد طیب قاسمی)

مولانا انیس احمد صاحب اصلاحی بمہوری

زیر نظر تحریر حضرت مولانا رضوان احمد صاحب القاسمی بمہوری صدر
 المدرسین جامعہ رشیدیہ بمہور کا مختصر و جامع مقالہ ہے، جو آپ نے بمہور میں
 ہونے والے سیمینار کے لیے رقم فرمایا تھا، راقم کی خواہش پر اس کی فوٹو کاپی
 عنایت فرمائی، مولانا موصوف کے شکریہ کے ساتھ بعینہ اس کو کتاب میں
 شامل کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا انیس احمد صاحب اصلاحی ولد حاجی محمد سلیمان صاحب ۱۹۱۳ء میں
 اپنے آبائی وطن بمہور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم متفرق طور پر بمہور ہی میں حاصل کیا، اس
 کے بعد مدرسۃ الاصلاح سرانمیر میں تکمیل کے لیے تشریف لے گئے، ۱۹۲۳ء میں مدرسۃ
 الاصلاح میں مکتب درجہ سوم میں داخلہ ہوا، درجات پرائمری کی تکمیل کے بعد فارسی اور عربی
 درجات میں تدریجاً ترقی فرماتے رہے، یہاں تک کہ دورہ حدیث سے فراغت حاصل کیا،
 فراغت کے بعد اپنے وطن بمہور میں واپسی ہوئی، اسی دوران حضرت مولانا نجم الدین
 صاحب اصلاحیؒ کی معیت میں ٹانڈہ تشریف لے گئے، اس وقت شیخ الاسلام حضرت مولانا

حسین احمد صاحب مدنی نور اللہ مرقدہ ٹانڈہ میں مقیم تھے، حضرت مدنیؒ سے بیعت کا شرف حاصل کیا، اس کے بعد اپنے وطن بمہور ہی میں عبادت و تلاوت، ذکر و اذکار کے ساتھ لیل و نہار گزارنے لگے، یہاں تک مدرسۃ الاسلام مکتب کا قیام عمل میں آیا، اور مولانا شروع ہی سے بحیثیت بانی مکتب ہر نوع کی خدمت میں مشغول ہو گئے، مکتب کی تعمیر، اس میں درس و تدریس، یہ ساری ذمہ داری ان کے سر پر آ گئی، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے فضل سے یہ ساری خدمت پورے اخلاص و للہیت کے ساتھ انجام دیتے رہے، بمہور کے اکثر علماء و فضلاء ان کے شاگرد ہیں، اپنے مکان کے پاس والی مسجد میں سالہا سال وجہ اللہ امامت کی سعادت حاصل کی، تقریباً ۵۳/۴۰ سال امامت کیے ہوں گے۔

اپنا کام اپنے ہاتھوں سے کرنے کے عادی تھے، بڑی سادہ زندگی تھی، وضع و قطع، نشست و برخاست ہر ادا سے سادگی ٹپکتی تھی، صبر و شکر، توکل و قناعت کے اوصاف اعلیٰ درجہ کے تھے۔

مولانا حکیم بھی تھے، گھر کے متصل باہر ایک کمرے میں ان کا قیام تھا، اسی میں مطب بھی تھا، یونانی اور ہومیو پیتھک دونوں قسم کی دوائیں رکھتے تھے، دونوں میں اچھا خاصا تجربہ تھا، خدمت خلق کے جذبہ کے ساتھ انھوں نے یہ پیشہ شروع فرمایا، اور خدمت کا حق ادا فرمادیا، بمہور بستی کے اکثر لوگ دوا لے جاتے، ان سے دوا کی قیمت کا مطالبہ نہیں فرماتے تھے، کسی نے قیمت دیا تو لے لیا، اور اگر نہیں دیا تو اس سے کوئی مطالبہ نہیں، گاؤں کے اکثر ویش تر لوگوں کو مفت دوا تقسیم فرماتے، اگر کوئی پوچھتا کہ آپ لوگوں سے دوا کی قیمت نہیں لیتے، تو فرماتے کہ تھوڑا بہت جو مجھ کو مل جاتا ہے، وہ میرے خرچ وغیرہ کے لیے کافی ہو جاتا ہے، تو زائد کی کیا ضرورت ہے۔

۱۹۸۰ء میں حج بیت اللہ کی سعادت سے مشرف ہوئے، سفر حج سے پہلے ہی سے ضعف

و کمزوری کی وجہ سے مکتب کی خدمت کو ترک فرما دیا تھا اور گھر ہی پر مقیم ہو گئے تھے، اکثر اوقات مسجد میں گزارتے تھے، بالآخر ۱۹۸۳ء میں اس دار فانی سے رحلت فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ

ابوالمعالی حضرت مولانا قاضی اطہر بن حاجی محمد حسن بن شیخ لعل محمد بن شیخ رجب بن شیخ رضا بن شیخ امام بخش صاحب مبارک پوری فاضل اجل، عالم ثانی، مشہور محقق و مصنف، شعر و شاعری کی دنیا سے آشنا، علم و ادب کے ماہر، علم و تصنیف اور سادگی سیرت میں سلف صالحین کی نظیر تھے۔

قصبہ مبارک پور کے محلہ پورہ صوفی میں ۴ رجب ۱۳۳۲ھ / ۷ مئی ۱۹۱۶ء کو صبح ۵ بجے پیدا ہوئے، نانا حضرت مولانا احمد حسین صاحب رسول پوریؒ بہت بڑے عالم و مصنف تھے، عبد الحفیظ نام تجویز فرمایا، مگر شاعری کے تخلص قاضی اطہر سے مشہور ہوئے، جہاں گیر کے دور سے خاندان میں عہدہ قضا چلا آ رہا تھا، اس لیے قاضی کہے گئے۔

ابتدائی تعلیم والدین سے پائی، پھر جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخل کیے گئے، جہاں محی السنہ حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب مبارک پوری، جامع منقول و معقول حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوری، فقیہ عصر حضرت مولانا مفتی محمد سلیم صاحب مبارک پوری سے تعلیم و تربیت پائی۔

دورہ حدیث کی تعلیم کے لیے مراد آباد جامعہ قاسمیہ شاہی میں پہنچے، جہاں فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادی، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی کے علوم و معارف سے مستفیض

ہو کر فارغ التحصیل ہوئے۔

فراغت کے بعد اپنے مادر علمی جامعہ عربیہ احياء العلوم مبارک پور میں استاذ ہوئے، ساڑھے چار سال تک جامعہ کے صیغہ تدریس سے منسلک رہے، پھر دوبارہ ۵/ ماہ عارضی طور پر مدرس رہے، ۱۹۴۸ء میں ایک سال جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں معلم و مدرس رہے، اسی زمانہ میں جامعہ اسلامیہ کے کتب خانہ سے شہرہ آفاق کتاب ”رجال السند والہند“ کی تصنیف کا آغاز کیا۔

قاضی صاحب کی زندگی کا بیش تر حصہ صحافت میں گزرا، ”زم زم“، ”انصار“ اور ”انقلاب“ وغیرہ کے کالموں کو سجا یا، طویل عرصہ تک البلاغ کی ادارت فرمائی۔ قاضی صاحب نے تصنیف و تالیف کو موضوع حیات بنایا تو علم و تحقیق کے نئے نئے گوشے روشن کر دیئے، اور پچاسوں علمی اور تحقیقی کتابیں ان کے زر نگار قلم سے وجود میں آئیں۔

عرب و عجم کے علماء و فضلاء یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس بوریہ نشیں نے اتنا عظیم کام کر ڈالا کہ قالین نشیں اکیڈمیاں تک نہ کر سکیں، آج بھی رجال السند والہند کو دیکھئے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ انھوں نے باپ دادا کا نام روشن کر دیا۔

قاضی صاحب تاریخ کی وادی میں گئے تو اسلامی ہند کی تاریخ کے گوشوں میں چراغ تحقیق روشن کرنے کی سعادت حاصل کی، انھوں نے اپنے زر نگار قلم سے ”عرب و ہند عہد رسالت میں“، ”خلافت راشدہ اور ہندوستان“، ”خلافت امیہ اور ہندوستان“ اور ”ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں“ وغیرہ تصنیف فرما کر سرزمین ہند کی اسلامی تاریخ کو علمی حلقوں کے سامنے پیش کر دیا۔

قاضی صاحب نے فقہ و فتاویٰ کی دنیا میں قدم رکھا تو ایک کام یاب مفتی و فقیہ نظر آئے، وہ فقہ حنفی کے علاوہ ائمہ اربعہ کے مسالک کے اصول و نظریات اور اختلاف و مباحث سے بھی اچھی طرح واقف تھے، حالات و زمانہ کے مقتضیات پر ان کی گہری نگاہ تھی، فقہ سے دل چسپی اور اس باب میں ان کا علم کتنا زندہ تھا، اس کا اندازہ ”البلاغ“ میں مطبوع مضامین و مقالات سے ہوتا ہے۔

قاضی صاحب حقیقی معنی میں صاحب تحقیق تھے، انھوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا، وہ بڑی دقت نظر سے مطالعہ کرتے تھے، وہ فن کی بنیادی کتابوں پر نگاہ رکھتے تھے، کثرت مطالعہ اور ذوق تحقیق نے ان میں ملکہ پیدا کر دیا تھا، ان کی تصانیف پڑھئے، تو ان کی دیدہ ریزی، کدوکاوش اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

قاضی صاحب نے شاعری شروع کی تو مبارک پور ان کے نغموں سے گونج اٹھا، اور ایک بلند پایہ شاعر بن کر عوام و خواص میں مقبول و مشہور ہوئے، آپ کا کلام لفظی اور معنوی محاسن کا مجموعہ ہوا کرتا تھا، قاضی صاحب صرف تاریخ و سیرت و شاعری ہی میں کمال و دسترس نہیں رکھتے تھے، بل کہ حدیث، اصول حدیث، تفسیر، اصول تفسیر اور عربی زبان و ادب پر بھی اچھا مطالعہ رکھتے تھے۔

۲۷ صفر ۱۴۱۷ھ / ۱۴ جولائی ۱۹۹۶ء یک شنبہ کا دن گزار کر شب میں دس بجے جوارِ رحمت میں پہنچ گئے، دوسرے دن دوشنبہ کو حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نماز جنازہ پڑھائی، اعظم گڑھ، بنارس، جون پور، غازی پور، گورکھپور، وغیرہ کے علمائے کرام و فضلاء عظام بھی نماز جنازہ اور تدفین میں شریک تھے۔ (قاضی اطہر نمبر)

مولوی اختر حسین صاحب مبارک پوری

مولوی اختر حسین ولد حاجی صفدر علی شاہ محمد پور میں ۱۲ مارچ ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے، والد تجارت کرتے تھے، ابتدائی دینی تعلیم مدرسہ باب العلم پورہ دہن میں حاصل کی، پھر ۱۹۳۶ء میں سلطان المدارس لکھنؤ میں داخلہ لیا، ۱۹۴۳ء میں صدر الافاضل کی اول درجے کی سند حاصل کی، پھر دو سال بعد مدرسۃ الواعظین میں داخلہ لیا، اس کا تین سالہ نصاب مکمل کر کے ۱۹۴۸ھ میں سند فراغت حاصل کی۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں بغرض تبلیغ پاکستان گئے، اور جھنگ شہر میں سکونت اختیار کی، اس دوران کافی دورے کیے، یہ سلسلہ ۱۹۵۴ء تک جاری رہا، ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے مولوی، فاضل اور منشی کا امتحان پاس کیا، ایک اسکول میں مدرس ہو گئے، اس کے علاوہ جمعہ اور پنج گانہ نماز کے امام بھی تھے۔

آپ کے علمی مضامین جراند میں شائع ہوتے رہے، پاکستان منتقلی کے بعد کئی بار وطن مبارک پور آئے، ۱۴ فروری ۱۹۸۹ء کو فیصل آباد پاکستان کے ایک اسپتال میں انتقال ہوا۔
(شجرہ طیبہ ص ۱۸)

مولانا قاری انوار الحق صاحب مبارک پوری

مولانا قاری انوار الحق صاحب ولد علی حسین صاحب مبارک پوری خوش مزاج، خوش طبع، خوش الحان و نعت خواں، فاضل دارالعلوم دیوبند تھے۔

۲۱ شوال ۱۳۴۹ھ / ۶ جون ۱۹۳۱ء کو اس مردم خیز قصبہ کی سرزمین محلہ پورہ دیوان سے اٹھے۔

متوسطات کی تعلیم و تربیت جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں ہوئی، اساتذہ عظام میں حضرت مولانا عبدالغنی صاحب بارہ بنکوی، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پوری اور حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوری خصوصیت سے شامل ہیں، تجوید کی تعلیم مولانا قاری ظہیر الدین صاحب معروفی سے پائی۔

پھر تعلیم کے ذوق و شوق نے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل پہنچا دیا، اس دور میں جامعہ اسلامیہ حضرت مولانا عبد الجبار صاحب معروفی اور مؤرخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری اور دیگر اکابر حضرات کی فیض رسانی سے چمنستانِ علم و معرفت بنا ہوا تھا۔

پھر اعلیٰ تعلیم کے جذبہ سے دارالعلوم دیوبند وارد ہوئے، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور دیگر اساطینِ علم و فن سے اکتسابِ فیض کر کے رسمی فراغت حاصل کی، وہیں پر خوش نویسی کا فن مشہور خطاط مولانا اشتیاق احمد صاحب سے سیکھا۔

تدریسی سلسلہ اولین مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور سے شروع کیا، چند سالوں یہاں تدریس کا سلسلہ رہا، پھر مدرسہ سراج العلوم دھولیہ پہنچے، وہاں تعلیم دی، پھر وہاں سے واپسی مبارک پور ہوئی اور مدرسہ اشاعت العلوم پورہ معروف، جامعہ اسلامیہ بنارس، اور جامعہ حسینیہ جون پور میں تدریس کا سلسلہ رہا، پھر دوبارہ جامعہ اسلامیہ بنارس پہنچے، اور ۱۷ سال نہایت استقلال کے ساتھ تعلیم دی کہ ۶۰ سال کی عمر میں ریٹائر ہو کر

ہی جدا ہوئے، پھر وطن مبارک پور آ گئے، جب مولانا شمس الدین صاحب الحسینی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے ناظم اعلیٰ منتخب کیے گئے تو انھوں نے معاونت کے لیے اپنا نائب مقرر کیا، آپ بحیثیت نائب ناظم جامعہ کی خدمت میں لگ گئے، چوں کہ انتظامی امور کی الجھنیں آپ کے مزاج کے خلاف تھیں، اس لیے اس منصب سے جلد ہی مستعفی ہو گئے۔

آپ نہایت خوش گلو تھے، قرآن کریم اور نعت پاک بہت عمدہ پڑھتے تھے کہ مجمع پر چھا جاتے تھے اور وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔

آپ عمدہ خطاط بھی تھے، نحیف الجثہ اور چھریرے بدن کے تھے، مگر جسمانی طاقت بہت تھی، آپ کی جسمانی طاقت کے حیرت انگیز واقعات مشہور تھے۔

محلہ پورہ دیوان کی مسجد (جگہ شاہ کے پاس) کے پنجگانہ امام تھے، ۱۲/شوال ۱۴۲۱ھ/۸ جنوری ۲۰۰۱ء کو عشاء کی نماز پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد مصلیوں سے کہا کہ آپ لوگ دعا کریں، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، پھر مسجد ہی میں لیٹے کہ خانہ خدا ہی میں ۷۰ سال کی عمر میں جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ دوسرے روز دوشنبہ کو نماز ظہر کے بعد ”استلاء“ کے پاس ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں نماز جنازہ اور تدفین عمل میں آئی۔ (ماہ نامہ ضیاء الاسلام شیخوپورہ، اکابر احیاء العلوم حصہ دوم)

حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پوریؒ

حضرت مولانا بشیر احمد ولد حاجی عصمت اللہ صاحب مبارک پوری علم و فضل میں ممتاز، معقولات و منقولات کے زبردست عالم تھے۔

سنِ ولادت معلوم نہیں ہو سکا، ابتدائی تعلیم سے متوسطات کی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، آپ کے اساتذہ کرام میں حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوریؒ، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب مبارک پوریؒ، حضرت مولانا علی احمد صاحب کوڑیاپاریؒ، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب برئی پوریؒ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوریؒ جیسے ماہر اصحابِ درس علماء شامل ہیں۔

اس فہرست اساتذہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ جامعہ کے عہدِ قدیم کے فیض یافتگان میں شامل ہیں، اور آپ کی ولادت بیسویں صدی کے بالکل ابتدائی دور میں ہوئی ہوگی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور پہنچے، اور دورہ حدیث کی تعلیم حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مظاہر علوم سہارن پور، حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کیمل پوریؒ اور حضرت مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث رحمہم اللہ جیسے اساطینِ علم و فضل سے حاصل کی۔

غالباً ۱۳۵۰ھ میں مظاہر علوم سے فارغ التحصیل ہوئے، پھر جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور سے تدریس و افادہ کے سلسلہ کا آغاز کیا، جب کہ محی السنہ حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوریؒ جامعہ کے ناظم تھے۔

کسی بات پر آپ مدرسہ سے علیحدہ ہو کر تاروریشم کی دوکان میں مشغول ہو گئے، ۱۳۶۸ھ کے صفر میں دوبارہ مدرسہ ہوئے، اور حضرت مولانا عبدالجبار صاحب معرونیؒ کی جگہ پر تقرری ہوئی، ۱۳۶۸ھ سے ۱۳۷۷ھ تک مدرسہ رہے، پھر قصبہ کے بعض اختلافات کی بنا پر آپ نے استعفیٰ دے دیا اور مدرسہ معہد ملت مالگواں چلے گئے، لیکن وہاں کی سیاست

آپ کے راس نہ آئی تو مدرسہ حیات العلوم محلہ پیرزادہ شہر مراد آباد میں استاذ ہوئے۔
سہ بارہ ۱۳۹۱ھ میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے شیخ الحدیث اور ناظم
تعلیمات مقرر ہوئے، پھر جامعہ کے ناظم اعلیٰ بھی منتخب ہوئے، پھر کچھ ایسے حالات رونما
ہوئے کہ اس سے علیحدہ ہو کر مدرسہ مرکزی محمدیہ گھوسی چلے گئے۔

آپ مطالعہ کے بہت پابند تھے، افہام و تفہیم کا ملکہ حاصل تھا، مشکل ترین بحثوں کو
ایسا سمجھاتے تھے کہ آسان ہو جاتی تھی۔

حدیث، فقہ، اصول فقہ، تفسیر اور معقولات کی بڑی بڑی کتابوں کو بے تکلف
پڑھاتے تھے، مطالعہ وسیع اور علم مستحضر تھا، یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم و فضل کے جس بلند مقام پر
فائز تھے، اس لحاظ سے انھیں کام کا میدان نہیں مل سکا۔

آپ کے تلامذہ میں مؤرخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ،
حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساحر مبارک پوریؒ، اور حضرت مولانا عبد المنان صاحب
باسو پاریؒ شیخ الحدیث وغیرہم مشاہیر علماء شامل ہیں۔

مدرسہ مرکزی محمدیہ کے زمانہ تدریس میں ۳ شوال ۱۴۰۴ھ / ۳ جولائی ۱۹۸۴ء
سہ شنبہ کو ساڑھے تین بجے وفات ہوئی، دوسرے دن چہار شنبہ کو حضرت مولانا حبیب الرحمن
صاحب اعظمیؒ نے نماز جنازہ پڑھائی، اور اپنے آبائی قبرستان ”شاہ پنچہ“ میں سپرد خاک
ہوئے۔

(اکابر احیاء العلوم حصہ دوم ص ۱۲۹ تا ۱۳۰، تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص ۲۶۶ تا ۲۶۸ و سہ

ماہی سراج العلوم جھیرا ضلع منوخصوصی اشاعت محرم تاریخ الاول ۱۴۳۵ھ ص ۱۵۴ تا ۱۵۵)

مولوی جواد حسین صاحب مبارک پوری

مولوی جواد حسین بن عبد المجید ۱۹۰۳ء میں مبارک پور میں پیدا ہوئے، قرآن شریف، فارسی اور اردو کی کتابیں اپنے گھر پر پڑھیں، اس کے بعد اہل سنت کے مقامی مدرسہ میں داخل ہوئے، پھر مدرسہ ایمانیہ بنارس میں داخلہ لیا، اس میں مولوی ناظر حسین اور مولوی سجاد اور مولوی جواد علی سے تعلیم حاصل کی، ۱۹۱۹ء میں لکھنؤ جا کر مدرسہ سلطان المدارس میں داخلہ لیا، ۱۹۲۴ء میں سندالافاضل اور صدرالافاضل کی سند لی، پھر لکھنؤ کے عربی کالج میں داخل ہوئے، ادب اور علم الکلام کی تکمیل کی، اس کے علاوہ علم طب کی بھی تعلیم حاصل کی، ۱۹۲۵ء میں مدرسۃ الوداعین میں داخلہ لیا، اس مدرسہ سے تین سالہ کورس دو سال میں مکمل کیا، اور فن مناظرہ میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔

۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک بمبئی، ۱۹۳۱ء میں دہلی، آگرہ، میرٹھ ۱۹۳۲ء میں علی پور ضلع مظفر گڑھ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء میں ضلع جھنگ ترویج مسلک کے لیے دورے کیا، ۱۹۳۶ء میں پارہ چنار صوبہ سرحد بحیثیت مفتی بھیج دیا گیا، جہاں چار سال تک یہ خدمت انجام دی، ۱۹۴۴ء میں ہنگو ضلع کوہاٹ گئے۔

تحریک پاکستان میں نمایاں حصہ لیا، یہ علاقہ کانگریس کا گڑھ تھا، دورے کیے، لوگوں کو مسلم لیگ میں شامل کیا، بمبئی میں آپ کا عیسائی مشنری سے مناظرہ ہوا، اس کو شکست فاش دی، اور بھاگنے پر مجبور کیا، ۱۴/۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء میں ۹۶ سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد ہنگو ضلع کوہاٹ میں وفات ہوئی، اور جامعۃ العسکر یہ کے احاطہ میں دفن ہوئے۔ (شجرہ طیبہ ۲۷۲ تا ۲۷۳)

مولانا جمیل احمد صاحب قاسمی، مدنی، مبارک پوری

تقویٰ و طہارت کے پیکر، اخلاقِ حمیدہ کے مالک، اوصافِ جلیلہ کے مرقع، امانت و دیانت کے پرتو، صاحبِ علم و فضل شخصیت کے حامل تھے۔

اپنی جد جہد، دعوتِ الی اللہ، مساعیِ جمیلہ کے ذریعہ جہالت و تاریکیوں سے ڈوبے ہوئے ایک خطہ کو منور و تاباں کیا اور سنت و شریعت سے معمور کر دیا۔

۱۸/شوال ۱۳۵۸ھ / ۳۰/نومبر ۱۹۳۹ھ کو مبارک پور کے علم و عرفان سے معمور خاندان کے جناب حاجی عبدالحی صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔

قرآن و شریف کی تعلیم اس زمانہ کے دستور کے مطابق گھریلو طور پر حاصل کی، پرائمری درجات کی تعلیم مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور میں ۱۹۵۰ء میں مکمل کیا، بعدہ فارسی کی تعلیم مولانا حکیم محمد اصغر صاحب سے حاصل کی۔

۱۹۵۱ء میں جامعہ عربیہ احياء العلوم مبارک پور میں داخلہ لیا اور عربی اول سے عربی پنجم (عالمیت) کی تکمیل کی، جامعہ میں حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوریؒ، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پوریؒ، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوریؒ، حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساآر مبارک پوریؒ، حضرت مولانا شمس الدین صاحب الحسینی، حضرت مولانا قاری ظہیر الدین صاحب معروفیؒ، حضرت مولانا عبدالمنان صاحب باسو پاریؒ وغیرہم کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۵۷ء میں علم و فن کی سرزمین دیوبند کا رخت سفر باندھا اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب

مراد آبادی، حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی، حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحب مراد آبادی، حضرت مولانا ظہور احمد صاحب، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب، حضرت مولانا جلیل احمد صاحب بلند شہری، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب اور حضرت سید حسن صاحب وغیرہم جیسے باکمال اور ماہر علوم و فنون کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور ۱۳۷۸ھ/۱۹۵۸ء میں فضیلت کی تکمیل کی۔

آپ کے درسی رفقاء میں: حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد احمد صاحب فیض آبادی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بھوری مہتمم جامعہ رشیدیہ بھور، حضرت مولانا نعمان الحق صاحب سابق استاذ دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد سعید صاحب مہتمم مدرسہ دارالرشاد بارہ بنگی، حضرت مولانا ندیر احمد صاحب نعمانی قاسمی منوی۔

رسی فراغت کے بعد وطن مبارک پور لوٹے تو اگلے سال شوال المکرم میں اپنے خاندانی چچا مولانا حکیم عبدالباری صاحب ابن مولانا حکیم الہی بخش صاحب بانی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے مشورہ سے دوبارہ دارالعلوم دیوبند لوٹ کر ”تکمیل فنون“ کیا اور ۱۹۶۰ء کو وطن لوٹے، اسی سال ۱۹۶۰ء میں اس زمانہ کے ناظم احیاء العلوم حضرت مولانا عبدالباری صاحب قاسمی کے توسط سے احیاء العلوم میں شعبہ عربی کے استاذ منتخب کیے گئے اور سولہ سال تک نہایت پابندی اوقات، پوری لگن و محنت، جانفشانی، مکمل تیاری و مطالعہ کے ساتھ ہمہ طور پر مشغول تدریس رہے اور آپ کی درس گاہ سے مستفیض ہو کر بہت سے اصحاب درس و تدریس اور علم و عمل کے گوہر بن کر میدانِ علم و فن میں آئے، چند نام یہ ہیں:

حضرت مولانا توفیق احمد صاحب مہتمم جامعہ حسینہ شاہی مسجد لال دروازہ جون پور،

حضرت مولانا فیاض احمد صاحب قاسمی بانی و تاحیات رکن الجامعۃ الاسلامیہ سراج العلوم بھینڈی،
حضرت مولانا عجاز احمد صاحب اعظمی سابق صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور، حضرت مولانا
عبدالمعید صاحب القاسمی سابق ناظم اعلیٰ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور، حضرت مولانا مفتی
محمد امین صاحب مبارک پوری مفتی و شیخ الحدیث جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور۔

دیارِ رسول ﷺ کی زیارت و قیام اور دیارِ رسول ﷺ کی عظیم یونیورسٹی الجامعۃ
الاسلامیہ میں تعلیم کی خواہش آپ کے دل و دماغ میں راسخ تھی، آخر سات سال پر آپ کے داخلہ
کی درخواست منظور ہوگئی اور چار سال تک جامعہ اسلامیہ کے کلیۃ الشریعہ میں تعلیم حاصل کی۔
۱۹۷۹ء میں وہاں سے فراغت کے بعد ملازمت کی تلاش میں رہے، اور کئی ملکوں
میں ہوتے ہوتے آخر افریقہ کے ایک ملک نائیجیریا کی راجدھانی ”لاگوس“ میں مبعوث
ہوئے، لاگوس شہر کا ایک نوآباد علاقہ اجیشاتید تھا، جہاں لوگ اسلام سے دور تھے، شعارِ
اسلام سے ناواقف تھے، تعلیم سے نابلد تھے۔

آپ نے اس علاقہ کے مدرسہ ”دارالقرآن“ میں بیٹھ کر اور یہاں سے چل پھر کر
لوگوں کو دین کی دعوت دی، دینی علوم کی طرف بلایا، آپ کی شب و روز کی مساعی جمیلہ سے
جوق در جوق طلبہ عزیز آنے لگے اور پورا علاقہ علم و عمل سے شاداب ہو گیا۔

۲۰۰۶ء میں ۲۷ سال کی جانفشانیوں اور مساعی جمیلہ کے بعد ریٹائرڈ ہو کر وطن کو
لوٹے اور جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے ساتھ وابستگی اور تعلق رکھا، کبھی رکن شوریٰ، رکن مجلس تعلیمی،
کبھی قائم مقام ناظم، کبھی سرپرست جامعہ کے عہدوں پر فائز رہے، تاحیات جامعہ کی خدمات
سے وابستہ رہے، آخر وقت موعود آ پہنچا، سرزمین دیوبند میں تھے، ۳ ربیع الاول ۱۴۲۰ھ /
۱۱ نومبر ۲۰۱۸ء کی تاریخ تھی، یکشنبہ کا دن تھا، داعی اجل حاضر ہو گیا اور روح قبض کر لی۔

مزارِ قاسمی میں بزرگوں اور اکابر دیوبند کے پہلو میں لیٹنے کی سعادت حاصل ہوئی، حضرت اقدس مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے نمازِ جنازہ پڑھائی، دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کرام، طلبہ عزیز اور اہالیانِ شہر اور متعلقین کی بڑی جماعت شریکِ جنازہ اور تدفین تھی۔

اللہ تعالیٰ والدِ گرامی کے درجات کو بلند فرمائے اور ان کی لغزشوں کو حسنات سے تبدیل فرمائے اور ان کی خواب گاہ کو روشن و منور فرمائے۔ آمین

مولانا حفیظ اللہ صاحب نعمانی مبارک پوریؒ

مولانا حفیظ اللہ ولد جناب نصیر الدین صاحب نعمانی مبارک پوری قصبہ مبارک پور کے محلہ پورہ رانی نزد پولس چوکی کے ایک تاجر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ تاریخِ ولادت کا علم نہیں ہو سکا، جب ہوش و حواس سنبھالا تو اس زمانے کے دستور کے مطابق ایک گھر میں قرآن کریم کی تعلیم ہوئی، پھر ابتدائی تعلیم کے لیے ان کے والد صاحب نے قصبہ کے مدرسہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں داخلہ کرایا، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ شاہی قاسمیہ مراد آباد شریف لے گئے، حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادی، اور مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی وغیرہما کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، اور ۱۳۸۲ھ میں فراغت حاصل کی۔ جب رسمی فراغت ہو گئی، والد صاحب کو شادی کی فکر ہوئی، اور ان کی والدہ مکرمہ کی نظر انتخاب ایک رئیس تاجر حاجی تاج محمد ولد عبد الرحمن نزد ہانس بابا کی مسجد پورہ رانی کی صاحبزادی ہاجرہ خاتون پر پڑی۔

حاجی تاج محمد صاحب جو مولانا حکیم الہی بخش صاحب مبارک پوریؒ، مولانا شکر اللہ

صاحب مبارک پوریؒ اور مولانا عنایت اللہ صاحب مبارک پوری کے محبین و متعلقین میں سے تھے، شادی کے بعد بھٹنی کے مدرسہ سے بمشاہرہ ۴۰ روپیہ تدریسی زندگی کا آغاز کیا، پھر وہاں سے شیوراج نیپال چلے گئے، پھر کچھ عرصہ کے بعد ان کی ملاقات جناب عبدالجلیل صاحب موضع گروچہواں ضلع گونڈہ (موجودہ ضلع بلرام پور) سے ہوئی، انھوں نے آپ سے گزارش کی کہ ہمارے گاؤں میں مدرسہ نہیں ہے، جس کی وجہ سے دینی تعلیم کی بڑی دشواری ہو رہی ہے، آپ وہاں چل کر تدریس کا کام شروع کر دیں، جس سے ہمارے گاؤں کے بچے دینی تعلیم سے آراستہ ہو سکیں، جناب عبدالجلیل صاحب کا اس پر شدید اصرار بڑھتا رہا، بہر حال آپ ان کے شدید اصرار پر گروچہواں جانے پر رضامند ہو گئے، جب اس گاؤں میں پہونچے تو کوئی جگہ درس و تدریس کے لیے نہیں تھی، اس گاؤں کے پردھان کے گھر سے درس و تدریس کا مبارک عمل شروع ہوا، پھر آپ کی شدید دوڑ دھوپ رنگ لائی، اور ایک زمین مہیا ہو گئی، پھر وقت آیا کہ ایک مدرسہ بنام مدرسہ اصلاح المسلمین کا سنگ بنیاد رکھا گیا، جب کہ پہلی تعمیر چھوٹی کی شکل میں تھی، پھر تعمیری سلسلہ شروع ہوا، پھر ایک دن آیا کہ مدرسہ اصلاح المسلمین کی شان دار عمارت کھڑی ہو گئی، جب تعمیری سلسلہ سے فراغت ہوئی، اپنی اکلوتی نور نظر کی شادی اپنے بھتیجے ارشاد احمد ولد محمد صدیق سے گھر آ کر کرنا چاہا، مگر اس گاؤں والوں نے کہا کہ یہ صرف آپ کی بیٹی نہیں ہے، بل کہ پورے گاؤں کی بیٹی ہے، اس کا نکاح یہیں سے ہوگا، چنانچہ آپ کی صاحبزادی کا نکاح جناب ارشاد احمد صاحب سے اسی گاؤں میں ہوا، جب آپ پر بڑھاپا چھا گیا، وطن مبارک پور لوٹنے کی خواہش ہوئی، اس گاؤں والوں نے روکا، مگر آپ نے کہا کہ مجھے اپنے وطن میں مرنے دیں، اپنے وطن کی مٹی میں دفن ہونا چاہتا ہوں۔

تو اس گاؤں والوں نے آپ کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے واپسی کی اجازت دیدی، تب گاؤں کے سبھی لوگ بوڑھے، جوان، بچے اور خواتین نے پُرِ نم آنکھوں سے آپ کو اور آپ کی اہلیہ کو الوداع کہا۔

مبارک پور واپسی کے بعد عرصہ تک باحیات رہے، بسا اوقات اس گاؤں میں آمد و رفت کا سلسلہ رہا۔

چند روز کی علالت کے بعد ۲۰۰۰ء میں گھر ہی پر وفات ہوئی، تدفین سمودی پورہ رانی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ (معلومات بواسطہ جناب رضوان اللہ سیٹھ)

مولانا داؤدا کبر صاحب اصلاحی بمہوریؒ

مولانا داؤدا کبر ولد حافظ محمد حسن صاحب بمہوری نہایت پاک طینت، خوش اخلاق، قناعت پسند، تسلیم و رضا کے خوگر، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے فاضل اور زبان وادب کے ماہر استاذ تھے۔

ضلع اعظم گڑھ کے مشہور مردم خیز موضع بمہور میں ۱۹۱۸ء کے حدود میں پیدا ہوئے۔ دینی فضا میں پروان چڑھے، ابتدائی تعلیم گھر اور گاؤں میں ہوئی، ۹ برس کی عمر میں مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں داخل کیے گئے۔

یہاں ان کے خاندانی عم محترم مولانا شبلی متکلم ندوی بحیثیت اعلیٰ مدرس تدریسی خدمات میں مصروف تھے، عربی کی مکمل تعلیم حاصل کر کے ۱۹۳۵ء میں فارغ التحصیل ہوئے، یہاں انھوں نے جن باکمال اساتذہ کے درس سنا دیے وہ ان سے مستفیض ہوئے، ان میں سے چند مشہور شخصیات یہ ہیں:

.....

مولانا شبلی متکلم ندوی، جمہوری، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی، مولانا امین احسن صاحب اصلاحی۔

رسمی فراغت کے ایک سال کے وقفہ کے بعد اپنے مادر علمی کی آغوش میں پہنچ گئے، ۶ سال بعد یہاں سے علیحدہ ہو گئے، پھر ۱۹۴۲ء میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کی مسند تدریس کو زینت بخشی، تقریباً ۷ سال اس سے وابستہ رہے، یہاں سے دوبارہ مدرسۃ الاصلاح سرانمیر ۱۹۴۹ء میں پہنچے، اور بحیثیت استاذ قرآن کریم مسند درس و تحقیق کو سجا یا، پھر دوبارہ ۱۹۷۰ء کو مدرسۃ الاصلاح کو خیر باد کہا، اور جون پور کے ایک تعلیمی مرکز مولانا آزاد اسرہٹہ کو اپنی نشاطات و سرگرمیوں کا مرکز بنایا، ۱۹۷۷ء تک یہاں تدریسی خدمت انجام دی، پھر یہاں سے سبکدوش ہو کر وطن آ گئے، اور چند سال گھر ہی پر مقیم رہے۔

۱۹۸۱ء میں جامعۃ الفلاح بلریا گنج کے استاذ مولانا جلیل احسن ندوی کا انتقال ہو گیا، اس وقت آپ کو جامعۃ الفلاح بلریا گنج بحیثیت استاذ تفسیر آنے کی دعوت دی گئی، جس کو آپ نے منظور فرمایا، جامعۃ الفلاح پر بہت کم وقت دے سکے، ڈیڑھ سال کا عرصہ بہ مشکل گزرا تھا کہ ایک روز جامعۃ الفلاح سے گھر آتے ہوئے راستہ میں دماغی فالج کا حملہ ہوا، پھر کچھ دنوں بعد دوبارہ اس کا شدید حملہ ہوا، اور چند روز صاحب فراش رہ کر ۴ فروری ۱۹۸۳ء کو رب رحیم کی آغوش میں پہنچ گئے، نماز جنازہ ان کے قدیم رفیق مولانا اظہار الدین صاحب اصلاحی نے پڑھائی، اور اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

مولانا اصلاحی کی بیش تر زندگی قرآن کریم کے درس و تدریس اور اس کے تفسیری نکات کی تفہیم میں گزری، آیات کے ترجمے نہایت عمدہ اسلوب میں کرتے تھے، قرآن عزیز کے مشکل مقامات اور اہم اسالیب کی توضیح و تشریح میں بیسوں تحقیقی مقالات و مضامین قلم بند

کئے، مشکلات القرآن اور قرآن کریم کا چیلنج کے نام سے دو کتابیں تصنیف کیں۔

(تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص ۲۸۰ تا ۲۸۲، اکابر احیاء العلوم ص ۱۵۱ تا ۱۵۴)

مولوی دین محمد صاحب ابراہیم پوری

مولانا دین محمد صاحب موضع ابراہیم پور کے باشندہ تھے، جامعہ مفتاح العلوم منو میں اپنی علمی پیاس بجھائی تھی، اس سے زیادہ معلومات نہیں ہو سکیں۔

مولانا ڈاکٹر رضاء اللہ صاحب مبارک پوری

مولانا رضاء اللہ ولد حاجی محمد ادیس ولد حکیم محمد شفیع صاحب مبارک پوری قصبہ کے محلہ پورہ صوفی میں ۳۰ / دسمبر ۱۹۵۴ء میں پیدا ہوئے، مبارک پور کے نہایت علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے، علامہ عبدالرحمن صاحب محدث مبارک پوری آپ کے دادا حکیم محمد شفیع صاحب کے بھائی تھے۔

بچپن ہی سے نجابت، متانت اور سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے، قرآن مجید اور اردو کی کتابیں اپنے والد بزرگوار سے، جناب محمد اسحاق صاحب سے دینیات، اپنے چچا زاد بھائی مولانا فضل الرحمن صاحب سے ریاضی پڑھی، مدرسہ دارالتعلیم اور جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں فارسی و عربی کی کتب درسیہ پڑھیں۔

پھر جامعہ رحمانیہ بنارس چلے گئے اور عربی چہارم تک تعلیم حاصل کی، پھر جامعہ سلفیہ بنارس میں داخلہ لیا، اور وہاں کے کہنہ مشق اساتذہ کرام سے شرف تلمذ حاصل کر کے ۱۹۷۴ء میں عالمیت کی تکمیل کی، اس کے بعد مراکش کے مشہور عالم دین ڈاکٹر تقی الدین

ہلالی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، مراکش میں دو سال رہ کر علوم و فنون کی تکمیل کی، عربی زبان و ادب میں پختگی پیدا کی، اور اس کے بولنے پر عبور حاصل کیا، پھر وہاں سے جامعہ اسلامیہ مدینہ مدینہ منورہ میں کلیۃ الحدیث میں داخلہ لیا، ۱۹۸۰ء میں بی اے کی سند لی، ۱۹۸۵ء میں ایم اے کا کورس کیا اور ۱۹۸۹ء میں دکتورہ کی ڈگری حاصل کیا، مدینہ سے فراغت کے بعد وطن لوٹے۔

درس و تدریس کے مشغلہ کو ترجیح دیا، اس کے لیے اپنے مادر علمی جامعہ سلفیہ بنارس کو منتخب کیا، دس سال تک علوم و فنون کی کتابیں آپ کے زیر درس رہیں، منظمین جامعہ نے آپ کی محنت و لگن کو دیکھ کر آپ کو شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز کیا، آپ نے پوری ذمہ داری سے بحسن و خوبی اس فریضہ کو انجام دیا۔

آپ کے تلامذہ کی اچھی خاصی تعداد ہے، جو ہندو بیرون ہند دینی و دعوتی اور تدریسی کاموں میں مصروف ہیں۔

آپ بیک وقت صحافت و خطابت دونوں کے شہسوار تھے، عربی اردو دونوں زمانوں میں یکساں مہارت حاصل تھی، علم حدیث و فقہ پر گہری نظر حاصل تھی، اپنی زندگی کا بیش تر حصہ تصنیف و تالیف اور بحث و تحقیق میں گزارا۔

آپ کی متعدد تصانیف اردو عربی دونوں زبانوں میں مطبوع ہیں، ان کے علاوہ مجلہ ”صوت الامة“، ”محدث“، جریدہ ”ترجمان“، ”اشاعت السنہ“ میں شائع ہونے والے علمی و تحقیقی مقالات آپ کی علمی یادگار ہیں۔

آپ کی قلمی کاوشیں درج ذیل ہیں:

(۱) تحقیق و تعلیق علی کتاب الرد علی من یتول القرآن مخلوق لابن النجاد (عربی مطبوع)

- (۲) تحقیق و تعلیق علی السنن الواردة فی الفتن واشترط الساعة لابی عمرو الدانی (۳ جلدیں)
- (۳) تحقیق و تعلیق کتاب العظمة لابی الشیخ الاصفہانی (پانچ جلدیں)
- (۴) تحقیق و تعلیق کتاب الاحوال لابن ابی الدنیا (مطبوع)
- (۵) الایمان بالیوم الآخر (اردو مطبوع)
- (۶) تعارف الجامعة السلفية (اردو مطبوع)
- (۷) المسائل الخاصة للنساء (اردو)
- (۸) خوض الانتخابات للدخول فی البرلمان فی الحکومات المعاصرة (اردو)
- (۹) خطرات یوم القيامة (اردو)
- (۱۰) مذکرۃ فی الحدیث النبوی ﷺ (اردو مطبوع)
- (۱۱) بنس ما فعل أخو العشيرة (عربی غیر مطبوع)
- (۱۲) ترجمة ووجهتان متضادان فی محمد بن عبد الوهاب للشیخ محفوظ الرحمن فیضی (اردو غیر مطبوع)
- (۱۳) ترجمة کتاب الجنائز للعلامة عبد الرحمن المبارك فوری
- (۱۴) الشبیهة للنساء المومنات (باللغة العربية)
- (۱۵) سلفیت کا تعارف اور اس کے متعلق شبہات کا ازالہ (اردو مطبوع)
- آپ ترجمہ و تالیف کے ساتھ اور بھی بہت ساری ذمہ داریاں نبھاتے تھے، مثلاً سعودی جامعات کے فضلاء ہندو نیپال کے صدر، فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے رکن، مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نائب امیر کے عہدے پر فائز تھے۔

صوبائی جمعیت اہل حدیث کی طرف سے منعقدہ ”دین رحمت کانفرنس“ میں تشریف

لے گئے تھے، خطاب کرنے کے بعد اسٹیج پر بیٹھ گئے، کچھ تھکان محسوس ہوئی، تو کامران ہوٹل کے لیے روانہ ہو گئے، راستہ میں طبیعت بگڑنے لگی، قریب کے فوزیہ اسپتال میں داخل کئے گئے، لیکن دل کے دورہ سے جانبر نہ ہو سکے، اس طرح ۲۵ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ/ ۳۰ مارچ ۲۰۰۳ء میں بروز یکشنبہ ڈھائی بجے دن میں انتقال کر گئے۔

مبارک پور نعش لائی گئی، دوسرے روز ۳۱ مارچ ۲۰۰۳ء دوشنبہ کو نماز جنازہ ادا کی گئی، عید گاہ کے قبرستان ”شاہ کا پنچہ“ میں سپرد خاک کیے گئے۔

(تراجم علمائے اہل حدیث ص ۱۰۳ تا ۱۰۶، تذکرہ علمائے اہل حدیث مبارک پور ص ۸۶ تا ۹۱)

مولانا ریاض احمد صاحب قاسمی ابراہیم پوری

مولانا ریاض احمد صاحب ولد عبدالقدیر قاسمی ابراہیم پوری نہایت ذہین و فطین، حاضر جواب عالم و فاضل تھے۔

آپ کی ولادت ۱۲ صفر المظفر ۱۳۷۶ھ/ ۱۸ ستمبر ۱۹۵۶ء کو موضع ابراہیم پور ضلع اعظم گڑھ میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے گاؤں کے مدرسہ عربیہ فیض العلوم میں حاصل کی، عربی تعلیم کے لیے اپنے دیار کے مشہور علمی سرچشمہ جامعہ عربیہ اہیاء العلوم مبارک پور کا رخ کیا، آپ نے جامعہ میں از فارسی تا عربی پنجم پڑھا، پھر اعلیٰ تعلیم کے شوق نے کان پور کے ایک مدرسہ میں پہنچا دیا، جہاں سے فراغت حاصل کی، پھر دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے شوق نے انھیں دیوبند کی سرزمین پر پہنچا دیا، ۲ سال دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کر کے ۱۳۹۶ھ/ ۱۹۷۶ء میں فراغت ہوئی۔

رسی فراغت کے بعد کان پور اپنے اساتذہ کرام سے ملاقات کی غرض سے پہونچے تو آپ کے ایک استاذ نے فرخ آباد کی ایک بستی میں تعلیم و تدریس کے لیے بھیج دیا، جو دینی تعلیم سے نا آشنا تھی، بدعات و خرافات کی آماج گاہ بنی ہوئی۔

آپ نے وہاں پہونچ کر مکتب کی بنیاد ڈالی، معاشرہ میں پھیلی ہوئی بدعات و خرافات کا اس علاقہ سے خاتمہ کیا، ان کی قربانیاں، جانفشانیاں آج بار آور ہو رہی ہیں، ان کی برکات سے بہت سے علماء و فضلاء پیدا ہو رہے ہیں، ان میں راقم حروف کا ایک شاگرد بھی شامل ہے، جس نے کئی مرتبہ اس علاقہ کا دورہ کرنے کی دعوت دی، مگر تا دم تحریر نہ پہونچ سکا۔ بہر حال آپ نے درمیان میں کچھ وقفہ کے ساتھ تقریباً ۲۰/۱۸ سال وہاں تدریسی خدمات انجام دیں۔

انتقال سے تقریباً دو ماہ پہلے گھر آئے ہوئے تھے، فرخ آباد واپس نہ ہو سکے تھے کہ فرشتہ ملک الموت حاضر ہو گیا، روح قبض کر لی، یہ حادثہ ۲۲ جنوری ۲۰۰۵ء / ۱۱ رزی الحجہ ۱۴۲۵ھ شنبہ صبح ۱۰ بجے کا ہے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ نماز جنازہ بعد نماز عصر حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب مبارک پوری دامت برکاتہم نے پڑھائی، اور ابراہیم پور کے قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔
(معلومات بہ واسطہ مولوی مفتی عین الہدی صاحب قاسمی)

مولوی حکیم سلمان احمد صاحب مبارک پوری

مولوی حکیم سلمان احمد بن مولوی علی حماد مبارک پوری محلہ شاہ محمد پور میں ماہ رمضان ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر مدرسہ باب العلم

مبارک پور میں داخل ہوئے، وہاں سے جامع العلوم جوادیہ بنارس پہونچے، جہاں سے فخر الافاضل کی سند حاصل کی، دینی تعلیم کی تکمیل کے بعد طب کا کورس مکمل کیا، ۱۹۷۴ء سے ۱۹۷۹ء تک مدرسہ باب العلم میں پرنسپل رہے۔

۱۹۸۰ء میں مولوی غلام عسکری نے مولوی سلمان احمد کو سورن کوٹ (پونچھ کشمیر) میں معین کیا کہ تنظیم المکاتب کی طرف سے جامعہ قائم کریں، جس کی بقاء و ترقی مولوی سلمان احمد کی مرہونِ منت تھی۔

بڑے سنجیدہ، کم سخن عالم و حکیم ہونے کے ساتھ بہترین شاعر بھی تھے، وطن سے دور پونچھ کشمیر میں ۲۷ مارچ ۱۹۸۳ء / ۱۲ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۳ھ یکشنبہ کو انتقال کیا، لاش وہاں سے لکھنؤ لائی گئی، وہاں سے مبارک پور پہونچی، جہاں جسدِ خاکی کو شیعہ عید گاہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ (شجرہ طیبہ ص ۳۱ تا ۳۳)

مولوی سبط حسن مبارک پوری

تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا، والد کا نام حاجی محمد علی مشہدی کر بلائی تھا، محلہ شاہ محمد پور کے باشندہ تھے۔

ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد سلطان المدارس لکھنؤ سے صدر الافاضل کی آخری سند لے کر تبلیغ مسلک کے ساتھ مبارک پور میں ”تاروکتان“ کی دوکان کی، پھر جین پور اور مبارک پور میں بساطہ کی دوکان کی، اپنے محلہ کی مسجد میں امام تھے، مبارک پور کے بعد مدرسہ حسینیہ گھوسی میں طویل مدت تک تدریس کے فرائض انجام دیئے، بیماری کے بعد مستقل طور پر وطن آ گئے۔

بڑے خوش اخلاق اور منکسر المزاج تھے، سب کا احترام کرتے تھے، طویل

علاقت کے بعد ۵۰ سال کی عمر میں ۱۱ صفر ۱۳۹۸ھ کو اس دنیا سے گزر گئے، شیعہ عید گاہ میں دفن کیے گئے۔ (شجرہ طیبہ ۲۹ تا ۳۱)

مولانا الحاج شمس الدین صاحب الحسینی مبارک پوری

مولانا شمس الدین ولد حاجی نعمت اللہ ولد عبد القادر صاحب مبارک پوری متقی و پابند شریعت، سادہ مزاج، متواضع و خاکساری کا پیکر، نہایت صابر و شاکر، نام و نمود سے دور رہنے والے محلہ پورہ خضر مبارک پور کے باشندہ تھے۔

ولادت کب ہوئی، تحقیق بسیار کے باوجود پردہ خفائیں ہے، ہاں یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ۱۹۱۵ء کے آس پاس پیدا ہوئے، آپ کی نشوونما دینی ماحول میں ہوئی، نہایت پرہیز گار، اور تہجد و اشراق کے پابند تھے، نانا حافظ ثناء اللہ صاحب قرآن کریم کے بہت اچھے حافظ تھے، آپ کے پڑھائے ہوئے طلبہ بڑی شہرت رکھتے تھے۔

غالباً ابتدائی تعلیم و تربیت جامعہ عربیہ اہیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، پھر تعلیم و تربیت کے عزم و ارادہ نے مدرسہ شاہی قاسمیہ مراد آباد پہنچا دیا، زیادہ تر تعلیم وہیں پر ہوئی، اساتذہ مدرسہ شاہی میں حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادی اور حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندی وغیرہما زیادہ مشہور ہیں۔

پھر اعلیٰ تعلیم کے جذبہ سے دارالعلوم دیوبند میں فروکش ہوئے، حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے صحیح بخاری اور ترمذی شریف پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، اور دارالعلوم دیوبند کے دیگر مایہ ناز اساتذہ علم و فن حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعجاز علی صاحب امر و ہوئی، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

مہتمم دارالعلوم دیوبند وغیرہم سے دیگر کتب حدیث پڑھ کر دورہ حدیث شریف کی تکمیل کی۔
آپ نے عملی زندگی کا آغاز کب سے کیا، یہ پردہ خفائیں ہے، مگر یہ معلوم ہے کہ
جامعہ عربیہ اہیاء العلوم مبارک پور میں تعلیم و تربیت کی خدمت میں مصروف ہو گئے، عام
طور سے آپ کے زیرِ درس نور الایضاح، کافیہ، ہدایۃ النخو، ترجمہ کلام پاک، فصول اکبری، علم
الصیغہ، میزان منشعب کتابیں تھیں۔

آپ کے درس و تدریس کے حوالہ سے آپ کے لائق و فائق شاگرد حضرت مولانا
اعجاز احمد اعظمی رقمطراز ہیں:

”مولانا شمس الدین صاحب الحسینی مدرسہ کے ناظم تھے، ان کی مشغولیات بہت
تھیں، مگر پورے سال سبق کی پابندی کی، پندرہ پارے کا ترجمہ انھوں نے
پڑھایا، اور بہت اچھا پڑھا۔“ (حکایت ہستی ص ۹۰)

آپ سے فیض یاب ہونے والوں کی بڑی تعداد ہے، چند نام ملاحظہ فرمائیں:
حضرت مولانا محمد عارف صاحب جہانا گنجیؒ، والد محترم حضرت مولانا جمیل احمد
صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد امین
صاحب مبارک پوری۔

جیسا کہ گزر چکا کہ آپ مدرسہ کے نائب ناظم تھے، یہ حضرت مولانا عبدالباری
صاحب قاسمی کا دورِ نظامت تھا، طویل عرصہ تک نیابت کی ذمہ داری انجام دیتے رہے، اس
دور میں بسا اوقات جامعہ مالی تنگی سے گذرا، آپ مسجد میں پہنچ جاتے، خوب دعائیں کرتے
تھے، غیب سے انتظام ہو جاتا، مالی تنگی دور ہو جاتی۔

بسا اوقات مدرسہ میں باورچی نہیں ہوتا تھا، یا کوئی پروگرام ہوتا، اپنے گھر سے خود یا

بچوں کے کندھے پر لا کر کھانا لاتے تھے، جامعہ کی کسی خدمت سے انھیں عار محسوس نہیں ہوتا تھا۔
الغرض شب و روز جامعہ کی تعمیر و ترقی میں مصروف تھے، حالات نے جامعہ سے
علیحدگی پر مجبور کر دیا اور جمعیتہ علماء کے مرکزی دفتر دہلی تشریف لے گئے۔

حضرت شیخ الاسلام کے بڑے صاحب زادے فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد
مدنی صدر جمعیتہ علماء ہند آپ کا بڑا لحاظ فرماتے تھے، جب آپ ایک بار جامعہ عربیہ احیاء العلوم
مبارک پور سے باضابطہ مستعفی ہو گئے تو فدائے ملت نے آپ کو تاحیات آرگنائزر مقرر فرمایا، اس
پلیٹ فارم سے ۳۰/۳۲ سال تک نہایت تندہی سے جمعیتہ کی خدمت انجام دی، حتیٰ کہ جامعہ کی
نظامتِ علیا کے زمانہ میں بھی حسبِ طاقت جمعیتہ کی یہ ذمہ داری انجام دیتے رہے۔

پھر ایک بار جامعہ کا منصب نظامت خالی پڑا تھا، جامعہ کی مجلس شوریٰ ہوئی، متفقہ
طور پر آپ کو ۱۱ جنوری ۱۹۹۳ء کو ناظم اعلیٰ منتخب کر کے جامعہ کے لیے خدمات حاصل کیں۔
مولانا بوڑھے تھے، بہت بوڑھے تھے، قوتِ سماعت کمزور پڑ رہی تھی، مگر آپ کا
عزم و حوصلہ جوان تھا، اس دور میں یہ راقم جامعہ کا طالب علم تھا، کبرسنی اور پیرانہ سالی کے
باوجود مولانا کے عزم و حوصلہ پر تعجب ہوتا تھا۔

مولانا منصبِ نظامت کے فرائض اور خدمات مفوضہ انجام دیتے رہے، مگر جب
اعضاء بالکل جواب دے چکے، پیروں میں سکت نہ رہی تو رسمی طور پر جامعہ سے چھٹی لے لی،
مگر جامعہ کے ساتھ تعلق و محبت کا سلسلہ قائم و دائم رہا۔

آپ بہت سی صفات کے جامع تھے، آپ کی زندگی کا بیش تر حصہ جدوجہد سے
لبریز ہے، حتیٰ کہ ضعف و پیری میں بھی آپ کی ہمت و حوصلہ شباب پر تھی، بڑھاپے میں بھی ہر
جنازہ میں شریک ہونے کے کوشاں ہوتے تھے، کسی کے جنازہ کی خبر لگتی، پیدل یا رکشہ پر

سوار ہو کر ضرور پہونچتے تھے، آپ بڑے صابر و شاکر تھے، آپ کس قدر صابر و شاکر تھے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ دو عالم و فاضل جواں سال صاحب زادے یکے بعد دیگرے حادثہ کا شکار ہو کر اچانک اللہ کو پیارے ہو گئے، مگر زبان سے آہ و فغاں یا شکایت کا کوئی کلمہ نہیں نکلا، اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کر کے راضی برضا رہے، آپ کے منغلے صاحب زادے مولانا مبارز الدین مرحوم کی دردناک موت ہوئی، جس کی تفصیل یہ ہے کہ مرحوم ۲ جولائی ۱۹۸۰ء کو کاشی ٹرین سے بمبئی کے لیے روانہ ہوئے، ۳ جولائی ۱۹۸۰ء کو ناسک اسٹیشن پر پانی لینے کے لیے اترے، اتنے میں گاڑی چل پڑی، دوڑ کر گاڑی پکڑنے کی کوشش کی، گاڑی ہاتھ سے چھوٹ گئی، نیچے گر پڑے، ٹرین کی زد میں آ کر اللہ کو پیارے ہو گئے، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

لوگ پریشان تھے کہ اس حادثہ کی اطلاع آپ کو کیسے دی جائے، ہمت نہیں ہو رہی تھی، مگر آپ کو اس کی خبر دی گئی، زبان سے سوائے ”انا اللہ وانا الیہ راجعون“ کے کوئی جملہ نہیں نکلا، بغیر چیخ و پکار کے اٹھے، وضو کر کے نفل میں مشغول ہو گئے۔

اس کے علاوہ آپ پر مصیبت پڑی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش آئی، حادثات کا شکار ہوئے، مگر صبر و استقامت میں لچک نہیں آئی، ہر آن صبر و استقامت کا دامن سنبھالے رکھا، یہاں تک کہ رب حقیقی سے جا ملے۔

آپ کثیر الاسفار انسان تھے، آپ کا سفر عام طور سے جمعیت علماء اور جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کی فراہمی مالیات کے سلسلہ میں ہوتا تھا، اور آخر عمر تک ضعف و نقاہت کے باوجود سفر کا سلسلہ جاری رہا، بہت بار حج و عمرہ اور زیارتِ حرمین شریفین سے سرفراز ہوئے، آپ کے حج بیت اللہ کی تعداد ۱۸ تک بتائی جاتی ہے۔

آپ کے پیرومرشد شیخ الاسلام تحریک آزادی کے امام اور عظیم مجاہد آزادی تھے، آپ پر بھی یہ رنگ چھایا ہوا تھا، آپ تحریک آزادی میں شریک تھے، آپ کا شمار مجاہدین آزادی میں تھا، تقریر کے ذریعہ انگریزوں کے خلاف قوم کو ابھارا۔

آپ شیخ الاسلام کے سچے عاشق اور جاں نثار تھے، محبت و عقیدت صرف شیخ الاسلام ہی سے نہیں بلکہ پورے مدنی خاندان سے والہانہ محبت و عقیدت تھی، آپ بہت اعتکاف بھی فرماتے تھے۔

اس قدر محنت و مجاہدہ سے جسم گھلنے لگا، امراض کا ہجوم بڑھنے لگا، قویٰ جواب دینے لگے، مگر آپ رب حقیقی کی یاد، ذکر و فکر، صوم و صلاۃ اور دعاء و اذکار میں لگے رہے، یہاں تک کہ وقت موعود آگیا، ۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ / ۱۹ ستمبر ۲۰۰۰ء شنبہ کی صبح تھی، داعی اجل روح قبض کرنے کے لیے حاضر ہوگا، آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، اور ہمیں سوگوار چھوڑ کر رب حقیقی کی آغوش میں پہنچ گئے، جس کے ہر گھڑی منتظر تھے، جس کے لیے ایمان و استقامت، صبر و شکر اور محنت و مجاہدہ کی زندگی بسر کی تھی۔

اسی دن عصر کی نماز کے بعد جامعہ کے وسیع صحن میں نماز جنازہ ادا کی گئی، نماز جنازہ میں کثیر مجمع تھا، محلہ پورہ خضر کے قدیم قبرستان مشہور بہ ”بنری باغ“ میں سپرد خاک کیے گئے۔

(اکابر احياء العلوم حصہ دوم ص ۱۴۲ تا ۱۴۶ مع حک و اضافہ)

مولانا شا کر علی صاحب لال چوک

مولانا شا کر علی صاحب لال چوک بمبئی میں امام تھے، بمبئی ہی میں ہارٹ اٹیک ہو گیا، اس سے زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

مولانا صفی الرحمن صاحب حسین آبادی

مولانا صفی الرحمن ولد عبد اللہ بن محمد اکبر بن محمد علی بن عبد المومن بن فقیر اللہ حسین آبادی ایک علمی و دینی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

قصبہ مبارک پور کے شمال میں ایک میل کے فاصلہ پر موضع حسین آباد ہے، وہیں ۶/جون ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم اپنے گھر سے شروع کی، قرآن مجید کے چند پارے دادا اور چچا سے پڑھا، پھر ۱۹۴۸ء میں مدرسہ دارالتعلیم پورہ صوفی میں داخل ہوئے، وہاں ۶/رسالہ کرپرائمری درجات اور مڈل کورس کی تکمیل کی، قدرے فارسی بھی پڑھی، اس کے بعد جون ۱۹۵۴ء میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخل ہوئے، اس وقت جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پوری اور حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساحر مبارک پوری کے فیوض درس جاری تھے اور ان سے دو سال تک مستفیض ہوتے رہے، بعدہ مدرسہ فیض عام منو پھونچے، ۵/رسالہ گزارے، اور مختلف علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی، جنوری ۱۹۶۱ء میں فراغت ہوئی، امتحانات میں امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوتے رہے، آپ نے جن ماہرین علم و فن کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، ان میں سے چند نام یہ ہیں:

شیخ الحدیث حضرت مولانا شمس الحق صاحب سلفی، مولانا عبد المعید صاحب بنارس اور مولانا عبد الرحمن صاحب نحوی وغیرہم ہیں۔

فراغت کے بعد اسی سال الہ آباد پھر شہر ناگ پور میں درس و تدریس کا مشغلہ اختیار

کیا، پھر دو سال بعد مارچ ۱۹۶۳ء میں مدرسہ فیض عام منو کے ناظم اعلیٰ کی دعوت پر اس میں دو سال گزارے کہ حالات نے علیحدگی پر مجبور کر دیا، اگلے سال جامعۃ الرشاد میں رہے، پھر فروری ۱۹۶۶ء سے مدرسہ دارالحدیث کی دعوت پر بحیثیت مدرس گئے، تین سال گزارے، تدریس کے ساتھ نائب صدر بھی رہے جنوری ۱۹۶۹ء میں استعفیٰ دے کر مدرسہ فیض العلوم سیونی (مدھیہ پردیش) منتقل ہو گئے، وہاں بھی درس و تدریس کے علاوہ مدرسہ کے تمام داخلی و خارجی معاملات کو بحیثیت صدر المدرسین بحسن و خوبی انجام دیا، وہاں دعوتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور سیونی کی جامع مسجد میں پابندی سے خطبہ جمعہ دیا، چار سال گزارے، پھر ۱۹۷۲ء کے آخر میں سالانہ تعطیل پر وطن آئے ہوئے تھے، مدرسہ دارالتعلیم کے اراکین کے اصرار پر اپنے اولین مادر علمی میں تعلیمی انتظامات اور تدریس کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

دو سال بعد جامعہ سلفیہ بنارس بلا لیے گئے، اور وہاں اکتوبر ۱۹۷۴ء سے مسلسل ۱۴ سال تک مختلف تعلیمی، تدریسی، تالیفی اور دعوتی خدمات انجام دیں، اور متعدد کتابیں تصنیف فرمائیں۔

اور اسی دوران ۱۹۷۶ء میں ”الرحیق المختوم“ تصنیف کی، اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے اہتمام سے نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ کے موضوع پر ہونے والے انعامی مقابلہ میں حصہ لیا اور اول انعام کے مستحق قرار پائے۔

فروری ۱۹۸۲ء میں جامعہ سلفیہ کے اردو ماہ نامہ ”محدث“ کا اجرا ہوا تو اس کی ادارت بھی آپ ہی کے حوالہ کی گئی، اس میں مختلف موضوعات پر مضامین تحریر فرمائے، ۱۹۸۸ء تک یہ ذمہ داری نبھائی، آپ کام یاب مناظر بھی تھے، آپ کے مناظرہ کی روداد، رزم حق و باطل

(مناظرہ بجز ڈیہہ) کے نام سے شائع ہوئی ہے، اگست ۱۹۸۸ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور مسلسل دس سال تک مختلف علمی و دعوتی کاموں میں گزارا، مرکز خدمۃ السنۃ والسیرۃ النبویۃ میں مختلف علمی و تحقیقی خدمات انجام دیں۔

الغرض آپ نے مقالات و مضامین کے علاوہ عربی واردوں میں تقریباً ۵۴ کتابیں تصنیف فرمائیں۔

۱۹۹۴ء میں مدینہ منورہ ہی میں فالج کا حملہ ہوا، کنگ فہد ہاسپٹل میں تقریباً ۱۰ روز تک زیر علاج رہے، کچھ دنوں چھڑی کے سہارے چلتے رہے، پھر مکمل صحت یاب ہو گئے اور دوبارہ علمی و دینی اور دعوتی کاموں میں مصروف ہو گئے۔

پھر ریاض میں قیام کے دوران ۲۰۰۱ء میں برین ہیمرج کا حملہ ہوا، فالج کا اثر نصف دائیں حصہ پر واضح طور پر محسوس ہوتا تھا، چوں کہ شوگر اور بلیڈ پریشر کے بھی مریض تھے، اس لیے روز بروز لاغر و نحیف ہوتے گئے، ذوقِ غذا ۱۴۲۶ء کو وطن مالوف واپس آ گئے۔ تقریباً ۶ ماہ کے قیام کے بعد سعودیہ عربیہ واپسی کا پروگرام تھا، اسی اثناء میں ۲۹ جون ۲۰۰۶ء بروز یکشنبہ دوبارہ برین ہیمرج کا حملہ ہوا، کافی نازک حالت میں بنارس کے ایک اسپتال میں داخل کیے گئے، بالآخر یکم ستمبر ۲۰۰۶ء یوم جمعہ کو دوپہر میں پونے دو بجے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

نماز جنازہ بروز دوشنبہ بعد نماز عصر آپ کے منجھلے صاحب زادے مولانا یاسر صاحب مدنی نے پڑھایا، اور حسین آباد کے قبرستان میں اپنے عمان محترمان مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی اور حافظ محمد یونس صاحب کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے۔

(الرحیق المختوم ص ۲۷ تا ۳۰، تراجم علمائے اہل حدیث ۱۴۹ تا ۱۵۶)

حضرت مولانا مفتی ظہور احمد صاحب ندوی

عظیم فقیہ، بلند مرتبہ قاضی، مدبر و منتظم، کامیاب مدرس، نہایت ذہین و فطین، قوی الحافظہ، فراست و شرافت کے مالک، حاضر جواب، تواضع و سادگی کے مرقع، قناعت پسند، حلم و بردباری کے پیکر تھے۔

قصبہ مبارک پور سے متصل ایک نامی گرامی بستی سکٹھی کے ایک زمین دار خاندان میں جناب عبدالستار صاحب کے گھر میں سن ۱۹۲۷ء میں آنکھیں کھولی۔

ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب ”ریاض العلوم“ میں حاصل کی، پھر دیارِ مشرق کی قدیم درس گاہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے بلند پایہ اساتذہ کرام سے شرح جامی تک مستفیض ہوئے۔ سن ۱۹۴۴ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، اور وہاں کے باکمال اساتذہ کرام کی صحبت میں رہ کر ۵ سال علمی استفادہ کرتے رہے۔

جن اساتذہ علم و فن سے مستفیض ہوئے، ان میں خاص طور سے حضرت مولانا ابوالعرفان صاحب ندوی، حضرت مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی، حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب عطا، حضرت مولانا ابوالحسن صاحب ندوی، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب، حضرت مولانا شبلی دوم صاحب جیراج پوری ہیں۔

سن ۱۹۴۹ء میں فارغ التحصیل ہوئے، اسی کے ساتھ دارالعلوم ندوہ میں بحیثیت ”استاذ فقہ“ تقرر عمل میں آیا، پھر چند سالوں کے بعد ندوہ کے صدر مفتی منتخب ہوئے، اور زندگی کی آخری سانس تک بہترین مدبر و منتظم اور ماہر مفتی کی حیثیت سے کارہائے مفوضہ کی انجام دہی میں مصروف رہے، اور مر کر ہی جدا ہوئے۔

آپ کا درس علم و حکمت سے پُر ہوتا تھا، پیچیدہ مسائل بھی مسکراتے ہوئے طلبہ عزیز کو ذہن نشین کرا دیتے تھے، درس کو آسان کر کے طلبہ کے ذہن سے قریب کر کے ذہنوں میں راسخ کر دیتے تھے، آپ کے علوم سے ہزار ہا تشنگان علوم سیراب ہوئے، ان میں سے چند نام وریہ ہیں: مولانا ناصر علی صاحب ندوی، ڈاکٹر اجتباء ندوی، مولانا سید سلمان حسینی، مولانا راشد حسین صاحب ندوی اور مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس صاحب۔

ان کی زندگی دنیا سے بے رغبتی اور زہد و تقویٰ سے معمور تھی، اس کے اثرات ان کے لباس و غذا سے ظاہر ہوتے تھے، معمولی کپڑے کا کرتا، اور پاجامہ، زیادہ تر بلا پرلیں پہنتے تھے، جس کے اوپر صدری رہا کرتی تھی، خاص خاص موقعوں پر شیروانی زیب تن کر لیتے تھے۔ راقم سطور ایک بار ندوہ حاضر ہوا، مفتی صاحب سے ملاقات کرنی تھی، دیکھا کہ مفتی صاحب ندوہ کے صحن میں نہایت سادگی سے کرسی پر تشریف فرما ہیں، نہ خادم ہیں نہ خدام، ارد گرد چند طلبہ ندوہ منطق و حکمت کے مسائل حل کر رہے ہیں، مفتی صاحب منطق و حکمت کے پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھا رہے ہیں۔

اس سے پہلے بھی والد گرامی حضرت مولانا جمیل احمد صاحب قاسمی، مدنی کے ہمراہ ملاقات کا شرف حاصل کر چکا تھا، اور استفادہ کا موقع حاصل ہو چکا تھا، مفتی صاحب والد گرامی کا بڑا خیال اور پاس رکھتے تھے۔

مفتی صاحب سے ہمارا خاندانی تعلق تھا، مفتی صاحب راقم السطور کے بچپن میں ہمارے خاندان میں تشریف لاتے تھے، لیکن اپنی کمسنی کی بنا پر علمی استفادہ سے محروم رہی، لیکن جب عربی درجات میں پہنچا تو مفتی صاحب کے مقام و مرتبہ سے واقف ہوا۔

مفتی صاحب درازی عمر اور مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے، آخر ۲۵ ستمبر ۱۹۱۶ء کو

پونے پانچ بجے صبح لکھنؤ میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون
 جنازہ کی نماز مرشدِ ملت حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسینی ناظم ندوۃ العلماء
 لکھنؤ نے ندوہ کے صحن میں پڑھائی، اور ڈالی گنج قبرستان میں سپردِ خاک ہوئے۔
 مفتی صاحب کے پس ماندگان میں تین لڑکے مولانا سہیل احمد صاحب ندوی،
 مولانا محمد شعیب صاحب ندوی، مولانا محمد زبیر صاحب ندوی اور چار لڑکیاں ہیں۔
 (ماخوذ از میری محسن شخصیتیں ص ۷۱ تا ۷۵ مع حک و اضافہ)

مولانا قاضی ظفر مسعود صاحب مبارک پوریؒ

مولانا قاضی ظفر مسعود بن مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ علم و ادب کے
 شیدائی تھے۔

یکم دسمبر ۱۹۴۱ء / ۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۰ء کو ولادت ہوئی، جامعہ عربیہ احیاء العلوم
 مبارک پور میں پرائمری درجات کی تکمیل کے بعد ایم پی انٹر کالج مبارک پور سے ۱۹۶۰ء میں
 ہائی اسکول پاس کیا۔

پھر علوم دینیہ کی تحصیل کے لیے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخلہ لیا اور
 ۱۹۶۹ء میں مدرسہ مفتاح العلوم منو سے عالمیت کی تکمیل کی، ۱۹۶۸ء میں فخر الحدیث حضرت
 مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادیؒ نے آپ کی علمی لیاقت سے خوش ہو کر خصوصی سند سے
 نوازا۔

دو مرتبہ آپ حج بیت اللہ کی سعادت سے سرفراز ہوئے، فراغت کے بعد علمی و دینی
 سرگرمیاں جاری رہیں، جن سے بہت سے علمی و ادبی میدان سرسبز و شاداب ہوئے، ان میں

زندگی اور تازگی کی روح دوڑ گئی۔

علم و ادب سے آپ کا گہرا تعلق تھا، کسی بھی اہل علم سے مل کر خوش ہوتے، علم کی باتیں کرتے، آپ کی مجلس شعر و ادب کی محفل ہوا کرتی تھی، زعفران زار اور باغ و بہار ہوا کرتی تھی، آپ کو موقع محل کے اچھے اور معیاری اشعار خوب یاد تھے، بکثرت اشعار سناتے، محفل سے اٹھ جاتے، محفل سونی پڑ جاتی تھی، آپ کی غیر حاضری کا فوراً احساس ہونے لگتا تھا۔

آپ میں بڑی خوبیاں تھیں، ایک خوبی یہ تھی کہ نہایت صاف گو تھے، حق بات کہتے اور سامنے کہتے، اصول کی باتیں کرتے اور اصول کے پابند تھے، بے اصولی پر ناراض ہوتے، ہر ملنے والے سے خندہ پیشانی سے ملتے، ان کے یہاں مذہب و ملت کی تفریق نہیں تھی۔

بڑے باپ کے بیٹے تھے، مگر آپ میں تکبر اور بڑائی نہیں تھی، خردنوازی کی صفت زندہ تھی، چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، بڑے جفاکش اور صابر انسان تھے، اپنا کام خود کرتے، ان کی زندگی رکھ رکھاؤ اور تکلفات سے پاک تھی۔

انھیں مشاعروں، ادبی تقریبات اور علمی گفتگو سے خاص تعلق تھا، مبارک پور میں لڑکیوں کی پہلی عصری درس گاہ انصار گرلس انٹر کالج کے بانیوں میں سے تھے، اس سے پہلے بھی کئی لائبریریوں اور اداروں کو وجود میں لانے کا فخر انھیں حاصل ہو چکا تھا۔

انھوں نے اپنے محترم المقام والد صاحب کے سلسلے میں کئی اشاریے ترتیب دیئے ہیں، جو تحقیقی کام کرنے والوں کی رہنمائی کا بہتر فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔

وفات سے ایک ہفتہ قبل پی جی آئی اسپتال لکھنؤ میں دل کا آپریشن کرایا تھا، مگر زندگی اور صحت مقدر نہ تھی، آخر ۱۷ دسمبر ۲۰۰۹ء پنجشنبہ کی شب میں ۱۱ بج کر ۱۰ منٹ پر اس جہان فانی سے کوچ کر گئے، ۱۱ بجے دن میں نعش مبارک پور پہونچی، بعد نماز ظہر ۲ بجے

نماز جنازہ اور تدفین ”شاہ پنجہ“ میں عمل میں آئی، اس کا ردائی میں جم غفیر شریک تھی۔
(مقدمہ تذکرہ علمائے مبارک پور ص ۳۳ تا ۳۴ مع حذف اضافہ)

مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب مراد آبادی

مولانا حافظ عبدالعزیز بن غلام نور بن عبدالرحیم بھوچپوری مراد آبادی، مبارک پوری مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور کے شیخ الحدیث و صدر المدرسین تھے، اور بریلوی جماعت میں ”حافظ ملت“ سے یاد کیے جاتے ہیں۔

۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۵ء یوم دوشنبہ کو بھوج پور ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے، دادا نے ”عبدالعزیز“ نام تجویز کیا۔

ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر پپیل سانہ اور مراد آباد میں ہوئی، پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے دارالعلوم عثمانیہ اجیر میں مولانا امجد علی گھوسوی سے تعلیم حاصل کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔

پھر مولوی امجد علی گھوسوی کے حکم پر مدرسہ اشرفیہ کی نشاۃ ثانیہ اور استحکام کے لیے ۱۹۳۲ء میں مبارک پور آئے، اور پوری زندگی یہیں گزار دی اور مدرسہ اشرفیہ کو پروان چڑھایا۔
پھر مدرسہ اشرفیہ کی توسیع و ترقی کے لیے قصبہ کے باہر اس کا سنگ بنیاد رکھ کر ”الجامعۃ الاشرفیہ“ بنادیا، جو اب ایک وسیع و عریض آراضی پر ان کے صاحب زادہ جناب عبدالحفیظ صاحب کی سربراہی میں چل رہا ہے۔

تدریسی و جماعتی مصروفیات کی بنا پر زیادہ وقت نہ مل سکا کہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ ہوتی، چند تصانیف ان کی طرف منسوب ہیں:

(۱) المصباح الجدید (۲) فرقہ ناجیہ (۳) معارف حدیث (۴) انباء الغیب
(۵) ارشاد القرآن (۶) الارشاد (۷) فتاویٰ عزیزہ۔

آپ کسی عالم کی اچھی تصنیف دیکھتے، خوب خوب حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے اور اس کی نشر و اشاعت کی کوشش کرتے، خود بھی نسخے لے کر فروخت کرتے، بعض مصنفین کو حوصلہ افزا کلمات لکھ کر ڈاک سے بھی بھیجتے تھے۔

آپ کی عادت تھی کہ کسی کی بیماری کی خبر لگتی، اس کی عیادت کے لیے ضرور جاتے۔
۱۹۶۶ء میں آپ نے پہلا حج بیت اللہ کیا، آپ نے پوری زندگی درس و تدریس میں گزار دی، آپ کی درس گاہ سے بہت سے علماء، فضلاء، خطباء، اصحابِ قلم اٹھے ہیں، چند نام ملاحظہ فرمائیں:

مولانا ضیاء المصطفیٰ قادری، مولانا مفتی عبدالمنان اعظمی، مولانا ارشد القادری،
مولانا عبید اللہ خاں اعظمی، مولانا قمر الزماں اعظمی، مولانا محمد ادریس بستوی، مولانا محمد شفیع اعظمی، مولانا محمد احمد مصباحی، مفتی انور علی بنگلور۔

یکم جمادی الاخریٰ ۱۹۹۶ء / ۳۱ مئی ۱۹۷۶ کو شب میں ۱۱ بج کر ۵۵ منٹ پر مبارک پور میں اپنی قیام گاہ پر نامدسہ میں اچانک انتقال کر گئے۔

دوسرے دن صبح ۹ بجے الجامعۃ الاشرفیہ کے وسیع و عریض میدان میں خلق کثیر نے نماز جنازہ پڑھ کر سپرد خاک کیا۔ (ماہ نامہ ماہ نور جولائی ۲۰۰۶ء)

ضروری وضاحت: مولانا کا وطن اگرچہ بھونچ پور ضلع مراد آباد تھا، مگر مبارک پور میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اور ان کے صاحب زادگان و احفاد بھی یہیں مستقل سکونت پذیر ہیں، اس لیے مبارک پور علماء میں شمار کیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالحمید شاہ ناظر مبارک پوری

۱۹۰۵ء کے حدود میں پیدا ہوئے، عالم ہونے کے ساتھ بہترین شاعر بھی تھے، ناظر تخلص تھا، اپنے وطن کے مدرسہ باب العلم میں تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ فیضانِ پنجتن کے نام سے ان کا مجموعہ کلام شائع ہو چکا ہے، جو ۲۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

تقریباً ۸۵ سال کی عمر میں ۱۵ جولائی ۱۹۹۰ء کو انتقال کیا، شیعوں کے مشہور قبرستان عید گاہ محلہ پورہ دہن میں مولوی علی ارشاد نجفی اور مولوی حکیم سلمان احمد کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے۔ (شجرہ طیبہ ص ۳۳ تا ۳۴)

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی محدث

حضرت مولانا عبید اللہ بن مولانا عبدالسلام بن شیخ خان محمد بن شیخ امان اللہ بن شیخ حسام الدین مبارک پوری مایہ ناز محدث، محقق، مصنف، اعمال و اخلاق میں اکابر و اسلاف کی یادگار، علم و فضل کی بنا پر بڑی عزت و شہرت کے مالک تھے۔

مورث اعلیٰ حسام الدین مجاہدین بالا کوٹ میں سے تھے، اور ۱۲۴۴ھ میں سرحد کے کسی علاقہ میں لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا، آپ کی ولادت ۱۳۲۷ھ میں ہوئی۔ آپ کے والد محترم آپ سے بے حد محبت کرتے تھے، چنانچہ جہاں بھی درس و تدریس کے لیے جاتے، وہاں آپ کو ساتھ رکھتے تھے، جب پڑھنے لکھنے کی عمر کو پہنچے تو اس وقت والد محترم جامعہ عالیہ منوناتھ بھنجن میں مسند تدریس پر فائز تھے، لہذا آپ نے اسی

مدرسہ سے اپنی تعلیم کا آغاز کیا اور تین سال اسی جامعہ میں رہ کر اردو و فارسی کی تعلیم حاصل کی، اور قرآن مجید کے تقریباً ۱۲ پارے حفظ کیے۔

۱۹۱۷ء میں جب آپ کے والد محترم جامعہ سراج العلوم بونڈیہار (بلرام پور) بحیثیت مدرس تشریف لے گئے تو آپ کو بھی اپنے ہمراہ لے گئے، چنانچہ وہاں آپ نے کافی شرح جامی، شرح وقایہ، مشکوٰۃ المصابیح، سراجی، شرح تہذیب، قطبی اور متنبی وغیرہ کی تعلیم اپنے والد محترم کی زیر سرپرستی اور زیر تربیت رہ کر حاصل کی۔

۱۹۲۳ء میں جب آپ کے والد محترم دارالحدیث دہلی گئے، تو وہاں بھی آپ کو ساتھ لے گئے، داخلہ لے کر دارالحدیث رحمانیہ کے مقررہ نصاب سے فضیلت تک کی تعلیم مکمل کی، بخاری و مسلم اور مؤطا امام مالک شیخ الحدیث مولانا احمد اللہ پر تاب گڈھی سے پڑھی، ہدایۃ الحکمت، شمس بازغہ، شرح مسلم، حمد اللہ، قاضی مبارک، شرح عقائد نسفی، شرح مواقف، التصریح، شرح چغینی، مسلم الثبوت وغیرہ مولانا غلام یحییٰ کان پوری سے، نور الانوار، تفسیر جلالین، جامع الترمذی، مقامات حریری، دیوان حماسہ مولانا عبدالرحمن نگر نہسوی سے ہدیہ سعیدیہ، سنن ابی داؤد مولانا ابوطاہر بہاری سے، الفوز الکبیر مولانا محمد اسحاق آروی سے صدر اشرح مطالع مولانا عبدالوہاب آروی سے اور تفسیر بیضاوی کا کچھ حصہ مولانا محمد گوندلوی سے پڑھا، ایام تعطیل میں گھر پر محدث کبیر مولانا عبدالرحمن صاحب مبارک پوری سے ترمذی شریف، شرح نخبہ، اور مقدمہ ابن صلاح پڑھ کر سند اجازت حاصل کی۔

۱۳۴۵ھ میں آپ دارالحدیث رحمانیہ سے فارغ ہوئے تو اسی سال شوال سے دارالحدیث رحمانیہ میں مدرس ہو گئے اور لگ بھگ اٹھارہ سال تک درس و تدریس سے وابستہ رہے، اسی دوران ۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک شیخ الحدیث رہے، تاحیات مستفتی

حضرات کے سوالات کے جوابات تحریر فرماتے رہے۔

دورانِ تدریس جب حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب محدث مبارک پوریؒ کی بینائی حد درجہ کمزور ہو گئی تو تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی کے کام کی تکمیل میں ہاتھ بٹانے کے لیے دارالحدیث رحمانیہ کی طرف سے دو سال کے لیے آپ مبارک پور تشریف لائے، اور اپنے رفیق کار مولانا عبدالصمد صاحب حسین آبادی اور مولانا محمد صاحب لاہوری پنجابی کے تعاون سے تحفہ کی جلد ثالث اور رابع کی تکمیل میں تعاون کیا، اور مؤلف تحفۃ الاحوذی کے انتقال کے بعد تحفۃ الاحوذی کی تکمیل اور نظر ثانی یا ترتیب حضرت مولانا عبدالصمد مبارک پوری اور صاحب ترجمہ یعنی آپ نے کی، پھر واپس دارالحدیث آگئے، اس دوران آپ کو مدرسہ کی طرف سے مشاہرہ ملتا رہا، وہاں آپ کو صحیح بخاری، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور مؤطا امام مالک کی تدریس کے ساتھ افتاء کا کام بھی سونپا گیا۔

دارالحدیث رحمانیہ سے ایک ماہ نامہ بنام ”محدث“ شائع ہوتا تھا، جس کے مدیر پیغمبر پور (ضلع درہنگہ) کے مولانا عبدالعلیم ناظم صدیقی تھے، ان کے انتقال کے بعد ۱۹۳۵ء سے اس کی ادارت کی ذمہ داری آپ اور مولانا نذیر احمد ملوی کے سر ڈال دی گئی، چنانچہ ملوی صاحب مدیر مسئول اور آپ مدیر تحریر تھے، پھر عوام کے فائدہ کے پیش نظر فتاویٰ کے باب کا بھی اضافہ کر دیا گیا، جس میں آپ کے فتاویٰ شائع ہوتے تھے۔

آپ نے ۱۸ سال تک درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا، اس مدت میں کتنے لوگوں نے آپ سے اکتسابِ فیض کیا، اس کا شمار مشکل ہے، خصوصی تلامذہ کی ایک مختصر فہرست پیش خدمت ہے:

مولانا عبدالرؤف صاحب جھنڈاگری، مولانا عبدالمعید صاحب بنارسی، مولانا

اقبال احمد صاحب رحمانی، مولانا ظہیر الدین صاحب رحمانی، مولانا رضاء اللہ نمبرہ مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری وغیرہم کثیر علمائے عظام۔

بیرون ہند کے جن حضرات نے آپ سے سند اجازت حاصل کی، ان میں شیخ اسماعیل انصاری، شیخ عبدالوہاب حلبی دمشق، الشیخ صحتی صالح سامرائی، شیخ سیف الرحمن صاحب دہلوی مدینہ منورہ وغیرہم کے اسمائے گرامی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے نتیجے میں دارالحدیث رحمانیہ بند ہو گیا تو اسی کے ساتھ آپ کا تدریسی سلسلہ بھی موقوف ہو گیا، آپ ایک سال تک گھر ہی پر مقیم رہے، بعض حضرات کی پیش کش پر مشکوٰۃ شریف کے تحشیہ کا کام ۱۹۴۸ء سے شروع فرمایا، مگر یہ حاشیہ کیا رہا، بلکہ آپ کی زرنگار قلم نے اسے ایک مفصل و مبسوط شرح بنادیا، آپ اپنے کام میں لگے رہے، ۱۹۶۱ء میں مرعۃ المفاتیح کی پہلی جلد منظر پر آئی، پھر آپ کے ایک شاگرد مولانا اقبال احمد صاحب رحمانی مہتمم مدرسہ سراج العلوم بونڈیہار نے مزید کام کروا کر شائع کیا، اب تک اس کی ۹ جلدیں مکتبہ جامعہ سلفیہ سے شائع ہو چکی ہیں، اس مبسوط شرح کے علاوہ آپ کی مصنفات میں تین کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے:

(۱) رمضان المبارک کے فضائل و احکام (مطبوع، اردو)

(۲) بیان الشریعۃ فی محل اذان خطبۃ الجمعة (مطبوع اردو)

(۳) لائف انشونس (بیہ) کی شرعی حیثیت (مطبوع اردو)

۲۲ رجب المرجب ۱۴۱۴ھ / ۵ جنوری ۱۹۹۴ء بروز چہار شنبہ بوقت صبح ۵ بج کر ۵۵ منٹ پر ۸۷ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور روح قفسِ غصری سے پرواز کر گئی، اسی دن بعد نماز مغرب آپ کے صاحب زادے مولانا عبدالرحمن صاحب نے نماز جنازہ

پڑھائی، اور آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے۔ (تراجم علمائے اہل حدیث جلد اول ص ۳۱۳ تا ۳۱۸)

مولوی حکیم عبدالمجید مبارک پوری

مولوی حکیم عبدالمجید بن علی احمد مبارک پوری اچھے عالم و فاضل، ماہر طبیب، خوش اخلاق اور تاریخ و انساب کے ماہر تھے، مبارک پور کے متاخرین علماء و حکماء میں ایک ممتاز مقام و مرتبہ رکھتے تھے، دیگر خصوصیات کے ساتھ تین خصوصیتوں میں خاص طور سے مشہور تھے، فن طب میں مہارت و حذاقت، خوش اخلاقی، کردار کی بلندی اور قصبہ مبارک پور اور یہاں کے خاندانوں کے انساب کی معلومات ان کے امتیاز میں تھیں، ان محاسن کی وجہ سے بلا تفریق مذہب و ملت خاص و عام میں مقبول تھے، ان کی مجلس زندگی اپنے پورے حقوق و آداب کے ساتھ باغ و بہار اور پُر لطف ہوا کرتی تھی۔

شجرہ مبارکہ یعنی تذکرہ علمائے مبارک پور کی تدوین و تالیف کے سلسلہ میں قیمتی معلومات بہم پہنچائیں تھیں اور تعاون دیا تھا۔

قصبہ مبارک پور کے محلہ پرانی بستی بکھری میں ۱۹۰۸ء / ۱۳۲۸ھ کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، بعدہ مدرسہ ایمانیہ بنارس میں داخلہ لیا، پھر جامع العلوم جوادیہ سے فخرالافاضل اور سلطان المدارس لکھنؤ سے ”سند الافاضل“ کیا، اس کے بعد بنارس میں علم طب حاصل کیا، قصبہ میں مطب کرتے تھے، ایک زمانہ میں مدرسہ باب العلم پورہ دلہن میں مدرس اعلیٰ کی حیثیت سے تدریس و نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

۶۹ کی سال کی عمر میں ۸ رجب المرجب ۱۳۹۷ھ / ۲۶ جون ۱۹۷۷ء کو

بعارضۃ فاج رحلت کی۔ (شجرہ طیبہ ص ۳۹ تا ۳۷)

مولانا مفتی علی احمد صاحب قریشی مصباحی

مولانا مفتی علی احمد ولد عبد الغفور صاحب قریشی مصباحی ۱۹۱۳ء کے کسی ماہ و تاریخ میں پیدا ہوئے، مدرسہ اشرفیہ مبارک پور میں آپ نے اس دور میں تعلیم حاصل کی، جب مدرسہ اشرفیہ اپنی ترقی کے ابتدائی مرحلہ میں قدم رکھ رہا تھا، فراغت کے بعد اس ادارہ سے ایسا وابستہ ہوئے کہ رحلت پر ہی اس سے جدا ہوئے، جب کہ مدرسہ اشرفیہ میں کتنے انقلاب آئے، کتنے لوگ آئے اور گئے مگر آپ نے کسی حالت میں اس سے اپنی وابستگی کا کوئی منقطع نہیں کیا، علالت کا سلسلہ مہینوں کیا سالوں جاری رہا، مگر اس حالت میں امکانی حد تک ادارے کی خدمت کرتے رہے، مدرسہ اشرفیہ کے جس کمرہ کو انھوں نے اپنا دفتر بنایا تھا، اپنی وفات کے چند روز پہلے تک اس حالت میں بھی قیام کرتے رہے۔

آپ اپنی بعض خوبیوں میں اپنی جماعت میں اپنے معاصرین میں ممتاز رہے، علم، فرائض میں مہارت رکھتے تھے، اپنی بذلہ سنجی اور خوش طبعی سے اپنی نجی محفلوں کو لالہ زار بنا دیتے تھے، کتنے افسردہ دلوں کو اپنی پُر کیف باتوں سے خوش و خرم بنا دیتے تھے۔

ان پر افلاس کے دور آئے، علالت کا طویل سلسلہ رہا، بعض اولاد کی جدائی کا غم برداشت کرنا پڑا، مدرسہ اشرفیہ کے معاملات میں بڑی پیچیدگیاں آئیں، تمام حالات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا، مگر غم و اندوہ کا سایہ ان کے دل پر نہیں پڑا۔

۱۹۷۷ء میں حج کیا، ۳ نومبر ۱۹۸۳ء کو انتقال کیا، اونچی تکلیف پورہ دیوان قصبہ مبارک پور میں دفن کیے گئے۔ (ماہ نامہ اشرفیہ فروری ۱۹۸۴ء و مولوی محمد رضوان انور مصباحی)

حضرت مولانا عبدالباری صاحب قاسمیؒ

حضرت مولانا عبدالباری بن حاجی محمد زاہد بن عبدالواحد بن نور محمد صاحب مبارک پوری قاسمی گونا گوں خصوصیات و کمالات میں ممتاز و منفرد تھے۔

محلہ پورہ رانی مبارک پور میں ۱۳۳۶ھ / ۱۹۱۸ء کو ولادت ہوئی، عمر کا اکثر حصہ فارغ البالی میں گزرا، قرآن کریم کی تعلیم حافظ عبدالغفور صاحب سے شروع کیا، اور ختم قرآن کریم حافظ منظور احمد صاحب چکیاوی نے کرایا۔

فارسی کی تعلیم مولانا نعمت اللہ صاحب مبارک پوریؒ سے حاصل کی، عربی کی ابتدائی کتب حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوریؒ سے پڑھی، اور بقیہ کتب درسیہ حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوریؒ نے پڑھائی۔

۱۳۵۰ھ میں رخت سفر باندھا، سہارن پور میں جا کر کھلا، مظاہر علوم میں ۴ سال قیام کر کے حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کیمل پوریؒ، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب ----- حضرت مولانا جمیل احمد صاحب عزیز خاص حضرت تھانویؒ، حضرت مولانا صدیق احمد صاحب کشمیریؒ وغیرہم سے بڑی محنت و مجاہدہ کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔

شوال ۱۳۵۴ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور عربی ہفتم اور دورہ حدیث شریف کی تکمیل کی، دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ حدیث میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعجاز علی صاحب امر و ہوئیؒ، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں اعزازی

طور پر ایک دو کتابوں کے درس کے ساتھ اپنے عم محترم مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوریؒ کا انتظامی امور میں ہاتھ بٹاتے رہے، جب ناظم جامعہ مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوریؒ رحلت فرما گئے تو جامعہ کی مجلس شوریٰ نے بارِ نظامت آپ کے سر پر ڈال دیا۔

نظامت کے اولین دور میں تدریس کا بھی سلسلہ رہا، مگر جب کاموں کے ہجوم نے انھیں گھیرا تو درسی سلسلہ موقوف کرنا پڑا۔

مولانا قاسمیؒ نے جہاں ایک طرف جامعہ کے ذریعہ اسلامی علوم و فنون اور دینی عقائد و اعمال کی اشاعت کی تو دوسری طرف جمعیۃ علماء اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے قومی و سیاسی ذمہ داریاں بھی انجام دیں۔

یوپی کے مشرقی خطہ میں باصلاحیت عالم دین، بلند پایہ منتظم اور سماجی و سیاسی رہنما کی حیثیت سے متعارف ہوئے، بہت سے عہدے اور ذمہ داریاں آپ کے سر تھیں، مثلاً یوپی وقف بورڈ کے ممبر، ضلع کانگریس کے صدر، ضلع جمعیۃ کے صدر اور ایک بار چیئرمین بھی رہے۔ پورے ضلع میں اعزاز و اکرام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اس دیار میں ”ناظم صاحب“ کے لقب سے مشہور تھے۔

آپ جنگ آزادی کے جانباز سپاہی تھے، ۱۹۴۱ء میں انگریزی حکومت کی طرف سے وارنٹ جاری کیا گیا، مگر ہمت نہیں ہاری، اور آزادی وطن کے لیے کوشاں رہے۔ اکابر علماء سے آپ کے خاص روابط تھے، خصوصاً حضرت مدنیؒ، حضرت مولانا ابوالوفاء صاحب شاہ جہاں پوریؒ، اور مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہارویؒ سے آپ کے گہرے تعلقات تھے۔

علاوہ ازیں کانگریس کے لیڈروں سے آپ کے روابط تھے، جن کی بنا پر ضلع کے

تمام مسائل حل کرانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

برسوں سے صاحب فراش تھے، موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا ہو کر ۱۲ ربیع الثانی ۱۴۰۸ھ / ۵ دسمبر ۱۹۸۷ء کو یوم شنبہ کی صبح ۹ بجے رب ذوالجلال کی طرف سے بلاوا آگیا تو دنیا کے تمام جھمیلوں سے منہ موڑ کر رب ذوالجلال کی آغوش میں پہنچ گئے۔

اسی دن سوادو بجے عید گاہ کے وسیع صحن میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوریؒ کے پہلو میں سپرد خاک کیے گئے، ہزاروں ہزار سگوواروں کا لاتنا ہی سلسلہ، دینی رہنما بھی، سیاسی قائد بھی امراء و رساء بھی تھے۔

(تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص ۵۰۸ تا ۵۱۰، اکابر احیاء العلوم حصہ اول ص ۸۴ تا ۹۰)

مولانا عبدالستار صاحب قاسمی

مولانا عبدالستار بن حافظ عبدالرشید بن حافظ عبدالرحیم بن حاجی محمد پکھن بن خوش حال ابن محمد لاہور محلہ پورہ رانی کے باشندہ، دینی دلی کاموں میں سرگرم شخصیت کے مالک تھے، جمعیتہ علماء کے پرزور حامی اور حضرت مولانا عبدالباری صاحب قاسمی کے دست راست تھے۔

۱۴ شعبان ۱۳۳۵ھ دوشنبہ محلہ پورہ رانی مبارک پور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، آپ نے جن اصحاب درس اور ماہرین علماء سے اکتساب فیض کیا، ان میں حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری اور حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوری رحمہما اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔

اس کے بعد جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد پہنچے، دورہ حدیث شریف کی تکمیل حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادی، حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی،

حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ وغیرہم کے فیض علم سے کی۔

اور دوبارہ دورہ کرنے دارالعلوم دیوبند ۱۹۳۴ء میں پہنچے اور دورہ حدیث شریف کی تکمیل کی، یہاں جن باکمال حضرات اساتذہ کرام کے علم و معرفت سے فیض اٹھایا، ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اور حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ شامل ہیں۔

مولانا نے تدریسی خدمت انجام دی یا نہیں؟ اس کا سراغ نہیں ملتا، ہاں دینی، ملی، سماجی امور سے دلچسپی تھی، مبارک پور اور اطراف کے سیاسی و سماجی مسائل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

آپ بہت صاف گو اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے، قصبہ اور بیرون قصبہ زیادہ تر پنچایتوں میں مدعو ہوتے تھے۔

آپ کا جمعیۃ علماء اور حضرت مولانا سید اسعد صاحب مدنیؒ سے گہرا تعلق تھا۔ ۱۱/۱۲/۱۳۱۲ھ / ۱۳/۱۳/۱۹۹۲ء کو جمعہ کی شب میں اربعے انتقال فرما گئے، دوسرے دن بعد نماز عصر نماز جنازہ ادا کی گئی اور اپنے آبائی قبرستان محلہ حیدر آباد، مبارک پور میں سپرد خاک ہوئے۔ (اکابر اہیاء العلوم حصہ دوم ص ۱۴۰ تا ۱۴۱)

مولانا مفتی عبدالمنان صاحب مصباحی اعظمی

مولانا عبدالمنان صاحب رضا خانی جماعت کے جلیل القدر عالم و مفتی، قادر الکلام شاعر، بہترین خطیب و مدرس تھے۔

آپ کی ولادت ۷/ربیع الثانی ۱۳۴۴ھ / ۲۶/نومبر ۱۹۲۵ء کو محلہ پورہ رانی قصبہ

مبارک پور میں ہوئی، قرآن مجید ختم کرنے کے بعد مدرسہ اشرفیہ مبارک پور میں داخلہ لے کر اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کیا اور درجہ فضیلت تک مدرسہ اشرفیہ میں تعلیم حاصل کی، جن حضرات سے اکتسابِ فن کیا، ان میں مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب مراد آبادی، مولانا عبدالرؤف صاحب بلیاوی، مولانا عبدالمصطفیٰ صاحب ازہری وغیرہم ہیں۔

فراغت کے سال، ہی ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء میں مدرسہ ضیاء الاسلام گورکھپور بہ حیثیت صدر المدرسین گئے، اس مدرسہ میں ایک سال تدریسی خدمت انجام دی، اور ایک چاروقتی رسالہ بنام ”الضیاء“ جاری کیا، غالباً بنائے اشرفیہ میں پہلے عالم ہیں، جنہوں نے صحافت کی دنیا میں قدم رکھا۔ اس کے بعد مدرسہ اہل سنت تلسی پور ضلع گونڈہ گئے، وہاں تقریباً ۹ سال درس و تدریس سے منسلک رہے۔

پھر مدرسہ اشرفیہ میں اعلیٰ مدرس کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا، ۱۹۷۶ء میں اس مدرسہ میں شعبہ افتاء کا باضابطہ قیام عمل میں آیا تو آپ مفتی مقرر ہوئے، ۱۳۹۶ھ میں مسندِ صدارت پر متمکن ہوئے، ۲۹ سال تک مدرسہ اشرفیہ میں تدریس و افتاء کی خدمات انجام دیتے رہے۔

۱۴۰۸ھ میں شمس العلوم گھوسی چلے گئے، اور تاحیات اسی سے منسلک رہے، آپ کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں ہے، ان میں مولانا عبداللہ خاں عزیزی، مولانا ضیاء المصطفیٰ صاحب امجدی، مولانا قمر الزماں خاں اعظمی، مولانا محمد احمد صاحب مصباحی وغیرہم۔

آپ نے درس و تدریس، خطابت و افتاء کے ساتھ تصنیف و تالیف کی بھی خدمت انجام دی، ان میں چند تصنیفات حسب ذیل ہیں:

- (۱) محمد المثل الکامل کا اردو ترجمہ (۲) الشاہد (۳) ازالہ اوہام (۴) عیدین کی تکبیرات زوائد (۵) مسئلہ آمین (۶) حیات صدر الشریعہ (۷) انوکھی لڑائی (واقعات کربلا

سے متعلق) (۸) مختار الاحادیث کا اردو ترجمہ (۹) حیات صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی (۱۰) اسلام کا چوتھا رکن وغیرہم۔

رضا خانی جماعت نے آپ کی علمی و فقہی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے طرح طرح کے اعزازات سے نوازا، مثلاً بحر العلوم کا خطاب، امام احمد رضا ایوارڈ، نوری ایوارڈ، قائد اہل سنت اور شیخ الاسلام تہذیب کا تمغیہ خطاب۔

خانقاہ برکاتیہ کی جانب سے علمی و فقہی خدمات کے اعتراف میں آپ کو چاندی سے تولا گیا، اور مدرسہ سراج العلوم نوادہ مبارک پور میں آپ کو ۵۰ ہزار ہندوستانی سکوں سے تولا گیا۔

قمری سال سے ۹۰ سال کی عمر پوری کر کے ہزاروں سوغواروں کو روتا بلکتا چھوڑ کر انتقال فرما گئے۔

۳ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ / ۱۸ نومبر ۲۰۱۲ء کو آپ پر غشی طاری ہوئی، بعد نماز مغرب ڈاکٹر امتیاز احمد صاحب اعظم گڑھ کے اسپتال میں داخل کیے گئے، ۱۴ محرم الحرام ۱۴۳۴ھ / ۲۹ نومبر ۲۰۱۲ء کو بعد نماز مغرب نکالے گئے، دونوں پھیپھڑے خشک ہو چکے تھے، علاج بے اثر رہا، اعظم گڑھ سے مبارک آتے ہوئے راستے میں ۹ بج کر ۲۰ منٹ پر اس دار فانی سے دار جاودانی کو روانہ ہو گئے۔

(ماہ نامہ اشرفیہ جنوری ۲۰۱۳ء ص ۲۹ مع اختصار)

حضرت مولانا عبدالکریم صاحب ابراہیم پوری

حضرت مولانا عبدالکریم بن حاجی محمد ضمیر بن عبدالواحد بن منصور پہلوان بن شیخ محی

الدین صاحب انصاری ابراہیم پوری بزرگ عالم دین، اسلام کے محافظ، حق و صداقت کے داعی و پاسدار، احقاقِ حق، ابطالِ باطل کے جذبہ سے سرشار، باکمال مدرس و معلم، انتظامی صلاحیتوں کے مالک، کامیاب خطیب، بہترین مفکر، اور مناظرِ اسلام تھے۔

شیخ محی الدین جین پور کے قریب موضع باسو پار کے باشندہ تھے، وہاں سے ترک سکونت کر کے ابراہیم پور میں آباد ہو گئے، اس وقت ابراہیم پور چند مکانات کا نام تھا۔

مکتب کی تعلیم اپنی آبادی ابراہیم پور کے مدرسہ فیض العلوم میں حاصل کی، پھر فارسی اور ابتدائی عربی کی تکمیل کے بعد مرکزِ علم و فن جامعہ عربیہ احياء العلوم مبارک پور میں داخلہ لیا، اس چمنستانِ علم سے ۵۴ سال فیض یاب ہوتے رہے، پھر منوچلے گئے، وہاں مدرسہ مفتاح العلوم میں محدث جلیل ابوالماثر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمیؒ سے ہدایہ اولین اور نام و ر عالم دین حضرت مولانا عبداللطیف صاحب نعمانیؒ سے مختصر المعانی اور دیگر اساتذہ کرام سے دیگر کتب درسیہ پڑھیں، پھر چند ماہ کے بعد جامعہ عربیہ احياء العلوم مبارک پور واپس ہوئے، اور یہیں حضرت مولانا عبدالغنی صاحب بارہ بکلوئیؒ سے بخاری شریف اور فقیہ عصر حضرت مولانا مفتی محمد یلین صاحب مبارک پوریؒ سے مسلم شریف پڑھ کر دورہ حدیث شریف کی ۱۳۶۵ھ میں تکمیل کی۔

ان حضرات کے علاوہ جامعہ میں جن حضرات اساتذہ کرام سے کسب فیض کیا، ان میں مورخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ، خطیب عصر حضرت مولانا محمد عمر صاحب مظاہری مبارک پوریؒ، حضرت مولانا شمس الدین صاحب الحسینیؒ شامل ہیں۔

سب سے پہلے ضلع منو کے کھورہٹ کے قریب ایک گاؤں پلیم میں کچھ عرصہ رہ کر کارخانہ چلوا یا، مگر اس شیدائی نبوت کے لیے یہ کام شاق گزر رہا تھا، اس لیے درس و تدریس کا میدان اختیار کیا اور اپنے خسر زبردست عالم دین حضرت مولانا منیر احمد صاحب ابراہیم پوریؒ

کی درخواست پر کلکتہ کا سفر کیا، اور غیر مقلدین کے ایک مدرسہ میں ۶۰ روپے مشاہرہ پر مدرس ہو گئے، دو سال بعد ایک حنفی مدرسہ ”مدرسہ احمدیہ حنفیہ گھڑیہ“ کا قیام عمل میں آیا، تو اس میں ۷۰ روپے مشاہرہ پر بلا لیے گئے۔

چند سالوں تک تدریس کے ساتھ صدر المدرسین کے عظیم منصب پر فائز ہو رہے، اور بحسن و خوبی ادارہ کی ترقی کے لیے کوشاں رہے، اس کے بعد مدرسہ کے نظام میں خلل آ گیا تو اس مدرسہ سے کنارہ کش ہو گئے، پھر بنگرام کے ایک باغ میں ایک مدرسہ کا قیام عمل میں آیا، جس کا نام بعد میں مدرسہ دارالعلوم نعمانیہ تجویز ہوا، اس کا سن تاسیس ۱۹۵۵ء ہے، مدرسہ روز اول سے ترقی پذیر رہا، رفتہ رفتہ مرجع خلائق بن گیا۔

اسی زمانہ میں اپنے وطن ابراہیم پور ضلع اعظم گڑھ آئے ہوئے تھے، یرقان کی بڑی بیماری میں مبتلا ہو گئے، اس شدید مجبوری کی بنا پر دارالعلوم نعمانیہ سے طویل رخصت لے لی تو مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور نے آپ کو آغوش محبت میں لے لیا، اور جامعہ میں ۱۹۶۹ء میں بمشاہرہ ۱۰۰ روپے درجہ علیاء کے مدرس مقرر ہوئے، اور بحسن و خوبی ۴ سال تدریسی زندگی گذاری، اس زمانہ میں ابوداؤد شریف، جلالین شریف، ہدیہ سعیدیہ، ملا حسن وغیرہ جیسی بڑی اور اہم کتب درسیہ آپ کے زیر درس رہیں، پھر اہل بنگال کی کے شدید اصرار و خواہش پر ۱۹۷۳ء میں عید الاضحیٰ کی تعطیل میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم کو خیر باد کہہ کر دارالعلوم نعمانیہ ضلع بیر بھوم مغربی بنگال تشریف لے گئے، اور اس گلشن اسلام کی آبیاری میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، اور اپنی حیات کے ۵۵ سال درس و تدریس اور دعوت و اصلاح میں گزار دیئے۔

جب ضعف و نقاہت شروع ہو گئی، اور امراض و عوارض کے پے در پے حملے شروع ہو گئے تو اپنے محبوب ادارہ مدرسہ دارالعلوم نعمانیہ کو الوداع کہا، اس طرح کہ اراکین مدرسہ کو

تمام ذمہ داریاں حوالہ کر کے وطن آ گئے۔

محبین و متعلقین کے پیہم اصرار پر دو چار بار بنگال کا سفر بھی ہوا، مگر چند دن قیام فرما کر وطن واپسی ہو گئی، زندگی کے بقیہ سات آٹھ سال وطن میں رہ کر دعوت و تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

آپ بنگال کے مشہور عالم دین قاضی ابوصالح سے تصوف کے میدان میں بیعت تھے، آپ کو قاضی صاحب کی طرف سے اجازت و خلافت کا تمغہ بھی حاصل تھا۔ آپ دارالعلوم دیوبند کے ترجمان، علماء دیوبند کے عقیدت مند اور اکابر دیوبند کے پیروکار تھے، آپ نے احقاق حق، اور بدعات و خرافات کے قلع قمع کے لیے گمراہ فرقوں سے کئی بار مناظرے بھی کیے تھے، گویا آپ مناظر اسلام تھے۔

آپ حج بیت اللہ اور زیارت حرین کے لیے بے قرار تھے، ۱۹۹۶ء میں آپ کو سفر حج کی منظوری ملی، پس حج بیت اللہ اور زیارت حرین شریفین سے مشرف ہوئے۔

آپ کئی سالوں سے بیمار رہا کرتے تھے، یکے بعد دیگرے مختلف امراض کا شکار ہوئے، مگر زندگی کے آخری ایام میں ضعف و نقاہت غالب آ گئی، آخر موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا ہو کر ۲۱ دسمبر ۲۰۱۰ء / ۱۴ محرم ۱۴۳۲ھ سنہ شنبہ کو بعد نماز ظہر ۳ بجے روح مبارک قفسِ غصری سے پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

دوسرے دن چہار شنبہ کو احاطہ ضیاء اللہ بابا میں نماز جنازہ ادا کی گئی، اس میں باشندگانِ ابراہیم پور کے علاوہ اعظم گڑھ، منو، مبارک پور، الملو، سریاں، نواہ، رسول پور، بلریا گنج، محمد آباد، بھیرہ، ولید پور، خیر آباد وغیرہ کے بہت سے افراد شریک تھے، منناک آنکھوں سے اس بزرگ عالم دین کو اس کی آخری آرام گاہ میں سلادیا گیا۔ رحمہ اللہ رحمۃ

واسعۃ۔ (تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو: تذکرہ مولانا عبدالکریم صاحب اعظمی ابراہیم پوری مصنفہ مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی ابراہیم پوری)

مولوی علی ارشاد نجفی مجتہد

مولوی علی ارشاد نجفی بن مولوی علی حماد بن مولوی علی سجاد مبارک پوری ۱۱ رذو قعدہ ۱۳۴۵ھ / مئی ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی، پھر جامعہ عربیہ احياء العلوم مبارک پور میں داخل ہوئے، پھر ایک سال مدرسہ باب العلم مبارک پور میں رہے، وہیں سے مدرسہ ناصریہ جون پور گئے، پھر جامع العلوم بنارس گئے، درس نظامی کے ساتھ ساتھ الہ آباد بورڈ اور لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ سے بھی امتحانات دیئے، اور تکمیل الطب لکھنؤ سے اعلیٰ سند حاصل کی۔

فخر الافاضل کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں نجف گئے، جہاں سات سال تک تعلیم حاصل کی، نجف سے واپسی کے بعد مبارک پور اور اطراف و نواح میں تبلیغی سرگرمیاں شروع کیں، اس کے بعد وثیقہ عربی کالج فیض آباد میں بحیثیت پرنسپل کام کیا۔

اس کے بعد مدرسہ رستم پورہ گجرات اور مدرسہ حسینیہ مالیگاؤں میں رہے، ۱۹۷۵ء میں مستقل طور سے مبارک پور میں قیام کا ارادہ کیا تو شیعہ جامع مسجد مبارک پور کی امامت و جماعت اپنے ذمہ لے لی اور آخر تک اس کام کو انجام دیتے رہے۔

اپنے مسلک کے فقیہ و عالم ہونے کے ساتھ ایک خوددار، باکردار شخصیت کے مالک تھے، کئی ایرانی علماء کی کتابوں کے ترجمے کیے۔

۱۳ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ / ۸ ستمبر ۱۹۸۷ء کو دوپہر میں شاہ محمد پور میں وفات

ہوئی، اور دوسرے روز ۱۰ بجے دن میں شیعہ عید گاہ میں تدفین ہوئی۔

(شجرہ طیبہ ص ۵۱ تا ۵۲)

حضرت مولانا مفتی عبدالرؤف منصف مبارک پوریؒ

حضرت مولانا عبدالرؤف بن محمد یوسف بن امین الدین بن شکر اللہ بن مومن بن خوش حال بن لاہور صاحب مبارک پوری کامیاب مدرس اور بہت سی صلاحیتوں کے مالک تھے، شعر و شاعری کا ذوق ہی نہیں بلکہ استاذ الشعراء کا مقام و مرتبہ رکھتے تھے۔

آپ کی ولادت ۱۹۲۸ء کے حدود میں ہوئی، ابتدائی و متوسطات کی تعلیم جامعہ عربیہ احياء العلوم مبارک پور میں ہوئی، اس دور میں اس عالی درس گاہ میں حضرت مولانا عبد الجبار صاحب معروفیؒ، حضرت مولانا مفتی محمد یلین صاحب مبارک پوریؒ، اور حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پوریؒ جیسے باکمال اصحاب درس مسند تدریس پر فائز تھے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا، داخلہ لے کر پڑھنے لگے کہ شدید مرض میں گرفتار ہوئے، گھر واپسی ہوئی، چند مہینوں کے بعد مرض نے پیچھا چھوڑا تو رخت سفر دیوبند کے لیے باندھا، دارالعلوم میں داخلہ ہوا، ۱۹۴۹ء میں فضیلت کی تکمیل کی، کتب حدیث جن نامی گرامی اساتذہ کرام سے پڑھی، درج ذیل ہیں:

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا اعجاز علی صاحب امر و ہوئیؒ، حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ وغیرہم۔

مولانا منصف صاحب نے متعدد مدارس میں مسند تدریس کو زینت بخشی، مدرسہ فیض العلوم بڑہل گنج ضلع گورکھپور، اور جامعۃ الفلاح بلریا گنج میں زیادہ دنوں قیام رہا، اور

آخر الذکر ادارے میں آپ کے کمالات کے جوہر کھل کر ظاہر ہوئے۔
جامعۃ الفلاح میں عام طور سے سنن ابی داؤد، سراجی، بدایۃ المجتہد، ہدایہ اولین،
نور الانوار، قدوری وغیرہ کا درس آپ کے ذمہ رہا۔

”نادیۃ الفضلاء“ مبارک پور کے سرپرست تھے، جو قصبہ کے نوجوان فضلاء کی ایک
تنظیم تھی، اس تنظیم کے زیر اہتمام ایک دو ماہی رسالہ ”ندائے فضلاء“ شائع ہوتا تھا، آپ کے
منظوم کلام اس کی زینت بنتے تھے۔

جامعۃ الفلاح کی تدریسی زندگی کے آخری دور میں روزانہ گھر آنے لگے تھے،
پیرانہ سالی کی بنا پر ضعف و نقاہت بڑھتی رہی تو مدرسہ سے چھٹی لے لی، اس عرصہ میں مولانا
منصف سے راقم کی بارہا ملاقات ہوتی رہی، استفادہ کرتا رہا، مولانا علم و فن کے موتی
برساتے رہے۔

مولانا منصف نے زندگی بھر حق کی ترجمانی کی، دولت و ثروت ان کی حق گوئی اور
یہاں کی ان کو پیچھے نہیں ڈال سکی، بڑے نڈر اور جری تھے، اپنے چھوٹوں پر بڑے شفقت تھے،
علمی و فکری، تعمیری و ترقی کے منصوبے ان کا ذہن سوچتا تھا۔

آخر مختلف امراض کے ہجوم نے ان کے جسم کو نڈھال کر دیا، ۶ جمادی الاخریٰ
۱۴۳۱ھ/ ۲۱ مئی ۲۰۱۰ء یوم جمعہ کو اس عالم فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی کو روانہ ہو گئے،
دوسرے روز صبح ۹ بجے نماز جنازہ ادا کی گئی، ضلع اعظم گڑھ کے اکثر مدارس عربیہ کے نظماء،
صدر المدرسین اور اساتذہ کرام اور جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے طلبہ عزیز بھی اور
قصبہ و قرب و جوار کے عوام و خواص ہزاروں کی تعداد میں شریک جنازہ تھے، اور استلاؤ کے
پاس تدفین عمل میں آئی۔

استلا و عائشہ تالاب کا بگڑا ہوا نام بتایا جاتا ہے۔

(اکابر احیاء العلوم ص ۱۶۴ تا ۱۶۸، اودھ میں افتاء کے مراکز اور ان کی خدمات ص ۴۱۰)

حضرت مولانا عبدالحنان صاحب بمہوریؒ

حضرت مولانا عبدالحنان ولد حافظ محمد یسین صاحب بمہوریؒ جامعہ رشیدیہ کے نائب صدر، باصلاحیت عالم دین، اور بہترین مدرس و مربی تھے۔

تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا، ہاں جنوری ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے، اپنے دیار کے مشہور و معروف چشمہ علم جامعہ عربیہ احیاء العلوم سے سیراب ہوئے، اس زمانہ میں جامعہ میں حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا داؤد اکبر صاحب اصلاحی، اور حضرت مولانا شمس الدین صاحب الحسینی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم کا علمی فیض جاری تھا۔

پھر مظاہر علوم سہارن پور بغرض تعلیم پہونچے، مگر دارالعلوم دیوبند سے فراغت مقدر تھی، ۱۹۵۴ء/ ۱۳۷۳ھ میں دارالعلوم دیوبند سے دورہ حدیث شریف کی تکمیل کی، دارالعلوم دیوبند میں جن اساتذہ علم و فن سے اپنی علمی پیاس بجھائی، ان میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، شیخ الادب والفقہ حضرت مولانا اعجاز علی صاحب امر و ہوئیؒ، اور حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رحمہم اللہ وغیرہم شامل ہیں۔

رسی فراغت کے بعد درس و تدریس کی زندگی اختیار کی، صوبہ بنگال کے مختلف مدارس میں تدریسی خدمت انجام دی، مدرسہ قرآنیہ اور مدرسہ حسینیہ لال دروازہ جون پور میں منطق و فلسفہ وغیرہ کا درس دیا، پھر اپنے مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں ۱۱ سال تک مدرس و معلم رہے، آپ کے شاگردوں میں سے بعض کی عالمانہ حیثیت بہت

بلند و وقیع ہے، آپ کی بڑی خوبی یہ تھی کہ کینہ کپٹ، بغض و عداوت سینہ میں نہیں رکھتے تھے، آپ کے اندر خرد نوازی کی صفت زندہ تھی، اپنے چھوٹوں پر ایسی شفقت فرماتے تھے کہ بسا اوقات چھوٹوں کو شرم آنے لگتی تھی، آپ کی بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ بڑوں کے حکم پر مضبوطی سے عمل کرتے اور عمل کراتے تھے، آپ کے اندر یہ صلاحیت بھی تھی کہ پہچان لیتے تھے کہ کون کس کام کا ہے، اسے اسی کام پر لگاتے تھے۔

آپ نے اپنے گاؤں کی مسجد میں امامت حسبہ اللہ کی اور جامعہ رشیدیہ بمہور کی ایسی خدمت کی کہ روزانہ صبح آٹھ بجے مدرسہ پہنچ جاتے اور پھر شام میں عصر کے وقت گھر واپس ہوتے تھے، کوئی مدرسہ میں موجود ہو یا نہ ہو، مگر آپ مدرسہ میں تشریف فرما ہوتے تھے، کوہلے کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی، بڑھا پا چھایا ہوا تھا، مگر مدرسہ کی خدمت میں تخلف نہیں ہوتا تھا، یہ حضرت مدنیؒ کے تلامذہ کی خصوصیات میں ہے، اور آپ بھی حضرت مدنیؒ کے تلامذہ کی فہرست میں شامل ہیں، جیسا کہ کسی نے کہا کہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تلامذہ نے تصنیف و تالیف اور تحقیق و تعلیق کی بیش بہا خدمت انجام دی، اور حضرت مدنیؒ کے تلامذہ نے مدارس کے قیام اور خدمت مدارس کو ترجیح دی۔

الغرض آپ نے مختلف مدارس عربیہ اسلامیہ کی خدمت انجام دی، اور آخر میں اپنے گاؤں کے جامعہ رشیدیہ کی ۲۸ سال تک مسلسل شاندار خدمت انجام دی۔

۲۷/ رمضان المبارک ۱۳۳۲ھ/ ۶/ اگست ۲۰۱۳ھ سہ شنبہ کو بوقت نماز ظہر ۲ بجے ۸۱ سال کی عمر میں چند ماہ کی علالت کے بعد اپنے وطن موضع بمہور ضلع اعظم گڑھ میں وصال فرما گئے، دوسرے دن چہار شنبہ کو ۱۱ بجے دن میں نماز جنازہ ادا کی گئی، اور اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

مولانا عبید الرحمن صاحب قمر رحمانی حسین آبادی

مولانا عبید الرحمن بن حاجی محمد یعقوب صاحب حسین آبادی کا تخلص قمر تھا، تخلص ہی سے عوام میں مشہور تھے، ابتدائی نوشت و خواند گھر پر ہوئی، پھر مدرسہ دارالتعلیم میں بیٹھائے گئے، یہاں پرائمری اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، پھر غالباً مدرسہ فیض عام منو میں پڑھا، پھر دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں تعلیم حاصل کی، لیکن آخری سال کی تعلیم کسی وجہ سے حاصل نہ کر سکے۔

پھر تجارت کا مشغلہ اختیار کیا، بمبئی میں تجارت کی، جب گھر آتے، آپ ہی خطبہ جمعہ دیتے، اور جب تک گھر پر قیام رہتا، آپ ہی خطبہ دیتے تھے، آپ کا خطبہ بہت ہی پر مغز اور کتاب و سنت کی روشنی میں ہوتا تھا، بہت ہی بلند اخلاق اور ملنسار تھے، جس سے ملتے، خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔

آپ کے تعلقات و مراسم حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری کے خاندان سے بہت گہرے تھے۔

تذکرہ علمائے مبارک پور پر آپ نے پیش لفظ لکھا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اچھے ادیب بھی تھے، چوں کہ آپ نے تدریسی زندگی اختیار نہیں کی، اس لیے آپ کی نمایاں خدمات معلوم نہ ہو سکیں۔

بمبئی میں بسلسلہ تجارت مقیم تھے، آپ پر فالج کا زبردست حملہ ہوا، دماغ کا آپریشن ہوا تو صحت یاب ہو گئے تھے، وطن واپسی پر بیمار ہوئے، کچھ دنوں صاحب فراش رہ کر ۱۸ ذیقعدہ ۱۴۱۵ھ / ۱۹ اپریل ۱۹۹۵ء شب شنبہ ۹ بجے داعی اجل کو لبیک کہا، تدفین ۲ بجے دن میں آبائی قبرستان حسین آباد میں ہوئی، آپ نے زندگی بھر حاجیوں کی خدمت

کی، فیصل عمر پاسا جو معلم تھے، انھوں نے اپنا نائب مقرر کیا تھا، اس لیے ہر سال سعودیہ جاتے تھے اور حجاج کی خدمت و رہنمائی کرتے تھے۔

(تذکرہ علمائے اہل حدیث مبارک پور ص ۱۱۰ مع اضافہ)

مولانا عبد الوحید صاحب فیضی

تاریخ پیدائش نہیں معلوم ہو سکی، ناظرہ قرآن کریم وغیرہ کی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر عربی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالتعلیم میں حاصل کی، اس کے بعد تکمیل درس کے لیے جامعہ اسلامیہ فیض عام منو میں داخلہ لیا، اور اسی مدرسہ سے غالباً ۱۹۶۲ء میں درس نظامی کی تکمیل کر کے فارغ التحصیل ہوئے۔

رسمی فراغت کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا، سیونی پھر غازی پور میں پڑھایا، پھر کان پور میں جامع مسجد اہل حدیث کے مستقل خطیب بنائے گئے، اور ایک طویل مدت تک اس خدمت کو انجام دیا، وہاں آپ کی بڑی قدر و منزلت تھی، جب فوج کا حملہ ہوا اور چلنے پھرنے سے مجبور ہو گئے تو وطن واپس آ گئے، جب آپ ہر طرح سے مجبور ہو گئے تو بیساکھی کے سہارے سے چلتے تھے، آخر میں ارباب دارالتعلیم کی خواہش پر بچوں کو حفظ و ناظرہ کی تعلیم اپنے گھر دیتے تھے، چوں کہ ان کا گھر مدرسہ دارالتعلیم سے بالکل متصل تھا، اس لیے بچے ان کے گھر جا کر پڑھتے تھے، اور محلہ کی جامع مسجد میں درس دیا کرتے تھے، بکثرت احادیث آپ کو زبانی یاد تھیں، جب صاحب فراش ہو گئے تو یہ سلسلہ بند ہو گیا، ایک طویل علالت کے بعد ۴ رمضان ۱۴۳۲ھ / ۵ اگست ۲۰۱۱ھ جمعہ کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

اسی دن بعد نماز عصر نماز جنازہ ادا کی گئی، اور ان کے آبائی قبرستان میں تدفین عمل

میں آئی۔ (تذکرہ علمائے اہل حدیث مبارک پور مخ اختصار ص ۹۵ تا ۹۶)

حضرت مولانا عبدالمعید صاحب القاسمی

مولانا کی تاریخ ولادت کیا ہے؟ اس کا صحیح علم تو نہیں ہو سکا، ہاں اتنا معلوم ہے کہ قصبہ مبارک پور کے مشہور و معروف، مردم خیز محلہ پورہ رانی میں جناب عبدالحمد صاحب کے گھرانہ میں زندگی کی پہلی سانس لی، اور نشوونما پائی۔

آدھار کارڈ کے مطابق آپ کی تاریخ ولادت ۵ دسمبر ۱۹۵۰ء ہے۔

آپ کے والد گرامی جناب عبدالحمد صاحب بسلسلہ کسب معاش بلیشیا رہتے تھے، آپ کو قاعدہ بغدادی کی ابتدا حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند نے کرائی تھی، پھر گھریلو طور پر قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی، پرائمری درجات کی تکمیل کے بعد ۱۹۶۲ء میں جامعہ عربیہ اہیاء العلوم کے درجہ فارسی میں داخلہ لیا اور مولانا ممتاز احمد صاحب سے فارسی کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد عربی درجات میں داخل ہوئے، آپ نے جن نابغہ روزگار شخصیات اور ماہرین تدریس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوریؒ سے القراءۃ الرشیدہ، حضرت مولانا محمد عثمان صاحب سحر مبارک پوریؒ سے دیوانِ متنبی، حضرت مولانا شمس الدین صاحب الحسیؒ سے ترجمہ قرآن کریم، حضرت مولانا عبدالمنان صاحب باسو پارٹیؒ سے نور الانوار، قدوری اور کبریٰ، حضرت مولانا زین العابدین صاحب معروفیؒ سے ہدایہ ثانی، سلم العلوم، مقاماتِ حریری اور ترجمہ قرآن کریم، حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بمہوریؒ سے ہدیہ سعیدیہ، شرح جامی، قطبی

اور علم الصیغہ، حضرت مولانا جمیل احمد صاحب قاسمی، مدنی سے مختصر المعانی، شرح وقایہ، کافیہ، شرح تہذیب اور القراءۃ الرشیدہ دوم پڑھیں۔

ان اساتذہ کرام سے عربی پنجم تک تعلیم حاصل کر کے فضیلت کی اعلیٰ ڈگری کے حصول کے لیے سن ۱۹۶۸ء/سن ۱۳۸۸ھ میں ازہر ہند دارالعلوم دیوبند کے لیے رخت سفر باندھا، اور دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لے کر دورہ حدیث شریف میں پہنچے، اور درج ذیل کتابیں درج ذیل اساتذہ عظام سے پڑھ کر سن ۱۳۹۰ھ/سن ۱۹۷۰ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔

حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادیؒ سے بخاری شریف اول، حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہیؒ سے بخاری شریف ثانی، حضرت مولانا شریف الحسن صاحب دیوبندیؒ سے مسلم شریف، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندیؒ سے ابوداؤد شریف، حضرت مولانا فخر الحسن صاحب مراد آبادیؒ سے ترمذی شریف، شمائل ترمذی، حضرت مولانا محمد حسین صاحب عرف ملا بہاریؒ سے نسائی شریف، حضرت مولانا اسلام الحق صاحب کوپانگہیؒ سے ابن ماجہ شریف، حضرت مولانا محمد انظر صاحب کشمیریؒ سے طحاوی شریف، حضرت مولانا نصیر احمد صاحب بلند شہریؒ سے مؤطا امام مالک، حضرت مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندیؒ سے مؤطا امام محمد۔

آپ کے درسی رفقاء میں حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ، حضرت مولانا محمد عامر صاحب مبارک پوریؒ، حضرت مولانا ڈاکٹر شمشاد احمد صاحب موضع آنوک ضلع اعظم گڑھ، مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمیؒ، مولانا انعام الحق صاحب اعظمیؒ، مولانا ابوالحسن صاحب اعظمیؒ۔

اس سال دارالعلوم کے شرکائے دورہ حدیث شریف کی تعداد: ۲۸ تھی، اور کل طلبائے دارالعلوم کی تعداد: ۱۳۱۴ تھی۔

دارالعلوم دیوبند کی ڈائری - جو ادارہ پیغام محمود دیوبند سے شائع ہوئی ہے - اس میں حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کے دورہ حدیث کے تلامذہ کی فہرست میں آپ کا نام ۱۳۹۱ھ کے فارغین میں درج ہے۔

رسی فراغت کے بعد وطن مبارک پور لوٹے، اس زمانہ میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں ایک باصلاحیت عربی مدرس کی ضرورت تھی، آپ جامعہ کے شعبہ تدریس سے منسلک ہوئے، اور علمی جواہر پارے بکھیرنے شروع کر دیئے۔

آپ نوجوان مدرس تھے، نئے نئے فارغ ہو کر آئے تھے، اس زمانہ میں کہنہ مشق اور درس و تدریس کے ماہر اساتذہ احیاء العلوم کی چہار دیواری میں اپنے علمی فیضان سے سینوں کو منور و تاباں کر رہے تھے، اس کے باوجود آپ کے علمی کمالات اور تدریسی مہارت نے آپ کو مشہور و معروف کر دیا، آپ کا درس نہایت سلیس، عمدہ، مرتب، عام فہم اور آسان زبان میں ہوتا تھا، گویا تشنگانِ علم کو گھول کر پلا رہے ہیں، دلوں اور ذہنوں میں اتار رہے ہیں۔

پھر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ آٹھویں دہائی میں احیاء العلوم سے علیحدہ ہو گئے، اور ضلع جون پور کے قصبہ مانی کلاں کے مدرسہ ضیاء العلوم میں بغرض تدریس بلائے گئے، اور شعبہ تدریس سے منسلک کیے گئے، اسی زمانہ تدریس میں آپ کا داخلہ ملک سعود یونیورسٹی ریاض میں ہو گیا، عربی زبان و ادب میں مہارت اور استحکام پیدا کرنے کے لیے ملک سعود یونیورسٹی پہونچے، اور وہاں کے پروفیسر اور لکچرار حضرات سے علمی استفادہ کیا اور فارغ التحصیل ہوئے، وزارت الشئون الاسلامیہ والاوقاف ریاض کی طرف سے تدریس کے لیے آپ کا ابتماع ہندوستان کے لیے ہوا۔

ضلع منو کے مشہور و معروف جامعہ فیض عام کے شعبہ تدریس سے متعلق ہوئے،

اور کئی سالوں تک وہاں منطق و فلسفہ اور عربی زبان و ادب کی تدریس پر مامور رہ کر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

ادھر جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا شمس الدین صاحب الحسینیؒ کافی کمزور ہو چکے تھے، ضعف و علالت کے مراحل سے گزر رہے تھے، ان حالات میں جامعہ کو ایک فعال، سرگرم منتظم اور ناظم اعلیٰ کی ضرورت تھی، اور ارباب احیاء العلوم کی نگاہیں اس کے لیے چاروں طرف دوڑ رہی تھیں۔

آخر کار سب کی نگاہیں آپ پر جم گئیں، اور آپ کو جامعہ میں لانے کے لیے کوشش شروع ہو گئی، آپ مستقل طور پر منوشہر میں سکونت پذیر تھے، اولاً آپ خود اس پر راضی نہیں تھے، لیکن ذمہ داران احیاء العلوم کے مسلسل اصرار اور پیہم کوشش نے آپ کو اس پر راضی کر دیا۔ جون ۱۹۹۷ء میں منعقدہ جامعہ کی مجلس شوریٰ کی میٹنگ نے حسب پروگرام اتفاق رائے سے فیصلہ کر کے احیاء العلوم کی نظامت علیا کا بارگراں آپ کے کندھوں پر ڈال دیا، اور اس کی مکمل باگ و ڈور سنبھالی۔

مولانا مرحوم نے جامعہ کی ذمہ داری سنبھالتے ہی شدت سے یہ بات محسوس کی کہ طلبہ کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے، درس گاہوں کا اضافہ ہو رہا ہے، جامعہ کی وسیع و عریض دو منزلہ قدیم عمارت نا کافی ہو رہی ہے اور مزید شعبوں اور ترتیب کے اضافہ میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ آپ جامعہ کی ترقی اور استحکام کے لیے جٹ گئے، اس کی ترقی اور استحکام کے لیے جدوجہد شروع کر دی۔

ذمہ داران جامعہ سے صلاح و مشورہ کیا، اتفاق سے جامعہ کے قیام پر ایک صدی پوری رہی تھی، اور جامعہ کی وسیع و عریض زمین قصبہ سے باہر اسلام پورہ کے قریب نہایت ہی

پُر فضا مقام پر خالی پڑی تھی۔

مولانا مرحوم نے جامعہ کو قصبہ سے باہر منتقل کرنے کا عزم مصمم کر لیا، اور ذمہ دارانِ جامعہ سے صلاح و مشورہ کے بعد نہایت اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے صد سالہ اجلاس منعقد کرنے اور قصبہ سے باہر اس پُر فضا مقام پر موجود وسیع و عریض زمین پر جامعہ کی درس گاہوں پر مشتمل عظیم الشان عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کا اعلان کیا، ملک کے طول و عرض سے مشہور و معروف مشائخ و علماء کو شرکت کی دعوت دی، جو الحمد للہ قبول کی گئی، ملک بھر سے اکابر علماء و مشائخ عظام نے کثیر تعداد میں شرکت کی، اور اربابِ جامعہ اور باشندگانِ مبارک پور کو بڑا حوصلہ دیا اور سرزمینِ مبارک پور کو انوار و برکات سے سرفراز کیا، خصوصاً دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارن پور، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جمعیتہ علمائے ہند، دارالمبلغین لکھنؤ اور بمبئی کے اکابر علماء نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

مولانا مرحوم نے اپنی قائدانہ صلاحیت کے ذریعہ باشندگانِ مبارک پور و اطراف کے اندر ایسی روح پھونک دی کہ صد سالہ اجلاس کے انتظام و انصرام اور فراہمی مالیات کے لیے ہفتوں پہلے سے بھی خواہانِ جامعہ اپنا کام دھام چھوڑ کر جوش و عمل کا نمونہ بن گئے، اور اتنا زبردست انتظام کیا کہ کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہوئی۔

اور درس گاہوں کی تعمیر کے لیے بھاری رقومات کا نذرانہ پیش کیا، اور طاقت و قوت سے بڑھ کر حوصلہ و ہمت کا ثبوت پیش کیا۔

پھر رفتہ رفتہ تعمیرات اور ضروریات ایک حد تک پایہ تکمیل کو پہنچیں، اور ستمبر ۲۰۱۳ء کی کسی تاریخ میں عربی، فارسی، حفظ و تجوید کے شعبہ جات کو جامعہ آباد منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جامعہ کے مختلف شعبہ جات کی منتقلی کے تین ماہ بعد مولانا جامعہ سے علیحدہ ہو گئے۔

اسی دوران سن ۱۹۹۹ء اور سن ۲۰۰۰ء میں غیر ذمہ دار، ناعاقبت اندیش عناصر کی وجہ سے قصبہ مبارک پور شیعہ، سنی فسادات کا شکار ہو گیا، اور اس کی زد میں مولانا مرحوم اور تقریباً سبھی ذمہ داران جامعہ بھی آ گئے، ان حضرات کو جھوٹے الزامات کے تحت مقدمات میں پھنسا دیا گیا، جس کی وجہ سے ایک عرصہ تک قید و بند کی صعوبت بھی برداشت کرنی پڑی۔ مولانا مرحوم کئی سالوں تک جمعیۃ علماء ضلع اعظم گڑھ کے صدر بھی رہے، اور آخر میں جب کافی کمزور ہو گئے تھے، تو اس کے سرپرست منتخب کیے گئے۔

۱۸ / جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ / ۱۲ فروری ۲۰۲۰ء کو تقریباً ۱۰ بجے رات میں انتقال فرما گئے اور دوسرے دن بعد نماز ظہر علماء، صلحاء، ذمہ داران مدارس اور عوام الناس کے ایک بڑے مجمع کے ساتھ سمودی قبرستان محلہ پورہ رانی میں تدفین عمل میں آئی۔ مولانا کے پس ماندگان میں پانچ لڑکے: مولانا محمد اسعد صاحب کئی، جناب محمد ارشد صاحب، جناب محمد دانش صاحب، حافظ محمد سالم صاحب جناب محمد آصف صاحب اور تین لڑکیاں اور اہلیہ محترمہ ہیں۔

خدا بخشنے بہت خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مولانا عبید اللہ صاحب قاسمی بمہوریؒ

مولانا عبید اللہ بن حاجی محسن بن الحاج مولانا محمد الیاس بن حاجی سلیمان بن شیخ امیر علی بن شیخ دمیر علی قاسمی بمہوری قصبہ مبارک پور سے تقریباً ۵ کلومیٹر پر ایک مردم خیز موضع بمہور میں ۲۸ / ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ / ۱۵ جنوری ۱۹۵۳ء پنجشنبہ کو بوقت صبح پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی، ۱۹۶۶ء میں جامعہ عربیہ اہیاء العلوم مبارک پور

میں داخلہ لیا، ۴ سال تک یہاں نابغہ روزگار اساتذہ کرام سے تعلیم حاصل کی، ۱۹۷۰ء میں جون پور گئے اور وہاں سے ازہر ہند دارالعلوم دیوبند پہنچے، ۱۹۷۲ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت ہوئی، اسی سال ۸ دسمبر کو جامعہ اسلامیہ بنارس میں تقرری ہوئی، یہاں دو سال تدریسی خدمت انجام دی، ۱۷ مئی ۱۹۷۴ء کو یہاں سے مستعفی ہو گئے، ۱۹۷۳ء کو موضع جیراج پور کے ایک مشہور علمی گھرانے میں آپ کا عقد مسنون ہوا۔

اس کے بعد اپنے عم محترم مولانا محمد مسلم صاحب بمہوری کے مشورے سے مفتی گنج تشریف لے گئے، یہاں دین کی بڑی خدمت انجام دی، بدعات و رسومات کا ایک سیلاب تھا، جہالت اس قدر عام تھی کہ مسلم گھروں میں دیوتاؤں کی تصویریں لگی تھیں، تالاب وغیرہ میں مسلم غیر مسلم بچے بچیاں ایک ساتھ نہاتے تھے، مولانا نے بڑی جدوجہد کی، اور خرافات سے لوگوں کو روکا، سنگھی ذہنیت والوں کو مولانا بمہوری کی محنت کھٹکنے لگی، اور آپ کے خلاف سازش رچی گئی، مگر ایک مسلم افسر نے آپ کو حالات سے آگاہ کیا اور ان کے ناپاک عزائم کی جانکاری دی، اور آپ کو مشورہ دیا کہ آپ یہاں سے چلے جائیں، وہاں سے واپسی کے بعد تجارت میں لگ گئے، کچھ دنوں تک مبارک پور اور بمبئی میں تجارت کی، پھر ۱۹۷۹ء میں سعودی عرب چلے گئے، وہاں ۱۶ سال تک کام کرتے رہے، ۱۹۹۵ء میں واپس ہوئے اور مبارک پور میں دوکان کی بنیاد ڈالی، تجارت کے ساتھ ساتھ جامع مسجد ذی النورین روڈ ویز مبارک پور میں تادم مرگ خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

مولانا بمہور اور اطراف میں بہت مقبول تھے، آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور آپ کے مقام و مرتبہ کی لوگ قدر کرتے تھے، اور کسی معاملہ میں اختلاف کی صورت میں آپ کی ثالثی پر راضی ہوتے تھے۔

۲۸ جنوری ۲۰۱۱ء یوم جمعہ ۹ بجے صبح حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

نماز جنازہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عارف صاحب اعظمیؒ نے پڑھائی، نماز جنازہ میں عوام و خواص کا بڑا مجمع تھا، اپنے آبائی قبرستان بھور میں مدفون ہوئے۔ (بتحریر صاحب زادہ مولانا محمد طیب صاحب قاسمی)

مولانا عزیز الرحمن صاحب سلفی حسین آبادی

مولانا عزیز الرحمن بن عبد اللہ بن محمد اکبر بن محمد علی صاحب مبارک پوری مولانا صنفی الرحمن صاحب حسین آبادی کے حقیقی بھائی تھے۔

قرآن مجید کی تعلیم گھر پر ہوئی، مدرسہ دارالتعلیم میں پرائمری درجات کے ساتھ عربی کی جماعت رابعہ تک تعلیم حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ سلفیہ بنارس میں داخلہ لیا، ۱۹۸۰ء یا ۱۹۸۱ء میں جامعہ سلفیہ سے فارغ ہوئے، پھر آپ کا داخلہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ہو گیا، وہاں سے فراغت کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا، مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، کبھی اڑیسہ میں، کبھی دارالتعلیم مبارک پور اور انوار العلوم املو میں آخر میں بمبئی میں تدریسی خدمت پر مامور تھے، کسی تعطیل کے موقع پر گھر آئے تھے اور تعطیل گزار کر مدرسہ جانے والے تھے کہ ایک دن پہلے دل کا دورہ پڑا، یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ آپ جانبر نہ ہو سکے، اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے، یہ ۲۴ نومبر ۲۰۰۴ء کا واقعہ ہے، اسی دن بعد نماز مغرب نماز جنازہ ادا کی گئی اور اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

(تذکرہ علمائے اہل حدیث مبارک پور ص ۱۰۱)

مولوی علی حسین صاحب مبارک پوری

مولوی علی حسین بن عبد المجید محلہ پورہ خضر کے باشندہ تھے، مسلک شیعہ سے تعلق رکھتے تھے، تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا، کہاں تعلیم حاصل کی، اس کا سراغ نہیں لگ سکا۔
افریقہ میں ایک طویل مدت تک اپنے مسلک کی تبلیغ کرتے رہے، جب وطن واپس ہوئے تو مدرسہ باب العلم کے پرنسپل بنائے گئے، آپ کی زیر نگرانی مدرسہ بہت اچھی طرح چلتا رہا، قادیانیت کے موضوع پر ان کی ایک تصنیف ہے، مدرسہ باب العلم میں تدریس و نگرانی کے علاوہ اپنے محلہ کی مسجد کے امام بھی تھے، تاریخ وفات کا علم نہیں ہو سکا، بڑی باغ نامی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ (شجرہ طیبہ ص ۵۵ تا ۵۶)

مولوی علی اصغر مبارک پوری

مولوی اصغر علی بن علیم اللہ محلہ پورہ صوفی کے باشندہ تھے، تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا، علم حاصل کرنے کے بعد پاکستان چلے گئے، وہیں اپنے مسلک شیعیت کی خدمت کرتے رہے، اور وہیں آخری وقت بھی گزرا، پنجاب میں مقیم تھے، اس سے زیادہ حالات کا علم نہیں ہو سکا۔ (شجرہ طیبہ ص ۵۴)

مولانا عبد الرب صاحب قاسمی، مبارک پوری

حضرت مولانا عبد الرب بن قاری محمد اسماعیل بن حاجی رحمت اللہ بن حاجی عظیم اللہ صاحب قاسمی نہایت کم گوار کم سخن، نیک، صالح انسان تھے، صلاح و تقویٰ سے ان کی

زندگی معمورتھی، سادگی، تواضع کے پیکر، شریف النفس، جفاکش اور ملنسار تھے۔

مولانا کے والد مکرم جناب قاری محمد اسماعیل صاحب مرحوم صوم و صلاۃ کے نہایت پابند، عامل بالشریعت، خاکساری اور انکساری کے مرقع تھے، دینی، ملی، سماجی کاموں میں حصہ لیتے اور نہایت ملنسار تھے۔

مولانا کی ولادت سن ۱۹۶۰ء کے حدود میں محلہ پورہ دلہن قصبہ مبارک پور کے ایک دین دار گھرانے میں ہوئی، ایمانی اور روحانی ماحول و فضا میں پروان چڑھے اور انشونما پائی، اور قرآن کریم کی تعلیم اس زمانہ کے دستور کے مطابق گھریلو طور پر حاصل کی، پھر دیارِ مشرق کی مشہور و معروف علمی درس گاہ جامعہ عربیہ احياء العلوم مبارک پور، اعظم گڑھ میں داخل کیے گئے، پرائمری درجات کی تکمیل کے بعد درجہ فارسی میں داخل کیے گئے، مولانا ممتاز احمد صاحب احيائی مدظلہ العالی سے فارسی اور قرأت سبعہ متواترہ کی تعلیم حاصل کی۔

بعدہ عربی درجات میں پہنچ کر سن ۱۹۷۸ء میں عربی پنجم (عالمیت) کی تکمیل کی، جن نابغہ روزگار، علم و عمل کے آفتاب و ماہتاب شخصیات سے کسب فیض کیا، ان میں سے چند نام یہ ہیں: حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پوری شیخ الحدیث، حضرت مولانا محمد عثمان صاحب معروفی، حضرت مولانا شکر اللہ صاحب ولید پوری، حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مدنی مبارک پوری، حضرت مولانا نیاز احمد صاحب العمری سریانوی۔

اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۷۸ء میں از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کا رخ کیا اور دارالعلوم میں داخلہ کی سعادت ہوئی، دو سال قیام فرما کر علوم و فنون کے ماہر اساتذہ عظام کے سامنے زانوائے تلمذ تہہ کر کے دورہ حدیث شریف کی تکمیل کر کے سن ۱۹۸۰ء میں فارغ التحصیل ہوئے، اساتذہ کرام کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

حضرت مولانا نصیر احمد صاحب بلندی شہری، حضرت مولانا محمد حسین صاحب عرف ملا بہاری، حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندی، حضرت مولانا محمد سالم صاحب قاسمی، حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم

رسی فراغت کے بعد تدریسی زندگی کو اختیار کیا، اس کی ابتدا مدرسہ علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور سے کی، سن ۱۹۸۳ء تک یہاں شعبہ فارسی کے استاذ رہے، پھر تبلیغی جماعت میں جانے کی وجہ سے یہاں سے تدریسی سلسلہ منقطع ہو گیا، جماعت سے واپسی کے بعد مدرسہ منبع العلوم نظام آباد، ضلع اعظم گڑھ میں مسند تدریس سبائی، پھر یہاں سے علیحدہ ہو کر مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور میں کچھ دنوں استاذ رہے، پھر حضرت مولانا انعام الحسن صاحب قاسمی منگرنوی کی کوششوں سے جیراج پور پہنچے، اور مدرسہ تعلیم الاسلام میں چھ سات سال تک تدریسی خدمات کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام بھی انجام دیتے رہے۔

سن ۱۹۹۸ء میں جب حضرت مولانا عبدالمعید صاحب القاسمی کے دورِ نظامت کا جامعہ کی ترقی کا دور تھا، اسی دور میں احیاء العلوم میں ”شعبہ فارسی“ میں طلبہ کی کثرت کی بنا پر دو ترتیب کی ضرورت محسوس ہوئی، تو بحیثیت ”استاذ فارسی“ آپ کا انتخاب عمل میں آیا، چار پانچ سال بعد جامعہ کی مجلس شوریٰ نے آپ کو ترقی دے کر ”شعبہ عربی“ میں منتقل کر دیا، اور بیس سال تک نہایت پابندی اور محنت و لگن کے ساتھ تدریسی فرائض کو حسن و خوبی انجام دیتے رہے۔

سال رواں شوال المکرم سن ۱۴۴۰ھ میں جامعہ کی ضرورت، آپ کے ضعف و کمزوری اور آمدورفت کی سہولت کے پیش نظر جامعہ کی قدیم بلڈنگ میں جاری ”شعبہ عربی“ نسواں میں آپ کو منتقل کر دیا گیا۔

دیوبندی جماعت کا جمعہ جامع مسجد متعلق جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں صرف

ہوتا تھا، کمزور اور ضعیف لوگوں کی رعایت میں سن ۱۹۸۲ء میں محلہ پورہ دلہن کی قدیم مسجد میں جمعہ کا آغاز ہوا، سب سے پہلے امام و خطیب حضرت مولانا ممتاز احمد صاحب احیائی تھے، جو سن ۱۹۹۰ء تک امامت و خطابت کے فرائض انجام دے کر مستعفی ہو گئے، اسی سال ۱۹۹۰ء میں آپ جمعہ کے امام و خطیب منتخب کیے گئے، اس زمانہ میں آپ جیراج پور میں مدرس تھے، ہر ہفتہ جیراج پور سے آکر جمعہ کی امامت فرماتے تھے، اور یہ سلسلہ زندگی کے آخری ایام تک جاری رہا، وفات سے چند ہفتہ پہلے جب امراض کا ہجوم اور شدت تھی، چکر اور بے اختیاری طور پر گرنے کی کیفیت پیدا ہو گئی تو جمعہ کی نماز پڑھا کر فرمایا کہ اب میں جمعہ پڑھانے سے مستعفی ہو رہا ہوں اور مسجد کی کمیٹی جمعہ کے لیے کسی کا انتخاب کر لے۔

اسی طرح جب جناب الحاج علی احمد صاحب گڑھست اور دیگر با حوصلہ حضرات کی کوششوں سے محلہ پورہ دلہن کی عید گاہ بنی، تو ۱۹۹۳ء سے آپ امامت و خطابت کے فرائض انجام دیتے رہے۔

آپ نے ۳۹ سال ایک طویل عرصہ تدریسی خدمات انجام دی ہیں، اس دوران بہت سے طلبہ آپ سے مستفید ہوئے، چند قدیم طلبہ میں حضرت مولانا عارف جمیل صاحب قاسمی استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد عامر صاحب قاسمی مبعوث برائے دعوت و تبلیغ نیوزی لینڈ، مولانا مفتی فہیم اختر صاحب قاسمی صدر مولانا شکر اللہ اکیڈمی مبارک پور۔

تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ شروع ہی سے مروجہ تبلیغ میں اپنا وقت لگاتے تھے، بل کہ کہا جائے کہ اس کے ایک اہم داعی اور سپاہی تھے تو غلط نہ ہوگا، دعوت و تبلیغ کے تعلق سے گھر گھر پہنچتے تھے، ایمان و یقین، نماز اور آخرت کی تیاری کی دعوت دیتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے بندوں کو مسجدوں کو آباد کرنے کا پیغام دیتے تھے، مبارک پور کے مختلف محلوں

میں اور سوادِ مبارک پور کے علاوہ دیگر مقامات پر جماعت کے ساتھ جاتے تھے، اور ہفتہ واری گشت کے دن محلہ پورہ دلہن اور دیگر محلوں میں پہنچ کر بیانات کا بھی سلسلہ مسلسل جاری رہتا تھا، تبلیغی اجتماعات میں بھی شرکت فرماتے تھے، تبلیغی جماعت سے گہری وابستگی کا ہی نتیجہ تھا کہ اہلیہ محترمہ کو بھی بسا اوقات ساتھ لے کر تبلیغی جماعت میں جاتے تھے۔

صوم و صلاۃ کے بڑے پابند تھے، وقت سے پہلے ہی مسجد میں پہنچنے کا معمول تھا، دیر تک ذکر و اذکار میں مصروف رہتے تھے، اور باجماعت نماز ادا کر کے اطمینان سے مسجد سے باہر تشریف لاتے تھے۔

بزرگوں اور اکابرین سے ان کا گہرا تعلق تھا، ان کے واقعات پڑھتے تھے اور سناتے تھے، حضرت مولانا مفتی عبدالقیوم صاحب رائے پوریؒ سے ان کا اصلاحی تعلق تھا، مفتی صاحب کی وفات کے بعد ابھی کسی شیخ سے رجوع کا موقع نہ مل سکا تھا کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا مرحوم والد مکرم کے شاگرد رشید تھے، والد صاحب سے انھیں والہانہ تعلق تھا، وقتاً فوقتاً والد صاحب سے ملاقات و استفادہ کے لیے حاضر ہوتے تھے، اس راہ سے راقم الحروف پر بھی نہایت شفقت اور مہربانی فرماتے تھے، عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے موقع پر محلہ کی عید گاہ میں بیان کرنے کا حکم فرماتے تھے، اور کبھی ہفتہ واری گشت کے موقع پر بھی مسجد میں بیان کا حکم کرتے تھے۔

مولانا مرحوم کے مکان کی تعمیر ہونے والی تھی، والد صاحب دیوبند کے سفر پر تھے، مولانا نے ازراہ شفقت سنگ بنیاد میں شریک ہونے کے لیے مجھے مامور فرمایا، پھر والد گرامی اسی تاریخ میں دیوبند سے واپس آ گئے تو والد صاحب کو مدعو فرمایا، والد مکرم نے تشریف لے جا کر سنگ بنیاد رکھا، اور خیر و برکت کی دعا فرمائی۔

مولانا صاحبِ اولاد نہیں تھے، مگر طلبائے مدارس ان کی روحانی اولاد کی صورت میں ایک بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

سالوں سے آپ شوگر کے موذی اور خطرناک مرض میں مبتلا تھے، جس نے آپ کے قویٰ اور جسم کو گھلا کر رکھ دیا تھا، دن بہ دن اضمحلال اور کمزوری بڑھتی رہی، یادداشت بھی کافی متاثر ہوتی رہی، یہاں تک کہ امامت کرتے ہوئے نسیان کا شکار ہونے لگے، آواز میں لڑکھڑاہٹ پیدا ہونے لگی، ایک دن جمعہ کا خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو گرنے لگے، راقم الحروف بیان کر کے آگے ہی بیٹھا تھا، سنبھالنے کی کوشش کیا۔

وفات سے ایک ہفتہ پہلے جامعہ کے شعبہ نسواں میں درس دینے کے لیے زینہ پر چڑھ رہے تھے کہ الٹے بل زور سے گرے، محلہ کٹرہ کے اسپتال محمدیہ میں داخل کیے گئے، ڈاکٹر فہیم احمد صاحب کے زیرِ علاج رہے، ایک دن بعد انھوں نے ریفر کر دیا، اعظم گڑھ اسپتال میں علاج کے لیے لے جائے گئے، وہاں بھی علاج کارگر نہ ہو سکا، لکھنؤ ریفر کیے گئے، وہاں بھی دو اسپتال میں دکھایا گیا، مگر صحت اور زندگی سے مایوسی رہی، وفات سے دو دن پہلے عصر کے وقت موت و حیات کی کش مکش میں مبارک پور لایا گیا، خدمت کے طور میں محمدیہ اسپتال میں داخل کیے گئے، عشاء کے بعد وہاں سے بھی جواب مل گیا، عشاء کے بعد احقر اسپتال پہونچا تو دیکھا کہ گھر کے لیے لے جائے جا رہے ہیں۔

بالآخر ۹ ربیع الثانی سن ۱۴۴۱ھ / ۷ دسمبر سن ۲۰۱۹ء شنبہ کو صبح میں ہمیشہ کے لیے دنیا سے آنکھیں بند کر کے جوارِ رحمت میں پہونچ گئے، جہاں سے پھر کسی کو واپس نہیں آنا ہے۔ رَحِمَهُ اللہُ تَعَالٰی رَحْمَةً وَّاسِعَةً

اسی دن بعد نمازِ ظہر دو بجے مدرسہ باب العلم کے سامنے میدان میں مولانا مفتی

محمد یاسر صاحب قاسمی ناظم اعلیٰ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی گئی، اور پُریم آنکھوں سے ان کے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

نماز جنازہ اور تدفین میں مبارک اور اطراف و جوانب کے عوام، قرب و جوانب کے مدارس بالخصوص جامعہ عربیہ احیاء العلوم، جامعہ نور الاسلام ولید پور، مدرسہ انوار العلوم جہانانگ، مدرسہ دارالقرآن جہانانگ وغیرہ کے نظماً، اساتذہ کرام اور تبلیغی جماعت کے ذمہ داران حضرات بھی شریک تھے اور اطراف و جوانب کے مدارس میں ایصالِ ثواب کا بھی اہتمام کیا گیا۔

مولانا مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ محترمہ کے علاوہ دو بھائی قاری سہیل احمد، جناب محمد اشہد صاحب، تین چچا حافظ رضوان اللہ صاحب، حاجی وصی اللہ صاحب، جناب عبید اللہ اور بھتیجے اور بھتیجیاں ہیں۔

دوسرے دن ۱۰ ربیع الثانی سن ۱۴۴۱ھ / ۸ دسمبر سن ۲۰۱۹ء کو بعد نمازِ عشاء مولانا شکر اللہ اکیڈمی مبارک پور کے زیر اہتمام ایک تعزیتی پروگرام زیر صدارت مولانا مفتی فہیم اختر صاحب قاسمی زید مجدہم پورہ دلہن کی بیٹھک والی مسجد۔ جس میں مولانا مرحوم نماز پنجگانہ ادا فرماتے تھے۔ کا انعقاد کیا گیا۔

مولانا قمر الدین صاحب رسول پوریؒ

مولانا قمر الدین ولد عنایت اللہ صاحب رسول پوری نہایت متواضع سیدھے سادے، اپنے کام میں منہمک، دینی اداروں کے بے لوث خادم و منتظم، نہایت امانت دار اور صاحب استعداد عالم تھے۔

آپ کی جائے ولادت موضع رسول پور ہے، جو مبارک پور کا مضافاتی محلہ ہے،

ابتدائی نوشت وخواند محلہ کے مکتب میں ہوئی، وہیں فارسی کی بھی تکمیل کی، پھر حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوری سے ابتدائی عربی کتب عربی دوم تک پڑھیں، آگے کی تعلیم کے لیے دیار مشرق کے قدیم ادارہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کا رخ کیا، حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا محمد عمر صاحب مبارک پوری، اور حضرت مولانا عبد الجبار صاحب معروفی وغیرہم اساتذہ علم و فن سے حدیث و تفسیر، زبان و ادب، فقہ و اصول فقہ کی تعلیم سے آراستہ ہوئے۔

عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مدرسہ شاہی قاسمیہ مراد آباد پہنچے، اور وہاں کے جلیل القدر اساتذہ عظام: حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادی، حضرت مولانا محمد میاں صاحب دیوبندی، حضرت مولانا انوار الحق صاحب۔۔۔۔ اور حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سنبھلی کے دریائے علم و فیض سے مستفیض ہو کر فراغت حاصل کی۔

عملی زندگی کا آغاز ڈھاکہ ملازمت سے کیا، آب و ہوا اس نہ آنے کی بنا پر وہاں زیادہ دنوں قیام نہیں رہا، پھر وطن واپسی ہوئی، اور اپنے محلہ ہی کے مکتب ”مدرسہ اسلامیہ“ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، آپ کی جدوجہد اور تعلیم و تربیت سے بہت جلد خوشگوار نتیجہ سامنے آ گیا، بچوں کے سینوں میں تعلیمی شوق محسوس ہونے لگا، لکھنے پڑھنے کا ماحول بن گیا۔

پھر مدرسہ اسلامیہ سے علیحدہ ہو گئے، اساتذہ کرام کے ایماء سے مدرسہ عربیہ منبع العلوم خیر آباد میں معلم و مدرس ہوئے، پھر اپنے اولین مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں بحیثیت نائب ناظم آپ کا انتخاب عمل میں آیا، تمام مفوضہ امور کی انجام دہی میں مصروف رہے، پھر جب حضرت مولانا عبد الباری قاسمی کی وفات ہوئی اور حالات میں تبدیلی کا احساس ہوا تو خاموشی کے ساتھ جامعہ سے علیحدگی اختیار کر کے گھر بیٹھ گئے۔

مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اپنے قائم کردہ ادارہ ”الجامعۃ الحجازیہ“ میں مدرسہ کی پیش کش کی، جسے آپ نے قبول کر کے حسبِ مزاج ادارہ کی تعمیر و ترقی میں ہمہ تن مصروف ہو گئے، مگر کسے معلوم تھا کہ زندگی کا یہ مسافر بہت جلد جدا ہو جائے گا، ۲۴ مئی ۱۹۹۱ء کو جمعہ کا دن تھا، نماز جمعہ کے لیے وضو فرما رہے تھے کہ دل میں شدید درد کا احساس ہوا، نماز جمعہ کے وقت دل کی حرکت موقوف ہو گئی اور روح قفسِ غضری سے پرواز کر گئی، دوسرے دن نمازِ جنازہ اور تدفینِ عمل میں آئی، امامت صاحبزادہ گرامی حضرت مولانا خورشید انور صاحب اعظمی نے فرمائی، نمازِ جنازہ میں جم غفیر کے ساتھ ممتاز علماء کی ایک بڑی تعداد شریک تھی۔ (علمائے رسول پور عظیم شخصیتیں ص ۷۳ تا ۷۷)

مولانا قرۃ العین صاحب فائق مبارک پوری

مولانا قرۃ العین بن جناب عبدالواحد بن حافظ عبدالرشید بن عبدالعظیم صاحب فائق جمعیت اہل حدیث مشرقی اتر پردیش کے سابق نائب امیر، ادیب و شاعر، ضلعی جمعیت کے ناظم تھے، مردم ساز، مردم شناس، نہایت ذہین و فطین، بہترین مدبر و منصوبہ ساز تھے۔ مبارک پور کے متصل موضع املو میں ۱۳۵۹ھ / ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے، چند ہی دن گزرے تھے کہ والدہ مکرمہ کا سایہ شفقت سر سے اٹھ گیا، آپ اپنی پھوپھی کی آغوش میں آ گئے، ان کے زیر سایہ رہ کر پروان چڑھے۔

ابتدائی تعلیم درجہ تین تک مدرسہ انوار العلوم املو میں حاصل کی، پھر مدرسہ فیض عام مئو میں پہلی جماعت میں داخلہ ہوا، ابھی تیسری جماعت میں تھے کہ صحت کی خرابی کی وجہ سے مدرسہ فیض عام کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے، قصبہ مبارک پور کے مشہور علمی ادارہ جامعہ عربیہ

احیاء العلوم مبارک پور میں داخلہ لیا، یہاں دو سال تک حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوریؒ، مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوریؒ، مولانا عبد المنان صاحب باسو پاریؒ، مولانا زین العابدین صاحب معروفیؒ سے مستفیض ہوئے۔

تحصیل علوم و فنون کے جذبہ سے جامعہ رحمانیہ بنارس پہنچے، وہاں دو سال تعلیم حاصل کی، صحت کی ناہمواری مانع ہوئی، دو سال تک تعلیمی سلسلہ موقوف رہا، پھر جامعہ فیض عام منو میں داخل ہو کر فارغ التحصیل ہوئے، جامعہ فیض عام کے اساتذہ درج ذیل ہیں:

مولانا محمد احمد صاحب ناظم منوی، مولانا مفتی حبیب الرحمن صاحب فیضی، مولانا عظیم اللہ صاحب منوی، مولانا شمس الحق صاحب سلفی، مولانا عبد الرحمن صاحب نحوی، مولانا عبد المعید بنارس، مولانا عبد الرحمن صاحب مبارک پوری۔

جامعہ رحمانیہ بنارس کے اساتذہ مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی الملو، مولانا حکیم بشیر احمد صاحب رحمانی مبارک پوری، مولانا محمد ادریس صاحب آزاد رحمانی وغیرہم ہیں۔

جامعۃ الرشاد شہر اعظم گڑھ سے بحیثیت استاذ دو سال وابستہ رہے، پھر جامعہ رحمانیہ منتقل ہو کر اس سے منسلک ہو گئے، وہاں ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۹ء تک سرگرم تدریس رہے، پھر کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ بادل ناخواستہ مستعفی ہو کر گھر آ گئے، قصبہ مبارک پور میں اسٹیشنری کی ایک دوکان کھول کر اس سے وابستہ ہو گئے، اس کے ذریعہ قرآن کریم، دینی کتب، اس کے علاوہ درسی کتابیں اور غیر درسی کتابیں، کاپیاں وغیرہ فروخت کرتے تھے۔

مبارک پور آنے کے بعد ملی اور جماعتی کاموں میں پڑھ چڑھ کر حصہ لیا، آپ ہی کی تحریک و کوشش سے مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور میں عربی شعبہ کا قیام عمل میں آیا، پھر آپ ہی کی سعی بلیغ سے مدرسہ انوار العلوم الملو میں بھی عربی شعبہ قائم ہوا، ایک مدت تک آپ مبارک پور

سے جہاں آپ نے مکان بنوا کر مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، صبح املو جاتے، ۱۰ بجے تک پڑھا کر واپس دوکان پر آتے، آگے چل کر جب تجارتی مصروفیات بہت بڑھ گئیں تو اس تدریسی خدمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔

آپ کے تلامذہ اور مستفیدین کی فہرست طویل ہے، چند نام پیش کیے جاتے ہیں: ڈاکٹر عبدالرحمن پریوائی، شیخ شاہد جنید بناری، شیخ عبداللہ سعود بناری، شیخ عبداللہ طیب بناری، مولانا ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب، مولانا ڈاکٹر رضاء اللہ صاحب، مولانا عبدالکبیر مبارک پوری وغیرہم ہیں۔

آپ کو افہام و تفہیم، مشکل مقامات کی تحلیل و تجزیہ اور نحو و صرف اور بلاغت کی کتابیں پڑھانے میں مہارت حاصل تھی، صرف کتابوں کی مثال پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ قرآن وحدیث سے مثالیں تلاش کر کے پیش کرتے تھے۔

مدرسہ اسلامیہ انوار العلوم املو کے ناظم تعلیمات بھی رہے، مولانا کے مضامین ملک کے بیش تر اخباروں اور رسائل میں شائع ہوتے رہے۔

مختصر علالت کے بعد ۲ فروری ۲۰۱۴ء کو یکشنبہ مغرب سے کچھ پہلے سواپانچ بجے انتقال کر گئے، ۳ فروری ۲۰۱۴ء بعد نماز ظہر ۲ بجے دن میں ”شاہ پنچہ“ میں نماز جنازہ ادا کی گئی، اور وہیں تدفین بھی ہوئی۔

(یہ معلومات مستفاد ہیں مولانا کے اپنے بارے میں لکھائے گئے مضمون سے، دو اور مضامین سے ایک مولانا فواز عبدالعزیز مبارک پوری ریسرچ اسکالر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے مضمون سے، دوسرے ابو بشار اعظمی کے مضمون سے جو ترجمان دہلی جمادی الاخریٰ ۱۴۳۵ھ میں شائع ہوا ہے، اور روزنامہ انقلاب ۳ فروری ۲۰۱۴ء سے)

مولوی محمد صاحب مبارک پوری

مولوی محمد ولد قاری سمیع اللہ صاحب مبارک پوری صوم و صلاۃ کے نہایت پابند، تہجد گزار، اور پرہیزگار عالم تھے، اور ساتھ ہی ساتھ حق گو، اور راست باز تھے، ۱۹۰۰ء کی کسی تاریخ و ماہ میں پیدا ہوئے۔

غالباً ابتدائی اور متوسطات کی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں مولانا حکیم محمد محمود صاحب معروفی وغیرہ اساتذہ کرام سے حاصل کی، پھر جذبہ اعلیٰ تعلیم نے مدرسہ عربیہ مظاہر علوم سہارن پور پہنچا دیا اور وہاں سے فراغت حاصل کی، پھر طب و حکمت کے شوق نے اپنے رفیق درس مولانا عبدالباری ولد مولانا حکیم الہی بخش کے ہمراہ لکھنؤ میں حکیم عبدالحکیم کے در پر پہنچا دیا، مگر طب کی تکمیل نہ کر سکے، پھر تجارت میں لگ گئے، مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وحی اللہ صاحب فتح پوری سے گہرا تعلق تھا، اور حضرت شاہ صاحب آپ کے والد بزرگوار قاری سمیع اللہ صاحب کے میزبان تھے۔

پست قد، سفید کرتا، پا جامہ میں ملبوس نظر آتے تھے، آخری عمر میں آپ پر فالج کا حملہ ہوا، ۱۹۸۵ء کے حدود میں انتقال فرمایا۔

حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوری

استاذ العلماء، صدر مجلس فقہ و فتاویٰ، سادگی و جفاکشی کے پیکر، فقیہ العصر، مربی و مصلح، کامیاب مدرس و معلم شخصیت کا اسم گرامی مولانا مفتی محمد یسین بن عبدالسبحان بن شیخ عبداللہ بن قیام الدین بن لال محمد صاحب ہے۔

یکم محرم الحرام ۱۳۲۵ھ / ۱۴ فروری ۱۹۰۷ء پنجشنبہ کو محلہ پرانی بستی کے ایک معزز خاندان میں زندگی کی پہلی سانس لی۔

جب پڑھنے لکھنے کے لائق ہوئے تو اپنے محلہ کے جید الاستعداد عالم دین مولانا عبدالرحمن ابن حاجی محمد قاسم صاحب نے بسم اللہ کرائی، حکیم محمد سعید پورہ صوفی سے قرآن کریم کی دولت حاصل ہوئی۔

اردو، فارسی اور عربی تعلیم کے لیے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں بیٹھائے گئے، جہاں حضرت مولانا محمد صدیق صاحب برٹی پوری، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری، حضرت مولانا علی احمد صاحب کوڑیا پاری، مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری، مولانا نعمت اللہ صاحب مبارک پوری کی درس گاہوں میں حاضری دے کر ان کے چمنستان علم سے علم و فن کے پھول چنے، اور ان کے دریائے فضل سے موتیوں کا انتخاب کیا۔

آپ کا حضرت مولانا علی احمد صاحب کوڑیا پاری سے خصوصی تعلق تھا، اسی کا اثر تھا کہ جب مولانا کوڑیا پاری یہاں سے علیحدہ ہو کر اپنی تدریس کا مرکز مدرسہ ناصر العلوم گھوسی کو بنایا تو آپ بھی گھوسی پہنچ گئے، اور ۵ سال تک مولانا کوڑیا پاری کے علم و فضل سے موتی چنتے رہے۔ کچھ دنوں میں مولانا ابوالحسن منوی سے مستفیض ہوئے، پھر اعلیٰ تعلیم کے ذوق

و شوق نے دیوبند پہنچا دیا، ۱۳۴۲ھ میں شہرہ آفاق درس گاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، اس دور میں دارالعلوم دیوبند میں امام حدیث حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ التفسیر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، شیخ الادب والفقہ مولانا اعجاز علی صاحب امر ہوئی اور جامع منقول و معقول حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی وغیرہم کے وجود و فیض سے آفتاب و ماہتاب بنا تھا۔

رسمی تکمیل کے بعد کچھ دنوں تدریسی سلسلہ پنڈدادن پنجاب میں رہا، مگر دور دراز مسافت اور سفر کی صعوبتوں کی وجہ سے گھر سے قریب ابراہیم پور میں مدرسہ قبول کر لی، تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۱۳۴۹ھ میں بہ مشاہرہ ۱۵/۱۷ روپے جامعہ عربیہ اہیاء العلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے، اور تاحیات اسی سے وابستہ رہے، درجہ ادنیٰ کے مدرس سے ترقی کر کے صدر المدرسین، ناظم تعلیمات، رکن مجلس شوریٰ اور مفتی جامعہ کے منصب پر فائز ہوئے۔

مدرسہ کے سوا سال بعد حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوریؒ کے معاون مفتی بنائے گئے، اس دور میں مولانا شکر اللہ صاحب کے لکھے ہوئے فتاویٰ کی تصدیق و تصویب کرتے تھے۔

پھر ۲۶/رجب المرجب ۱۳۵۲ھ سے فتویٰ نویسی شروع کر دی، اور نصف صدی سے زائد عرصہ تک تحقیق و تدقیق اور خوش اسلوبی کے ساتھ یہ خدمت انجام دی۔

فتویٰ کی عبارت ایسی آراستہ و پیراستہ کی کہیں ایک لفظ کی کمی بیشی کی گنجائش نہیں ہوتی، فتویٰ نویسی میں ان کی ذات سند کی حیثیت رکھتی تھی، دور دراز مقامات سے استفتاء آتے تھے، کبھی دوسرے صاحب افتاء سے اختلاف ہوتا تو بحیثیت دلائل مفتی صاحب کا فتویٰ بھاری ہوتا تھا، راقم کی نگاہ سے نقول فتاویٰ کے رجسٹر میں کئی ایسے مسائل گزرے ہیں۔

مسائل دریافت کرنے کے لیے قصبہ و بیرون قصبہ سے مسلسل لوگوں کی آمد رہتی تھی، سب کو تسلی بخش جواب دیتے تھے، مسائل کا استحضار تھا، مگر سائل کو زبانی جواب دینے کے ساتھ اطمینان قلب کے لیے کتاب کی عبارت اور حوالہ بھی دکھا دیتے تھے۔

قصبہ میں مفتی صاحب کی حیثیت گویا قاضی کی تھی، نکاح پڑھانا، جمعہ و عیدین کی امامت انھیں کے سر تھی۔

طلبہ عزیز کی تعلیم و تربیت کا حد درجہ اہتمام تھا، جو طالب علم سامنے آ جاتا، اس سے دریافت کرتے کہ کیا پڑھتے ہو؟ کتاب کا نام بتانے پر اس کتاب سے زبانی کوئی سوال کرتے، جواب دینے پر خوش ہوتے، ورنہ اسے محنت سے پڑھنے کی ترغیب دیتے۔

نجیف الجیشہ، دبلے پتلے، دراز قد، گھنی داڑھی، سنجیدگی و متانت کے موقع، ڈھیلا ڈھالا لمبا کرتا، دوپلی ٹوپی، جمعہ کے روز عام طور سے سیاہ عمامہ، سیاہ لمبا عبا، اور ہاتھ میں عصا ہوتا تھا۔ مطالعہ اور فتویٰ نویسی میں جزئیات کی تلاش و جستجو، ماخذ و مراجع کی چھان بین کے پیش نظر اکثر جامعہ ہی میں شب گزارتے تھے، بسا اوقات لڑکوں سے کھانا منگوا لیتے تھے، دارالافتاء میں بیٹھے مصروف مطالعہ رہتے، دائیں بائیں کتابیں پتائیوں پر لدی رہتی تھیں، سردی ہو یا گرمی یا برسات کی جھڑی ان کے معمولات اور درس و تدریس میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

تعلیم کا طریقہ سیدھا سادہ، محنت کرنا اور طلبہ سے محنت لینا، ان کا طرہ امتیاز تھا، ان کی انتہائی کوشش ہوتی تھی کہ طلبہ عزیز کو کچھ آجائے، اخلاقی تربیت کے ساتھ طلبہ کی وضع قطع اور نشست و برخاست کا جائزہ لیا کرتے، طلبہ عزیز کو علماء و صلحاء کی شکل و صورت اختیار کرنے کی ترغیب دیتے تھے، کبھی کبھی ٹوپی اتروا کر بال کی تراش و خراش بھی دیکھتے، اگر فیشنی پاتے تو سخت تنبیہ کرتے۔

مقامی طلبہ کو بھی نماز کی پابندی کی طرف بار بار توجہ دلاتے، تاکید کرتے، الغرض طلبہ کی تعلیمی و اخلاقی تربیت کا پاس و لحاظ بہت زیادہ تھا، مقامی اور اطراف کے دینی جلسوں میں مفتی صاحب کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی، سنجیدہ انداز میں پند و نصیحت قرآن و حدیث اور بزرگان دین کے اقوال و اعمال کی روشنی میں اس طرح کرتے کہ بات دل میں اتر جاتی، ان کی چند منٹ کی سادہ بیانی، گھنٹوں کی لچھ دار تقریر سے تاثیر میں بڑھی ہوتی تھی۔

مفتی صاحب مرنجاں مرنج طبیعت کے مالک انسان تھے، بحث و مباحثہ اور قیل و قال سے حتی الامکان پرہیز کرتے تھے۔

مفتی صاحب کی پچاس سال سے زائد زندگی قال اللہ اور قال الرسول میں گزری، اور کتب درسیہ کی توضیح و تشریح میں صرف ہوئی، اس مدت میں بے شمار تلامذہ پیدا ہوئے، جن کا شمار خدائے علیم ہی بہتر جانتا ہے۔

آخری عمر میں اسہال کی شکایت ہوئی، ضعف و نقاہت بڑھتی رہی، چند ماہ قبل آنکھوں کا آپریشن کرایا تھا، اس کے لیے مدرسہ سے رخصت لی تھی، خیال تھا کہ احتیاطی تدابیر کی تکمیل کے بعد جامعہ حاضر ہو کر تدریس و افتاء میں مصروف ہو جائیں گے۔

مگر ضعف و نقاہت آڑے آئی، ۲۲ محرم ۱۴۰۴ء / ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۳ء کی شب میں ساڑھے بارہ بجے اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
دوسرے دن غسل و کفن کے بعد نعش جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں آخری دیدار کے لیے لائی گئی، شائقین دیدار پروانہ وار گر رہے تھے، محتاط اندازہ کے مطابق ۲۰ ہزار کا مجمع تھا۔

سمودی عید گاہ کے سامنے تین بج کر ۱۰ منٹ پر نماز جنازہ ادا کی گئی، اور حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری کے مزار کے قریب سپرد خاک کیے گئے۔
تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ فرمائیں:

حامی دین متین: مولانا محمد عثمان صاحب ساحت مبارک پوری

فتاویٰ احیاء العلوم: مرتب مولانا مفتی جمیل احمد صاحب ندیری

تذکرہ علمائے اعظم گڑھ: مولانا حبیب الرحمن صاحب قاسمی

اکابر احیاء العلوم: محمد صادق مبارک پوری

مولانا محمد اصغر صاحب سریا نوئی

موضع سریاں کے باشندہ، مظاہر علوم سہارن پور کے فاضل اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔

۱۹۰۷ء کے حدود میں موضع سریاں میں ولادت ہوئی، خانگی تعلیم حاصل کرنے کے بعد غالباً جامعہ عربیہ اہیاء العلوم میں متوسطات تک تعلیم حاصل کی۔

۱۳۵۱ھ میں مظاہر علوم سہارن پور پہونچے، مشکوٰۃ شریف کی جماعت میں داخلہ ہوا، ۱۳۵۲ھ میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور دیگر اساطین علم و فن سے دورہ حدیث شریف کی کتابیں پڑھ کر فارغ التحصیل ہوئے۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۲ء / ۲۵ رجب ۱۴۱۲ھ یوم جمعہ بوقت ۶ بج کر ۵ منٹ پر صبح ہندو یونیورسٹی بنارس میں انتقال فرمایا۔

۱۲ بجے دن میں نعش سریاں پہونچی، تجہیز و تکفین بعد نماز عشاء ساڑھے آٹھ بجے عمل میں آئی، نماز جنازہ حضرت مولانا نیاز احمد صاحب العمریؒ نے پڑھائی۔

مولانا محمد عمر صاحب مظاہری مبارک پوریؒ

حضرت مولانا محمد عمر بن حاجی حکیم سعید احمد بن شیخ عبدالکریم بن شیخ محمد عالم بن شیخ بدل صاحب مبارک پوری استاذ العلماء، عمدہ خطیب اور باصلاحیت عالم دین تھے۔

قصبہ کے محلہ پورہ صوفی میں ۱۳۲۷ھ / ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے، ایک علمی گھرانے میں آنکھ کھولی، علم طب کی فضا میں نشوونما پائی۔

ابتدائی تعلیم کے بعد قصبہ کے مشہور مدرسہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخل کیے گئے، متوسطات کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ ”ناصر العلوم“ گھوسی میں داخلہ لے لیا۔ اس وقت مشہور صاحب درس عالم حضرت مولانا علی احمد صاحب کوریا پارٹی کا فیض درس پورے آب و تاب کے ساتھ جاری تھا، چند سالوں مستفیض ہونے کے بعد مدرسہ عربیہ ”مظہر العلوم“ بنارس پہنچے، اس وقت ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمیٰ بحیثیت صدر المدرسین گوہر علم و معرفت کی افشانی میں مصروف تھے، ایک سال مظہر العلوم میں رہے، ۱۳۲۸ھ میں ”مظاہر علوم“ سہارن پور پہنچے، وہاں دو سال موقوف علیہ اور دورہ کی تعلیم نابغہ روزگار شخصیات سے حاصل کی، مثلاً شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مظاہر علوم سہارن پور اور حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کیمل پوری۔

مظاہر علوم سے رسمی فراغت کے بعد مبارک پور کے مشہور مدرسہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم سے درس و افادہ کا آغاز کیا، مدتوں درس و تدریس میں مصروف رہے، گھر گریہستی کی ذمہ داری بھی آپ کے سر تھی، باہر جانے کی بھی ضرورت پیش آتی تھی، آخر درس و تدریس کا سلسلہ موقوف کرنا پڑا، قصبہ میں ریشم کی دوکان کر لی، پھر کاروبار میں خوب ترقی ہوئی، اس زمانہ میں بھی علم و علماء سے تعلق برقرار رہا، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے طلبہ کو پڑھانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

ضلع اور اطراف میں دینی جلسوں میں مدعو ہوتے تھے، آپ کا وعظ عام فہم اور علمی ہوتا تھا، عوام و خواص میں بے حد مقبول تھا، وعظ میں بکثرت باحوالہ حدیث پڑھتے تھے، اس لیے علماء بھی ان کے وعظ کو پسند کرتے تھے، آپ کے درس و افادہ سے مستفیض ہونے والوں

میں کبارِ علماء ہیں، ان میں دو نام یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوریؒ (۲) حضرت مولانا زین العابدین صاحب معروفیؒ صدر شعبہ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارن پور۔
طویل عرصہ سے تعلیمی اور تدریسی سلسلہ موقوف تھا، مگر علم مستحضر تھا، یہ شب و روز کتب بینی اور مطالعہ کی برکت تھی۔

۱۳/۱/۱۹۹۵ء / ذوقعدہ ۱۴۱۶ھ کو بوقت ۱۰ بجے دن ۸۶ سال کی عمر میں اس سرائے فانی کو چھوڑ کر دارِ غلد کو روانہ ہو گئے، اسی دن بعد نماز مغرب مبارک پور کے قدیم قبرستان ”شاہ پنچہ“ میں سپرد خاک ہوئے۔

(اکابر احیاء العلوم ج ۲ ص ۱۳۱ تا ۱۳۴، تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص ۵۳ تا ۵۷)

مولوی محمد علی صاحب مبارک پوری

ولادت ۱۹۱۲ء میں ہوئی، والد کا نام علی حسن تھا، جنھیں بابائے قوم کا لقب دیا گیا تھا، اسی لیے سب لوگ انھیں ”علی حسن بابا“ کہتے تھے، محلہ پورہ رانی بازار کے باشندہ تھے۔
ترویجِ مسلک کے ساتھ دوکان داری بھی کرتے تھے، یہی ذریعہ معاش تھا، سب سے خوش روئی اور خوش اخلاقی سے ملتے تھے۔

۱۹۸۷ء میں انتقال کیا، بڑی ارجمندی ”بنری باغ“ کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

(شجرہ طییبہ ص ۷۱ تا ۷۲)

مولوی محمد منیر صاحب مبارک پوریؒ

مولوی محمد منیر ولد شیخ عبداللہ بن قیام الدین بن لال محمد صاحب مبارک پوریؒ حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوریؒ کے برادر اصغر تھے۔

۱۹۱۳ء کے حدود میں پرانی بستی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم غالباً جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، پھر جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں داخل ہوئے۔ تعلیمی زندگی کے بعد تدریسی زندگی کا آغاز کیا یا نہیں؟ اس کا سراغ نہیں ملتا، خاندانی پیشہ تجارت تھا، آپ بھی تجارت کرنے لگے۔

ابتداء میں ۱۹۶۸ء تک کٹک اوڈیسہ کاروباری سلسلہ تھا، پھر سیوان کے علاقے سے تجارت کا سلسلہ رہا، سیوان تجارت کے سلسلہ میں جاتے تو ایک مدرسہ میں قیام کرتے تھے، وہاں کے طلبہ عزیز سے علمی سوالات کرتے، بسا اوقات کوئی مدرس نہ ہوتا تو درس بھی دیتے، علم ازبر تھا، یادداشت مضبوط تھی، مارچ ۱۹۶۳ء میں حج کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔

آخر ہجری سن سے ۷۳ سال اور عیسوی سن سے ۷۱ سال کی عمر میں ۲۸ فروری ۱۹۸۴ء سنہ شنبہ کو وفات ہوئی۔ (معلومات از صاحب زادہ مقصود احمد صاحب بہ توسط جناب عبدالاعلیٰ صاحب)

حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساہر مبارک پوریؒ

حضرت مولانا محمد عثمان بن حافظ علی حسن صاحب مبارک پوری صرف و نحو اور ادب و تفسیر کے نہایت کامیاب مدرس اور طلبہ کی دینی تربیت میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، اردو، عربی دونوں زبانوں کے بلند پایہ ادیب اور قادر الکلام شاعر، اچھے صاحب قلم تھے، بڑے کریم

النفس، نرم خو، کم سخن، اور حلیم و بردبار تھے۔

۱۳۲۳ھ / ۱۹۱۴ء کو مبارک پور میں ولادت ہوئی، از ابتدا تا مشکوٰۃ وغیرہ کی تعلیم اپنے قصبہ مبارک پور کے مدرسہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم میں نابغہ روزگار حضرات اساتذہ کرام سے حاصل کی، ان میں چند اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

حضرت مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا محمد عمر صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا مفتی محمد یلین صاحب مبارک پوری، رحمہم اللہ تعالیٰ۔

دورہ حدیث کی تعلیم کے لیے مراد آباد کے مدرسہ جامعہ قاسمیہ (مدرسہ شاہی) پہنچے، وہاں دورہ حدیث درج ذیل اساتذہ کرام سے پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔
حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادیؒ سے صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، سنن ابن ماجہ، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ سے سنن ترمذی، حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب سنہجلیؒ سے صحیح مسلم شریف وغیرہ۔

آپ کو علم حدیث اور زبان و ادب سے خصوصی تعلق تھا، آپ نے درس و تدریس اور نظم و قصیدہ کی راہ سے ان کی اشاعت و خدمت انجام دی۔

تکمیل تعلیم کے بعد آپ نے طریقہ سلف اختیار کرتے ہوئے درس و افادہ کی محفلوں کو سجا یا، ہندوستان کے مختلف مدارس میں تقریباً نصف صدی تک معلم و مدرس رہے۔

۲۰ سال مدرسہ بیت العلوم مالگاوں، ۱۰ سال مدرسہ سراج العلوم دھولیہ ۱۱ سال جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور، ۱۱ سال مدرسہ حسینیہ جون پور،۔۔۔ سال مدرسہ ضیاء العلوم مانی کلاں جون پور، ۱۰ سال مدرسہ منبع العلوم خیر آباد ضلع مئو میں تدریسی زندگی گزاری۔

مولانا ساحتجو صرف اور ادب و تفسیر کے نہایت کامیاب استاذ تھے، طلبہ عزیز کی دینی تربیت میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔

شعر و شاعری کا فطری ذوق تھا، نعت بڑی عمدہ کہتے تھے، بہت زود گو عربی میں بھی مشق سخن جاری تھی، اور اردو کی ہر صنف سخن میں اشعار کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ بدن بھاری تھا، قبل از وقت دانت جھڑ گئے، آپ نے بہت تصنیفی کام شروع کیا، مگر پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے، یا ان کی طباعت و اشاعت نہ ہو سکی، اب یہ مسودات کہاں اور کس حال میں ہیں؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ایک بار انھوں نے قصبہ کی مساجد کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی تھی، روزانہ بعد مغرب گھر سے نکلتے تھے، اور مسجد مسجد پہنچ کر تاریخ معلوم کرتے تھے مگر یہ بھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی، دو تصنیف شائع ہوئی ہیں:

(۱) القصائد الغالیہ: جس میں چند عربی قصیدے ہیں۔

(۲) نور و سرور: نعتوں کا مختصر مجموعہ ہے۔

۲۰/۱ اپریل ۱۹۹۳ء/۲۷ شوال ۱۴۱۳ھ سہ شنبہ کو ۶ بجے شام مبارک پور میں انتقال فرما گئے، دوسرے دن چہار شنبہ کو ۲ بجے دن میں آبائی قبرستان حیدر آباد مبارک پور میں سپرد خاک کیے گئے۔ (تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص ۵۷۰ تا ۵۷۳، اکابر احیاء العلوم ص ۱۳۸ تا ۱۳۹)

مولوی خواجہ محمد شفیع صاحب مبارک پوری

مولوی خواجہ محمد شفیع ولد عبدالشکور صاحب محلہ پورہ صوفی کے باشندہ تھے، ۱۹۱۴ء کے حدود میں ولادت ہوئی، ابتدائی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں پائی، پھر

مظاہر علوم سہارن پور تحصیل علوم و فنون کے لیے پہونچے، وہاں سے لاہور کے کسی مدرسہ میں پہونچ کر تعلیم و تربیت پائی۔

اولاً جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے پرائمری درجات میں معلمی کے فرائض انجام دیئے، پھر مبلغ و سفیر بنائے گئے۔

خواجہ صاحب نے بڑی محنت و لگن سے دیہات دیہات میں جامعہ کی فراہمی مالیات کے سلسلہ میں دورہ کیا، ۶۰ گاؤں تک ان کی دوڑ دھوپ جاری تھی، ہر گاؤں سے غلے آتے تھے۔ یہاں سے جدا ہو کر جنجیرہ میں انسپکٹر آف مدارس ہوئے، وہاں سے واپسی ہوئی تو بڑہل گنج کے مدرسہ میں نظامت قبول کرنی پڑی۔

پھر غالباً جامعہ حسینیہ جون پور کی خدمت انجام دیتے رہے، وفات سے ایک دو سال پہلے حج بیت اللہ کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔

مولانا محمد عثمان صاحب ساحر سے آپ کے گہرے مراسم و تعلقات تھے۔ آخر عمر میں گھر آ گئے تھے، فالج کا حملہ ہوا، اسی مرض میں ۱۴/رجب ۱۴۰۹ھ/ ۳۰ مارچ ۱۹۸۹ء دوشنبہ کو وفات ہوئی، بعد نماز عصر ”شاہ پنچہ“ میں تدفین عمل میں آئی۔
(معلومات از حاجی خالد کمال صاحب مع اضافہ)

مولانا مفتی محمد محبوب صاحب اشرفی نوادوی

مولانا مفتی محمد محبوب بن عبد اللہ بن فرید گڑھست ۱۹۱۵ء میں قصبہ مبارک پور کے مضافاتی محلہ موضع نوادہ میں پیدا ہوئے، ٹھوس علمی صلاحیت رکھتے تھے، مدرسہ اشرفیہ کے فیض یافتہ، مدرسہ احسن المدارس کان پور میں مدرس و مفتی تھے، مقرر و خطیب بھی تھے اور

مضمون نگار بھی تھے۔

جن علماء نے انھیں دیکھا ہے، ان میں سے بعض نے بیان کیا کہ اپنی ذات میں بڑے نیک صالح تھے، صوم و صلاۃ کے بڑے پابند تھے، حتیٰ کہ پیرانہ سالی میں بھی بکثرت تلاوت قرآن پاک میں مشغول رہتے تھے اور آخر تک تراویح کے پابند تھے، رسالوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

ناظر قرآن کی تعلیم حافظ عبدالغفار سے نواہ میں مکمل کی، پھر مدرسہ اشرفیہ میں داخل ہوئے، مولانا شمس الحق صاحب گجہراوی سے اردو اور عربی کی تعلیم حاصل کی، اور ابتدائی عربی کی بھی تعلیم یہیں پائی، پھر مدرسہ منظر الاسلام بریلی بھیجے گئے، پھر ایک دو سال میرٹھ کے ایک مدرسہ میں بغرض تعلیم قیام رہا، جب مولانا عبدالعزیز مراد آبادی بحیثیت صدر المدرسین مدرسہ اشرفیہ آئے، تو آپ بھی مبارک پور واپس ہوئے، اور مدرسہ اشرفیہ میں داخل ہو کر فراغت حاصل کی، یہ فارغین اشرفیہ کی پہلی جماعت تھی۔

رسمی فراغت کے بعد کلکتہ کے ایک مدرسہ سے بسلسلہ تدریس وابستہ ہوئے، پھر کچھ دنوں بنارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، اس سے علیحدگی ہوئی تو مدرسہ بحر العلوم ممبئی میں رہے، پھر حالات نے آپ کو کان پور پہنچا دیا، جہاں تقریباً ۴۰ سال دارالعلوم اشرفیہ احسن المدارس میں بحیثیت مفتی و مدرس قیام پذیر رہے اور کان پور میں مفتی اعظم کان پور سے جانے جاتے تھے۔

سنی جمعیتہ العلماء اتر پردیش کے صدر بھی رہے، آپ ہی کے دورِ صدارت میں بے مثال سنی کانفرنس کان پور میں ہوئی، جس میں رضا خانی جماعت کے سبھی اکابر و اصاغر نے شرکت کی۔

.....

آپ کی مشہور تصنیفی خدمات میں سے العذاب الشدید اور قرآن کریم کے تین پاروں کی تفسیر، جو ماہ نامہ سنی لکھنؤ میں شائع ہوتی رہی۔

۳/ شوال المکرم ۱۴۱۳ھ / ۲۷ مارچ ۱۹۹۳ء کو انتقال کیا۔

(معلومات از مولانا محمد احمد صاحب بواسطہ حافظ محمد اکرم صاحب مع اضافہ)

شیخ مولانا محمد ادریس صاحب آزاد رحمانی

مولانا محمد ادریس ولد عبدالعزیز ولد محمد صدیق ولد الحاج نور محمد ولد چندن ولد ایمن قصبہ مبارک پور سے مشرق میں ایک میل پر املو کے باشندہ تھے، جماعت غیر مقلدیت میں عبقری شخصیت کے مالک اور مختلف علوم و فنون میں ماہر تھے۔

۲ جنوری ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے، علمی و دینی ماحول میں آنکھیں کھولی اور پرورش پائی، ابتدائی تعلیم اپنے ماموں کے گھر حاصل کیا، ختم قرآن کے بعد مدرسہ دارالتعلیم میں اردو، فارسی، حساب، جغرافیہ اور عربی کی کتابیں مولانا عبدالرحمن صاحب محدث مبارک پوری سے پڑھیں، پھر جامعہ فیض عام منونقل ہو گئے، وہاں کبار علماء سے تعلیم حاصل کی، پھر ۱۹۳۴ء میں دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں تیسری جماعت میں داخلہ لیا اور وہاں کے اساتذہ کرام کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

۱۹۳۹ء میں دارالحدیث رحمانیہ دہلی سے فارغ التحصیل ہوئے، فراغت کے بعد دو سال تجارت کی، پھر اپنے استاذ مولانا نذیر احمد صاحب املوی کے ایماء پر ۱۹۴۲ء میں املو میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی، اسی میں تدریسی خدمت انجام دینے لگے، پھر اس سے جدا ہو کر ۱۹۵۰ء میں مدرسہ دارالتعلیم میں مدرس ہوئے، دو سال اس میں مدرس رہے، اس

کے بعد مدرسہ احمدیہ درجہ نگہ بہار میں تدریسی خدمت انجام دی، اور وہاں سے شائع ہونے والے مجلہ ”الہدیٰ“ کی ادارت بھی فرماتے رہے، پھر جب جامعہ سلفیہ بنارس کا قیام عمل میں آیا تو جامعہ سلفیہ منتقل ہو گئے، اور وہاں مختلف ذمہ داریاں انجام دیتے رہے، مفتی و مدرس بھی تھے اور صوت الجامعہ (اردو) کے مدیر بھی تھے، پھر آپ مرض کا شکار ہوئے، چند دنوں گھر پر رہے، پھر جامعہ سلفیہ پہنچے، لیکن مرض میں افاقہ نہیں ہوا، مرض بڑھتا رہا، یہاں کہ ۶ مئی ۱۹۷۸ء کو بروز شنبہ صبح کے وقت اس دار فانی سے رحلت فرما گئے، نعش وطن لائی گئی، ایک جم غفیر نے نماز جنازہ میں شرکت کی، پھر اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

(ملخص از تذکرہ علمائے اہل حدیث مبارک پور ۱۳۳ تا ۱۳۹)

مولانا مختار احمد صاحب مبارک پوریؒ

مولانا مختار احمد ولد شکر اللہ صاحب مبارک پوریؒ محلہ علی نگر میں ۱۹۱۷ء کے حدود

میں پیدا ہوئے۔

پرورش نانہال پورہ رانی میں پائی، ان کے نانا غالباً عبد المجید صاحب متصل مدرسہ احیاء العلوم تھے، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں تعلیم پائی، اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند پہنچے اور دارالعلوم دیوبند سے فراغت ہوئی۔

چند ماہ احیاء العلوم میں فارسی کے مدرس رہے، پھر ولید پور ضلع منو کے مدرسہ میں استاذ ہوئے، پھر تدریسی سلسلہ ترک کر کے احمد آباد صوبہ گجرات کے عربی میل میں کام کرتے تھے، اور باپونگر میں قیام تھا، پھر ان کے ماموں قاضی محمد احمد صاحب نے بھیونڈی میں لوم لگوا یا تو ان کو احمد آباد سے بلا کر لوم کی دیکھ ریکھ پر مامور کیا، مولانا عبد الباری ولد مولانا حکیم

الہی بخش پورہ دولہن ان کے خاص دوستوں میں سے تھے۔

وفات سے پہلے وطن مبارک پور لوٹ آئے، بیمار رہنے لگے، یکم جون ۱۹۹۷ء کو بہ
عمر ۸۰ سال ۲ بجے دن میں وفات ہوئی، شاہ پنچہ حیدر آباد میں تدفین عمل میں آئی۔
(معلومات از رشید احمد مبارک پور و صغیر احمد بھونڈی)

الاستاذ محمد حسن صاحب الاعظمی الازہری

الاستاذ محمد حسن ولد امداد علی الاعظمی صاحب عمدہ شاعر، زبان و ادب کے مالک، تنظیمی
صلاحیتوں کے حامل، سینکڑوں کتابوں کے مصنف، نابغہ روزگار شخصیت، خود اعتمادی کے پیکر،
ایک عظیم داعی و صالح، نہایت ذہین و فطین، قلم کار، خوش آواز خطیب، عالمی تنظیم اتحاد العالم الاسلامی
کے بانی و صدر، پروفیسر جامعات قاہرہ، ازہر، پنجاب، جدید عربی کالج کے پرنسپل تھے۔

محلہ پورہ دیوان مبارک پور میں ۲۵ دسمبر ۱۹۱۸ء / ۲۲ ربیع الاول ۱۳۳۷ء میں پیدا
ہوئے، ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل
کی، پھر ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۹۳۰ء میں حصول تعلیم کے شوق میں گھر سے نکلے
تو سورت پہونچے، وہاں جامعہ سیفیہ (فاطمیہ) میں ملا رحمت علی کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ
کیا، وہاں آپ نے خصوصی طور پر اسلامی فرقوں کی بنیادی کتب اور ادیان عالم کا مطالعہ کیا۔

پھر بمبئی کو اپنی سرگرمیوں کا محور بنانا چاہا، لیکن حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے
اپنا قدم نہ جما سکے، پھر لاہور پہونچے، اس کو اپنا مستقر بنایا، کافی مدت تک وہاں قیام کیا، مگر
اپنے مقصود سے ہم کنار نہ ہو سکے، وہاں سے ناامید ہو کر حیدر آباد دکن پہونچے، وہاں بھی
ناکامی ہاتھ آئی، پھر شوقِ علم نے انھیں مصر پہونچا دیا، وہاں جامعہ ازہر میں علمی مدارج طے

کرتے ہوئے، قاہرہ کی مشہور یونیورسٹی کے پروفیسر ہو گئے، اور انھوں نے عربی زبان پر اس قدر دسترس حاصل کر لی کہ وہاں کے اخباروں اور ادبی رسالوں میں مقبول ہونے لگے، پھر بہت سی کتابیں تصنیف کیں، جو علمی حلقوں میں مقبول ہوئیں۔

استاذ محمد حسن کی بہت سی عربی تصانیف قاہرہ اور بیروت سے شائع ہوئیں، ۱۹۳۹ء میں حکومت مصر نے جامعہ ازہر کے ہزار سالہ جشن کے موقع پر مشہور فاطمی حاکم امیر تمیم کا دیوان شائع کیا، جسے استاذ مرحوم نے مرتب کیا تھا، پھر ۱۹۵۴ء میں مصر سے شائع ہوا، ان ہی کی جدوجہد سے شاہ فاروق کے دور میں جامعہ ازہر میں پہلی بار اردو زبان کی تعلیم جاری ہوئی، اور وہی اس کے پہلے پروفیسر تھے۔

استاذ ازہری نے اپنی سینکڑوں عربی اور اردو تصانیف کے ذریعہ اسماعیلی مذہب کو ستر سے ظہور میں لاکھڑا کیا، ان کی تصانیف میں ”المعجم الاعظم“ عربی اردو لغت اہم ترین تصنیف ہے۔

اس کے علاوہ عربی اردو لغت ۵ جلدوں میں اور اردو عربی لغت کئی جلدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

استاذ ازہری نے اپنی بعض تصانیف کے ذریعہ مصریوں کو ہندوستان کے تاریخی اور دیگر احوال سے باخبر کیا، پھر مصر کے حالات پر اردو میں کتابیں تصنیف کیں، تاکہ دونوں ملکوں کے باشندوں کے درمیان شناسائی اور دلچسپی ہو اور یہ دلچسپی ادبی اور تجارتی تعلقات کی ترقی کا زینہ بنے۔

آپ نے ایک کتاب فلسفہ اقبال پر بھی عربی میں لکھی ہے، جس کے ذریعہ مصر کے اہل علم طبقہ کو اقبال سے روشناس کرایا، اور دیگر چند تصانیف درج ذیل ہیں:

.....

الحیاء والموت فی فلسفۃ اقبال، حدیث الروح (ترجمہ شکوہ اور جواب شکوہ)، اللائی الاسلامیۃ الغالبیۃ من افکار اقبال وسعدی العالمیہ، فتی الہند وباكستان، كشیر جنۃ الارض، الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند وباكستان، الوحۃ فی الشرق، درر الفكاهات والحكايات، بحث فی الشیعۃ، اساس العربیہ، المكالمۃ العربیۃ، القواعد العربیۃ، الرسائل الاعظیۃ، المكاتب الاعظیۃ، القراءۃ الاعظیۃ، النخبۃ الاعظیۃ، القراءۃ القرآنیۃ، محاضرات عن مصر، آزاد مصر، آج كامصر، انقلابی مصر، حیات محمد عبدہ، شرعی پردہ اور مسلم خواتین، مبادی اللغۃ العربیۃ۔

ان خدمات کے علاوہ مصر اور دیگر اسلامی ممالک کے علماء اور ادباء کے تعاون سے ایک عالم گیر جماعت مصر میں قائم کی، جس کا نام الاخوة الاسلامیۃ ہے، جس کے آپ جنرل سکریٹری تھے، اس کے سابق صدور میں شیخ طنطاوی جوہری، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، جناب آفتاب اقبال فرزند اکبر شاعر مشرق علامہ اقبال تھے۔

اس تنظیم کا مرکز ۱۹۴۸ء میں بہ مشورۃ قائد اعظم محمد علی جناح کراچی منتقل کیا گیا، ۱۹۴۹ء کے اجلاس کے موقع پر مصلحتاً نام بدل کر مؤتمر العالم الاسلامی اختیار کر لیا گیا، بعد میں پھر اسے اتحاد العالم الاسلامی کے نام سے رجسٹرڈ کرایا گیا۔

استاذ ازہری نے مشرق وسطیٰ اور ترکی کا دورہ کر کے ہر ملک میں اس تنظیم کی شاخیں قائم کیں، ہندوستان سے منتقل ہونے کے بعد ۱۹۸۰ء میں ہندوستان کا پہلا تحقیقی دورہ کیا، جو ۶ نومبر سے ۱۵ جنوری کو محیط تھا، بوہروں کو ثابت قدم پا کر بہت مطمئن ہوئے، اس وقت آپ نے محلہ پورہ صوفی میں عبداللہ چیچر مین کے مکان پر قیام کیا تھا اور بعض اہل خاندان کو

لے کر پاکستان چلے گئے۔

دوسری بار ۱۹۸۸ء یا ۱۹۸۹ء میں ہندوستان آمد ہوئی، اس بار حاجی محمد خلیل گڑھست محلہ پورہ دیوان مبارک پور کے مکان پر تشریف لے گئے، اور حاجی صاحب مرحوم کے مہمان ہوئے، ڈاکٹر محمد حسن الاعظمی کی وفات کب ہوئی، تادم تحریر اس کا سراغ نہ لگ سکا۔
(انقلابی مصر، تذکرہ علمائے مبارک پور مع حذف و اضافہ)

مولانا مظفر حسن صاحب ظفر ادیبی

مولانا مظفر حسن بن شیخ محمد سعید انصاری بن شیخ محمد عبدالوہاب بن روشن بن خوش حال ابن لاہور صاحب مبارک پوری نامور خطیب و مقرر، باصلاحیت عالم دین اور اصحاب درس علماء میں سے تھے، اچھے شاعر بھی تھے، تواضع و خاکساری ان کی ہر اداسے ٹپکتی تھی۔
۲۰ دسمبر ۱۹۱۹ء کو مبارک پور کے ایک بڑے زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے، محلہ کے کسی گھر میں قرآن مجید پڑھا، پھر مدرسہ مصباح العلوم الشرعیہ پرانی بستی میں داخل کیے گئے، شرح مسلم، ملاحسن تک پوری و مجموعی کے ساتھ پڑھ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ چلے گئے، کچھ دنوں بغرض تعلیم ندوہ میں قیام رہا، پھر سرائے میر لوٹ کر مدرسۃ الاصلاح میں داخلہ لیا، وہاں بخاری شریف، مسلم شریف اور حجتہ اللہ البالغہ اور دیوان امراء القیس کے کچھ حصے پڑھے، لیکن طبعی اکتاہٹ آڑے آگئی اور بغیر سند فراغت لیے گھر واپس آ گئے۔

۱۹۵۰ء یا ۱۹۵۱ء میں مولانا عبدالعزیز صاحب مراد آبادی کے حکم پر مدرسہ اشرفیہ سے تدریسی زندگی کا آغاز کیا، اسی کے ساتھ ۱۹۵۳ء میں میدانِ خطابت میں قدم رکھا، خطابت کا آغاز مدرسہ شمس العلوم کریم الدین پور گھوسی کے جلسہ عید میلاد النبی کے سٹیج سے کیا۔

اس کے علاوہ چھوٹے بڑے بہت سے جلسوں سے خطاب کرتے رہے، ۲۲ سال تک تدریسی خدمات کے ساتھ تقریر و خطابت کا بھی مشغلہ جاری رہا۔

۱۹۷۱ء میں مدرسہ اشرفیہ میں بڑا ہیجان خیز انقلاب برپا ہوا کہ اس کی تیز و تند لہروں میں بہہ کر مدرسہ سے باہر آ گئے۔

مدرسہ سے علیحدگی کے بعد بڑے صبر آزما، اور حوصلہ شکن حالات سے گزرے، بچے زیر تعلیم تھے، معیشت کے لیے کسی ہنر سے واقف نہیں تھے، کھیتی باڑی نہیں کر سکتے تھے۔ آپ کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ہر مسلک و مذہب کے لوگوں سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔

آپ نے درس و تدریس، تقریر و خطابت کے علاوہ تصنیف و تالیف کی وادی کو بھی سبز و شاداب کیا ہے۔

(۱) اسلام کا نظریہ حیات و ممات (۲) حیاۃ بعد الممات (۳) ربوبیت الہیہ (۴) لفظ کملی کا شرعی و ادبی جائزہ وغیرہ شامل ہیں۔

۳۰ جنوری ۲۰۰۶ء کا دن گزار کر ۸ بجے شب میں اس جہان فانی سے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے، دوسرے دن آبائی قبرستان میں بعد نماز ظہر ۳ بجے سپرد خاک ہوئے۔

(اسلام کا نظریہ حیات و ممات ص ۹ تا ۱۳ مع اضافہ)

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اعظمی قریشی

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اعظمی قریشی قصبہ مبارک پور کے ایک دین دار گھرانے میں ۱۹۲۰ء کے اوائل میں پیدا ہوئے، پرائمری درجات کی تعلیم جامعہ عربیہ اہل العلوم

مبارک پور میں حاصل کر کے عربی تعلیم کے حصول کے لیے ۲/ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۵ھ میں مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور میں داخلہ لیا، فارسی اور ابتدائی عربی کی تعلیم کے بعد شوال ۱۳۵۹ھ میں مدرسہ مظہر اسلام بریلی میں داخل ہوئے، ایک سال بعد پھر مدرسہ اشرفیہ مبارک پور واپس آگئے اور یہیں سے ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء میں درس نظامی سے فراغت ہوئی، فراغت کے بعد ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۳ء تک مدرسہ انوار العلوم تلمیسی پور میں مدرس رہے۔

یکم مارچ ۱۹۵۲ء سے ۱۵/ اپریل ۱۹۵۸ء تک مدرسہ بنس العلوم گھوسی میں بہ حیثیت صدر المدرسین رہے۔

۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۱ء تک مدرسہ اشرفیہ میں مدرس و معلم رہے، ۲/ جون ۱۹۷۱ء کو انتظامیہ نے ناظم تعلیمات اور نائب ناظم کی خدمات آپ کے سپرد کیں۔ ستمبر ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۶ء تک ناظم اعلیٰ کے عہدہ پر فائز رہے، دورِ نظامت میں بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔

آپ اپنی قابلیت، استعداد، حسنِ انتظام وغیرہ میں منفرد شخصیت کے مالک تھے، بہترین مقالہ نگار بھی تھے، شروع شروع میں جب ماہ نامہ ”پاسبان“ الہ آباد سے نکلتا تو آپ کے مضامین پابندی کے ساتھ شائع ہوا کرتے تھے، مختلف کتابوں پر تقریظات و تصدیقات لکھیں، آپ نے جامعہ اشرفیہ میں ”شعبہ تحقیق فی الفقہ“ کا اضافہ کیا۔

پہلا جج ۱۹۷۱ء میں اور دوسری بار جج وزارت ۱۹۸۴ء میں کیا، تمام تر مصروفیات کے باوجود آپ کی قلمی کاوشیں جا رہی رہیں، ملک کے متعدد رسائل و جرائد میں آپ کی نگارشات شائع ہو چکی ہیں۔

مسئلہ توسل پر ایک کتاب الوسيلة السنية الى حضرة رب البرية تصنیف

کی، جو بریلوی مکتب فکر میں بہت مقبول و مشہور ہے۔

۷ / جمادی الاخریٰ ۱۴۱۱ھ / ۲۶ / ستمبر ۱۹۹۱ء کو بوقت شب چہار شنبہ انتقال کیا۔

(معلومات از ماہ نامہ اشرفیہ دسمبر ۱۹۸۰ء ص ۲۶۰ بہ واسطہ مولوی رضوان انور مصباحی)

تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہو: حیات حافظ ملت، مقدمہ فتاویٰ رضویہ

مولانا مطیع اللہ صاحب رحمانی

مولانا مطیع اللہ بن عبد العزیز بن اسماعیل بن عبد اللہ نور بان ملو کے دین دار و بااخلاق عالم شمار کیے جاتے تھے۔

۱۹۲۰ء میں ملو میں پیدا ہوئے، ابتدائی نوشت و خواند گھر پر ہوئی، پھر مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور میں اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالحدیث رحمانیہ کا رخ کیا۔

وہاں مولانا نذیر احمد صاحب ملوی اور مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی وغیرہما سے تعلیم حاصل کر کے فارغ التحصیل ہوئے، رسمی فراغت کے بعد مختلف مدارس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی، آخر کلمتہ کے تانتی باغ کی ایک مسجد میں بحیثیت خطیب ایک طویل عرصہ تک کام کیا، جب کمزوری بڑھ گئی، وطن واپس آ گئے اور وطن ہی کے ہو کر رہ گئے۔

آپ مدرسہ انوار العلوم کے نائب صدر، پھر صدر رہے، خوش دلی سے ملتے تھے، اور نرمی سے بات چیت کرتے تھے، وقتاً فوقتاً ملو کی جامع مسجد میں خطبہ جمعہ بھی دیا کرتے تھے۔

۱۶ / محرم الحرام ۱۴۱۱ھ / ۸ / اگست ۱۹۹۰ء کو بروز چہار شنبہ بعد نماز مغرب وفات ہوئی، دوسرے دن نماز جنازہ ادا کی گئی اور اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

(تذکرہ علمائے اہل حدیث مبارک پور ص ۱۴۱ تا ۱۴۲)

ملا محمد یونس شکیب اسماعیلی مبارک پوری

ملا محمد یونس شکیب بن ملا رحمت علی بن شیخ محمد علی اسماعیلی مبارک پوری اصلاح پسند بوہرہ جماعت کے سربراہوں میں بلند درجہ کے مالک اور مترجم و صحافی تھے، ان کے والد ابوالطیب ملا رحمت علی عربی زبان کے زبردست ادیب و شاعر اپنے مذہب کے جید عالم اور پیشوا تھے۔

ملا یونس کی ولادت ۲۱ مئی ۱۹۲۳ء کو ہوئی، انھوں نے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ سے عربی زبان کا درس لیا، پھر مدرسۃ الاصلاح سرانے میر، جامعۃ السیفیہ سورت گجرات میں تعلیم حاصل کی، انھیں عربی، اردو اور گجراتی زبان میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت تھی، کئی مذہبی کتابوں کے مصنف تھے، انھوں نے اسماعیلی مذہب کی اہم اور بنیادی کتاب دعائم الاسلام کو پہلی بار اردو اور گجراتی زبان کا لباس پہنایا۔

”ادارۃ ادبیات فاطمی“ کے نام سے ان کا ایک ادارہ بھی تھا، جو ان کی کتابوں اور دوسری مذہبی کتابوں کی اشاعت کے لیے وجود میں آیا تھا۔

غزل، نوحہ اور نعت کہتے تھے، کئی جگہ علمی و دینی خدمات انجام دینے کے بعد آخر میں تصنیفی و تبلیغی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے افریقی ملک مارشیش میں اقامت گزریں رہے، انتقال سے چند روز پہلے وطن مبارک پور آ گئے تھے، ۲ جون ۱۹۹۷ء کو مبارک پور میں وفات ہوئی۔ (مقدمہ مئے طہور ص ۴۶ تا ۴۷، تذکرہ علمائے مبارک پور ۷۹ و ۸۰)

مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب مبارک پوری

مولانا قاری محمد یحییٰ بن محمد بشیر بن حاجی نعمت اللہ بن عبد اللہ صاحب مبارک پوری محلہ پورہ رانی مبارک پور کے باشندہ تھے، اپنی جماعت میں باکمال مدرس، بے مثال مجتہد مانے جاتے تھے، ساتھ ہی متقی و پرہیزگار عالم دین اور قابل فخر شمار کیے جاتے تھے۔

۹ اگست ۱۹۲۴ء / ۸ محرم الحرام ۱۳۴۴ھ شنبہ کو پیدا ہوئے، ناظرہ کی تعلیم میاں جی ولی محمد سے حاصل کی، پرائمری درجات کی تعلیم مدرسہ اشرفیہ لطیفہ پورہ رانی میں حاصل کی، عربی کی تعلیم جامعہ اشرفیہ میں حاصل کر کے ۱۳۶۶ھ میں فارغ التحصیل ہوئے۔

نہایت ذہین و فطین بڑی سوجھ بوجھ کے مالک تھے، ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۸ء تک جامعہ اشرفیہ کے ناظم اعلیٰ رہے، پھر صدر منتخب ہوئے، آپ کے دورِ نظامت میں الجامعۃ الاشرفیہ کے لیے تقریباً ۴۰ ہیکٹرز زمین خریدی گئی، آپ نے اپنی تنظیمی صلاحیتوں سے جامعہ اشرفیہ کو ترقی دی اور تاحیات مرکزی جامع مسجد راجہ مبارک شاہ کے امام و خطیب رہے۔

۱۵ مئی ۱۹۹۶ء / ۲۶ رذی الحجہ ۱۴۱۶ھ چہار شنبہ کو صبح ساڑھے چار بجے انتقال کیا، بعد نماز مغرب سمودی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

(معلومات از اسلم نظامی صاحب مع حذف و اضافہ)

مولانا محمد عمر سیفی الاعظمی ابراہیم پوری

مولانا محمد عمر سیفی بن حاجی محمد رفیع الاعظمی ابراہیم پوری ضلع اعظم گڑھ کے مشہور شاعر، قلم کار ادیب و صحافی تھے، بڑے زود نگار، اور خوش گو شاعر تھے، علامہ کیفی چریا کوٹی

کے دبستان شاعری سے اکتساب فن کیا تھا۔

یکم جنوری ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے، آپ کے والد صاحب کلکتہ میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے، انھوں نے دوشادیاں کی تھیں، سیفی صاحب کی والدہ کلکتہ ہی کی تھیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں ہی کے مدرسہ فیض العلوم میں حاصل کی، اور عربی و فارسی کی تعلیم اپنے دیار کے مشہور مدرسہ جامعہ عربیہ احياء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، اس زمانہ میں اس چشمہٴ علم سے حضرت مولانا عبدالغنی صاحب بارہ بنکوئی، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری اور حضرت مولانا شمس الدین صاحب الحسینی وغیرہم کا فیض جاری تھا۔ سیفی صاحب نے شاعری کی ابتدا کی تو اپنے والد محترم سے اصلاح لی، پھر مؤرخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری سے اصلاح لینے کا سلسلہ شروع کیا، آخر میں علامہ محمد مبین صاحب چریا کوٹی سے شرف تلمذ حاصل کیا، اور شعر و شاعری کی دنیا میں بہت آگے بڑھے۔

سیفی صاحب نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا، صحافت کا اچھا تجربہ بھی حاصل ہوا، مختلف مقامات سے مختلف اخبارات کا اجرا کیا، انھیں میں سماوات بھی شامل ہے، مگر ان اخبارات کی عمر زیادہ نہیں ہوئیں۔

ذریعہٴ معاش کے سلسلہ میں مختلف مقامات پر رہے، درس و تدریس سے وابستہ رہے، آخر میں جامعہ عربیہ احياء العلوم مبارک پور کے شعبہٴ پرائمری کی تدریس سے منسلک ہو گئے تھے، کئی سالوں تک اس سے وابستہ رہے، اس دوران راقم الحروف کی سیفی صاحب سے ملاقات ہوتی رہی، اور اپنے بعض مضامین کی اصلاح بھی لیتا رہا، مگر کسے معلوم تھا کہ سیفی

صاحب جلد ہی تدریس سے معذور ہو جائیں گے، اور اصلاح ورہ نمائی کی مزید تمنا دل میں چھپی کی چھپی رہ جائے گی۔

سیفی صاحب وفات سے چند سالوں پہلے جامعہ کی تدریسی خدمت سے مستعفی ہو گئے تھے، یہاں تک کہ وقت موعود آ پہنچا اور ۲۲ مارچ ۲۰۰۲ء کو اس دارِ فانی سے دارِ باقی کی طرف کوچ کر گئے۔ (معلومات از مولانا قمرالزماں صاحب مبارک پوری مع اضافہ)

مولانا قاری محمد زبیر صاحب مبارک پوری

مولانا قاری محمد زبیر بن محمد اسحاق بن محمد ابراہیم بن عبد السبحان بن عبد الرحمان صاحب مبارک پوری، ترجمان اہل حدیث کے مدرسہ دارالتعلیم کے شیخ الحدیث اور ساتھ ہی ساتھ اچھے کاتب و خوش نویس بھی تھے۔

یکم اکتوبر ۱۹۳۷ء کو محلہ پورہ صوفی میں ولادت ہوئی، ۱۹۴۶ء میں دارالتعلیم میں داخل ہوئے، سات سال رہ کر قرآن مجید، پرانہری درجات، فارسی اور ابتدائی عربی کی تعلیم حاصل کی، پھر جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں داخلہ لیا، اور تین سال رہ کر عربی زبان و قواعد، صرف و نحو اور دیگر فنون سے اپنے دامن کو بھرا، دورانِ تعلیم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی صاحب مرعاة المفاہج سے بلوغ المرام اور نخبة الفکر پڑھی، پھر دارالعلوم احمدیہ سلفیہ در بھنگہ میں عربی چہارم میں داخل ہوئے، لیکن سخت بیمار ہو کر صرف میں گھر لوٹ آئے، پھر مدرسہ فیض عام منو میں ربیع الاول میں عربی سوم میں داخلہ لیا، یہاں سات سال رہے، عربی زبان و ادب، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ کی تعلیم حاصل کی، اور جنوری ۱۹۶۰ء میں رسمی فراغت ہوئی، دارالعلوم منو میں قرأت سبعہ پڑھا اور اپنے وطن مبارک پور

میں مولوی قاری عبدالحی مبارک پوری سے قرأت عشرہ پڑھا۔
نیز الہ آباد بورڈ کے امتحانات بھی دیئے، جامعۃ الملک سعود ریاض میں تدریس المعلمین
کا کورس ۱۹۸۷ء میں مکمل کیا۔

غالباً تدریسی زندگی کا آغاز ۱۹۶۱ء میں مدرسہ سبل السلام دہلی سے کیا، دو سال ابتدائی
عربی درجات کی تعلیم دی، پھر ۱۹۶۳ء سے مدرسہ جامع اعظم بلیماران دہلی میں ۱۲ سال تک
صدر المدرسین رہے، پھر مدرسہ ریاض العلوم دہلی میں بحیثیت شیخ الحدیث ۳ سال درس و افادہ
میں مشغول رہے، پھر مدرسہ دارالتعلیم مبارک پور میں ۱۹۷۶ء سے بحیثیت شیخ الحدیث تدریسی
خدمات میں منہمک رہے، ۲۰۰۶ء میں ریٹائر ہو کر خدمات سے سبکدوش ہو گئے۔

دہلی میں کئی برس خطابت، ملک کے مختلف مقامات پر دعوتی پروگراموں میں شرکت،
جامعۃ الملک سعود کے مسابقہ قرآن میں شرکت اور اول نمبر سے کامیابی اور انعام یافتگی۔
۱۹۸۰ء میں پہلی مرتبہ سفر حج، پھر دوبارہ ۱۹۹۰ء میں مع اہلیہ حج و عمرہ کی ادائیگی، درس
و تدریس کے ساتھ مسلسل تصنیف و تالیف میں لگے رہے، اور متعدد کتابیں تصنیف کیں، دعاء
محمدی، وظائف نبوی، مختصر سوانح امام بخاری، جامع الترمذی کی مختصر شرح معارف الترمذی وغیرہ۔
آخر الذکر تصنیف ہمارے کتب خانہ میں موجود ہے، کیوں کہ قاری صاحب راقم
الحروف کے والد محترم مولانا جمیل احمد صاحب مدنی کے ہم درس تھے، اور والد صاحب کو بطور
ہدیہ عنایت فرمائی تھی۔

مدرسہ دارالتعلیم سے ریٹائر ہونے کے بعد کچھ دنوں پرائیویٹ طور پر درس
و تدریس کی خدمت انجام دی، مگر عمر کے تقاضا، بڑھتے ہوئے ضعف، اور آنکھ کی بینائی کی
کمزوری نے آپ کو ترک تدریس پر مجبور کر دیا۔

دھیرے دھیرے مرض بڑھتا گیا، علاج و معالجہ سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، آخر وقت موعود آگیا، ۱۳ جنوری ۲۰۱۱ء / ۱۴۳۲ھ بروز جمعرات صبح ساڑھے آٹھ بجے اپنے رب حقیقی سے جا ملے۔

اسی دن بعد ظہر شیخ الحدیث عبید اللہ صاحب رحمانی کے صاحب زادے مولانا عبدالعزیز صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ کی امامت میں ہزاروں سوگواروں نے نماز جنازہ ادا کیا اور اپنے آبائی قبرستان ”شاہ کا پنچہ“ میں تدفین عمل میں آئی۔

(تذکرہ علمائے اہل حدیث مبارک پور ص ۹۲ تا ۹۴ مع حذف و اضافہ)

مولوی محمد ناصر قاسمی

مولوی محمد ناصر بن محمد حسین بن محمد قاسم دادا کی نسبت سے قاسمی کہے گئے، ۲۶ فروری ۱۹۳۲ء کو مبارک پور میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ باب العلم میں حاصل کی، پھر اپنے تایا زاد بھائی مولوی سبط حسن مرحوم کے ساتھ لکھنؤ گئے، اور سلطان المدارس میں داخل ہوئے، پھر مدرسہ جواد یہ بنارس میں تعلیم حاصل کر کے فخر الافاضل کی سند لے کر فارغ ہوئے۔

مولانا ڈاکٹر محمد یحییٰ صاحب بمہوری

مولانا ڈاکٹر محمد یحییٰ بن حافظ محمد یسین بن عبداللطیف بن خدا بخش بن علی بخش بمہوری ۱۹۳۴ء میں موضع بمہور میں پیدا ہوئے۔

آپ کے والد حافظ محمد یسین صاحب بہت ہی نیک اور صوفی صفت انسان تھے۔

.....

آپ کی ابتدائی تعلیم بمہور میں ہوئی، اس زمانہ میں ماسٹر نصیر احمد اور مولوی محمد انیس صاحب مکتب مدرسۃ الاسلام میں مدرس تھے، ان حضرات سے آپ کو شرفِ تلمذ حاصل ہوا، بمہور سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جامعہ عربیہ اہیاء العلوم مبارک پور پہنچے، جسے دیارِ مشرق میں ام المدارس کی حیثیت حاصل ہے، پھر وہاں سے مزید علمی پختگی اور دینی بصیرت اور اکابر اساتذہ کرام سے شرفِ تلمذ کے شوق نے آپ کو مظاہر علوم سہارن پور پہنچا دیا، اور وہیں سے آپ نے سندِ فراغت حاصل کی۔

دینی تعلیم کے ساتھ آپ نے عصری تعلیم جو نیز ہائی اسکول الملو مبارک پور سے حاصل کی، اور الہ آباد یونیورسٹی سے طب میں اختصاص اور اس کی سند حاصل کی، اور کئی سالوں تک مہراج گنج ضلع اعظم گڑھ اور مبارک پور میں پریکٹس کی، لیکن فکرِ معاش نے یکسوئی کے ساتھ مطب چلانے کی فرصت نہیں دی، بالآخر ۱۹۶۸ء میں بمبئی تشریف لے گئے، اور سپاری وغیرہ کی تجارت سے منسلک ہو گئے، اخیر میں لوہے کی تجارت شروع کی۔

دنیاوی مشاغل و تجارت کے ساتھ آپ کا تعلق دینی جامعات اور اداروں سے بہت گہرا رہا، ان کے تعاون میں پیش پیش رہتے تھے، حتیٰ کہ معاشی تنگی میں مبتلا ہوتے، تب بھی ان کی اعانت و امداد سے ہاتھ نہیں کھینچتے تھے۔

جامعہ رشیدیہ بمہور کے فاونڈر ممبر تھے، جب موضع بمہور میں ۱۹۸۶ء میں جامعہ رشیدیہ کی بنیاد کا پروگرام طے ہوا، اور اس کی تعمیر کے لیے الحاج شمس الدین صاحب بمہوری نے آپ سے اعانت و امداد کے لیے ۱۵ ہزار کا مطالبہ کیا تو آپ نے بے چوں چراں قبول کر لیا، حالانکہ اس وقت آپ کے کاروبار کا بٹوارہ ہوا تھا، کل ۱۰ ہزار روپے کی پونجی بچی تھی۔

۱۹۹۸ء میں بغرض علاج فوزیہ اسپتال میں داخل کیے گئے، اور ۶ ستمبر ۱۹۹۸ء /

۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۹ھ بروز یکشنبہ ساڑھے چار بجے شام میں ہمیشہ کے لیے دار بقا کو کوچ کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون (ماخوذ از مقالہ مولانا ارشاد الحق صاحب مہتمم جامعہ رشیدیہ بمہور)

حضرت مولانا محمد مسلم صاحب بمہوریؒ

حضرت مولانا محمد مسلم بن مولوی محمد الیاس اصلاحی بن حاجی محمد سلیمان صاحب بمہوریؒ باصلاحیت عالم دین، بہترین مربی و معلم تھے۔

۱۳۵۵ھ / ۱۹۳۶ء کے حدود میں ولادت ہوئی، ایک علمی گھرانے میں آنکھیں کھولیں، ابتداءً اپنے نانیہال بلریا گنج میں مڈل تک تعلیم حاصل کی، پھر عربی کا ذوق و شوق پیدا ہوا تو اپنے علاقہ کے مشہور و معروف مدرسہ جامعہ عربیہ اہیاء العلوم مبارک پور میں داخل ہوئے، ۱۹۵۶ء میں عالمیت کی تکمیل کی، جامعہ میں جن باکمال اساتذہ کرام سے اپنی علمی پیاس بجھائی، ان میں حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوریؒ، حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوریؒ، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پوریؒ، حضرت مولانا محمد عثمان صاحب ساحر مبارک پوریؒ، حضرت مولانا عبد المنان صاحب باسو پاریؒ وغیرہم شامل ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے ۱۹۵۷ء میں دارالعلوم دیوبند پہنچے، ۱۹۵۸ء میں دورہ حدیث کی تکمیل کی، بخاری شریف حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادیؒ سے جو اسی سال بحیثیت شیخ الحدیث دارالعلوم تشریف فرما ہوئے تھے اور دیگر کتب حضرت علامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب بلند شہری، حضرت مولانا فخر الحسن صاحب مراد آبادی، حضرت مولانا محمد حسین صاحب (ملا بہاری) رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم سے پڑھیں۔

فراغت کے بعد تدریسی زندگی کا آغاز دارالعلوم منٹو سے کیا، دو سال بڑی جانفشانی سے تعلیمی و تربیتی خدمات میں مصروف رہے، اس دور ہی میں آپ کی تدریسی و تربیتی کمال کا اعتراف کیا گیا۔

۱۹۶۰ء میں اپنے مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں بحیثیت استاذ عربی منتخب کیے گئے، ۹ سال تک نہایت یکسوئی و انسہاک کے ساتھ طلبہ عزیز کی تعلیم و تربیت میں لگے رہے، یہ آپ کی تدریس کا تابناک دور تھا، پھر ایسے حالات پیدا ہوئے کہ مادر علمی کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے۔

۱۹۶۹ء میں اپنی تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں کا مرکز جامع الشرق (بڑی مسجد) جون پور کو بنایا، دیکھتے ہی دیکھتے تن مردہ میں روح دوڑ گئی، اطراف و اکناف سے طلبہ امنڈ پڑے۔ آپ کی مخلصانہ جدوجہد سے مدرسہ قرآنیہ عروج و ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا کہ مسجد اور مدرسہ کی انتظامیہ میں کش مکش شروع ہو گئی، جو ختم ہونے کے بجائے بڑھتی رہی، پھر ایسے حالات پیدا ہوئے کہ اسے بھی الوداع کہنا پڑا۔

پھر جامعہ حسینیہ کی تعمیر و ترقی میں لگ گئے، جو ابتداءً لال دروازہ مسجد تھی، اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا، اور اپنی محنتوں سے اسے پروان چڑھایا، اس کی تعمیر و ترقی ایک حد کو پہنچی کہ ایسے حالات رونما ہوئے کہ اسے بھی بہ حکم اکابر چھوڑنا پڑا۔

کچھ دنوں جمعیتہ علماء دہلی کے دفتر میں کام کیا، پھر اپنے گاؤں میں مدرسہ کے قیام کی فکر ہوئی، جناب الحاج شمس الدین صاحب بمہورئی کے تعاون و توجہ سے آپ کی سرکردگی میں ۹ ستمبر ۱۹۸۶ء کو جامعہ رشیدیہ کا قیام عمل میں آیا، آپ اس کے مہتمم منتخب کیے گئے، پھر اس جدید مدرسہ کی تعمیر و ترقی میں جٹ گئے، دیکھتے ہی دیکھتے جامعہ رشیدیہ کی نہایت دیدہ

زیب عمارت کھڑی کر دی، جو آج بھی پورے آب و تاب سے رواں ہے۔

مولانا طبیعت اور قلب کے نہایت مضبوط انسان تھے، فیصلہ کرتے تو بہت سوچ کر، جو فیصلہ کر لیتے، اس سے ہٹنے کا تصور نہیں تھا، غالباً ۱۹۸۴ء میں آپ کو حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی، آپ پوری لگن و توجہ سے جامعہ رشیدیہ کی ہمہ جہت تعمیر و ترقی میں مصروف تھے کہ ۱۳ جولائی ۱۹۹۳ء کو آپ پر فالج کا حملہ ہوا، شہر اعظم گڑھ کے اسپتال میں داخل کیے گئے، حالت نازک تھی، ڈاکٹروں کے مشورے سے میڈیکل کالج لکھنؤ میں داخل کیے گئے، علاج کارگر نہ ہوا، ۲۰ جولائی ۱۹۹۳ء کو زندگی کا یہ مسافر عالم آخرت کا راہی ہو گیا، دوسرے دن ساڑھے دس بجے دن میں نماز جنازہ ادا کی گئی، اس میں ضلع اعظم گڑھ اور منو کے بہت سے مدارس کے ذمہ داران، اساتذہ کرام اور طلبہ عزیز شریک تھے، اپنے آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: اکابر احیاء العلوم حصہ دوم ص ۵۸ تا ۱۸۶ و تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص ۵۷ تا ۵۸)

مولوی محمد رضوان الحسین مبارک پوری

۱۳۵۸ھ / یکم ستمبر ۱۹۳۸ء کو اپنے وطن محلہ شاہ محمد پور مبارک پور میں پیدا ہوئے، والد کا نام کلب حسن تھا، جو مبارک پور کی شیعہ قوم میں جانی پہچانی اور سربرآوردہ شخصیت کے حامل تھے۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ باب العلم پورہ دلہن میں حاصل کی، پھر مولوی سید ظفر الحسن وغیرہ کی سرپرستی میں اخذِ علم کیا اور جامعہ جواد یہ میں فخر الافاضل کی اعلیٰ سند امتیازی نمبروں سے حاصل کی۔

کسبِ علم کا جذبہ اور شوق انھیں مدرسۃ الواعظین لکھنؤ لے گیا، وہاں اپنے دامن کو علم و فن سے بھرا، اور ”واعظ“ کی سند پائی۔

آپ کی شادی وطن کے مشہور عالم علی حماد کی صاحبزادی سے ہوئی، ان کے بطن سے ایک لڑکی اور تین لڑکے پیدا ہوئے۔

۲۰ سال ہندوستان کے مختلف صوبوں میں تبلیغ مسلک کرتے رہے، پھر گجرات میں موضع احمد آباد کو اپنا مرکز بنایا، جہاں درس و تدریس اور امامت نماز کرتے رہے، اپنی حیات کے آخری سالوں میں وطن واپس آ گئے، اور اہل و عیال سمیت مستقل طور پر وطن میں قیام کیا، شیعہ جامع مسجد محلہ شاہ محمد پور کے امام جمعہ و جماعت تھے، جسم نہایت دبلا پتلا تھا، مگر عزم و حوصلہ بے حد قوی تھا، مدرسہ باب العلم کے دوبار صدر منتخب ہوئے۔

۱۳ شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ / ۲۹ ستمبر ۲۰۰۴ء کو رجب شب میں انتقال ہوا۔

(شجرہ طیبہ ص ۶۶ تا ۷۱)

مولانا مسرور حسن مجیدی قسمی

مولانا مسرور حسن ولد مولوی حکیم عبدالمجید ولد علی احمد محلہ پرانی بستی بکھری میں یکم اپریل ۱۹۴۵ء کو پیدا ہوئے۔

صدر الافاضل کی سند حاصل کی، ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۰ء تک الواعظ کے مدیر رہے، ہر ماہ ادارہ کے علاوہ مضامین لکھتے تھے اور دیگر تالیف و ترجمہ کی طرف بھی توجہ رہتی تھی، اسی زمانہ میں مدینہ یونیورسٹی کے پروفیسر المحسن العباد کا شہرہ آفاق مضمون عقیدۃ اہل السنۃ والاثر فی مہدی المنتظر کا اردو ترجمہ کیا، جو ماہ نامہ ”الواعظ“ میں قسط وار شائع ہوا ہے۔

۱۹۸۳ء میں جب سازمان تبلیغات اسلامی ایران سے وابستہ ہوئے تو ادارہ کے ذمہ داروں کی خواہش پر بہت سے مضامین کے اردو ترجمے کیے، نیز بہت سی کتابوں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا، ان کی چند تصانیف و ترجمے کے نام یہ ہیں:

- (۱) انقلاب اسلامی اور اقوام عالم کا مستقبل (ترجمہ) (۲) رئیس مذہب شیعہ امام جعفر صادق (ترجمہ) (۳) فلسفہ اخلاق شہید مطہری (ترجمہ) (۴) حق و باطل شہید مطہری (۵) انسان و دین شہید مطہری (۶) تلخیص ارنج المطالب (۷) تحفہ سجاد یہ (۸) ہدیہ مجیدیہ (۹) زیارت قبور مومنین (۱۰) العرفان فی تفسیر القرآن (جلد اول تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم) (۱۱) فیضان الہیہ فی شرح خطبہ شعبانیہ (۱۲) یادداشت و شخصیات (۱۳) قرآن مکرم اور ہم (۱۴) نغمہ ونوحہ (مجموعہ کلام) (۱۵) قلم اپنا (مجموعہ مضامین)۔ ان کے علاوہ ان کے خطبات بھی ”خطابات و خطبات“ کے نام سے زیر طبع تھے۔

حکومت ایران کی طرف سے افریقہ اور دیگر بیرونی ممالک میں مبعوث تھے، کامٹی کسی پروگرام میں شرکت کے لیے آئے تھے، وہیں اچانک ۱۳ ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ / یکم دسمبر ۲۰۰۹ء کو قبل طلوع فجر انتقال کیا، ان کی نعش مبارک پور لائی گئی، دوسرے روز ۱۴ ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ / ۲ دسمبر ۲۰۰۹ء کو ۴ بجے شام میں اونچی تکیہ پر تدفین عمل میں آئی۔ (شجرہ طیبہ ص ۸۸، مجید البیان ۴۳ تا ۴۵ مع اضافہ)

مولانا محمد ہارون صاحب نعمانی ابراہیم پوریؒ

مولانا محمد ہارون ولد حاجی محمد علی سردار نعمانی ضلع اعظم گڑھ کے موضع ابراہیم پور کے سرگرم عالم تھے۔

۲ فروری ۱۹۴۷ء کو پیدا ہوئے، والد صاحب پنچایتی آدمی تھے، پورے ابراہیم پور کی پنچایت کو حل کرتے تھے، اس لیے سردار کہے جاتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں کے مدرسہ فیض العلوم میں حاصل کی، پھر اپنے دیار کے مشہور و معروف مرکزی مدرسہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں درجہ فارسی سے دورہ حدیث تک کی تعلیم حاصل کی۔

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں جن اساتذہ کرام کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، ان میں حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا بشیر احمد صاحب مبارک پوری، حضرت مولانا شکر اللہ صاحب ولید پوری، حضرت مولانا زین العابدین صاحب معروفی، حضرت مولانا عبد المنان صاحب باسو پاری، حضرت مولانا محمد عثمان صاحب معروفی اور حضرت مولانا جمیل احمد صاحب مبارک پوری رحمہم اللہ تعالیٰ شامل ہیں۔

۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء میں فارغ التحصیل ہوئے، فراغت کے بعد اس زمانہ کے جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا عبد الباری صاحب قاسمی کے حکم پر تقریباً ایک سال تک جامعہ کے مبلغ رہے، پھر درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا، اسی ارادہ سے آنوک پہونچے، وہاں کے مدرسہ میں تقریباً ڈھائی سال تک تدریسی خدمت انجام دی، پھر اپنے گاؤں سے قریب محمد آباد کے مدرسہ ضیاء العلوم سید واڑہ آگئے، وہاں ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۲ء تک ۵ سال تعلیم کے ساتھ وہاں کے ناظم جناب عبد المجید صاحب مرحوم کے ساتھ مالی فراہمی میں مسلسل کوشاں رہے، پھر نہ معلوم کن اسباب کی بنا پر ضیاء العلوم کی تدریس ترک کر کے اپنے گاؤں ابراہیم پور آگئے، کچھ دنوں گھر کے کام کاج میں مصروف رہے۔

۱۹۸۴ء کے زمانہ میں آپ کے وطن موضع ابراہیم پور کے اتر محلہ میں بدست ابوالماثر حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب الاعظمی ایک مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا، جس کا

نام مدرسہ مظہر العلوم تجویز ہوا تو اتر محلہ کے بااثر لوگوں نے آپ کو ناظم اعلیٰ منتخب کر کے مدرسہ کی ذمہ داری سونپ دی، ۱۶/۱۷ سال تک بحیثیت ناظم اعلیٰ مدرسہ مظہر العلوم خدمت پیہم کرتے رہے، اس کے علاوہ تمام ملی و سماجی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور سے ہمدردی اور تعاون ان کا مسلسل جاری رہا، زندگی کے آخری دو سالوں میں علیل رہتے تھے، اسی علالت میں ۶ جنوری ۲۰۱۱ء کو آٹھ بجے شب میں انتقال کیا، اور دوسرے دن بعد نماز ظہر نماز جنازہ ادا کی گئی، اور اتر محلہ کے قبرستان چھوٹی باغ میں سپرد خاک کیے گئے۔ رَحِمَهُ اللّٰهُ رَحْمَةً وَّاسِعَةً
(معلومات از مولوی مفتی عین الہدی صاحب قاسمی مع حذف و اضافہ)

مولانا محمد عامر صاحب مبارک پوری

مولانا محمد عامر بن حاجی محمد خلیل بن رحمت علی صاحب قاسمی، مبارک پوری نہایت سیدھے سادے اور متواضع زندگی کے مالک تھے اور بہت سی خوبیوں کے حامل تھے۔
۲۲ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۶ھ / ۱۴ مئی ۱۹۴۷ء کو محلہ پورہ دہن مبارک پور کے ایک دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔

قد میانہ، ہلکا بدن، رنگ صاف اور حسن سے بھرا ہوا تھا، چہرہ سے متانت و سنجیدگی ٹپکتی تھی، پورے چہرے پر ہلکی گھنی داڑھی تھی، جاڑے کے دنوں میں شیروانی اور پانچامہ پہن کر اور رومال اوڑھ کر مدرسہ جاتے تھے، اور ہر ایک سے سلام کرتے تھے، امیر و غریب کی تفریق نہیں ہوتی تھی، سلام کرنے میں پہل کرتے تھے۔

والد محترم حاجی محمد خلیل صاحب بڑے نیک اور صالح بزرگ تھے، فارسی اور عربی کی تعلیم متوسطات تک جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، آپ کے اساتذہ

میں حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب رسول پوریؒ، حضرت مولانا محمد عثمان صاحب سائر مبارک پوریؒ وغیرہ شامل ہیں۔

۱۳۸۸ھ/۱۹۶۸ء میں دارالعلوم دیوبند پہونچے اور بخاری شریف اول حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادیؒ سے، بخاری شریف ثانی حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ سے، مسلم شریف حضرت مولانا شریف الحسن صاحب دیوبندیؒ سے، جامع ترمذی اور شمائل ترمذی حضرت مولانا فخر الحسن صاحب سے، ابوداؤد شریف حضرت مولانا عبدالاحد صاحب دیوبندیؒ سے، نسائی شریف حضرت مولانا حسین احمد بہاریؒ سے، ابن ماجہ شریف حضرت مولانا اسلام الحق صاحب اعظمیؒ سے، موطا امام مالک حضرت مولانا نصیر احمد خاں صاحب بلندی شہریؒ سے، موطا امام محمد حضرت مولانا محمد نعیم صاحب دیوبندیؒ سے اور طحاوی شریف حضرت مولانا انظر شاہ صاحب کشمیریؒ سے پڑھ کر دورہ حدیث شریف کی تکمیل کی۔

دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء میں دارالعلوم فاروقیہ کوری لکھنؤ میں استاذ ہوئے، پھر وطن لوٹ آئے۔

آپ جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے استاذ بھی رہے، رکن مجلس شوریٰ بھی ہوئے، پھر تاحیات جامعہ کے نائب ناظم رہے۔

آپ مینارہ جامع مسجد (خالد بن ولیدؓ) پورہ دلہن کے امام تھے، پنج گانہ نماز کی بڑی مستعدی سے امامت فرماتے تھے، اس میں تخلف نہیں ہوتا تھا، اسی کے ساتھ بااخلاق اور پاک باطن تھے، تلاوت قرآن کریم میں ممتاز تھے۔

۸/شوال ۱۴۰۳ھ/۳۰/جولائی ۱۹۸۲ء کا جمعہ کا دن گزار کر مختصر علالت کے بعد انتقال فرما گئے، تدفین شیشم والی باغ محلہ پورہ دلہن میں ہوئی، اس وقت آپ کی عمر ۵۳ سال تھی۔ (اکابر احیاء العلوم حصہ دوم ص ۱۹۰ تا ۱۹۲ مع اضافہ)

مولانا مقبول احمد صاحب رحمانی

مولانا مقبول احمد صاحب موضع بہور کے غیر مقلد عالم تھے، خاموش طبیعت، نام و نمود سے یکسو شخصیت کے مالک تھے، تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا۔

دارالحدیث رحمانیہ سے فارغ تھے، رسمی فراغت کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا یا نہیں؟ علم نہیں ہو سکا، مسلسل ایک طویل مدت تک مدراس اور بمبئی وغیرہ کی طرف سے دعوت و تبلیغ اور امامت و خطابت جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی میں لگے رہے۔

قرب و جوار میں بھی دعوت و تبلیغ کا کام کیا کرتے تھے اور خطبہ جمعہ بھی دیا کرتے تھے، ایک کتاب ”دعاء المقبول“ کے نام سے لکھی تھی، جس میں روزمرہ کی دعائیں درج ہیں۔ گم نامی کی زندگی بسر کی، بہور میں آپ کی وجہ سے ترک تقلید کا سلسلہ باقی ہے، اور آپ کی اولاد و احفاد غیر مقلد ہیں، اور وہیں پرسکونت پذیر ہیں۔

آپ کا انتقال ۲۴ مئی ۲۰۰۷ء بروز جمعرات ۱۰ ربیعہ دن میں ہوا، اسی روز بعد نماز مغرب نماز جنازہ ادا کی گئی اور اپنے آبائی قبرستان سپرد خاک کیے گئے۔

(تذکرہ علمائے اہل حدیث مبارک پور ص ۱۴)

مولوی محمد یوسف صاحب مبارک پوری

مولوی محمد یوسف بن حافظ عبدالرحیم بن شیخ خدا بخش صاحب مبارک پوری محلہ پورہ رانی کے باشندہ، اور مولانا محمد حنیف صاحب رہبر صاحب مقام الحدید کے علاقائی بھائی تھے۔

ان کے والد حافظ عبدالرحیم صاحب کی پہلی زوجہ محترمہ ہمشیرہ مولانا شکر اللہ صاحب مبارک پوری سے مولانا محمد حنیف صاحب رہبر پیدا ہوئے، ابھی چھوٹے ہی تھے کہ والدہ مکرمہ کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا تو حافظ عبدالرحیم صاحب نے دوسری شادی کی، جن

سے مولانا محمد یوسف صاحب پیدا ہوئے، تاریخ ولادت کا علم نہیں ہو سکا، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں تعلیم حاصل کی اور اسی سے فارغ التحصیل بھی ہوئے۔ فراغت کے بعد چھوٹی مسجد ارچنٹی کی دکان میں ریشم کی تجارت شروع کی اور اسی سے وابستہ رہے، ان کی دکان علماء کی مجلس تھی۔

۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ / ۱۰ دسمبر ۱۹۸۸ء کو پورہ رانی میں وفات ہوئی، تدفین سمودی قبرستان میں ہوئی۔

مولانا محمد داؤد صاحب مبارک پوری

ابراہیم پور کے باشندے تھے، ترک وطن کر کے قصبہ مبارک پور کے محلہ پورہ خضر میں آکر آباد ہو گئے، غالباً دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل تھے۔ ۲۰۰۰ء کے حدود میں وفات ہوئی، راقم حروف اپنی یادداشت سے عرض کرتا ہے کہ ان کے جنازہ میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے ذمہ داران اور اساتذہ کرام بھی شریک تھے، یہ راقم بھی اس میں شامل تھا، حضرت مولانا مفتی محمد امین صاحب مبارک پوری دامت برکاتہم نے تدفین کے بعد ان کے مکان پر صبروتسلی کے کلمات کہے تھے۔ بڑی محنت و کوشش کے باوجود اس سے زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

مولانا حاجی محمد ابراہیم صاحب خازن

مولانا محمد ابراہیم صاحب خازن قصبہ مبارک پور کے محلہ پورہ صوفی کے باشندہ، جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے خازن اور فعال رکن مجلس شوری تھے۔ مولانا چانک بیمار ہوئے، علالت کا سلسلہ تقریباً ایک سال رہا، ۷ مارچ ۱۹۸۶ء کو

شب جمعہ میں انتقال کیا، نماز جنازہ بعد نماز جمعہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے وسیع صحن میں ہزاروں سوگواروں کی معیت میں ادا کی گئی، اس سے زیادہ حالات کا علم نہیں ہو سکا۔

(روداد جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور ۱۹۸۶ء)

مولانا محمد حاتم اشرفی مبارک پوری

مولانا محمد حاتم اشرفی مبارک پوری محلہ پورہ رانی مبارک پور کے باشندہ اور مدرسہ منظر الاسلام بریلی کے سند یافتہ تھے، اچھے مقرر و خطیب بھی تھے، اشرفی سلسلہ میں مرید تھے، مدرسہ احسن المدارس کان پور میں معلم و مدرس تھے، ویلور میں بھی ۳ سال تدریسی خدمت انجام دی، اور بھی بہت سے مدارس میں معلمی کے فرائض انجام دیئے۔

جن دنوں احسن المدارس کان پور میں تدریسی فرائض میں مشغول تھے، ہر سال احسن المدارس کی جانب سے مدرسہ اشرفیہ میں ممتحن ہوا کرتے تھے، اس سے زیادہ حالات کا علم نہیں ہو سکا۔ (معلومات از مولانا قمر الزماں صاحب مبارک پوری، مولانا غلیل احمد صاحب گوہر)

مولانا محمد حنیف صاحب اعظمی

مولانا محمد حنیف صاحب محلہ کٹرہ مبارک پور کے باشندہ، اور بہترین خطیب و مقرر تھے۔ پوری تعلیم مدرسہ اشرفیہ میں حاصل کی تھی، مدرسہ ضیاء العلوم خیر آباد میں ۱۶ سال مدرس رہے، بعد کے سالوں میں صدر مدرس بھی رہے، الجامعۃ الاسلامیہ سکھٹی میں مدرس اول تھے، اس کے علاوہ بھی انھوں نے دوسرے مدارس میں تعلیم و تربیت کی خدمت انجام دی، مولانا مظفر حسن صاحب ادیبی کے خاص تربیت یافتہ اور ان کی علمی صحبتوں سے متمتع تھے، درس گاہ سے کم، اسٹیج سے زیادہ مشہور تھے۔

مولانا محمد حنیف صاحب لال چوک

مولانا محمد حنیف صاحب لال چوک محلہ۔۔۔۔۔ کے باشندہ تھے، بمبئی میں مدرسہ محمدیہ میں پڑھاتے تھے، اس سے زیادہ معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔

مولانا مجیب الرحمن صاحب الملوئی

مولانا مجیب الرحمن الملو کے باشندہ تھے، قومی، ملی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، مدرسہ اشرفیہ میں ان کی آمدورفت رہتی تھی، تعلیم و تدریس کا سلسلہ نہیں تھا، سانپ کے ڈسنے سے ۱۹۷۰ء کے بعد ان کی وفات ہوئی، تاریخ ولادت و وفات اور مزید حالات کا علم نہیں ہو سکا۔ (معلومات از مولانا قمر الزماں صاحب مبارک پوری، مولانا اسرار الحسن صاحب)

مولوی نور محمد شاہ واعظ مبارک پوری

ولادت ۱۹۱۹ء میں ہوئی، والد کا نام مولانا شاہ تھا، سلطان المدارس لکھنؤ سے صدر الافاضل اور مدرسہ واعظین سے واعظ کی سند حاصل کر کے مختلف مقامات پر اپنے مسلک کی خدمت انجام دی اور تدریس کے فرائض بھی انجام دیئے، اور امامت بھی کرتے تھے، خوش پوشاک اور خوش خوراک تھے، آخری ایام شکار پور میں گزرے، ۲۷ جنوری ۱۹۹۵ء کو انتقال کیا، ۵ بج کر ۲۷ منٹ پر بلند شہر میں دفن کیا گیا۔ (شجرہ طیبہ ص ۸۲ تا ۸۳)

مولانا نجم الدین صاحب احيائی بمہوری

حضرت مولانا نجم الدین ولد منشی محمد رضا ولد محمد آصف غوری صاحب احيائی بمہوری باصلاحیت عالم دین، قلم و قسطاس کے مالک، روضا خانیت کے مصنف تھے۔

۱۶ جنوری ۱۹۳۶ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک مردم خیز موضع بمہور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی منشی محمد رضا صاحب سے حاصل کی، پھر بمہور کے سرکاری پرائمری اسکول میں پرائمری درجہ دوم تک تعلیم حاصل کی، شاہ گڑھ سے مڈل اسکول اور ہائی اسکول علی گڑھ سے پاس کیا۔

ایک بھائی شمس الدین کے انتقال کے بعد دینی تعلیم کی طرف پھیر دیئے گئے، فارسی اور عربی کی تعلیم موقوف علیہ تک دیار مشرق کے مرکزی ادارہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں درج ذیل اساتذہ کرام سے حاصل کیا۔

حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوری، مولانا داؤد اکبر صاحب اصلاحی، مولانا عبدالمنان صاحب باسو پارٹی وغیرہم۔

دورہ حدیث کی تعلیم کے حصول کے لیے دیوبند وارد ہوئے، دارالعلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت حسین احمد صاحب مدنی اور دیگر اساتذہ علم و فن سے فیض اٹھا کر ۱۳۷۶ھ میں فارغ التحصیل ہوئے، حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ نے آپ کو خصوصی سند سے نوازا، لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب کیا، رسمی فراغت کے بعد کاردتدریس کو اختیار کیا، مختلف مقامات پر علم و فن کے موتی برسائے، ان میں فیض آباد، نجیب آباد، گونڈہ شامل ہیں۔

دارالعلوم فاروقیہ کاکوری اور بحر العلوم مدرسہ عالیہ قدیم محل میں عالم و فاضل کے طلبہ کو پڑھایا۔

پھر درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر کے مبارک پور میں ہلال بک ڈپو ۱۰ اپریل ۱۹۶۷ء کو قائم کیا، اس مکتبہ سے متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں، ان کے علاوہ آپ کے تحقیقی و اصلاحی مضامین و مقالات تجلی، ماہ نامہ دارالعلوم دیوبند، البدر، انقلاب و البلاغ میں زینت بنتے تھے۔

۱۰ مئی ۱۹۸۵ء / ۱۹ شعبان ۱۴۰۴ھ روز جمعہ کو علم و فضل کا یہ آفتاب غروب

ہو گیا، ان کے دوست مولانا ابوالوفاء صاحب احیائی نے نماز جنازہ پڑھائی، اور اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے۔ (معلومات از مولانا محمد ہلال صاحب بمبوری)

حضرت مولانا نیاز احمد صاحب العمری سریانویؒ

حضرت مولانا نیاز احمد بن حاجی محمد عمر بن حاجی ابوالقاسم بن شیخ کتوارو باصلاحیت عالم دین، لائق وفاق معلم و مدرس، سلیم الطبع اور منکسر المزاج شخصیت کے مالک تھے۔
قصبہ مبارک پور کے مشرقی شمالی گوشہ میں چند فرلانگ پر سریاں میں ۱۹۴۵ء/۱۳۶۵ء میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی اور متوسطات کی تعلیم قصبہ مبارک پور کے مشہور ادارہ جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، آپ کے باکمال اساتذہ کرام میں حضرت مولانا مفتی محمد یسین صاحب مبارک پوریؒ، حضرت مولانا عبدالمنان صاحب باسوپاریؒ اور حضرت مولانا قاری ظہیر الدین صاحب معروفیؒ وغیرہم کے اسمائے گرامی ذکر کیے جاتے ہیں۔
۱۹۶۱ء میں از ہر ہند دارالعلوم دیوبند پہنچے، تین سال بڑی محنت و یکسوئی سے تعلیم حاصل کی، یہاں کے اساتذہ کرام میں حضرت مولانا سید فخر الدین صاحب مراد آبادیؒ اور حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ جیسے درنایاب اصحاب درس و تحقیق ہیں۔

۱۹ سال کی عمر میں ۱۹۶۴ء میں فارغ التحصیل ہوئے، اور دورہ حدیث شریف کی کتب میں اعلیٰ نمبرات سے سرفراز ہوئے، اس کے بعد تدریسی زندگی کا آغاز میرٹھ کے ایک مدرسہ سے کیا، دو سال مقیم رہ کر مدرسہ دینیہ غازی پور منتقل ہوئے، وہاں بھی زیادہ دنوں قیام نہیں رہا، ۱۹۶۹ء میں اپنے مادر علمی جامعہ عربیہ احیاء العلوم کی آغوش میں بحیثیت مدرس آگئے، ۳۰ سال تک استاذ حدیث رہے، تدریسی ذمہ داری کے ساتھ چند سالوں تک

جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور کے ناظم تعلیمات بھی رہے اور آخر میں صدارتِ تدریس کے منصب پر فائز ہوئے، اسی منصب پر فائز رہتے ہوئے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

چہرہ ہشاس بشاش، قد لمبا، بدن بھاری تھا، ہر ملنے والے سے خندہ پیشانی سے ملنے کا معمول تھا، شیروانی زیب تن فرماتے تھے، اساتذہ کرام اور طلبہ عزیز کے حق میں خصوصاً نہایت شفیق تھے، شوگر کے مرض میں گرفتار ہوئے، جس نے پورے وجود کو گھلا کر رکھ دیا تھا، وفات سے ۵ مہینہ پہلے سے گردہ نے کام کرنا بند کر دیا تھا، دوا و علاج چلتا رہا، مگر رو بصحت نہیں ہوئے، آخر یکم صفر ۱۴۲۰ھ / ۱۸ مئی ۱۹۹۹ء دوشنبہ کو داعی اجل کو لبیک کہا، دوسرے روز ۹ بجے صبح نماز جنازہ ادا کی گئی اور سریاں کی باغ میں سپرد خاک ہوئے، جس خاک سے اٹھے تھے، اسی خاک کے حوالہ ہو گئے۔

مولانا قاضی نثار احمد صاحب مبارک پوری

مولانا قاضی نثار احمد ولد حاجی محمد عمر ولد میاں جی ولی محمد ولد قاضی شیخ رجب علی ولد قاضی محمد رضا ولد قاضی شیخ امام بخش صاحب مبارک پوری محلہ پورہ صوفی کے باشندہ، مدرسہ منظر الاسلام بریلی کے فارغ التحصیل تھے۔

آپ کے والد میاں جی حاجی محمد عمر ایک زمانہ میں ”الجامعۃ الاشرفیہ“ کے ناظم اعلیٰ تھے۔ اجیر سے آتے ہوئے شاہ گنج سے قریب ۱۰ رجب ۱۴۰۴ھ / ۲۲ اپریل ۱۹۸۵ء سہ شنبہ کو ۳ بجے دن میں وفات ہوئی اور تدفین چہار شنبہ ۱۰ بجے دن میں شاہ پنچہ میں ہوئی۔ بڑی کوشش کے باوجود بھی اس سے زیادہ حالات کا علم نہیں ہو سکا۔

مولانا نثار احمد صاحب نوادوی

مولانا نثار احمد ولد حاجی صوفی عبد الرحمن صاحب نوادوی قصبہ مبارک پور کے

مضافاتی محلہ نوادہ کے باشندہ، فاضل دارالعلوم دیوبند، سیدھے سادے، صاف باطن، درویش صفت نیک صالح، نہایت پابندِ صوم و صلاۃ انسان تھے۔

۱۹۴۳ء کے کسی ماہ و تاریخ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے موضع نوادہ کے مکتب عین الاسلام میں حاصل کی، پھر ۵ سال عربی کی تعلیم جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور میں حاصل کی، ۱۹۶۰ء میں ازہر ہند دارالعلوم دیوبند پہنچے، ۱۹۶۲ء میں فارغ التحصیل ہوئے، ۱۹۸۰ء میں دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جلسہ میں دستارِ فضیلت حاصل ہوئی۔

مختلف مدارس و مکاتب مدرسہ عربیہ قاسم العلوم منگراواں، مرکزی محمدیہ گھوسی، مدرسہ عین الاسلام نوادہ، مدرسہ اسلامیہ رسول پور میں تدریسی خدمات انجام دیں، آخر میں جامع مسجد بندر بازار ضلع اعظم گڑھ میں استاذ ہوئے۔

عقائد و نظریات میں بہت پختہ تھے، کوئی مہانت انھیں گوارہ نہ تھی، جو بات حق سمجھتے تھے، اسے برملا ظاہر کرتے تھے، خواہ اس کی وجہ سے انھیں مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا، سوالات خوب کرتے، جب اطمینان بخش جواب پاتے تو بہت خوش ہو جاتے، الغرض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں جری تھے، جوانی سے تا وفات نوادہ کی جامع مسجد کے امام جمعہ رہے، اور جب گھر پر رہے تو پنجگانہ کے بھی امام رہے۔

۸/رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ/۳۰/اگست ۲۰۰۹ء کو شب میں اعظم گڑھ میں اسپتال میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے، نماز جنازہ میں روزہ داروں اور علماء و صلحاء کا مجمع تھا، بعد نماز ظہر جنازہ کی نماز ہوئی، حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ نے امامت کرائی۔
(ماہنامہ ضیاء الاسلام نومبر، دسمبر ۲۰۰۹ء ص ۴۲ و معلومات از مولانا مفتی فرحت افتخار صاحب نوادوی)

ماخذ و مصادر

- ۱ اسلام کا نظریہ حیات و ممات مولانا مظفر حسن صاحب ظفر ادیبی
- ۲ انقلابی مصر ڈاکٹر محمد حسن صاحب اعظمی
- ۳ اکابر احیاء العلوم حصہ اول، دوم محمد صادق مبارک پوری
- ۴ اودھ میں افتاء کے مراکز اور ان کی خدمات ڈاکٹر اشتیاق احمد اعظمی
- ۵ تذکرہ علمائے اعظم گڑھ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی
- ۶ تذکرہ علمائے مبارک پور مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری
- ۷ تذکرہ علمائے اہل حدیث مبارک پور مولانا فیاض احمد صاحب سلفی ریاضی
- ۸ تذکرہ مولانا عبدالکریم صاحب اعظمی ابراہیم پوری مولانا حبیب الرحمن ابراہیم پوری
- ۹ تراجم علمائے اہل حدیث مولانا خالد حنیف صدیقی
- ۱۰ حامی دین متین مولانا عثمان صاحب ساحر مبارک پوری
- ۱۱ الرحیق المختوم مولانا صفی الرحمن صاحب حسین آبادی
- ۱۲ شجرہ طیبہ مولانا کرار حسین اطہری مبارک پوری
- ۱۳ علمائے رسول پور و عظیم شخصیتیں محمد صادق مبارک پوری
- ۱۴ فتاویٰ احیاء العلوم مبارک پور مرتب مولانا مفتی جمیل احمد صاحب ندیری
- ۱۵ قاضی طہر نمبر خصوصی شمارہ ضیاء الاسلام شیخوپور مدیر مولانا ضیاء الحق صاحب خیر آبادی
- ۱۶ مجید البیان مولانا مسرور حسن صاحب مجیدی قتی
- ۱۷ مقدمہ منہ طہور مولانا قمر الزماں صاحب مبارک پوری
- ۱۸ میری محسن شخصیتیں مولانا ندیر احمد صاحب ندوی

ماہ نامے و روز نامے

۱۹	ماہ نامہ نامہ اشرفیہ مبارک پور	مدیر مولانا مبارک حسین صاحب مصباحی
۲۰	سہ ماہی سراج العلوم چھپرہ خصوصی اشاعت ۱۳۳۵ھ	مدیر مولانا ضیاء الحق خیر آبادی
۲۱	ماہ نامہ ضیاء الاسلام ۱۹۸۶ء	مدیر مولانا ضیاء الحق صاحب خیر آبادی
۲۲	ماہ نامہ نور جولائی ۲۰۰۶ء	مضمون نگار مولانا محمد عبدالمبین نعمانی
۲۳	روز نامہ انقلاب ۳ فروری ۲۰۱۴ء	
۲۴	روداد جامعہ عربیہ احیاء العلوم مبارک پور ۱۹۸۶ء	

ان کے علاوہ درج ذیل حضرات سے معلومات حاصل کی گئی ہیں:

۱	مولانا قمر الزماں صاحب مبارک پوری
۲	مولانا اسرار الحسن صاحب مبارک پوری
۳	مولانا خلیل احمد صاحب گوہر
۴	مولانا مفتی فرحت افتخار صاحب نوادوی
۵	مولانا محمد احمد اشرفی نوادوی
۶	مولوی مفتی عین الہدیٰ صاحب قاسمی ابراہیم پوری
۷	مولانا ڈاکٹر محمد ہلال صاحب بمہوری
۸	ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب عزیز پورہ رانی، مبارک پور
۹	جناب جمیل احمد بھائی علیگ ولد حاجی عبداللہ چیڑمین پورہ صوفی مبارک پور
۱۰	جناب رضوان اللہ صاحب سیٹھ پورہ رانی، مبارک پور
۱۱	جناب رشید احمد صاحب پورہ صوفی، مبارک پور
۱۲	جناب صغیر احمد صاحب بھینڈی

- ۱۳ جناب مقصود احمد صاحب محلہ پورہ خواجہ، مبارک پور
- ۱۴ جناب اسلم صاحب نظامی پورہ رانی، مبارک پور
- ۱۵ جناب مولوی رضوان انور صاحب مصباحی
- ۱۶ مولانا انعام الرحمن صاحب انصاری مبارک پوری
- اور درج ذیل حضرات کے مضامین و مقالات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے:
- ۱ مولانا ارشاد الحق صاحب مہتمم جامعہ رشیدیہ بمہور
- ۲ مولانا رضوان احمد القاسمی صدر المدرسین جامعہ رشیدیہ بمہور
- ۳ مولانا محمد طیب قاسمی بمہوری
- ۴ مولانا فواز عبدالعزیز مبارک پوری ریسرچ اسکالرشپ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
- ۵ مولانا ابوبشار صاحب اعظمی، الہ آباد

قاضی صاحب مرحوم کی تصانیف

۱	ائمہ اربعہ (اُردو)	۲۱	رجال السند والہند (عربی)
۲	اسلامی نظام زندگی (اُردو)	۲۲	طبقات الحجاج (اُردو)
۳	افادات حسن بصری (اُردو)	۲۳	العرب والہند فی عہد الرسالۃ (عربی)
۴	اسلامی شادی (اُردو)	۲۴	العقد الثمین فی فتوح الہند (عربی)
۵	اسلامی ہند کی عظمت رفتہ (اُردو)	۲۵	علی و حسین (اُردو)
۶	آثار و اخبار (اُردو)	۲۶	علماء اسلام کے القاب و آداب (اُردو)
۷	بنات اسلام کی دینی و علمی خدمات	۲۷	عرب و ہند عہد رسالت میں (اُردو)
۸	تبلیغی و تعلیمی سرگرمیاں عہد سلف میں	۲۸	کاروانِ حیات (اُردو)
۹	تاریخ اسماء الثقات (عربی)	۲۹	مآثر و معارف (اُردو)
۱۰	تذکرہ علماء مبارک پور (اُردو)	۳۰	معارف القرآن (اُردو)
۱۱	تدوین سیر و مغازی (اُردو)	۳۱	مسلمانوں کے ہر طبقہ میں علم و علماء
۱۲	جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول (عربی)	۳۲	مئے طہور (اُردو)
۱۳	الحکومات العربیہ فی الہند و السند (عربی)	۳۳	مکتوبات امام احمد بن حنبلؒ (اُردو)
۱۴	حج کے بعد (اُردو)	۳۴	ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت
۱۵	خلافت راشدہ اور ہندوستان (اُردو)	۳۵	الہند فی عہد العباسین (عربی)
۱۶	خلافت اُمیہ اور ہندوستان (اُردو)	۳۶	مطالعات و تعلیقات
۱۷	خلافت عباسیہ اور ہندوستان (اُردو)	۳۷	ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں
۱۸	خیر القرون کی درس گاہیں (اُردو)	۳۸	محمد کے زمانہ کا ہندوستان
۱۹	خواتین اسلام کی علمی و دینی خدمات	۳۹	ہندو سند کے قدیم علماء (ترجمہ رجال السند والہند)
۲۰	دیارِ پورب میں علم و علماء (اُردو)	۴۰	مسئلہ خلق قرآن کی سیاسی حیثیت